ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۲

یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس (کے کلام اللہ ہونے) میں کوئی شک نہیں ہے
(یہ) ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کیلئے

کتاب مستطاب

جلد اول

فیضان الرحمٰن

فی تفسیر القرآن

از افاداتِ عالیہ

مفسر قرآن حجۃ الاسلام حضرت العلام مجتہد العصر و الزمان مد ظلہ العالی

آیۃ اللہ الشیخ محمد حسین النجفی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیضان الرحمٰن

جلد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جلد اوّل

مصنف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آیت اللہ الشیخ محمد حسین النجفی دام ظلہٗ

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

ڈیزائننگ وسیٹنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قلب علی سیال فون: 0301-7229417

سال اشاعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔2013ء

ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور

فون نمبرز۔ 042-37314311,0321-4481214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ !مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عہدِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ادارہ ھذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی تائید واعانت کا ثمرہ ہے۔

مہربان ،رحیم وکریم خالق نے ''انسان'' کو اپنی تمام مخلوقات میں عزت وشرف کے تاج سے مزیّن فرما کر فلکِ نیلگوں کے زیرِ سایہ نعماتِ انواع واقسام سے سرشار،فکری ونظری نشانیوں سے مرصع ایسے قطعۂ ارض پر متمکن فرمایا۔جہاں ہر روز آفتابِ عالم ظلمات اللّیل کو فاش کرتے ہوئے نجوم وقمر کے تسلط کو دامنِ فلک میں گوشہ نشین کر دیتا ہے اور اپنے فیوضاتِ پُروقار سے ہر ذی روح کے اندر زندگی کی ہلچل کو تیز تر کر دیتا ہے۔

نظامِ شمس وقمر کی ان ضیاؤں سے ہر ذی روح اپنی اپنی استطاعتِ بصارت وبصیرت کے مطابق فیض یاب ہوتا ہے۔نباتات اپنی صغیر کلیوں اور حسین پھولوں کے ذریعے شبنم وقمر کی مٹھاس سے لطف اندوز ہوتے ہیں چرندو پرند سورج کی کرنوں سے سینۂ ارض پر غذائی نعمات پا کر مسرور ہوتے ہیں۔درندے تاریکیوں کو جال سمجھ کر اور روشنیوں کو غنیمت جان کر دھرتی پہ جلوہ فگن حُسنِ زندگی کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔سورج کی تمازت خیز کرنیں ہوں یا چاند کی دلنشیں شعاعیں،صاحبانِ بصیرت کیلئے تاریکیوں سے نکل کر اُجالوں سے مستفیض ہونے کی نوید ہیں۔

لہٰذا وہ پاکیزہ نفوس کے حامل اہل بصیرت جو روشنیوں کے منتظر ہوتے ہیں،وہ خوابِ غفلت میں مدہوش گہری نیند نہیں سوتے بلکہ جونہی ظلمات اللیل اٹھتے ہیں،وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں۔مگر وہ مریض نفوس جنہیں قدرت کی ایسی عظیم نعمتوں سے فیضیاب ہونا ہی نہیں آتا وہ سورج کے اس نورِ بے کراں کے سامنے بےفیض ہو کر اپنے مستقبل سے بے خبر،مایوسیوں کے شکنجے میں مقفس، پردے کی اوٹ میں چادر اُوڑھ

کر معمول کی گہری نیند سو جاتے ہیں۔

''انسان'' جسم و روح سے مرکب، عقل سلیم کے زیور سے آراستہ اپنے اندر صفاتِ جمیلہ وصفات رذیلہ ہر ایک کے ارتقاء کی قوت رکھتا ہے۔ رذائل کا ارتقاء حیوانات سے بھی بدتر درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ جبکہ صفات جمیلہ کے ارتقاء سے انسان ملائکہ سے بھی افضل قرار پاتا ہے۔ مایوس اور مریض نفوس کی شفایابی کیلئے، صفاتِ رذیلہ کے خاتمے اور صفاتِ جمیلہ کے ارتقاء کیلئے ہمیشہ حکیمِ روحانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ روحانی تسکین اور معرفتِ الٰہی سے فیض یاب ہونے کیلئے قرآنی آیات پر غور وفکر کرنا، ان کے رموز وحقائق کو سمجھنا اور قرآن کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا، آخرت کی کامیابی و کامرانی کا باعث ہے۔

بلاشبہ دنیا کا ہر شخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنے ملک اور اپنی قومی زبان، بلکہ اپنے علاقے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتا ہے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر پاکستان میں علاقائی ذوقِ زبان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور عقائد کی اصلاح اور ان کی پختگی اور اعمال کی اہمیت اور ان کی درستگی کیلئے 10 جلدوں پر مشتمل زیرِ نظر تفسیری مجموعہ ''**فیضان الرحمٰن**'' قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ آیت اللہ الشیخ محمد حسین النجفی مدظلہٗ العالی کی عظیم مساعی جمیلہ اور شب و روز کی محنت کا ثمرِ نایاب ہے۔ خداوند عالم اُن کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اور انہیں طاقت وصحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُنہوں نے ادارہ ھذا کو یہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مزید برآں آپ ہماری تمام کتب بشمول تفسیر فیضان الرحمٰن ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی ویب سائٹ www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست مضامین جلد اوّل

سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرَانِ ---------- ۴۸۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد للہ علی نو الہ والصلاۃ والسلام علی النبی وآلہ

گفتار اولین

خداوند عالم کے اس خصوصی لطف وکرم کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس نے اس بندہ گنہگار بلکہ ذرّہ بے مقدار کو یہ توفیق مرحمت فرمائی کہ پڑھنے پڑھانے کے علاوہ بیان وکلام کے علاوہ قلم وتحریر کے ذریعہ اس کے دین مبین کے تمام شعبوں اور اسلامی علوم کے تمام گوشوں کی بقدر وسعت واستطاعت خدمت کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں۔ علم کلام وعقائد ہو یا علم حدیث واخبار، علم فقہ ومسائل ہو یا اسلامی سیرت وسوانح وتاریخ، علم الاخلاق ہو یا علم مناظرہ وجدال احسن۔ الغرض سب اسلامی علوم وفنون پر اس راقم آثم کی کئی کئی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں اور بفضلہٖ تعالیٰ قبول عام کی سند پا چکی ہیں اور ان کی وجہ سے اندرون ملک وبیرون ملک ایک ذہنی وفکری انقلاب رونما ہو چکا ہے والحمد للہ علی احسانہٖ

البتہ اب تک اسلامیات کے ایک اہم شعبہ پر کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اور وہ ہے قرآن، اس کا ترجمہ، تفسیر اور اس کے معارف وحقائق اور اسرار ورموز کی نشر واشاعت، مدت سے اپنی بھی تمنا تھی اور چند مخلص زندہ ومرحوم علماء کرام اور دیگر دانشوران عظام کا بھی حد سے زیادہ اصرار تھا کہ اس موضوع پر کام کیا جائے لیکن اس اہم کام کو ہاتھ لگانے کی کچھ اپنی عدم الفرصتی کی وجہ سے اور کچھ اپنی بے مائیگی کی وجہ سے جرأت نہیں ہوتی تھی۔ مگر ایک تو اس کام کی اہمیت وافادیت دوسرے مخلص اعزاء واحباب کے اصرار اور تیسری اپنی شرعی ذمہ داری کے احساس سے متاثر ہو کر اب یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ بعونہٖ تعالیٰ اس کام کا آغاز کر دیا جائے اور بہ توفیق ایزدی دس جلدوں میں ایک ایسی جامع ومانع اور مکمل ومفصل تفسیر قرآن پیش کی جائے جو جدید وقدیم علوم کا حسین امتزاج ہو جس میں نہ طول مملل ہو اور نہ اختصار مخل۔ بلکہ ان کے بین بین ہو اور اسلامی اعتدال کی مظہر ہو اور قدیم و جدید علوم کی روشنی میں دنیا ودین کے تمام تقاضوں کو پورا کرے اور جسے دوسرے اسلامی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام ومفسرین عظام کی لکھی ہوئی اعلیٰ قسم کی تفسیروں کے مقابلہ میں مکتب اہل بیتؑ کی ترجمانی کے سلسلہ میں بڑے حوصلہ جرأت مندی اور فخر وسباہات کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ **واللہ ولی التوفیق وبیدہ ازمۃ التحقیق۔**

بارگاہ رب العزت میں دعا واستدعا ہے کہ وہ رحیم وکریم حسب سابق اس عظیم کام سے عہدہ برآ ہونے کی مجھے توفیق مرحمت فرمائے۔ اور اسے قبول عام وبقائے دوام کے عظیم اعزاز سے نوازے۔

اوراسے جہاں میرے لئے فلاح کونین کا ذریعہ بنائے وہاں اسے رشدوہدایت کا وہ ابدی سرچشمہ بنائے کہ جس سے تمام دنیاو جہاں کے لوگ رہتی دنیا تک سیر وسیراب ہوں اورفیض پاتے رہیں۔آمین۔یارب العالمین بجاہ النبی وآلہ الطاھرینؑ۔

ایضاح

قرآن مجید چونکہ علوم وفنون اورمعارف وحقائق کا وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اورمختلف اسرارورموزاوردقائق کا وہ دریا ہے جس کا کوئی ساحل نہیں ہے اس لئے قدیم الایام سے اب تک برابر ہر مفسر نے اپنے علم وذوق وشوق کے مطابق اس بحر ناپیدا کنار میں شناوری کر کے اس سے آبدار موتی وموتگے برآمد کئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے نحوی وادبی نکات کومطمع نظر قرار دے کران سے اپنی تفسیر کوبھر دیا ہے ۔جیسے علامہ طبرسی اورفاضل زمخشری۔کسی کے ہاں علم کلام وجدال کی بھرمار ہے جیسے علامہ فخرالدین رازی اورفاضل ابوالفتوح کسی نے قصص وحکایات اورتاریخی واقعات پرزیادہ توجہ دی ہے اوراپنی تفسیر کوان سے لبریز کردیا ہے جیسے علامہ طبری کی تفسیرابن جریروتفسیر ثعلبی اورسید ہاشم بحرانی کی البرہان۔کسی نے ہرقسم کے صحیح وسقیم اخباروآثار سے اپنی تفسیر کوبھردیا ہے جیسے علامہ سیوطی کے درمنثوراورفاضل بحرانی کی البرہان۔کسی نے اپنی توجہ کا مرکز طبعی علوم کوقراردے کراپنی تفسیر کوفلکیات وارضیات اوردیگرطبعیات سے پرکردیا ہے جیسے فاضل طنطادی اوران کی تفسیر جواہر۔

اورکسی نے علم تصوف سے متاثر ہوکرقرآن کوتصوف کی کتاب بناڈالا جیسے ابن عربی کی تفسیر القرآن اورملا کاشی کی تفسیراورکسی نے قرآن کواپنے خیالات کے سانچہ میں ڈھال کراسے تفسیر بالرائے کا مجموعہ بنادیا جیسے سیداحمد خان اورجناب پرویز اوران کی تفسیریں۔ہم نے ہرقسم کے افراط وتفریط سے اپنے دامن کوبچاتے ہوئے سب سے پہلے توتفسیر قرآن میں خودقرآن اورتمام اسلامی علوم کی سرسبزروشوں سے فیض حاصل کرتے ہوئے قرآنی مطالب ومعانی کی تشریح اس کے اجمالی حقائق کی توضیح اوراس کے بیان کردہ عقائد واحکام اوراوامر ونواہی کی تفسیر پراکتفا کی ہے۔

دامان نگاہ تنگ وگل چین توبسیار   گل چین توازتنگی دامان گلہ دارد

ہاں البتہ چونکہ میرا ذاتی رجحان ومیلان زیادہ ترعقائد کی اصلاح اوران کی پختگی اوراعمال کی اہمیت اوران کی درستگی کی طرف ہے کیونکہ قرآن کتاب ہدایت ہے جیسا کہ نازل کرنے والے کاارشاد ہے۔ھذابیان اللناس وھدی وموعظة اللمتقین(آل عمران۔۱۳۹)اس لئے ناظرین کواس چیز

کی جھلکیاں اس تفسیر میں نمایاں نظر آئیں گی ویسے ضرورت کی کسی بھی چیز کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس لئے امید کامل ہے کہ سب لوگ اس تفسیر میں اپنے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان موجود پائیں گے اور اس سے اپنے علمی شوق کی پیاس بجھائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم زانکہ من بندۂ گنہگارم

وانا الاحقر

محمد حسین النجفی عفی عنہ بقلمہٖ

۱۵ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ بمطابق ۱۵ فروری ۱۹۹۷ء سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودہا۔

نوٹ: یہ گفتار اولین لکھنے اور سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی بعض آیات کا ترجمہ و تفسیر لکھنے کے بعد بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ سلسلہ یک دم بند ہو گیا اور اڑھائی سال کے انقطاع کے بعد اب ۷۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے پھر اس سلسلہ جلیلہ کو شروع کیا جا رہا ہے۔

اللّٰھم وفقنا للاتمام بجاہ النبی وآلہ علیھم السلام

۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء

مقدّمات تفسیر قرآن

کلام اللہ الحمید کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے یہاں بڑے اختصار کے ساتھ بطور مقدمہ چند امور کی وضاحت کر دینا انسب معلوم ہوتی ہے۔ جن کا اصل مقصد سے گہرا ربط و تعلق ہے اور آئندہ تفسیر قرآن کے دوران قرآنی مطالب و معانی کے سمجھنے سمجھانے میں ممدّ و معاون ثابت ہوں گے انشاء اللہ۔

پہلا مقدمہ

لفظ قرآن کے لغوی اور اصطلاحی معنی کی توضیح:

لفظ قرآن کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

سو واضح ہو کہ لفظ قرآن، قرأت اور باب قرء یقرء بروزن نصر ینصر و، فتح یفتح کا مصدر ہے۔ جس کے لغوی معنی جمع کرنے اور پڑھنے کے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے قرأ الکتاب۔ کتاب کو پڑھا۔ اور کہا جاتا ہے قرءً قرءً و قرآناً الشئی یعنی اسے ملایا، جمع کیا۔

کتابت و کتاب کے عام مروجہ طریقہ سے پہلے کسی کلام منظوم و منثور کے جمع کرنے کا طریقہ کا راسے یاد کر لینا اور ازبر کر لینا اور سینہ میں محفوظ کر لینا تھا اور چونکہ کسی تحریر کو جمع کرنے کا ایک سہل طریقہ اس پر نظر ڈالنا یا اس کا زبان پر جاری کرنا بھی ہے۔ اس لئے قرآت کے ایک معنی پڑھنا بھی ہیں اور چونکہ پہلی وحی کی ابتداء ''اقرأ'' سے ہوئی ہے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ کتاب خداوندی کے قرآن کہلانے کا تعلق اسی ''اقرأ'' سے ہو۔ تو جس طرح کتاب بمعنی مکتوب اور بیان بمعنیٰ مبین کے معنی میں عام استعمال ہوتا ہے اسی طرح قرآن بھی بمعنی مقروٗ اور محفوظ ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں قرآن کا اطلاق اس کلام الٰہی پر ہوتا ہے جسے خدائے رحمن نے بطور وحی بتوسط جبرئیل، بحیثیت معجزہ حضرت پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا۔ جس کا مختصر تعارف یہ ہے کہ

"ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" یہ قرآن بھی ہے۔ "اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ "(سورہ بنی اسرائیل...۹) "تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ"(سورہ فرقان...۱) یہ فرقان بھی ہے۔ ''قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ"(سورہ مائدہ...۱۵) یہ نور بھی ہے، اور

کتاب مبین بھی ہے۔" اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ "(سورہ حجر ...۹) یہ ذکر بھی ہے۔" هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ "۔ یہ کتاب ہدایت ایسی کتاب ہے جو نہ عام دنیا کی کتابوں کی طرح کی کوئی کتاب ہے اور نہ دنیا کے عام دستوروں کی طرز کا کوئی دستور ہے۔ اس کا انداز ترتیب ہے تو ساری کائنات کی کتابوں سے جدا اور اس کے اصول و معارف اور حقائق و اسرار ہیں تو دنیا جہاں کی کتابوں سے ممتاز و منفرد۔ بنا بریں جس طرح اس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک جملہ قرآن ہے۔ اسی طرح اس پورے مقدس مجموعہ کا نام بھی قرآن ہے۔

" اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ "(سورہ واقعہ،، تا۹،) یہ خالق کلام کا کلام حق ترجمان ہے۔

" نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ "(سورہ شعراء)۔ اس کے مطالب و معانی بھی منجانب اللہ ہیں اور الفاظ و کلمات بھی منجانب اللہ ہیں جو فصاحت و بلاغت میں حد اعجاز تک پہنچے ہوئے ہیں۔

قرآن و حدیث قدسی اور عام حدیث میں فرق

اسی مذکورہ بالا بیان سے قرآن اور حدیث قدسی اور عام حدیث کا باہمی فرق بھی اہل دانش و بینش پر واضح و عیاں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ حدیث قدسی میں بھی الفاظ و کلمات اور ان کے مطالب و معانی دونوں منجاب اللہ ہوتے ہیں۔ مگر وہ بطور معجزہ و دلیل نبوت نازل نہیں ہوتے بخلاف قرآن کے کہ اس کے الفاظ و عبارات اور ان کے مطالب و معانی بطور معجزہ اور دلیل نبوت کے نازل کئے گئے ہیں۔ اور جہاں تک عام حدیث کا تعلق ہے تو اس میں گو مطالب و معانی منجاب اللہ ہوتے ہیں مگر اس کے الفاظ و کلمات نبیؐ و امام علیہ السلام کے اپنے ہوتے ہیں۔

(از مقدمہ کواکب مضیئہ در احادیث قدسیہ۔ مولفہ ایں احقر)

دوسرا مقدّمہ

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ خالدہ ہے

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن مجید پیغمبر اسلامؐ کی نبوت و رسالت کی صحت و صداقت کا وہ معجزہ خالدہ ہے جو آپؐ کے اعلان نبوّت سے آج تک برابر معجزہ تھا اور آفتاب قیامت کے طلوع ہونے تک معجزہ رہے گا۔

معجزہ کی تعریف

معجزہ اعجاز سے مشتق ہے اور اعجاز عجز سے ہے۔ جس کے لغوی معنی عاجز کرنے والا کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں خدائے قدیر کے اس خارق عادت (مجرائے طبیعی اور نیچر کے خلاف) فعل کا نام ہے جسے وہ اپنے کسی نبی یا اس کے وصیؑ کے دعوائے نبوت و وصایت کے وقت بطور سند ان کی نبوت و وصایت کی صداقت ثابت کرنے کی غرض سے ان کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے (تمام کتب کلامیہ)۔ یہی وجہ ہے کہ معجزہ کی نسبت خدائے عظیم کی طرف بھی ہوتی ہے اور معجزہ نما (نبیؑ و امامؑ) کی طرف بھی۔ ہاں البتہ فرق یہ ہے کہ یہ نسبت خدا کی طرف حقیقی ہوتی ہے کیونکہ وہی اپنی قدرت کاملہ سے یہ معجزہ ظاہر کرتا ہے اور نبیؑ و امامؑ کی طرف مجازی ہوتی ہے کیونکہ ان کی دعا و استدعا پر ان کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔

خداوند عالم جہاں قادر ہے وہاں علیم بھی ہے اور جہاں علیم ہے وہاں حکیم بھی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے مختلف اعصار و ادوار میں ہر ہر نبی کو وہ معجزہ دیا (ظاہر فرمایا) جس کی اس دور میں ضرورت تھی۔ الغرض جس عہد میں جس چیز کا زیادہ چرچا تھا اور جس پر لوگ زیادہ فخر و ناز کرتے تھے اس دور کے نبی کو اسی قسم کا معجزہ دے کر ان لوگوں کا غرور و پندار خاک میں ملا دیا۔ چنانچہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے دور میں سحر و ساحری کا بڑا زور تھا تو خدائے علیم و حکیم نے جناب موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصا کے اژدھا بننے کا معجزہ دے کر سب جادوگروں کو عاجز کر دیا۔ جناب عیسیٰؑ کے زمانے میں طب و حکمت کا بڑا چرچا تھا تو خدائے خبیر و قدیر نے ان کو نابینے کو بینا اور مردے کو زندہ کرنے کا معجزہ دے کر سب طبیبوں اور حکیموں کو عاجز اور واماندہ کر دیا۔ اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کے عہد معدلت انگیز میں لوگوں کو اپنی فصاحت و بلاغت، طلاقت لسانی اور قادر الکلامی پر بڑا فخر و ناز تھا اور اسے ہی سرمایہ افتخار قرار دیا جاتا تھا حتیٰ کہ عرب اپنے مقابلہ میں کل کائنات کو اعجم (گونگا) سمجھتے تھے تو قادر و قیوّم خدا نے آنحضرتؐ کو فوق العادہ فصاحت و بلاغت کا وہ شاہکار (قرآن) عطا فرمایا جس نے تمام فصحاء بلغاء کی زبانوں پر تالے لگا دیئے۔

چنانچہ خداوند عالم نے تمام منکرین رسالت کو عموماً اور عالم عرب کو خصوصاً چیلنج کیا کہ اگر تمہیں پیغمبر اسلامؐ کی نبوت اور قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک ہے تو اس جیسی کوئی کتاب بنا کر لاؤ ''فَأْتُوا بِكِتٰبٍ''۔

جب کچھ مدت تک انتظار کرنے کے باوجود ایسی کتاب نہ لا سکے تو قرآن نے یہ کہہ کر ان کی غیرت و حمیت پر تازیانہ لگایا کہ

''قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ''(سورہ اسراء......۸۸)

(کہہ دیجئے کہ اگر تمام انس وجن متحد ہوکر بھی کوشش کریں کہ اس جیسی کتاب لائیں تو ہر گز نہیں لا سکیں گے)

مگر اس کے باوجود جب وہ ایسا نہ کر سکے تو قرآن نے اپنے چیلنج میں قدرے نرمی کرتے ہوئے دوسرا اعلان فرمایا:

فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ: یعنی اگر پورے قرآن جیسی کتاب نہیں لا سکتے تو اس جیسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لاؤ یہ دوسرا تازیانہ تھا جوان کے جوادِ طبع کو مہمیز کرنے کیلئے لگایا گیا مگر وہ اسے بھی شیر مادر کی طرح پی گئے ۔تو جب خداوند عالم نے بموجب دروغگو را بایدتا خانہ اش رسانید اس چیلنج کو یہاں تک نرم کر دیا کہ فرمایا:

''وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ''(سورہ بقرہ......۲۳)

جو کچھ ہم نے اپنے (بندہ خاص) پر نازل کیا ہے۔(اس کے کلام اللہ ہونے میں) اگر تمہیں کچھ شک ہے تو اس کے مانند ایک سورہ ہی لے آؤ یہاں خدا نے ان کو ایک اور تازیانہ عبرت رسید کیا کہ فرمایا:

''ایک اللہ کو چھوڑ کر اپنے سب حمایتیوں اور ہم نواؤں کو بھی بلا لو۔اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے''۔

مگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے اور نہ قیامت تک کر سکیں گے لہٰذا جب تم انفرادی واجتماعی کوشش وکاوش سے بھی ایسا نہ کر سکو تو پھر تسلیم کر لو کہ یہ کسی فوق البشر طاقت کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

قرآن مجید کی بعض سورتیں تو دوسو ستاسی (۲۸۷) آیتوں پر مشتمل ہیں جیسے سورہ بقرہ اور بعض صرف چار(۴) آیتوں پر مشتمل ہیں جیسے سورہ العصر تو مخالف اسلام طاقتوں کیلئے کتنا ہی آسان طریقہ تھا کہ کم از کم چار آیتوں کی کوئی سورہ بنا کر پیش کر دیتے تو اس طرح جہاں قرآن کے اس چیلنج کا جواب ہو جاتا وہاں اسلام و قرآن کی صداقت کا خاتمہ بھی ہو جاتا۔مگر مشاہدہ شاہد ہے کہ مشرق ومغرب کے دشمنان اسلام وقرآن چودہ سو سال کی مسلسل جدوجہد اور کدوکاوش کے باوجود آج تک جبکہ پندرھویں صدی کا بیسواں سال بھی قریب الاختتام ہے اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے اور نہ ہی آئندہ قیامت تک دے سکیں گے۔انشاءاللہ

تو آیا اس کے بعد بھی قرآن کے کلام اللہ ہونے' اسلام کے دین برحق ہونے اور پیغمبر اسلامؐ کے برحق نبی ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے؟ اور کسی بھی منصف مزاج شخص کیلئے انکار کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ اس لئے خدا ایسے لوگوں کو یہ دھمکی دینے میں حق بجانب ہے کہ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

قرآن کے وجوہِ اعجاز

اب رہی اس بات کی تحقیق کہ قرآن مجید کن وجوہ کی بنا پر معجزہ ہے؟ اس سلسلہ میں علماء اعلام میں اختلاف فکر ونظر پایا جاتا ہے۔ اور اس موضوع پر بہت سے علماء اسلام نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں بڑی تفصیل جمیل کے ساتھ وجوہ اعجاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ بعض وجوہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ پہلی وجہ قرآن کی فوق العادہ فصاحت وبلاغت ہے جس نے فصحائے عرب اور بلغائے عالم کو اس کا مقابلہ ومعارضہ کرنے سے عاجز ودرماندہ کر دیا۔ جس پر ابھی کچھ پہلے بقدر ضرورت تبصرہ کر دیا گیا ہے۔

۲۔ دوسری وجہ اس کے بے پایاں علوم ومعارف ہیں۔ باوجود یکہ پیغمبر اسلامؐ ایسے ماحول میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے اور پروان چڑھے جو علمی ماحول نہ تھا۔ اور نہ ہی عرب کے لوگ کوئی پڑھے لکھے لوگ تھے۔ وہاں نہ کوئی مدرسہ نہ کالج اور نہ کوئی یونیورسٹی اور نہ ہی آنحضرتؐ نے کسی مدرسہ وجامعہ میں کوئی تعلیم حاصل کی مگر اس کے باوجود ایک ایسی کتاب لائے جو تمام کائنات کے علوم وفنون کی جامع اور انسان کی تمام انفرادی واجتماعی ضروریات معاش ومعاد پر حاوی ہے اور ایک ایسا مکمل دستور العمل اور ضابطہ حیات ہے کہ جس کی گرفت سے انسان کی زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ باہر نہیں ہے۔ کیا یہ اس بات کی ناقابل ردّ دلیل نہیں ہے کہ یہ کسی بندہ کا کلام نہیں بلکہ خالق دوجہاں کا کلام حق ترجمان ہے۔ اور پیغمبر اسلامؐ کا وہ معجزہ خالدہ ہے جس کا رہتی دنیا تک اعجاز باقی رہے گا۔ انشاءاللہ۔

۳۔ تیسری وجہ اس کی اخبار غیبیّہ ہیں۔ قرآن مجید میں ماکان کی بہت سی ایسی واضح اور تفصیلی خبریں دی گئی ہیں جو اس دور کے احبار ورھبان کو بھی تفصیل کے ساتھ معلوم نہ تھیں جو گذشتہ آسمانی کتابوں کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح ''ما یکون'' کے متعلق بعض ایسے واقعات کی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں جو حرف بحرف وقوع پذیر ہوئیں جیسے کہ روم' فارس کے مقابلہ میں پہلے رومی مغلوب ہوں گے اور اہل فارس غالب آئیں گے مگر دس سال کے اندر اندر اہل فارس مغلوب ہوں گے اور رومی غالب آ جائیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ یہ بات اس کی قطعی

دلیل ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا ہی کلام ہے اور پیغمبر اسلامؐ کا معجزہ خالدہ ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ۔ اس کی غیر معمولی تاثیر ہے۔ بعض علماء نے قرآن مجید کی غیر معمولی عجیب تاثیر کو اس کی وجہ اعجاز قرار دیا ہے۔ جس نے عرب وعجم کی مختلف قوموں کے مزاج بدل دیئے۔ اخلاق بدل دیئے۔ کج خلق گنواروں کو معلم اخلاق بنا دیا۔ بھیڑ بکریاں چرانے والوں کو حکمران بنا دیا۔ اور جاہلوں کی کایا پلٹ کر انہیں عالم انسانیت کا استاد بنا دیا۔

قرآن مجید کی ان انقلابی تاثیرات نے ثابت کر دیا کہ یہ روحانی تاثیر قادر مطلق کی قوت قاہرہ کا نتیجہ ہے یہ کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ قرآن مجید کی اس حیرت انگیز تاثیر کا اقرار یورپ کے سینکڑوں مستشرقین نے بھی کیا ہے بطور نمونہ از خروارے یہاں صرف ڈاکٹر گستاولی بان (Ghustawali Bann.DR) کا وہ بیان نقل کیا جاتا ہے جو اس نے اپنی کتاب تمدن عرب میں درج کیا ہے موصوف کے بیان کا ترجمہ یہ ہے۔

''اس پیغمبر اسلامؐ اس نبیؐ امیؐ کی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے ایک ناہنجار قوم کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہیں آئی تھی رام کیا۔ اور اسے اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر وزبر کر ڈالا اور اس وقت بھی وہی نبی امیؐ اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگان خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔''

بہرحال قرآن کی یہ بے مثال تاثیر اس بات کی قاطع دلیل ہے کہ قرآن کسی بندہ کا کلام نہیں بلکہ خالق کون ومکان کا کلام حق ترجمان ہے اور پیغمبر اسلامؐ کا معجزہ خالدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بار بار پڑھنے اور سننے سے دل نہیں اکتاتا۔ بلکہ ہر بار دل ودماغ پر اس کا نیا اثر ہوتا ہے۔ اور نئی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

۵۔ پانچویں وجہ۔ صرفہ ہے۔ بعض علماء صرفہ کی حیثیت سے قرآن کے معجزہ ہونے کے قائل ہیں۔ یعنی جب کوئی شخص قرآن کی مثل لانے کی کوشش کرتا ہے تو قادر مطلق اپنی قوت قاہرہ سے اس کی قوت معارضہ کو سلب کر لیتا ہے اور وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ برآمد ہوتا ہے کہ خود قرآن مجید میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے دنیا جہاں کے مخالفین قرآن کا مثل لانے سے عاجز اور بے بس ہیں یہ محض خدائے قدیر کی قدرت کا کرشمہ ہے لیکن حقیقت الامر اس کے خلاف ہے اور مذکورہ بالا علل واسباب کی وجہ سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی علمی وعملی سطح اس قدر بلند وبالا ہے کہ اس کا مقابلہ ومعارضہ کرنا انسانی دل ودماغ کے بس کا روگ نہیں ہے۔

تیسرا مقدمہ

قرآن ایک جامع کتاب

قرآن تمام علوم وفنون کی جامع کتاب ہے بلکہ اس میں کائنات کی ہر خشک وتر چیز کا تذکرہ ہے باوجودیکہ قرآن چھوٹے سے حجم کی مختصر سی کتاب ہے مگر جامعیت کے لحاظ سے محیر العقول حد تک اس قدر جامع و کامل بلکہ اکمل کتاب ہے کہ کائنات کا کوئی ایسا علم وفن نہیں ہے جو اس میں مذکور نہیں ہے۔

فاضل رازی نے ''ستّینی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ساٹھ علوم وفنون کا تذکرہ موجود ہے۔ جن میں سے ہر علم وفن کی اصل قرآن میں موجود ہے جیسے علم الحدیث، علم الرجال، علم الفرائض، علم القصص، علم التذکیر بالاء اللہ، علم التذکیر، علم التذکیر بالموت و مابعدہ، علم الاحکام، علم الکائنات، علم صرف ونحو، معانی و بیان، کلام ومناظرہ، علم الفقہ، اصول الفقہ وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری مرحوم نے ''علوم القرآن'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں قریباً بہتر ۷۲ علوم وفنون کا تذکرہ کیا گیا ہے اور سب کی اصل قرآن سے ماخوذ ہے۔ ارشاد قدرت ہے:

''لا رطب ولا یابس الاّفی کتاب مبین'' دنیا جہان میں کوئی خشک وتر چیز ایسی نہیں ہے جو کتاب مبین میں مذکور نہیں ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

''تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ'' (سورہ نحل......۸۹) قرآن مجید میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔

متعدد اخبار وآثار میں مذکور ہے۔ ''ان للقرآن ظهرا و بطنا وللبطن بطنا الی سبعة ابطن'' قرآن کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور پھر باطن کا ایک باطن ہے یہاں تک کہ سات بواطن ہیں۔ (مرآۃ الانوار وغیرہ)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''خداوند عالم نے قرآن مجید میں ہر چیز اس طرح بیان کر دی ہے کہ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کاش فلاں چیز قرآن میں ہوتی۔ کیونکہ خدا نے وہ بات بھی بیان کر دی ہے'' (الکافی)

انہی جنابؑ سے مروی ہے فرمایا:

''کائنات کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں دو شخصوں کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے۔ مگر یہ کہ اس کی اصل قرآن مجید میں مذکور ہے۔ مگر عام لوگوں کے عقول وافہام کی وہاں تک رسائی نہیں ہے''۔ (الکافی)۔

نیز انہیں جنابؑ سے منقول ہے فرمایا:

''قرآن مجید میں ابتداءِ خلقت سے قیامت تک کے واقعات وحالات مذکور ہیں اور اس میں زمین و آسمان، جنت ونار اور ''ما کان وما یکون'' کے سب اخبار موجود ہیں اور میں یہ سب باتیں کتاب خدا سے جانتا ہوں'' (البرھان)۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''ہر چیز کا تذکرہ قرآن وسنت میں موجود ہے''۔ (البرھان)

لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا : (سورہ کہف......۱۰۹)

چوتھا مقدمہ

سرکار محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی قرآنی علوم کے حقیقی عالم ہیں

اس بات میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ حضرت رسول خداؐ جن کو خدائے علیم وحکیم نے معلم قرآن بنا کر بھیجا تھا جیسا کہ متعدد قرآنی آیات سے واضح ہے

''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ''

(سورہ جمعہ۔ آیت ۲)

''وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ'' (سورہ نحل۔ آیت ۴۴)

بتعلیم اللہ تمام قرآنی علوم وفنون، اس کے حقائق ودقائق اور اسرار ورموز سے کما حقہ واقف وآگاہ تھے جیسا کہ الرحمن علم القرآن۔ علمك ما لم تكن تعلم وغیرہ آیات سے واضح وآشکار ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر آپ قرآن کے تمام علوم واسرار اور اس کے ظواہر وبواطن سے واقف وآگاہ نہ ہوں تو پھر اس کے معلّم ربّانی کس طرح ہوسکتے ہیں؟ جو کچھ بحث ہے وہ اس میں ہے کہ

آیا پیغمبر اسلامؐ کے پڑھانے سے تمام امت مسلمہ عالم علوم قرآن بن گئی ہے؟

یا کم از کم آنحضرتؐ کے دور کے سب مسلمان تمام قرانی مطالب ومعانی اور اس کے اسرار ورموز

سے آگاہ ہو گئے تھے؟

کچھ مسلمانوں کا یہی خیال ہے مگر قرآنی آیات، معصومی روایات اور تاریخی واقعات سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ بلکہ تکذیب ہوتی ہے ارشاد قدرت ہے

''وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ‌ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ قَالُوۡا لِلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا'' (ان بزم نشینوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو آپ کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب تیری بزم سے باہر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے کہتے ہیں جن کو علم دیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابھی کیا کہا ہے؟ سورہ محمدؐ......آیت ۱۴)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ بارگاہ رسالت میں بیٹھنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اول سے آخر تک حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام سنتے تھے۔ مگر پھر بھی پلے کچھ نہ پڑتا تھا اور کچھ مخصوص اہل علم سے پوچھتے تھے کہ آپ نے کیا فرمایا؟ اسی لئے خدائے حکیم نے فرمایا:

''ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا'' ہم نے (علم) کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا ہے جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہے (سورہ فاطر......آیت ۳۲)۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ وہ اللہ کے منتخب کردہ بندے کون ہیں؟ ان کی نشاندہی پیغمبر اسلامؐ نے اپنی مشہور بلکہ متواتر حدیث ثقلین میں فرمائی ہے۔

''انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله و عترتی اهلبيتی''۔ (متفق علیہ)۔ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ ایک کتاب اللہ (قرآن) اور دوسری اپنی عترت اہل بیتؑ۔

معلوم ہوا کہ قرآن مسلمانوں کا نصاب تعلیم ہے اور پڑھانے والے عترت اہل بیت۔ ہیں یا قانون اسلام قرآن ہے اور اس قانون کے جاننے والے اور نافذ کرنے والے عترت اہلبیتؑ ہیں۔

''اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىۡ صُدُوۡرِ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ‌ ؕ'' (سورہ عنکبوت......آیت ۴۹)

سلیم بن قیس ہلالی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امیرؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ فرمارہے تھے۔

''ما نزلت آية على رسول الله لا اقرانيها و املاء على فكتبتُها بخطى و علمنى تأويلها و تفسيرها و ناسخها و منسوخها و محكمها و متشابهها و دعا الله لى ان يعلمنى فهمها و حفظها فما نسيت آية من كتاب الله ولا علما املاه على فكتبته منذ دعا لى

بما دعا و ما ترك شئياً علمه الله من حلال و حرام ......الی الآخر ''۔
جو آیت بھی حضرت رسول خداؐ پر نازل ہوئی ہے۔آپ نے وہ مجھے پڑھائی اور لکھوائی جسے میں نے اپنے خط کے ساتھ لکھا ہے اور پھر مجھے اس کی تاویل وتفسیر پڑھائی ہے اور اس کے ناسخ ومنسوخ اور محکم ومتشابہ سے آگاہ فرمایا ہے اور خدا سے دعا کی کہ وہ مجھے اس کے سمجھنے اور یاد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ پس جب سے آنحضرتؐ نے میرے لئے دعا فرمائی ہے میں نہ کوئی آیت بھولا ہوں اور نہ کوئی ایسا علم بھولا ہوں جو آپ نے مجھے پڑھایا ہے۔(الکافی۔العیاشی۔اکمال الدین)۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''ما يستطيع احد ان عنده جميع القران كله ظاهره وباطنه غير الا وصيا''

ائمہ اہل بیتؑ کے سوا اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس پورے قرآن یعنی اس کے ظاہر و باطن کا علم ہے۔(الکافی)

''علی مع القرآن و القرآن مع علی لن يفترقا حتی يردا علیّ الحوض''

علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ۔جب تک حوض کوثر پر دونوں اکٹھے وارد نہیں ہوں گے تب تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔(حدیث نبوی) ولنعم ماقيل۔

محکم کہیں، کہیں متشابہ تیرا کلام
یا رب عجیب راز یہ قرآن میں بھر دیا
اب تک مفسروں کا الجھنا دلیل ہے
دنیا کو اہل بیتؑ کا محتاج کر دیا

پانچواں مقدمہ

نزولِ قرآن اور اس کی تاریخ کا بیان:

قرآن وحدیث کی تصریحات سے ثابت ہے کہ پورا قرآن لوح محفوظ میں موجود تھا ''بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ' وہاں سے ایک بار بیت المعمور پر اور دوسری بار وہاں سے قلب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

''شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الۡقُرۡاٰنُ

ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا (سورہ بقرہ......۱۸۵)۔

اس آیت سے اجمالاً اس قدر تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید بارہ مہینوں میں سے ماہ رمضان میں نازل ہوا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے

''اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ''۔

ہم نے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں نازل کیا (دخان......آیت ۳)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان کی کسی خاص رات میں ہوا ہے تیسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

''اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ'' ہم نے اس قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا (سورہ قدر......آیت ۱)۔

اس سے نزول قرآن کی مکمل تاریخ کا علم ہو گیا کہ پورا قرآن شب قدر میں لوح محفوظ سے بیت المعمور پر اترا تھا پھر وہاں سے موقع ومحل کی مناسبت اور ضرورت کے مطابق جبرائیل امین کبھی ایک آیت، کبھی چند آیات اور کبھی پورا سورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لاتے رہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾

جبرائیل نے اسے آپ کے قلب پر اتارا..................(شعراء......آیات ۱۹۳، ۱۹۴)

اور یہ سلسلہ برابر تئیس سال تک جاری وساری رہا۔ مگر اعلان نبوت کے بعد ابتدائی تین سال تک تبلیغ چونکہ سرسری ومخفی تھی۔ اس لئے اس دور میں نزول قرآن برائے نام تھا۔ اور بعد از اں جہری دور تھا جس میں بکثرت قرآن نازل ہوا۔ اس لئے بعض احادیث میں مدت نزول بیس سال اور بعض میں تئیس سال مذکور ہے۔ اس لئے ظاہری نزول کی کوئی ایک تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ وہ تئیس ۲۳ سال کی مدت میں تدریجاً اترا ہے (اصول کافی، عیاشی، صافی) اگرچہ روایات کے مطابق اکثر وبیشتر جبرائیل امین وحیہ کلبی کی شکل میں مجسم ہو کر وحی لاتے تھے۔ مگر ان کا ہمیشہ اس طرح آنا لازم نہ تھا بلکہ مشاہداتی شکل کے علاوہ بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل ودماغ تک کلام الٰہی پہنچاتے تھے اس طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ زمین پر سب سے پہلا سورہ کونسا نازل ہوا؟ مشہور ومنصور قول یہ ہے کہ سب سے پہلے سورہ اقراء نازل ہوا ہے۔ واللہ العالم۔

چھٹا مقدمہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد جمع قرآن کا بیان

یہ حقیقت ہر قسم کے شک وشبہ سے بلند وبالا ہے کہ قرآن مجید یکبارگی نازل نہیں ہوا۔ بلکہ تئیس سال کی مدت میں مختلف حالات وواقعات کی مناسبت سے تدریجاً حضرت رسول خداؐ پر نازل ہوا۔ کبھی ایک آیت نازل ہوتی۔ کبھی چند آیات اور کبھی پورا سورہ نازل ہوتا۔ کبھی حضر میں کبھی سفر میں، کبھی دن کے اجالے میں اور کبھی رات کی تاریکی میں، کبھی مکہ کے ریگزاروں میں اور کبھی مدینہ کے سبزہ زاروں میں۔ آنحضرتؐ کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب کوئی آیت یا سورہ نازل ہوتی تو آپؐ اس کی تلاوت کر دیتے، تبلیغ فرمادیتے اور اگر کوئی کاتب وحی موجود ہوتا تو اس کو لکھوا بھی دیتے۔ مگر چونکہ وہاں کاغذ کمیاب تھا لہٰذا یہ آیات پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں اور اگر کاغذ مل جاتا تو اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ آنحضرتؐ آیت، آیات یا سورہ کے نزول کے وقت فرمادیتے تھے کہ یہ آیت یا آیات فلاں سورہ میں فلاں مقام پر لکھی جائیں۔ مگر اس طرح آنحضرتؐ کے حکم سے جو کتابت ہوتی تھی۔ وہ مرتب شکل میں نہیں تھی۔ بلکہ متفرق اجزاء کی صورت میں ہوتی تھی۔ جب حضرت رسول خداؐ کی وفات حسرت آیات واقع ہوئی۔ تو قرآن مجید اس طرح متفرق اجزاء کی صورت میں متفرق چیزوں پر لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''آنحضرتؐ نے اپنی وفات کے وقت جناب امیرؑ سے فرمایا:

یا علی ان القرآن خلف فراشی فی الصحف والحریر والقراطیس فخذوہ واجمعوا ولا تضیعرہ کما ضیعت الیھود التوراۃ

(یا علی! قرآن میرے فرش خواب کے پیچھے ورقوں، ریشم اور کاغذوں پر لکھا ہوا موجود ہے۔ اسے حاصل کرو، جمع کرو اور اسے اس طرح ضائع نہ کرو جس طرح یہود نے تورات کو ضائع کیا)

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے بڑھ کر ان اجزاء کو زرد رنگ کی چادر میں اکٹھا کیا اور قسم کھائی کہ آپ کی وفات کے بعد جب تک قرآن جمع نہیں کرلینگے۔ تب تک کاندھوں پر چادر نہیں اوڑھیں گے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا چنانچہ اس اثنا میں اگر کوئی شخص آپ سے ملنے کیلئے آتا تو آپ چادر اوڑھے بغیر اس سے ملاقات کرتے

تھے..........."(تفسیر عیاشی صافی)

چنانچہ آپ نے تنزیلی ترتیب کے مطابق قرآن مجید جمع فرمایا اور بعض اخبار و آثار کے مطابق اس میں جابجا تفسیر کی مفید معلومات بھی درج فرمائے۔ جبھی تو ابن سیرین کہا کرتے تھے کہ "لو اصیب ذلك الکتاب لکان فیه العلم "اگر وہ کتاب دستیاب ہو جاتی تو علم قرآن کا ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ مل جاتا۔(تاریخ الخفاء سیوطی ص ۱۴۷ طبع مصر)

اور جب اس اہم اسلامی فریضہ کی ادائیگی سے فارغ ہو چکے تو اتمام حجت کی خاطر اسے ارباب حکومت کے سامنے پیش کیا مگر انہوں نے اپنی مخصوص سیاسی مصلحتوں کے تحت اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ ہمیں آپ کے جمع کردہ قرآن کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس قرآن موجود ہے اور آپ خاموشی سے اپنا جمع کردہ قرآن واپس لائے اور اپنے ذخیرۂ خاص میں رکھ دیا۔ صرف اتنا فرمایا کہ آج کے بعد تم اس قرآن کو نہیں دیکھو گے (احتجاج طبرسی وغیرہ)

اے کاش کہ سب سے عظیم عالم قرآن شخصیت کی خدمت سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ اور اسے مخصوص سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ نہ چڑھایا جاتا۔ اس طرح اتنے بڑے علمی خسارہ کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اس طرح جہاں ناسخ و منسوخ کی شناخت مشکل ہو گئی۔ وہاں آیات کی تقدیم و تاخیر سے اور سیاق و سباق کے بدل جانے سے بعض آیات کی تفسیر و تاویل بھی دشوار ہو گئی۔ لیکن یہ خود معنوی طور پر قرآن مجید کے اسلوب کا معجزہ تھا کہ غیر مرتب شکل میں یکجا ہونے کے بعد بھی اس کی آیات کی افادیت برقرار رہی اور اسکی معجزانہ شان فصاحت و بلاغت کو صدمہ نہیں پہنچا۔(مقدمہ فصل الخطاب)۔

موجودہ قرآن مجید کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام نے طلحہ کے سوال پر فرمایا:

"ان اخذ تم بما فیه نجو تم من النا ر و د خلتم الجنة فان فیه حجتنا وبیان حقنا و فرض طاعتنا"۔

اگر تم اس پر عمل کرو گے تو جہنم سے نجات پا جاؤ گے اور جنت میں داخل ہو جاؤ گے کیونکہ اس میں ہماری حجت کا بیان، ہمارے حق کا بیان اور ہماری اطاعت کے فرض ہونے کا بیان موجود ہے۔(احتجاج طبرسی)

اسی لئے حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے جمع کردہ قرآن کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی۔ بہرحال ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں پہلے جامع قرآن اور حافظ قرآن علیؑ ہیں دوسری طرف ارباب اقتدار کی جانب

سے یہ کارروائی کی گئی کہ جب جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ قرآن مارے گئے۔ تو کچھ لوگوں نے دربار خلافت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر جنگوں کا یہی سلسلہ جاری رہا اور اس طرح حفاظ قرآن مارے جاتے رہے تو کہیں ہم قرآن سے محروم ہی نہ ہو جائیں۔ لہٰذا قرآن کو کتابی شکل میں یکجا جمع کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ زید بن ثابت کو حکم دیا گیا اور انہوں نے خاص انداز سے قرآن مجید کو یکجا جمع کیا۔ (بخاری شریف وتفسیر قرطبیؔ وغیرہ)۔

وہ خاص طریقہ کار یہ تھا کہ اعلان عام کیا گیا کہ جس کے پاس قرآن کی کچھ آیات لکھی ہوئی ہیں وہ زید کے پاس لائے۔ لہٰذا جب کوئی شخص ایسی آیات لاتا تو چند طریقہ سے ان کی تصدیق کی جاتی تھی۔

۱۔ اپنی یادداشت سے۔

۲۔ دو معتبر آدمی گواہی دیتے کہ یہ آیتیں آنحضرتؐ کے سامنے لکھی گئیں۔

۳۔ ان مجموعوں سے مقابلہ کیا جاتا جو مختلف صحابہ نے تیار کئے ہوئے تھے۔ (البرھان فی علوم القرآن)۔

مگر جب تیسرا دور خلافت آیا تو اسلام عرب سے نکل کر روم وایران وغیرہ کے ممالک تک پہنچ چکا تھا۔ اور جب نئے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو اختلاف قرات کی وجہ سے باہمی اختلاف رونما ہوا اور جھگڑے پیش آنے لگے۔ تو بعض لوگوں کے مشورہ سے دور اول کا جمع کردہ نسخہ جناب حفصہ سے منگوایا گیا اور دوسرے مختلف صحیفے اکٹھے کر کے ایک چار رکنی کمیٹی کے سپرد کئے گئے۔ جس کے ایک رکن وہی زید بن ثابت بھی تھے۔ انہوں نے سورتیں بھی یکجا مرتب کیں (جب کہ پہلے اس طرح مرتب نہیں تھیں بلکہ الگ الگ لکھی ہوئی تھیں) اور پھر سب نسخوں کی ایک قرات متعیّن کی گئی۔ اس طرح اس نئے مرتب شدہ مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں جنہیں مختلف علاقوں میں بھیجا گیا اور لوگوں کو اسی مصحف کے مطابق پڑھنے کا حکم دیا گیا اور اس کے علاوہ سب نسخوں کو پہلے پھاڑا گیا۔ پھر جلایا گیا۔ (بخاری شریف مع حاشیہ سہارنپوری)۔

معارف القرآن کے مقدمہ نگار لکھتے ہیں۔ ''قرآن کریم کے متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمانؓ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش فرما دیئے جو مختلف صحابہ کے پاس موجود تھے تا کہ رسم الخط، مسلمہ قرائتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے''۔ (مقدمہ معارف القرآن)۔

ایک غلط نقطۂ خیال کا ابطال

آج کل کچھ شیعہ وسنی جدید قلمکار اس بات پر بہت زور دے رہے ہیں کہ موجودہ قرآن پیغمبر اسلامؐ

کے عہد کا اور انہی کے زیر نگرانی مرتب کردہ ہے۔ یہ ایک ایسا دعوی ہے جس کی صحت پر سینہ زوری کے سوا اور کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی بھی دعویٰ دلیل و برھان کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا تو پھر یہ اتنا بڑا ادعویٰ بلا دلیل کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ تمام شیعہ و سنی محقق مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موجودہ قرآن جس ترتیب اور جس طریقہ سے مرتب شکل میں موجود ہے یہ تیسرے دور خلافت کا کارنامہ ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے دور میں اس وضع و قطع اور اس شکل وصورت کے ساتھ ہرگز موجود نہیں تھا اور بھلا ہو بھی کس طرح سکتا تھا جبکہ وہ تدریجاً نازل ہوا تھا اور یہ سلسلۂ نزول آپ کے آخری لمحات حیات تک برابر جاری وساری رہا۔ فاضل کاشانی مقدمہ سادسہ تفسیر صافی میں اس موضوع کے متعلق رقمطراز ہیں:

''فاما کونه مجموعا فی عهد النبی صلی الله علیه و آله و سلم علی ما هو الان فلم یثبت و کیف کان مجموعا انما کان ینزل نجوما و کان لایتم الا بتمام عمره''

یعنی موجودہ قرآن کا موجودہ شکل وصورت میں پیغمبر اسلامؐ کے عہد میں جمع شدہ ہونا ہرگز ثابت نہیں ہے۔ اور بھلا اس طرح جمع ہو بھی کس طرح سکتا تھا جبکہ وہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا تھا۔ اور آنحضرتؐ کی عمر مبارک کے اختتام کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہوا۔

(فندبّر و تشکّر و لا ینبئك مثل خبیر)

ساتواں مقدمہ

مقدار قرآن اور مسئلہ تحریف قرآن کا بیان

قال الشیخ اعتقادنا ان القرآن الذی انزل الله علی نبیه محمد هو ما بین الدفتین وهو مافی ایدی النّاس لیس باکثر من ذلك الی ان قال ومن نسب الینا انا نقول انه اکثر من ذلك فهو کاذب

حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں کہ مقدار قرآن کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ قرآن جو خداوند عالم نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا وہ یہی ہے جو دو دفیتوں کے درمیان لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو شخص ہماری طرف یہ نسبت دے کہ ہم موجودہ قرآن سے زائد قرآن کے قائل ہیں تو وہ جھوٹا ہے۔

مسلمانوں میں ایسے مسائل کی کوئی کمی نہیں ہے جن پر نیک نیتی سے غور وفکر نہ کرنے یا تجاہل عارفانہ

سے کام لینے کی وجہ سے انہیں اختلاف امت کی آماجگاہ بنادیا گیا۔ انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ تحریف قرآن بھی ہے جس کی وجہ سے مذہب شیعہ خیرالبریہ کو دل کھول کر بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ تحریف قرآن کا قائل ہے۔ ہر چند کہ علماءِ شیعہ ہزاروں مرتبہ اس قبیح نسبت سے اپنی برات و بیزاری ظاہر کر چکے ہیں۔ مگر برادران یوسف کی بار گاہ میں کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ اور برابر یہی رٹ لگائی جاتی ہے کہ شیعوں کا قرآن پر ایمان نہیں ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب احسن الفوائد اور تجلیات صداقت میں بڑی تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ یہاں بھی اختصار کے ساتھ چند حقائق پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔ خدا کرے کہ اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔ اور قرآن مجید کے بارے میں مدتوں سے جو یہ لا یعنی بحث جاری ہے اس کا خاتمہ ہو جائے **وما ذلك على الله بعزيز**۔

تحریف کے حقیقی مطلب ومفہوم کی تعیین

قبل اس کے کہ اصل مطلب پر دلائل پیش کئے جائیں پہلے ''تحریف'' کا مطلب واضح کر دینا ضروری ہے سو مخفی نہ رہے کہ ''تحریف'' باب تفعیل کا مصدر ہے جس کا مادہ ''حرف'' بمعنی طرف و کنارہ ہے لہٰذا تحریف کے لغوی معنی ہوں گے۔ ''**الاخذ بالطرف**'' کسی چیز کو ایک طرف اور ایک کنارہ سے پکڑنا اور اسے پوری طرح حاصل نہ کرنا اور اصطلاح میں تحریف کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام کو متغیر و متبدل کر دینا خواہ یہ تغیر و تبدل کلام کے اجزاء کو مقدم و موخر کرنے کی وجہ سے ہو۔ یا زیادتی اور کمی کے سبب سے۔ نیز اس میں یہ بھی کوئی قید نہیں یہ تحریف و تغیر فقط لفظوں میں واقع ہو۔ یا صرف معانی و مطالب میں یا الفاظ و معانی دونوں میں۔ تحریف کی ان مختلف اقسام وانواع میں سے بعض اقسام کے وقوع اور بعض کے عدم وقوع پر سب کا اتفاق ہے اور بعض کے متعلق شدید اختلاف ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تحریف بمعنی اول یعنی تقدیم و تاخیر کے وقوع پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کیونکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ موجودہ ترتیب قرآن میں مکی سورہ موخر اور مدنی مقدم ہیں۔ اور یہ تقدیم و تاخیر فقط سوروں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ آیات قرآنیہ میں بھی واقع ہے کہ بعض سوروں کی آیات دوسرے بعض سوروں میں شامل ہوگئی ہیں۔ جیسا کہ علامہ جلال الدین السیوطی وغیرہ نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر در منثور جلد ۴ طبع مصر ص ۴۲۔ راجع بسورہ رعد۔ تفسیر کبیر ج ۵ ص ۲۵۸ راجع بسورہ رعد۔ تفسیر در منثور ج ۴ ص ۶۹ راجع بسورہ ابراہیم۔ تفسیر در منثور جلد چہارم ص ۳۴۲ راجع بسورہ حج۔ کذا فی التفسیر الکبیر جلد ۶ ص ۳۰۶۔ تفسیر در منثور جلد ۵ ص ۸۲ راجع بسورہ شعراء۔ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۹۷ راجع بسورہ لقمان وغیرہ۔ حاشیہ قرآن مجید مترجم مولانا عبدالماجد دریا آبادی حصہ اول ص ۲ مطبوعہ تاج کمپنی لاہور پر مکی و مدنی سورتوں کی وجہ تسمیہ بیان

کرنے کے بعد لکھا ہے۔

''لیکن یہ تقسیم صرف عمومی حیثیت سے ہے ورنہ بار ہا ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدنی سورت کے اندر مکی آیتیں رکھا دی ہیں یا اس کے برعکس۔ ربط مضمون ومناسبت مقام کا صحیح تر ولطیف تر احساس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر اور کس کو ہوسکتا ہے؟ اس لئے کسی متعین آیت کے باب میں اسکے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ حزم کے ساتھ کرنا دشوار ہے روایتیں جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں کوئی درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی نہیں ہیں محض مفید ظن ہیں۔ مفید یقین نہیں ہیں۔ اس وقت ہمیں اس امر کے متعلق بحث کرنا مقصود نہیں کہ آیتوں کا یہ اختلاط وامتزاج حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے عمل میں لایا گیا یا خلیفہ سوم کے ایماء سے ایسا کیا گیا۔ (وان کان الحق ھو الثانی) بلکہ یہاں پر صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مکی سوروں کے آیات کا مدنی سوروں کے آیات میں اور اس کے برعکس مدنی سوروں کے آیات کا مکی سوروں کے آیات میں داخل ہونا عند الکل مسلم ہے۔

اسی طرح دوسری قسم یعنی تحریف بمعنی زیادتی کے عدم وقوع پر سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ مقدمہ تفسیر مجمع البیان اور مقدمہ تفسیر بتیان پر علامہ طبریؒ اور علامہ طوسیؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ اما الزیادۃ فیہ مجمع علی بطلانھا یعنی قرآن مجید میں زیادتی کے بطلان پر تمام اہل اسلام کا اجماع واتفاق ہے۔ ہاں اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ تحریف بمعنی سوم میں ہے۔ یعنی کمی کے واقع ہونے یا واقع نہ ہونے میں برادران اسلامی شیعان حیدر کرار۔ کو ہمیشہ مطعون کرتے رہتے ہیں کہ وہ موجودہ قرآن میں کمی کے قائل ہیں۔ لہٰذا ان کا اس قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ اور اس قسم کے بہت سے بے جا الزامات واتہامات کا انہیں مورد قرار دے کر اپنی آتش غیظ وغضب کو بجھاتے ہیں۔

ملحد و کافر و زندیق ہمیں کہتے ہیں
نام کیا کیا حب حیدرؑ میں رکھا یا ہم نے

حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ ہم اسی قرآن کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور اسی کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ اور اسی کی تفسیریں لکھتے ہیں۔ اور اسی کے اکرام واحترام کو واجب ولازم اور اس کی ہتک حرمت کو ناجائز و حرام سمجھتے ہیں۔ ائمہ ہدیٰؑ نے صحیح اور غلط حدیث معلوم کرنے کا معیار اسی قرآن کی مطابقت کو قرار دیا ہے۔ حضرت صادقؑ فرماتے ہیں:

"کل شئی مردود الی الکتاب و السنۃ و کل حدیث لا یوافق کتاب اللہ فھو زخرف"

ہر چیز کو کتاب وسنت کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اور ہر وہ حدیث جو قرآن کے مطابق نہ ہو وہ باطل ہے۔ (اصول کافی)

نیز انہی حضرتؑ سے مروی ہے فرمایا:

''مالم یوافق من الحدیث القرآن فھو زخرف''

جو حدیث قرآن کے موافق نہ ہو وہ باطل ہے۔ (اصول کافی)

اور اسی قرآن کی تلاوت کے ثواب بیان فرمائے ہیں۔ جن کا تھوڑا سا تذکرہ بعد ازیں کیا جائے گا۔ انشاءاللہ العزیز۔

موجودہ قرآن کی توثیق از ائمہ اہل بیت علیہ السلام

حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام نے بھی اسی قرآن کی تصدیق وتوثیق فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت امیر المومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں:

''ما بین الدفتین کتاب اللہ'' جو کچھ دو دفتیوں کے درمیان موجود ہے' یہ اللہ کی کتاب ہے۔ (نہج البلاغہ)۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اقرو اکما یقرئه النا س'' اسی طرح قرآن پڑھو جس طرح مسلمان پڑھتے ہیں (مقدمہ تفسیر صافی)

جناب امام علی نقیؑ فرماتے ہیں:

''اجمعت الامته قاطبة علی ان القرآن حق لا ریب فیه القرآن حق لا اختلاف بینھم فی تنز یله و تصدیقه فاذ اشھد القرآن بتصدیق خبر و تحقیقه فانکم الخبر طائفة من الامة الز مھم الاقرار به ضرورة'' (احتجاج طبرسی)

''تمام امت اسلامیہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید وہ برحق کتاب ہے کہ جس میں ہرگز کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ قرآن برحق ہے' مسلمانوں کے اندر اس کی تنزیل وتصدیق میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پس جب قرآن کریم کسی حدیث کی صحت کی شہادت دے اور باایں ہمہ امت کا کوئی گروہ اس حدیث کا انکار کرے تو اس کے لئے یہ روا نہیں ہے بلکہ اسے اس کی صحت کا اعتراف کرنا لازم ہے''۔

ائمہ معصومینؑ نے اس قرآن کے ساتھ تمسک کرنے کی اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ اس کی مخالفت کو کفر

قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''من خالف کتاب الله وسنة محمد فقد کفر'' جو شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔ (اصول کافی)

اگر چہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کی ان فرمائشات کے بعد اس سلسلہ میں علماء اعلام کی تصریحات کی ضرورت تو نہیں رہتی۔ مگر منکرین کے اطمینان قلب کیلئے بعض اعلام کی تصدیقات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پیش پیش حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ کا توضیحی بیان ہے جو انہوں نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں دیا ہے۔ جس میں سرکار موصوف نے بڑے پرزور طریقہ پر موجودہ قرآن کو کامل و مکمل اور منزل من اللہ بتایا ہے اور عقیدہ تحریف کی شدت کے ساتھ رد فرمائی ہے۔

دیگر شیعہ علمائے اعلام کی تصدیق

شیخ الفرقه المحققه جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ اپنے رسالہ اوائل المقالات میں رقمطراز ہیں:

''وقد قال جماعة من اهل الامامة انه لم ینقص من کلمة ولا من سورة و لکن حذف ما کان ثیتاً فی مصحف امیر المومنین من تاویله و تفسیر معانیه علی حقیقة تنزیله۔۔و عندی ان هذا القول اشبه من مقال من ادعی نقصان کلمه من نفس القرآن علی الحقیقة دون التاویل والیه امیل ....واما الزیادة فیه فمقطوع علی فسادها''

یعنی فرقہ امامیہ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ قرآن میں کسی سورہ اور آیت بلکہ ایک حرف کی بھی کمی نہیں ہاں البتہ مصحف امیر المومنین علیہ السلام میں اس قرآن کی جو تفسیر و تاویل مذکور تھی۔ اسے حذف کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قول اس قول سے بہتر ہے جس میں اصل قرآن سے بعض کلمات کا کم ہونا بیان کیا گیا ہے اور میرا میلان اسی کی طرف ہے اور قرآن میں کسی قسم کی زیادتی کے باطل ہونے کا تو قطعی یقین حاصل ہے۔

حضرت سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی اصل کتاب ہمارے پیش نظر نہیں ہے مگر ان کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الطائفہ طوسی نیز مفسر جلیل علامہ طبرسی علیہ الرحمہ نے ان کے نظریہ کی تفسیر تبیان اور مجمع البیان میں تصریح فرمائی ہے (و کفی بهما شاهدین عادلین) کہ انہوں نے بھی بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن میں کمی بیشی والے

نظریہ کو باطل فرمایا ہے۔اسی ضمن میں فرمایا ہے:

" ان العلم بصحة نقل القرآن کا لعلم با لبلدان والحوا دث الکبا ر وا لو قائع العظام والکتب المشھو رہ وا شعا ر العرب المسطورة"

موجود قرآن کی نقل کی صحت کا اسی طرح علم ویقین حاصل ہے جس طرح بعض دور دراز شہروں اور بڑے بڑے گذشتہ واقعات اور مشہور کتب اور عربوں کے لکھے ہوئے اشعار کا علم ویقین حاصل ہے"۔

حضرت شیخ الطائفہ اپنی تفسیر بتیان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"اما الکلام فی زیادة القرآن و نقصانه فمما لا یلیق به لان الزیادة فیه مجمع علی بطلانها واما النقصان منه فالظاهر ایضاً من مذهب المسلمین خلافه و هو الالیق بالصحیح من مذهبنا و هو الذی نصره المرتضیٰ و روایاتنا متناصرة بالحث علی قرائته والتمسك به ورد ما یرد من اختلاف الاخبار الیه۔"

قرآن میں کمی بیشی کے متعلق کلام کرنا ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے (کیونکہ یہ فقط قرآن کی تفسیر ہے) اس لیے کہ قرآن میں زیادتی کے باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ باقی رہی کمی۔ بظاہر مسلمانوں کا مذہب اس کے خلاف ہے۔اور یہی ہمارا مذہب ہے اور حضرت سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ نے بھی اسی نظریہ کی نصرت کی ہے۔

سرکار علامہ طبرسیؒ اپنی تفسیر مجمع البیان کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اما الزیادة فمجمع علی بطلانه اما لنقصان منه فقد روی جماعة من اصحابنا وقوم من حشویة العامة ان فی القرآن تغیراً ونقصاناً والصحیح من مذهب اصحابنا خلافه وهو الذی نصره المرتضیٰ قدس سره و استوفی الکلام فیه غایة الاستیقاء فی جواب المسائل الطرابلسیات"۔

اس عبارت کا مطلب وہی ہے جو حضرت شیخ طوسیؒ کی عبارت کا ہے۔اسی طرح دیگر بہت سے

علمائے اعلام مثل علامہ بلاغیؒ (درالاءلرحمن)۔علامہ السید ابوالقاسم الخوئی الجنفی (مقدمہ تفسیر البیان) علامہ السید ابوالقاسم الرضوی القمیؒ وعلامہ السید علی الحائری (درتفسیر لوامع التنزیل)' علامہ السید علی نقی النقوی (درمقدمہ تفسیر قرآن) وغیرھم نے اس سلسلہ میں اپنی تحقیقات رائقہ سے اس مطلب کو محقق ومبرہن فرمایا ہے شکر اللہ سعیھم۔ بہرحال شیعہ خیر البریہ تو ہمیشہ سے بابانگ دہل یہ کہتے آئے ہیں۔

جمال و نور قرآن نور جان ہر مسلمان ہے
قمر ہے چاند تاروں کا ہمارا چاند قرآن ہے

ایک اشکال کا ابطال

مخالفین کی عیاری ومکاری بھی قابل تردید ہے۔جب انہیں ان اساطین مذہب کی تصریحات دکھائی جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ اسلامی اصول کے مطابق اپنی افتراء پردازی سے دست بردار ہوجائیں اوراپنی غلط بیانی کا اقرار کرکے بارگاہ الہٰی میں تائب ہوں۔الٹا وہ یہ راگ الاپنا شروع کردیتے ہیں کہ علمائے شیعہ کے بیانات تقیہ پرمبنی ہیں۔ورنہ درحقیقت وہ تحریف کے قائل ہیں۔سبحان اللہ ھذا بھتان عظیم۔

یہ بیان عقل ودانش اورعدل وانصاف سے کس قدر دور ہے۔اس امر کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جن کی نظریں ہمارے علمائے اعلام کی ان کتب پر ہیں جن میں انہوں نے یہ تصریحات فرمائی ہیں۔بھلا وہ علماء جو انہی کتب میں اصحاب ثلاثہ کی خلافت کے ابطال پر دلائل وبراہین کا انبار لگا رہے ہیں۔جنہوں نے مذہب شیعہ کی تائید اور دیگر مذاہب کی رد میں متعدد کتب لکھی ہیں۔وہ اورتو کسی مسئلہ میں تقیہ سے کام نہیں لیتے۔بس اگر انہیں تقیہ یاد آتا ہے تو صرف مسئلہ تحریف قرآن میں کہ اس میں اپنے حقیقی نظریات سے دست بردار ہوکر جمہور اہل سنت کی ہمنوائی اختیار کرلیتے ہیں۔اگر تقیہ کرتے تو مسئلہ خلافت میں کرتے اورثلاثہ کی خلافت کا اقرار کرلیتے تاکہ باہمی چپقلش ہمیشہ کیلئے ختم ہوجاتی۔یہ کیا الٹی منطق ہے کہ سب سے بڑے مہم اورنازک مسئلہ میں تو تقیہ کرتے نہیں اوراگر تقیہ کرتے ہیں تو بعض خفیف اورغیر اہم مسائل میں؟ یہی وہ وجوہ تھیں جن کی بنا پر بعض منصف مزاج علمائے اہل سنت یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوگئے۔کہ شیعہ علماء محققین تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں۔اورنہ ہی ان علماء اعلام کا کلام حقیقت ترجمان تقیہ پرمبنی ہے۔

بعض منصف مزاج علمائے اہل سنت کی زبانی ہمارے مومن بالقرآن ہونے کی تصدیق

حافظ محمد اسلم صاحب جے پوری اپنی کتاب تاریخ القرآن صفحہ ۶۲ تا ۶۷ بذیل ''شیعہ اور قرآن'' شیعہ اکابر و اساطین کے فرامین نقل کرنے کے بعد ان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''یہ ان علمائے شیعہ کے اقوال ہیں۔ جو اہل تشیع میں مقبول و مستند ہیں۔ اور ان اقوال میں نہ تاویل کی گنجائش ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے تقیہ سے کہا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں۔ جنہوں نے علمائے اہل سنت کی تردید میں رسائل لکھے ہیں۔ ان کی نسبت تقیہ کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ اور ابو جعفر قمی کی کتاب الاعتقاد اور ملا محسن کی تفسیر صافی یہ دونوں کتابیں شیعہ کے نصاب درس میں داخل ہیں۔ اس سے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے عقیدہ کے خلاف اپنے فرقہ کو تعلیم دیتے ہیں۔''

اسی طرح فاضل جلیل شیخ رحمت اللہ ہندی اپنی مشہور تصنیف اظہار الحق جلد ۲ صفحہ ۹۸ طبع بمبئی میں بعض اعلام شیعہ کا کلام حق ترجمان نقل کرکے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

"فظهر ان المذهب المحقق عند علماء الفرقة الامامية الاثنا عشرية ان القرآن الذى انزله الله على نبيه هو ما بين الدفتين و هو ما فى ايدى الناس ليس باكثر من ذالك وانه كان مجموعا مؤلفاً فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم و حفظه و نقليه الوف من الصحابة (الى قال) و بعض الاخبار الضعيفة التى رويت فى مذهبهم لا يرجع بمثلها عن المعلوم المقطوع على صحته"۔

یعنی ان حقائق کے پیش نظر ثابت ہو گیا کہ فرقہ شیعہ اثنا عشریہ کے علماء اعلام کے نزدیک جو نظریہ مسلم ہے وہ یہی ہے کہ وہ قرآن جو خداوند عالم نے اپنے نبی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا تھا۔ وہ یہی ہے جو لوگوں کے ہاتھوں میں کتابی شکل میں موجود ہے۔ اور یہ کہ عہد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن جمع ہو چکا تھا۔ جسے ہزاروں صحابہ نے حفظ و نقل کیا اور بعض ضعیف روایات جو ان (شیعہ) کے مذہب میں (تحریف کے سلسلہ میں) مروی ہیں ان

کی وجہ سے ایک ثابت شدہ حقیقت سے دست برداری اختیار نہیں کی جا سکتی ۔ ع

خو شتر آں با شد کہ سر دلبر اں
گفتہ آید در حدیث دیگر اں

و الفضل ما شهدت به الاعداء (فضیلت وہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کرے)۔ لیکن بایں ہمہ متعصب ملا عوام کالانعام میں ہمیشہ شب و روز یہی ڈھنڈورا پیٹا کرتے ہیں کہ شیعوں کا موجودہ قرآن پر ایمان نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے؟ بلکہ وہ تحریف کے قائل ہیں۔

آہ کس رو ز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

ہمیں معلوم ہے کہ ان کے اس اتہام و افتراء کے باطنی علل و اسباب تو کچھ اور ہیں۔ لیکن اس کا ظاہری سبب وہ بعض روایات ہیں جو ہماری بعض کتب حدیث و تفسیر میں موجود ہیں۔ اور بظاہر تحریف کا وہم پیدا کرتے ہیں۔

شیعہ روایات تحریف کا الزامی جواب

اگر چہ اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور خود ہم اپنے بعض علمی مضامین میں اس کے متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ہماری ان روایات کی وجہ سے ہمیں قائل تحریف اور منکر قرآن قرار دینا صحیح ہے؟ تو پھر کسی طرح بھی خود برادران اسلامی اس الزام سے اپنی گلو خلاصی نہیں کرا سکتے۔ اور نہ وہ ہرگز مومن بالقرآن کہلا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی بکثرت روایات ان کے ہاں بھی موجود ہیں۔ ہم ذیل میں بطور نمونہ مشتے از خروارے۔ ان کی بعض روایات کا اجمالاً تذکرہ کرتے ہیں تا کہ تصویر کے دونوں رخ سامنے آجانے کے بعد باانصاف ناظرین کرام کو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے میں کوئی دقت و زحمت نہ ہو اور یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

روایات اہل سنت سے قرآنی سوروں میں تحریف:

تفسیر اتقان مولفہ علامہ جلال الدین سیوطی ج ۲ ص ۲۵ مطبع ازہر مصر میں ام المومنین عائشہ سے مروی ہے:

"قالت کانت سورة الاحزاب تقرأ فی زمن النبی مأ یتی ایةٍ فلما کتب عثمان المصاحف لم نقدر منہا الا علی ما ھو الان........"

''سورہ احزاب کی عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دوسوآیتیں پڑھی جاتی تھیں۔مگر جب عثمان نے قرآن لکھے توہمیں صرف اسی قدر آیتیں دستیاب ہوئیں۔۔۔جواب موجود ہیں۔ جوکل تہتر ہیں باقی ایک سوستائیس آیات غائب ہیں''۔(کذافی تفسیر الدّرالمنشو رجلد ۵ صفحہ ۱۸۰ طبع مصر میں بھی اسی طرح ذکر ہے)۔

اسی طرح تفسیر اتقان کے صفحہ ۲۵ جلد ۲ ذر بن حُبیش سے منقول ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ابی بن کعب نے مجھ سے دریافت کیا''کاین تعد سورة الاحزاب''۔آج کل موجود قرآن میں سورہ احزاب کی کس قدر آیات شمار ہوتی ہیں؟

میں نے کہا اثنتین و سبعین آیة او ثلاثه و سبعین آیته۔بہتر یا تہتر آیتیں ہیں۔

اس پر انہوں نے کہا''ان کانت لتعدل سورة البقرة''۔کہ(عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں)یہ سورۃ بقرہ کے برابر ہوتی تھی۔واللہ کنّا لنقرافیھا اية الرجم اورہم اس میں آیت رجم بھی پڑھتے تھے۔

قلت وما آیة الرجم؟ میں نے کہا وہ آیت رجم کیا تھی؟

کہا وہ یہ ہے'اذازنی الشیخ والشیخة فارجموھما البتة نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم''۔

تفسیر درمنثورج ۳ص ۲۰۸ طبع مصر میں بحوالہ کتب معتبرہ جناب حذیفہؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"قال التی تسمون سورة التوبة ھی سورة العذاب واللہ ما ترك احدا الا نالت منه ولا تقرأون منھا مما کنا نقرأ الا ربعھا"۔

فرمایا وہ سورہ جسے تم سورہ توبہ کہتے ہو۔وہ توسورہ عذاب ہے۔بخدااس نے ہم میں سے کسی کو بھی سلامت نہیں چھوڑا۔اس میں ہر شخص کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور نازل ہوا۔جس قدر ہم اس کی مقدار پڑھتے تھے تم تو اس کا صرف چوتھا حصہ پڑھتے ہو۔

روایات اہل سنت سے قرآنی آیات میں تحریف

برادران اسلامی کی کتب تفسیر وحدیث میں بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جن سے آیات قرآنیہ میں تحریف وتغیر ثابت ہوتی ہے۔ بطور نمونہ چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) موجودہ قرآن میں یہ آیت اس طرح ہے۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (سورہ بقرہ آیت۔ ۲۳۸)

مگر حضرات کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ درمنثور جلد اول صفحہ ۳۰۲ میں کتب متعددہ کے حوالہ سے علامہ سیوطی نے عمرو بن رافع سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا:

''کنت اکتب مصحفا لحفصة زوج النبی فقالت اذا بلغت هذه الآية فاذنی حافظوا علی الصلوات والصلواة الوسطی فلما بلغتها اذنتها فاملت علی حافظوا علی الصلوات و الصلواة الوسطی و صلواة العصر و قوموا لله قانتين وقالت اشهد انی سمعتها من رسول الله''۔ میں جناب حفصہ زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرآن کی کتابت کرتا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ جب تم آیت حافظوا علی الصلواۃ پر پہنچو تو مجھے اطلاع دینا۔ چنانچہ جب اس آیت پر پہنچا تو میں نے ان کو اطلاع دی انہوں نے اس آیت کو اس طرح لکھوایا حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی وصلوۃ العصر اور کہا میں گواہی دیتی ہوں کہ میں نے آنحضرتؐ سے اس آیت کو اسی طرح سنا ہے لیکن موجودہ قرآن میں ''وصلوۃ العصر'' کی لفظ موجود نہیں ہے۔

کتاب مذکور کے مذکورہ بالا صفحہ پر جناب عائشہ کے کاتب قرآن ابی یونس سے بھی بعینہ یہی روایت منقول ہے۔

۲۔ موجودہ قرآن میں یہ آیت اس طرح ہے۔ ''يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ''(سورہ مائدہ ۶۷)

مگر ان حضرات کی کتب تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تحریف واقع ہوئی ہے چنانچہ تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ طبع مصر پر علامہ سیوطی نے جناب ابن مسعود سے روایت کی ہے فرمایا:

''کنا نقرء علی عهد رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك ان علیا مو لی المو منین وان لم تفعل فما بلغت رسالته''۔ لیکن آج کل جملہ ''ان علیا مولی المومنین'' ندارد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ساقط کر دیا گیا ہے۔

۳۔تفسیر اتقان جلد ۲ ص ۲۵ طبع مصر اور تفسیر درمنشورج ۵ ص ۱۸۰ پر متعدد روایات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید سے آیۃً رجم خارج کردی گئی۔

ابی بن کعب کہتے ہیں۔''کنا نقرأ فیھا آیۃالرجم قلت و ما آیۃ الرجم قال اذا زنا الشیخ والشیخۃ فارجعو ھما البتتہ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم''۔یعنی ہم اس سورہ (احزاب) میں آیت رجم بھی پڑھتے تھے۔

میں (ذربن حبیش) نے کہا آیت رجم کون سی آیت ہے؟

کہا''اذا زنی الشیخ والشیخۃ''جس وقت بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت زنا کرے تو انہیں سنگسار کردو۔ یہ خدائے عزیز وحکیم کی طرف سے ان کے اس جرم کی پاداش ہے۔لیکن موجودہ قرآن مجید میں آیت رجم کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا''۔

۴۔موجودہ قرآن مجید میں یہ آیت مبارکہ اس طرح ہے''اِنَّ اللہ وَ مَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا''(سورہ احزاب ۵۶)

لیکن روایات اہل سنت سے مترشح ہوتا ہے کہ اس آیت میں تحریف ہوئی ہے۔ چنانچہ تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۵ اور تفسیر درمنثور جلد ۵ صفحہ ۲۲۰ پر کئی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب عائشہ و حفصہ کے مصاحف میں اس آیت کا تتمہ قبل ان یغیّر عثمان المصاحف قبل اس سے کہ جناب عثمان مصاحف کو متغیر کریں یوں تھا۔والذین یصلون الصفوف الاول۔مگر آج یہ تتمہ ندارد ہے۔

۵۔موجودہ قران میں یہ آیت اس طرح ہے''وَ کَفَیااللہ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ''(سورہ احزاب ۲۵)

لیکن حضرات کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت اصل میں یوں تھی کفی اللہ المومنین القتال بعلی ابن ابی طالب (تفسیر درمنثور ج ۵ ص ۱۹۲) مگر موجودہ قرآن میں اس آیت کے اندر حضرت امیر علیہ السلام کا اسم گرامی موجود نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسے عمداً حذف کردیا گیا ہے یہاں اسی مختصر مقدار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اند کے غم دل با تو گفتم و بدل ترسیدم کہ
دل آزردہ شوی ور نہ سخن بسیار است

ان حقائق کی روشنی میں یہ امر روز روشن کی طرح واضح وآشکار ہو جاتا ہے کہ برادران اسلامی کے

نزدیک قرآن مجید محرف ومبدل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب عبداللہ بن عمر کہا کرتے تھے: ''لا یقولن احد قد اخذت القران کله و ما یدریه ما کله قد ذھب منه قرآن کثیر'' ہرگز کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے پورا قرآن حاصل کرلیا ہے۔ اسے کیا خبر کہ پورا قرآن کس قدر تھا؟ قرآن کا اکثر حصہ تو تلف ہوگیا۔ (تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۵) لیکن بایں ہمہ ان حضرت کے شرم وحیا کی داد دینی چاہیے کہ بایں ہمہ وہ کہتے یہی ہیں کہ شیعوں کا قرآن ناقص ہے اور ان کا اس پر ایمان نہیں ہے۔

ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ
این چہ بو العجبی است

دوٹوک فیصلہ

یہ حضرات ہماری چند روایات دیکھ کر ہمیں تحریف قرآن کا الزام دیتے ہیں۔ اب ہم ان کی ان روایات کی روشنی میں ان کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ جو جواب تم اپنی روایات کا دوگے۔ وہی جواب ہماری طرف ہماری روایات کا سمجھ لو۔ اگر تم اپنی روایات پر ضعیف الاسناد ہونے کا فتوی صادر کرکے انہیں ناقابل اعتماد قرار دو تو ہماری روایات کو بھی ایسا ہی سمجھو۔ اور اگر ان اضافوں کی جو ان روایات میں مروی ہیں تفسیری وتوضیحی بیانات پر محمول کرو تو ہماری روایات کا بھی یہی مفہوم سمجھو۔ جیسا کہ حضرت شیخ صدوقؒ نے رسالہ اعتقادیہ میں ان روایات کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

ع

بس اک نگاہ پر ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا ؟

ایک تاویل علیل کا ابطال

متعصب ملاؤں کا یہ پرانا وطیرہ ہے کہ جب ان کے بے بنیاد اعتراض کے جواب میں الزامی طور پر ان کی مذکورہ بالا یا ان جیسی دیگر روایات پیش کرکے ان کا ناطقہ بند کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان سے ان روایات کا کوئی معقول جواب نہیں بن پڑتا۔ تو وہ فوراً نسخ کا سہارا لیتے ہوئے اپنی گلوخلاصی کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیات منسوخ ہوچکی ہیں اور یہ روایات نسخ پر محمول ہیں ان کی یہ تاویل چند وجہ سے ناقابل قبول اور علیل ہے۔

اولاً۔ اس لئے کہ خود ان روایات میں ایسی ایسی تصریحات موجود ہیں۔ جو نسخ والی تاویل کا قلع قمع کرتی ہیں۔ کیونکہ ''نسخ'' فقط عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نزول قرآن کے وقت ہی متصور ہو سکتی ہیں۔ کمالایخفی۔ چنانچہ تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۶ طبع مصر پر لکھا ہے۔ ''غیر جائز نسخ شئی من القرآن بعد وفاۃ النبّی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''یعنی آنحضرت کی وفات کے بعد نسخ قرآن جائز نہیں ہے۔ مگر ان روایات کے اندر تصریح موجود ہے کہ جناب عائشہ وحفصہ فلاں آیت کو اس طرح پڑھتی تھیں اور اسی طرح اپنے مصاحف میں لکھواتی تھیں۔ اور شہادت دیتی تھیں کہ عہد رسالت میں اسی طرح یہ آیات پڑھی جاتی تھیں اسی طرح بعض صحابہ کرام کی یہ تصریحات موجود ہیں کہ فلاں آیت جناب عثمان کے تغیر وتبدیل سے پہلے اس طرح پڑھی جاتی تھی اہل انصاف بتائیں کہ ان تصریحات کے ہوتے ہوئے ''نسخ'' والا سہارا کس طرح مفید مطلب ہو سکتا مگر سچ ہے الغریق یتشبث بکل حشیش۔ یعنی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

ثانیاً۔ اس لئے کہ ''نسخ'' کے چند قواعد وضوابط ہیں۔ جب تک وہ نہ پائے جائیں کسی آیت کے منسوخ ہونے کا نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دھاندلی کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ جس آیت کے متعلق چاہا ''نسخ'' کا فتوی صادر کر دیا۔ علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تفسیر اتقان ۲ ص ۲۴ طبع مصر میں نسخ کے متعلق رقمطراز ہیں:

''انما یرجع فی النسخ الی نقلٍ صریح عن رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوعن صحابی یقول انہ کذا انسخت کذا ''یعنی نسخ کے سلسلہ میں فقط جناب رسول خدا کی کسی صریح حدیث یا کسی صحابی کے ایسے قول پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ جس میں اس نے وضاحت کی ہو کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کیا ہے''

پھر فرماتے ہیں:

''ولا یعتمد فی النسخ علی قول عوام المفسرین بل ولا اجتہاد المجتہدین غیر نقل صحیح والا معارضۃ بینۃ لان النسخ یتضمن رفع حکم واثبات حکم تقرر فی عہدہ صلی اللہ علیہ وسلم والمعتمد فیہ النقل والتاریخ دون الرائے والاجتہاد''۔ یعنی نسخ کے سلسلہ میں عام مفسرین کے قول بلکہ مجتہدین کے اجتہاد کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جب تک اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث یا اس آیت کے معارض کوئی بینہ موجود نہ ہو کیونکہ نسخ ایک حکم کے اٹھنے اور عہد نبوی میں اس کی جگہ دوسرے حکم کے مقرر ہونے کا نام ہے لہٰذا اس سلسلہ میں فقط نقل صریح اور تاریخ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ نہ

رائے واجتہاد پر۔

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ جب تک کسی آیت کے منسوخ ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح السند حدیث پیش نہ کی جائے۔ اس وقت تک فقط بعض مفسرین ومناظرین بلکہ مجتہدین کے اقوال پر بھی ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر ہماری پیش کردہ ان الزامی روایات کے متعلق یہ حضرات مدعی ہیں کہ وہ منسوخ ہیں تو وہ اس سلسلہ میں کوئی صریح وصحیح حدیث نبوی پیش کریں۔ ثالثاً۔ ارشاد قدرت ہے "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا" (سورہ بقرہ......۱۰۶) جب بھی ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لاتے ہیں۔ اس آیت مبارکہ سے بعبارۃ النص ظاہر ہے کہ جس قدر آیتیں منسوخ ہوں اتنی ہی ناسخ موجود ہوتی ہیں۔ لہٰذا نسخ کے دعویداروں پر لازم ہے کہ اگر وہ دعوائے نسخ میں سچے ہیں تو ناسخ آیات پیش کریں۔ ہمیں گو وہمیں میدان۔ لیکن اگر وہ یہ ثابت نہ کر سکیں اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔ تو پھر انہیں اپنے دعوی بلا دلیل سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

بعض علماء کے قائل تحریف ہونے سے پورے مذہب کا قائل ہونا لازم نہیں آتا

ہاں یہ درست ہے کہ ہمارے بعض علماء کرام تحریف کے قائل ہیں۔ لیکن یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ کسی اختلافی مسئلہ میں کسی مذہب کے بعض علماء کا نظریہ خصوصاً جب کہ وہ اکابر علماء مذہب کے نظریہ سے متصادم ہو۔ اسے پورے مذہب کا نظریہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور جو علماء کرام اس نظریہ کے قائل ہیں وہ بھی اپنے اس نظریہ کی صحت پر دلائل رکھتے ہیں۔ ذیل میں ان کے چند ادلہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

قائلین تحریف کی پہلی دلیل

اس سلسلہ میں ان کی پہلی اور محکم دلیل وہ روایات ہیں جو اس مسئلہ کے متعلق کتب فریقین میں موجود ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جمع قرآن کے وقت اس میں فی الجملہ ضرور کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ روایات اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ ان سب کا انکار کرنا مشکل ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے مراۃ العقول میں ان کے تواتر کا ادعا فرمایا ہے اور اس قدر صریح الدلالہ ہیں کہ ان میں کسی تاویل کی گنجائش کم ہے۔

دوسری دلیل

جمع قرآن کی وہ کیفیت جو کتب سیر وتواریخ میں مذکور ہے کہ پہلے پہل مسلمانوں کے پہلے خلیفہ کے حکم سے یہ اہم کام زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا۔ اور اسے حکم دیا گیا کہ مسجد نبوی کے دروازے پر بیٹھا کریں اور لوگوں میں اعلان کرایا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کا کوئی حصہ ہو۔ وہ زید کے پاس لائے اور شرط یہ مقرر کی گئی کہ جو شخص دو گواہ پیش کردے۔ اس کے لائے ہوئے اجزاء لے کر قرآن میں درج کر لئے جائیں۔ چنانچہ اسی التزام کے مطابق قرآن کریم جمع کیا گیا اور کچھ اجزاء جو ہڈیوں، کھجوروں کی شاخوں، گتوں اور کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے وہ جمع کر لئے گئے۔ (تفسیر اتقان ج ۱ ص ۶۰)

اسی طرح خلیفہ سوم کے عہد میں اس جمع کردہ قرآن میں معمولی تقدیم وتاخیر اور قرأت میں اصلاح کے بعد اسے دوبارہ مرتب کیا گیا۔ جو غیر جانبدار شخص بھی جمع وترتیب کی یہ کیفیت ملاحظہ کرے گا اسے ظن غالب بلکہ یقین کامل ہو جائے گا کہ اس طرح کچھ نہ کچھ حصہ ضرور جمع ہونے سے رہ گیا ہوگا۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ کسی کے پاس جمع شدہ کچھ مقدار ہو۔ مگر اس نے اپنا جمع کردہ حصہ ان حضرات کے حوالہ کرنا مناسب نہ سمجھا ہو جس طرح جناب عبداللہ بن مسعود وغیرہ کا اپنا قرآن دینے سے انکار کرنا ثابت ہے اسی طرح ام المومنین عائشہ نے بھی اپنے مصحف نہیں دیئے تھے نیز ممکن ہے کسی کے پاس کچھ اجزا قرآن مجید ہوں۔ مگر اسکی قرآنیت پر اس کے پاس دو گواہ موجود نہ ہوں۔ اسلئے اس کا لایا ہوا جز قبول نہ کیا گیا ہو۔

اسی طرح تفحص وتلاش کا جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا قرین عقل ہے کہ اس سے قرآن کے بعض اجزاء باوجود تلاش وتتبع کے دستیاب نہ ہوئے ہوں۔ جیسا کہ مشاہدہ شاہد ہے کہ ایسے مواقع پر ایسا ہوتا ہے بالخصوص جب کہ وہ شخص جو اس جمع وترتیب کا متصدی ہے غیر معصوم ہو۔

تیسری دلیل

کسی شخص کی جمع کردہ چیز پر اسی وقت یہ وثوق ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوگا جب کہ اس کے جامع کا ایمان وایقان ایسا مسلم ہو کہ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا تر ہو اور اس شخص کی اس جمع وترتیب سے سوائے دین اسلام کی خدمت کے اور کوئی غرض وغایت وابستہ نہ ہو۔ لہٰذا جن لوگوں کو ان جامعین قرآن کے ایمان میں ہی کلام ہے اور ان کے مساعی وجہود کو کسی جذبہ دینی پر محمول کرنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں بلکہ وہ اس جمع وترتیب کو ان کے دنیوی اغراض ومقاصد پر محمول کرتے ہیں۔ اگر وہ اس میں کچھ کمی کے قائل ہوں بھی تو وہ معذور ہیں۔

باقی رہا یہ خیال کہ اس طرح موجودہ قرآن سے اعتماد اٹھ جائے گا تو یہ خیال غلط ہے کیونکہ یہ اعتماد اس لئے ختم نہیں ہوتا کہ حقیقی محافظان اسلام وقرآن یعنی ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس کے قرآن ہونے کی تصدیق کردی ہے اور جہاں جہاں جامعین نے مزعومہ تحریف کی تھی ان مقامات کی نشاندہی بھی فرمادی ہے۔لہٰذا اس نظریہ کے قائل بھی موجودہ قرآن پر دوسرے مسلمانوں کی طرح ایمان رکھتے ہیں۔

چوتھی دلیل

چونکہ پہلی امتوں میں آسمانی کتب میں تحریف ہوچکی ہے اور پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے کہ جو کچھ بھی پہلی امتوں میں واقع ہوا ہے۔بعینہ وہ میری امت میں بھی واقع ہوگا۔(کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۵۴۔۵۶، درمنثور جلد ۵ صفحہ ۴، نہایہ ابن اثیر جلد ۱ صفحہ ۲۴۴ مشکوٰۃ صفحہ ۴۵۰ وغیرہ) لہٰذا اس عمومی مشابہت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس امت میں بھی آسمانی کتاب میں کچھ تحریف واقع ہو۔

پانچویں دلیل

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کے خلیفہ اوّل ودوم اور بالخصوص حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن مجید موجود تھا۔تو اس کی موجودگی میں جناب خلیفہ ثالث کو ازسرنو اس کے جمع کرنے کی کیا ضرورت درپیش آئی تھی؟ اور اپنے جمع کردہ مصحف کو رائج کرنے میں اس قدر مبالغہ سے کام کیوں لیا تھا کہ باقی تمام جمع کردہ نسخے (سوائے حضرت امیر علیہ السلام کے نسخے کے) نذر آتش کرادیئے تھے (بخاری شریف جلد ۲ صفحہ ۷۴۶ طبع دہلی تفسیر اتقان جلد ۱ صفحہ ۶۱) اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جامع قرآن کی کوئی خاص غرض پوشیدہ تھی جس کے تحت اس قدر اہتمام کیا گیا تھا اور وہ غرض قانون شریعت کی کتاب میں تحریف وتغییر کرکے دین اسلام کو متغیر ومتبدل کرنا ہی ہوسکتی ہے۔اس قسم کی اور بھی بہت سی دلیلیں یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ہمیں یہاں ان دلائل کی صحت وسقم سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔بلکہ ان کے یہاں ذکر کرنے سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ جو حضرات اس نظریہ کے قائل ہیں وہ بھی کچھ دلائل رکھتے ہیں اور ان کا یہ نظریہ محض بے دلیل نہیں ہے اور یہ کہ ان کے اس نظریہ سے کسی اسلامی مسلمہ عقیدہ کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی۔کمالا یخفی۔

نظریہ تحریف کے ابطال پر دو آیتوں کے ساتھ غلط استدلال

نظریہٴ تحریف کے ابطال پر دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں آیت یہ ہے

''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ''(سورہ حجر آیت۔۹)

(ہم نے ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

جب خداوند عالم قرآن کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے تو کون شخص اس میں کچھ تحریف اور تغیر کر سکتا ہے؟ تحریف کے ابطال پر قطع نظر تحریف والے نظریہ کے غلط صحیح ہونے کے اس آیت مبارکہ کے ساتھ تمسک کرنا چند وجہ سے صحیح نہیں ہے۔

اوّلاً۔ قرآنی اصطلاح میں ''ذکر'' کا اطلاق جس طرح قرآن پر ہوا ہے ''اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (سورہ انعام...... ۹۰)'' اسی طرح اس کا اطلاق جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات پر بھی ہوا ہے ''قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا ...... (سورہ طلاق ۱۰،۱۱)'' لہٰذا عین ممکن ہے کہ یہاں ذکر سے مراد پیغمبر اسلامؐ کی ذات والا صفات ہو کہ خداوند عالم شرِ اعداء سے ان کی حفاظت وحراست کا وعدہ فرما رہا ہے۔ (وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (سورہ مائدہ آیت۔٦٧) اسی بنا پر آیت مبارک ''فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ'' (سورہ نحل آیت۔۴۳) میں وارد شدہ لفظ ''اھل الذکر'' سے مراد اہل رسولؐ لئے جاتے ہیں۔ بنابریں اس آیت کو ہمارے متعلقہ مسئلہ کے ساتھ کوئی ربط ہی نہیں رہتا۔ اور وہ موضوع سے بالکل اجنبی قرار پاتی ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۲۵۷ طبع مصر) میں مذکور ہے کہ بعض علماء اہل سنت مثل فراء اور ابن انباری نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

ثانیاً۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہاں ''ذکر'' سے مراد قرآن مجید ہی ہے تو غور طلب امر یہ ہے کہ آیا اس سے مراد قرآن مجید کے تمام افراد ہیں؟ یا اس سے مراد مطلق قرآن ہے؟ (جو کہ ایک فرد کے ضمن میں بھی متحقق ہوسکتا ہے) پہلی شق تو یقینا غلط ہے۔ کیونکہ جناب عثمان کا قرآن کے نسخوں کو جلانا (بخاری شریف وغیرہ) اور ولید کا قرآن کے نسخوں کو تیروں کا نشانہ بنانا (ادب والدین والدنیا وغیرہ) مسلمات میں سے ہے۔ اسی طرح طباعت واشاعت میں اغلاط کا رہ جانا بھی بالمشاہدہ ثابت ہے۔ نیز کئی دفعہ قرآن اتفاقاً جل بھی جاتے ہیں کسی اور طریقہ سے تلف بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر قدرت کاملہ نے ہر ہر فرد کی حفاظت کا وعدہ کیا ہوتا تو پھر کوئی شخص کسی قرآن کے ساتھ بے ادبی نہ کر سکتا اور نہ خود بخود ایسا ہوتا۔

پس ماننا پڑے گا کہ اس امر سے مراد مطلق قرآن (قرآن کلی) ہے لہٰذا اگر قرآن کا ایک فرد بھی اس تحریف سے محفوظ ہے تو وعدہ خداوندی پورا ہے اور قائل تحریف کہہ سکتا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن اس وعدۂ الٰہیہ کی عملی تصویر ہے جو موجود ہے اور ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے۔ ہاں البتہ جو تحریف کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام کے جمع کردہ قرآن مجید اور موجودہ قرآن کریم میں صرف اس

قدر فرق تھا کہ آنجناب کا جمع کردہ کلام پاک ترتیب نزول کے مطابق تھا جب کہ موجودہ کلام پاک اس کے مطابق جمع نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس قرآن میں تنزیل کے ساتھ ساتھ اس کی تاویل بھی مذکور تھی جو کہ موجودہ قرآن میں نہیں ہے۔ اسی بنا پر ابن سیرین کہا کرتا تھا کہ اگر جناب امیر علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن مجید دستیاب ہوجاتا تو علم کا ایک ذخیرہ مل جاتا۔ (تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۲۴ طبع مصر) واللہ العالم۔

ثالثاً۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس حفاظت خداوندی سے مراد کیا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ مراد ہو کہ کوئی شخص دلائل وشبہات سے قرآن کی حقانیت وصداقت کو نہیں جھٹلا سکے گا کیونکہ **الحق یعلو ولا یعلی علیہ** اور **بفضلہ تعالیٰ** یہ امر عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔ کہ صدیاں گذر گئیں اور باوجود قرآن کے چیلنج کے آج تک کوئی شخص بھی اس کی ایک آیت کا مثل نہیں لا سکا پس بموجب **اذا قام الاحتمال بطل الاستدلال** اس آیت کے ساتھ تحریف قرآن کے ابطال پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ بعض علمائے اہل سنت نے بھی اس کا اعتراف کرلیا ہے۔ چنانچہ علامہ فخر الدین رازی نے قاضی باقلانی کے اس آیت کے ساتھ نفی تحریف پر کئے ہوئے استدلال کو بایں الفاظ "**احتج القاضی بقولہ انا نحن علی فساد قول بعض الامامیۃ**" ذکر کرکے اس استدلال کی رکاکت وکمزوری پر ان الفاظ کے ساتھ تنبیہ کی ہے:

"**و ھذا الاستدلال ضعیف لانہ یجری اثبات الشئی بنفسہ**"۔ یہ استدلال ضعیف ہے کیوں کہ یہ مصادرہ علی المطلوب یعنی دعویٰ کو دلیل قرار دینے کو مستلزم ہے جو کہ باطل ہے۔ (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۲۵۸ طبع مصر)

بعد ازیں اس استدلال میں کیا وزن باقی رہ جاتا ہے؟

دوسری آیت یہ ہے "وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۟ۙ﴿۴۱﴾ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾ (سورہ حم سجدہ) اور یہ قرآن تو یقینی ایک عالی رتبہ کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی پھٹک سکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے اور خوبیوں والے دانا خدا کی بارگاہ سے نازل ہوئی ہے (ترجمہ فرمانؒ)

اس سلسلہ میں اس آیت مبارکہ سے بھی تمسک کرنا صحیح نہیں ہے۔

اولاً۔ اس لئے کہ اس پر بھی وہی ایراد وارد ہوتا ہے جو پہلی آیت پر دوسرے نمبر میں وارد کیا گیا ہے کہ اس سے مراد قرآن کے تمام افراد ہیں یا بعض؟ تمام افراد تو مراد لئے نہیں جاسکتے ہیں۔ لہٰذا بعض مراد لینے پڑیں گے تو وہ ایک قرآن کے صحیح ہونے کی صورت میں بھی صادق ہے۔

ثانیاً۔ اس باطل سے مراد کیا ہے جو اس قرآن میں راہ نہیں پا سکتا اگرچہ تحریف بھی امر باطل ہے۔لیکن عین ممکن ہے کہ قرآن کے آگے پیچھے سے باطل کے نہ آنے کا یہ مطلب ہو کہ اس کی گذشتہ یا آنے والی اخبار میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جو قرآن کیلئے موجب بطلان ہو۔ (مجمع البیان و کذا فی تفسیر البیضاوی صفحہ ۳۸۴ طبع ایران)

اور ممکن ہے کہ مطلب یہ ہو کہ نہ پہلی آسمانی کتب اس کتاب کی تکذیب کرتی ہیں اور نہ بعد میں کوئی ایسی کتاب و شریعت آئے گی جو اسے جھٹلائے اور اس کے احکام کو منسوخ قرار دے۔ جیسا کہ تفسیر قمی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔

"لا یأتیه الباطل من قبل التورٰة ولا من قبل الانجیل والزبور و لا من خلفه ای لا یاتیه من بعده کتاب یبطله"۔

لہٰذا ان وجوہ سے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ آیت مبارک بھی تحریف کی نفی پر قطعی دلالت نہیں کرتی (ایسا ہی تفسیر کبیر رازی جلد ۷ صفحہ ۳۶۳ طبع مصر پر بھی مذکور ہے)۔

ایک وہم کا ازالہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس طرح تحریف کا قول اختیار کرنے سے قرآن سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور تمام قرآن مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وہم کا اوپر بھی اجمالاً ازالہ کیا جا چکا ہے۔ اور ایک بار پھر واضح کیا جاتا ہے کہ اگر تحریف کا اس طرح اعتقاد رکھا جائے جس میں مقامات تحریف کی تعیین ونشاندہی نہ کی گئی ہو تو بے شک اس طرح یہ اعتقاد پوری کتاب کو مشکوک اور غیر معتبر بنانے کا سبب بن سکتا ہے۔لیکن اگر یہ نظریہ اس طرح اختیار کیا جائے کہ موارد تحریف اور تحریف کی نوعیت کا کسی طرح علم ہو جائے تو اس سے باقی ماندہ حصص و اجزاء کے اعتبار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور جو بعض علماء تحریف کے قائل ہیں ان کے نظریہ کی یہی کیفیت ہے۔

روایات تحریف دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اجمالاً بیان کیا گیا ہے کہ قرآن میں تحریف واقع ہوئی ہے اور دوسری قسم میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ کن سورتوں اور آیتوں میں کس قسم کی تحریف کی گئی ہے مثلاً یہ کہ فلاں جگہ سے فلاں نام ساقط کیا گیا اور فلاں جگہ سے فلاں جملہ حذف کیا گیا وعلی ہذا القیاس۔

اس طرح باقی ماندہ حصہ پر اعتماد بحال رہتا ہے۔ خصوصاً جب کہ موجودہ قرآن کی تصدیق و توثیق ائمہ طاہرین علیہم السلام نے بھی کر دی ہو جیسا کہ اس مبحث کی ابتداء میں ان کی توثیق و تصدیق پیش کی جا چکی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ج فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (سورہ مزمل آیت۔ ۱۹)۔

آٹھواں مقدمہ

قرآن کے سات حرفوں پر نازل ہونے کی تشریح اور اس کا ابطال

برادران اسلامی میں مشہور ہے اور ہماری بعض روایات سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان القرآن نزل علی سبعة احرف کلها کاف شاف"

یعنی قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے جن میں سے ہر ایک کافی وشافی ہے۔

اس حدیث شریف کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں علماء اسلام کے درمیان بہت اختلاف واقع ہوا ہے۔ فاضل سیوطی نے اپنے رسالہ تجیر میں پندرہ قول نقل کئے ہیں اور بقول صاحب حدیقہ سلطانیہ بعض علماء اہل سنت نے اس کے متعلق چالیس قول نقل کئے ہیں ان میں زیادہ مشہور دو قول ہیں ایک یہ کہ سبعہ احرف سے مراد قراء سبعہ کا اختلاف قرأت ہے دوسرا یہ کہ اس سے مراد اختلاف لغت ہے۔ یعنی قرآن مجید عرب کے مختلف لغات پر نازل ہوا ہے۔ کچھ قریش کی لغت پر' کچھ ہذیل، کچھ ہوازن اور کچھ یمن وغیرہ کی لغت پر۔ بنا برصحت حدیث ہماری بعض احادیث میں اس کے ایک اور معنی بھی بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''قرآن سات اقسام پر نازل ہوا ہے اور وہ سات اقسام یہ ہیں۔ امر' زجر' ترغیب' ترھیب' امثال' جدل' اور قصص (حدیقہ سلطانیہ)''۔ اس مفہوم کی تائید برادران اسلامی کی بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے چنانچہ بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

"کل الکتب تنزل من باب واحد و نزل القرآن علی سبعة احرف زجر و امر و حلال و حرام و محکم و متشابه و امثال"

یعنی سابقہ آسمانی کتابیں ایک ہی قسم پر نازل ہوتی تھیں۔ مگر قرآن سات اقسام پر نازل ہوا ہے اور وہ اقسام یہ ہیں زجر' امر' حلال حرام' محکم' متشابہ اور امثال۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول بعض روایات میں ''سبعہ احرف'' کی تاویل سبعۃ ابطن کے ساتھ بھی کی گئی ہے۔ یعنی قرآن کے ایک ظاہری معنی ہیں اور دوسرے باطنی معنی اور پھر باطن کا باطن وعلی ھذا القیاس

اس کے سات باطن ہیں۔

مگر ہماری روایات معتبرہ میں اس نظریہ کو رد کیا گیا ہے اور یہ تصریح کی گئی ہے کہ قرآن ایک حرف پر نازل ہوا ہے۔ چنانچہ صحیحہ فضیل بن یسار میں وارد ہے کہ انہوں نے حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے کہ آپ نے سن کر فرمایا: دشمنان خدا جھوٹ کہتے ہیں قرآن ایک ہی حرف پر نازل ہوا ہے اور بروایت زرارہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

"ان القرآن واحد نزل من عند واحد ولکن الا ختلاف یجئی من قبل الرواۃ"۔

قرآن ایک ہے اور ایک ہی ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے اس میں جو اختلاف (الفاظ و قرات) پایا جاتا ہے۔ وہ راویوں اور قاریوں کی طرف سے ہے"۔

یہی نظریہ ہمارے علماء اعلام میں مشہور و معروف ہے چنانچہ شیخ الطائفہ شیخ طوسی علیہ الرحمہ مقدمہ تفسیر بتیان میں فرماتے ہیں۔ واعلموا ان المعروف من مذھب اصحابنا واشائع من اخبارھم وروایاتھم ان القرآن نزل بحرف واحد علی نبی واحد۔ ہاں البتہ قرآن کے سات اقسام کا ہونا یا اس کے سات بطنوں کا ہونا دوسری احادیث سے ثابت ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی بہت سی روایات مزاۃ الانوار اور تفسیر برھان وغیرہ میں موجود ہیں۔ واللہ العالم بحقائق الامور۔

نواں مقدمہ

تمسک بالقرآن اور اختلاف روایت کے وقت ان کو قرآن پر پیش کرنے کا حکم

حضرت رسولخداؐ سے مروی ہے فرمایا:

فاذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانه شافع مشفع وماحل مصدق ومن جعله امامه قاده الی الجنة ومن جعله خلفه ساقه الی النار وھو لدلیل یدل علی خیر سبیل وھو کتاب فیه تفصیل وبیان وتحصیل وھول افصل ولیس بالھزل ولھظھر وبطن فظھرہ حکم وباطنه علم

ظاهرہ انیق وباطنہ عمیق لہ تخوم وعلی التخوم تخوم لاتحصی عجائبہ ولا تبلی غرائبہ فیہ مصابیح الھدی ومنار الحکمۃ ودلیل علی المعرفۃ لمن عرف الصفۃ۔

جب تمہارے اوپر فتنے تاریک رات کی طرح چھا جائیں تو تم پر دامن قرآں مضبوطی سے پکڑنا لازم ہے۔ کیونکہ وہ شفاعت کرنے والا مقبول الشفاعہ ہے اور (اپنے اوپر عمل کرنے والوں کے حق میں) جھگڑا کرنے والا ہے کہ وہ جو کچھ کہے گا اس کی تصدیق کی جائے گی جو شخص قرآن کو اپنا قائد بنائے گا وہ اسے کھینچ کر جنت کی طرف لے جائے گا اور جو اسے پس پشت ڈالے گا۔ یہ اسے دوزخ کی طرف ہانک کر لے جائیگا۔ یہ وہ ہادی ورہبر ہے جو بہترین راستہ (اسلام) کی طرف ہدایت کرتا ہے یہ وہ کتاب ہے۔ جس میں ہر شئی کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ یہ سراسر حق وحقیقت ہے اس میں تمسخر و مذاق نہیں ہے۔ اس ظاہر ہے اور باطن بھی اس کا ظاہر حکم ہے اور باطن علم ہے۔ اس کا ظاہر خوش آئند ہے اور باطن بہت گہرا ہے اس کی ایک انتہا ہے اور اس کی انتہا ہے۔ اس کے عجائبات کا شمار نہیں ہوسکتا اور اس کے غرائب کبھی کہنہ نہیں ہوتے۔ اس میں رشد و ہدایت کی کنجیاں ہیں اور حکمت کے منارے ہیں جو معرفت حاصل کرنے کے طریقہ کار سے آگاہ ہو اس کیلئے یہ معرفت کا راہبر ہے۔ (اصول کافی، عیاشی، صافی)۔

متواتر حدیث ثقلین اسی سلسلے جلیلہ کی ایک اہم کڑی ہے جس میں قرآن کے ساتھ تمسک کرنے کی تاکید مزید کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کے ساتھ تمسک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اوامر پر عمل درآمد کیا جائے اور اس کے نواہی سے دامن کو بچایا جائے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''جب قیامت کا دن ہوگا اور انبیاء و مرسلین ملائکہ مقربین اور تمام اوّلین و آخرین موجود ہوں گے تو قرآن مجید ایک دلکش اور خوبصورت شکل میں آئے گا اور جب مسلمانوں کے پاس سے گزرے گا تو وہ خیال کریں گے کہ شاید وہ ہم سے کوئی مسلمان ہے مگر قرآن ان سے آگے نکل کر انبیاء علیہم السلام کی صفوں کے پاس سے گزرے گا وہ یہ خیال فرمائیں گے کہ ہم میں سے کوئی نبی ہے مگر وہ جب ان سے بھی نکل کر ملائکہ مقربین کے پاس پہنچے گا۔ تو وہ یہ خیال کریں گے کہ ہم میں سے کوئی فرشتہ ہے مگر وہ ان کی صفوں کو چیرتا ہوا بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوگا اور عرض کرے گا۔ بارالہا! فلاں آدمی دنیا میں رہ کر دن کو روزہ رکھتا تھا اور رات کو میری تلاوت کرتا

تھا تو ارشاد قدرت ہوگا۔ اے قرآن! تو آج ان سب لوگوں کو جنت میں اپنے اپنے منازل پر پہنچا۔ چنانچہ قرآن ان لوگوں سے کہے گا کہ تم قرآن پڑھتے جاؤ اور مدارج عالیہ پر چڑھتے جاؤ۔ یہاں تک کہ قرآن ایسے سب لوگوں کو ان کے منازل و مراتب تک پہنچا کر رہے گا۔ (تفسیر صافی بحوالہ اصول کافی)۔

اسی طرح متعدد احادیث میں وارد ہے کہ جب روایات میں اختلاف رونما ہو تو انہیں قرآن پر پیش کرنا چاہیے۔ پس جو حدیث قرآن کے موافق ہو اسے صحیح سمجھ کر لے لیا جائے اور جو قرآن کے مخالف ہو۔ اسے دیوار پر مار دیا جائے۔ چنانچہ کتب فریقین میں مذکور ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھ پر جھوٹ بولنے والے بہت ہو گئے ہیں۔ لہٰذا تم تک جب میری کوئی حدیث پہنچے تو اسے قرآن پر پیش کرو پس اگر قرآن کے موافق ہو تو اسے لے لو اور اگر قرآن کے مخالف ہو تو اسے دیوار پر پھینک دو''۔ (بخاری شریف، مجمع البیان)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''**کل شئی مردود الی الکتب و السنۃ و کل حدیث لا یوافق کتاب اللہ فھو زخرف**'' (اصول کافی)۔ ہر چیز کو کتاب وسنت کی طرف لوٹایا جائے گا اور ہر وہ حدیث جو قرآن کے مطابق نہ ہو وہ باطل ہے۔

نیز انہی جناب سے منقول ہے فرمایا:

''**ما لم یوافق من الحدیث القران فھو زخرف**'' جو حدیث قرآن کے موافق نہ ہو وہ باطل ہے (اصول کافی)

جمال و نور قرآن جان ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند تاروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

دسواں مقدمہ

قرآن اور عترت کے ساتھ تمسک کرنے کا حکم اور اس بات کی وضاحت کہ مذہب وہ صحیح ہے جو قرآن وعترت کے مطابق ہے:

یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ جو دین اسلام خدا نے بنایا۔ جو مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں تک پہنچایا اور جو ادیان باطلہ کو مٹا کر ساری کائنات کو ایک سیدھے راستہ پر چلانے کیلئے آیا وہ خود اختلاف وانتشار کا شکار ہو گیا۔ ایک اسلام کے تہتر (۷۳) اسلام بن گئے۔ اور پھر لطف بالائے لطف یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے کو برحق اور دوسرے تمام فرقوں کو باطل قرار دے رہا ہے۔ عقل حیران اور ناطقہ سربگریبان ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی ایک طویل الذیل خونچکاں داستاں ہے جس پر ہم نے اپنی کتاب اثبات الامامت میں فی الجملہ تبصرہ کر دیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ سب کچھ خاندان رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت بنوت علیہم السلام کا دامن چھوڑنے کا نتیجہ ہے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کو جس پلیٹ فارم پر چھوڑ کر گئے تھے امت نے وہ پلیٹ فارم چھوڑ دیا، جس خانوادہ کا تعارف کرا کے گئے تھے امت نے اس خانوادہ کو بھلا دیا اور آپ جو دروازہ امت کو دکھا کر گئے تھے۔ امت نے وہ دروازہ ہی جلا دیا۔ اس روش ورفتار کا قدرتی اور فطری نتیجہ یہ نکلا کہ

و تشعّبت شعبا فکل جزیرۃ
فیها امیرالمومنین و منبر

اب رہی اس بات کی تحقیق کہ ان مختلف فرق ومسالک میں سے برحق کون ہے وناجی کون؟ یہ عقدہ حدیث ثقلین نے حل کر دیا ہے۔ کیونکہ اس میں مخبر صادق علیہ الصلوۃ و السلام نے یہ وضاحت و صراحت کر دی ہے کہ حق وصداقت تمسک بالقرآن والعترۃ میں مضمر ہے اور اُخروی نجات وفوز وفلاح اتباع ثقلین میں پوشیدہ ہے۔

''انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی اهلبیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا بعدی و انّهما لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض'' (حدیث نبوی متواتر)

شاہ عبدالعزیز دہلوی نے تحفہ اثناء عشریہ میں اور فریقین کے دوسرے محقق علماء کرام نے صراحت کی ہے کہ مذہب وہ برحق ہے جو قرآن وعترت کے مطابق ہے۔ چنانچہ فاضل دہلوی لکھتے ہیں:

''باید دانست کہ باتفاق شیعہ سنی این حدیث ثابت است کہ پیغمبرؐ فرمود۔ انی تارك فیكم الثقلین ما ان تمسكتم بهما لن تضلوا بعدی احدهما اعظم من الاخر كتاب الله و عترتی۔ پس معلوم شد کہ در مقدمات دینی و احکام شرعی ما را پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حوالہ بایں دو چیز عظیم القدر فرمود۔ پس مذہبے کے مخالف این دو باشد در امور شرعیہ عقیدۃً وعملاً باطل و نامعتبر است و ہر کہ انکار ایں دو بزرگ نماید کافر و خارج از دین است''۔ (تحفہ اثناعشریہ ص ۱۳۰ طبع مصر)

اب رہی اس بات کی تحقیق کہ تمام فرقہ ہائے اسلام میں سے کون سا ایسا فرقہ ہے جو متمسک بالثقلین ہے؟ دعویٰ تو سب یہی کرتے ہیں کہ وہ متمسک بالثقلین ہیں مگر خدا لگی بات یہ ہے کہ اس معیار پر صرف شیعیان حیدر کرار ہی پورے اترتے ہیں۔ یہی وہ واحد فرقہ ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین و دنیا کا مرکز، رشد وہدایت کا محور اور اپنے دین و دنیا کا رہبر و رہنما اور اپنا مقتدا و پیشوا قرآن وعترت کو ہی جانتا ہے اور انہی کو اپنا سب کچھ مانتا ہے اس کے نزدیک مفسر قرآن ہیں تو اہل بیتؑ، محدث و حدیث دان ہیں تو اہل بیت علیہم السلام، امام و فقہ دان ہیں تو اہل بیت علیہم السلام، خلیفہ و جانشین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں تو اہل بیت علیہم السلام اور دین دنیا کے مرشد و راہنما ہے تو اہل بیت علیہم السلام۔ شیعہ اتباع کرتے ہیں تو نبیؐ کے بعد اہل بیت نبی علیہم السلام کی، اطاعت کرتے ہیں تو خدا و مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خانوادہ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دودمان مرتضی کی۔ بخلاف دوسرے فرقہاے اسلام کے کہ ان کے خلفاء ہیں تو اور ان کے مرشد و راہنما ہیں تو اور۔ زبانی کلامی طور پر تو وہ سب کچھ اہل بیت علیہم السلام کو مانتے ہیں مگر عملی طور پر وہ ان کو کچھ بھی نہیں مانتے وہ سب کچھ اوروں کو مانتے ہیں۔

اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

چنانچہ مولانا وحید الزمان اپنی کتاب انوار اللغت پ ۱۸ صفحہ ۱۴ طبع بنگلور لکھتے ہیں:

''حنفیوں، شافعیوں اور خوارج وغیرہ نے قرآن کو لے لیا اور عترت کو چھوڑ دیا۔ ان کی کتابوں میں جہاں دیکھو ابوحنیفہ اور شافعی کے اقوال بھرے پڑے ہیں''۔

اسی وجہ سے حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

:''یا علی علیہ السلام! انت و شیعتك هم الفائزون یوم القیامة''۔

یا علیؑ! قیامت کے دن آپ اور آپ کے شیعہ کامیاب و رستگار ہونے والے ہیں۔

(تفسیر درمنثور سیوطی، صواعق محرقہ ابن حجر مکی، تذکرۃ الخواص سبط ابن جوزی و تحفہ اثناعشریہ دہلوی۔)

گیارہواں مقدمہ

ایمان وعمل کے لازم وملزوم ہونے کا بیان

اگر دنیا کے ملل و مذاہب کی تعلیمات کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ دنیوی فوز وفلاح اور اخروی نجات ونجاح کے سلسلہ میں تین آراء پائی جاتی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اس مقصد کے حصول کیلئے صرف ایمان واعتقاد کافی ہے عمل ضروری نہیں ہے۔

(۲) صرف عمل وکردار کافی ہے ایمان واعتقاد لازم نہیں ہے۔

(۳) دونوں لازم وملزوم ہیں ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کے علاوہ باقی ادیان کی تعلیمات کو پہلے دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسلامی حقائق اور ماخذ ومدارک کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو وہ تیسرے نظریہ کا علمبردار نظر آتا ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں سائنسی علوم بڑی ترقی کر گئے ہیں۔ مگر تا حال کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہوا۔ جس کی مدد سے آگ سے گرمی، برف سے ٹھنڈک اور تیل سے تراوٹ الگ کی جا سکے۔ مگر ممکن ہے کہ کل کلاں کوئی ایسا آلہ ایجاد ہو جائے۔ مگر سائنس ہزار ترقی کر جائے صبح قیامت کے طلوع ہونے تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہو سکے گا جس کی مدد سے ایمان سے عمل صالح کو اور عمل صالح سے ایمان کو علیحدہ کیا جا سکے۔ اس بات کا وجود تو کجا اس کا تصور بھی نہیں کیا سکتا۔

جہاں بھی ایمان ویقین ہوگا وہاں اس کے مطابق عمل بھی ضرور ہوگا اور جہاں بھی عمل ہوگا وہاں اس کے پیچھے ایمان ویقین کی قوت کارفرما ہوگی۔ عمل کی کمزوری ایمان کی کمزوری کا فطری نتیجہ ہے۔ اور ایمان ویقین کی کمزوری کا قدرتی نتیجہ عمل وکردار کی غیر پختگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے پورے قرآن میں اور چہاردہ معصومین ؑ نے اپنے فرامین میں جہاں بھی کسی قوم وملت یا کسی فرد سے فوز وفلاح کا وعدہ کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ جب ایک ہاتھ میں ایمان کا دامن ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں نیک کام کا دامن۔ ”وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ“ (سورہ بقرہ آیت۔ ۸۲)۔

اگر کوئی نام نہاد مبلغ ومقرر یا خطیب وادیب یہ کہتا ہے کہ فلاح کونین وسعادت دارین کیلئے صرف ایمان واعتقاد یا محبت اہل بیت علیہم السلام کافی ہے اس کے ساتھ عمل وکردار ضروری نہیں ہے۔ یا اگر کوئی غیر ذمہ دار مذہبی زعیم وریفارمر یہ کہتا ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے صرف عمل وکردار کافی ہے اور ایمان واعتقاد اور محبت اہلبیتؑ لازمی نہیں ہے۔ تو محتاط الفاظ میں ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے شخص نے

قرآن وسنت کو پڑھا نہیں ہے اور اگر پڑھا ہے تو پھر اسے سمجھا نہیں ہے ورنہ جس شخص کی نگاہ اللہ تعالیٰ کے قرآن اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کے فرمان پر ہو۔ وہ کبھی ایسی بات نہ زبان سے کہہ سکتا اور نہ قلم سے لکھ سکتا ہے کیونکہ عقل وشرع اور قرآن وسنت اس حقیقت پر متفق ہیں کہ ایمان کے ساتھ عمل اور محبت کے ساتھ اتباع اس طرح لازم وملزوم ہیں کہ ایک کا دوسرے کے بغیر تصور کرنا بھی محال و ناممکن ہے۔ اس امر کی مزید وضاحت قارئین کرام کو اس تفسیر میں جابجا نظر آئے گی۔ انشاءاللہ۔ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

بارھواں مقدمہ

محکم ومتشابہ آیات کا بیان اوران کی تشریح

ارشادقدرت ہے: هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ (سورہ آل عمران آیت ۔۷)۔ ''وہی ہے جس نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جس میں کچھ آیتیں تو محکم ہیں جو کتاب کی اصل و بنیاد ہیں اور کچھ متشابہہ ہیں۔ اب جن لوگوں کے دلوں میں کجی (ٹیڑھ) ہے وہ تو فتنہ برپا کرنے اور من مانی تاویلیں کرنے کی خاطر متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ حالانکہ خدا اوران لوگوں کے سوا جو علم میں مضبوط و پختہ کار ہیں اور کوئی ان کی تاویل (اصل معنی) کو نہیں جانتا......۔

اس طرح خود خدائے علیم وحکیم نے قرآنی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ چونکہ قرآنی دعوت تمام لوگوں کو شامل ہے جن میں عالم و جاہل، ذہین اور کند ذہن وغیرہ سب داخل ہیں۔ نیز مطالب ومعانی بھی کچھ ایسے سلیس وآسان ہوتے ہیں کہ درس وتدریس اور تحقیق کے بغیر سمجھ میں آجاتے ہیں اور کچھ ایسے دقیق وعمیق ہوتے ہیں جو تحقیق وتدقیق کے بعد سمجھ میں آتے ہیں۔ نیز کبھی کسی بات کے مبہم رکھنے میں مصلحت ہوتی ہے اس لئے ضرورت تھی کہ قرآن کریم میں آیات محکمات بھی ہوں اور متشابہات بھی۔

محکم ومتشابہ کی تعریف

اب اس بات کی تحقیق کہ محکم کسے کہتے ہیں اور متشابہ کسے؟ اگرچہ ان کے مختلف مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کی بہترین تعبیر وتشریح یہ ہے کہ محکم وہ ہے جس کی مراد ہر اس شخص پر بالکل واضح و عیاں ہو۔ جو عربی زبان اور اس کے قواعد وضوابطہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ کیونکہ محکم کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں

جو کسی قرینہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ جیسے ''قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ'' (اخلاص آیت۔۱)، ''اِنَّ اللهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر'' (بقرہ آیت۔۲۰)، ''وَ مَا اللهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ'' (مومن آیت۔۳۱)، ''قُلِ اللهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ'' (رعد آیت۔۱۶)، اور ''لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ'' (شوریٰ آیت۔۱۱) اور متشابہ وہ ہے کہ جس کی مراد زبان دان اور واقف الفاظ و معانی پر بھی مبہم اور غیر متعین ہو۔ اور متکلم کا مطلب واضح نہ ہو۔ بلکہ مشتبہ ہو۔ اور اس اشتباہ کے کئی علل و اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) لغت و عرف کے لحاظ سے اس لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں اور معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کونسے معنی مراد ہیں؟ جیسے لفظ قرء جو کہ حیض و طہارت دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ''وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ'' (سورہ بقرہ آیت۔۲۸)۔

(۲) ایک لفظ کے کئی معانی ہیں اور جو معنی عام طور پر مراد ہوتے ہیں عقل ان کا انکار کرتی ہیں جیسے ''ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ'' (اعراف آیت۔۵۴) کہ عرش کے عمومی معنی چارپائی کے ہیں جن کا خدا کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یا ''كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ'' (سورہ رحمٰن آیت۔۲۶،۲۷) کہ ''وجہ'' کے عمومی معنی چہرہ کے ہیں جو یہاں مراد نہیں لیے جا سکتے۔

(۳) ایک لفظ عام ہے جو بظاہر تمام مکلفین کو شامل ہے مگر اس سے مراد بعض افراد ہیں جیسے ''وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا'' (سورہ مائدہ آیت۔۳۸) جبکہ معلوم ہے کہ اگر کوئی باپ بیٹے کا مال چرائے، یا قحط کے زمانہ میں چرائے یا ربع دینار سے کم چرائے۔ یا غیر محفوظ جگہ سے چرائے تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔

(۴) یا وہ حکم منسوخ ہو چکا ہو مگر آدمی کو اس کا علم نہ ہو جیسے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔

(۵) یا جس کے اجمالی معنی تو معلوم ہوں مگر تفصیل کا علم انسانی عقل و خرد کے حدود سے ماورا ہو۔ جیسے روح ''فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا'' (سورہ انبیاء آیت۔۹۱) وغیرہ وغیرہ۔۔۔

بہرحال جب محکم و متشابہ کا مفہوم معلوم ہو گیا تو یہاں خداوند عالم نے مختلف لوگوں کی روش و رفتار کا تذکرہ فرمایا ہے کہ جو لوگ سلیم الفطرت ہوتے ہیں وہ تو محکمات کی اتباع کرتے ہیں اور متشابہات کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ وہ متشابہات کی کوئی مناسب تاویل و توجیہ کر کے انہیں محکمات کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کو متکلم کی مراد جانتے ہیں اور ان کے کوئی ایسے معنی نہیں کرتے جو دین و مذہب کے مسلمات اور آیات محکمات کے خلاف ہوں۔ اور یہی حزم و احتیاط اور سلامتی کا راستہ ہے۔ مگر جن لوگوں کے دل ٹیڑھے ہوتے ہیں اور ارادوں

میں کجی اور نیتوں میں فتور ہوتا ہے۔ وہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور پھر ان کی من مانی تاویلیں کر کے اور اپنی خواہش کے مطابق ان کے معانی نکال کر اپنے مقاصد باطلہ کی تائید کر کے لوگوں کے دلوں میں وسوسے اور شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں اور ان کو گمراہ و بدراہ کرتے ہیں اور فتنہ وفساد کی آبیاری کرتے ہیں اور اپنی مطلب برآری کرتے ہیں اور یہی قرآن کی تفسیر بالرائے کرنے کا مفہوم ہے جو کہ بالاتفاق حرام ہے کہ مفسر قرآن کوئی غلط نظریہ رکھتا ہو اور قرآن کو توڑ موڑ کر اور اس کے سیاق وسباق اور اس کے حقیقی مفہوم سے ہٹ کر اپنے باطل نظریہ کی اس سے تائید حاصل کرے اور آیت کو من بھاتے معنی کا جامہ پہنائے۔ اور اس طرح خود بھی گمراہ ہو۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے۔ اس لئے قرآن وسنت میں ایسے لوگوں کی سخت مذمت وارد ہوئی ہے جو۔۔۔۔۔۔۔ع

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ''وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ''۔(آلِ عمران آیت۔۷) خدا اور راسخون فی العلم جو کہ سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام ہیں کے سوا اور کوئی ان متشابہات کی تاویل ومفہوم کو نہیں جانتا۔ لہٰذا متشابہات کے سمجھنے اور قرآنی اسرار ورموز کو سمجھنے کیلئے ان ذواتِ مقدسہ کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔

تیرہواں مقدمہ

تفسیر بالرائے کی حرمت اور اس کی تشریح

فریقین کی کتب احادیث میں اس قسم کی متعدد حدیثیں موجود ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''من فسّر القرآن برائه فليتبوء مقعده من النار''

جو شخص اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرے وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنائے (صافی، عیاشی، سنن ابن داؤد وغیرہ)

یہی وجہ ہے کہ تمام مفسرین اسلام کا تفسیر بالرائے کی حرمت پر اتفاق ہے۔ اور وہ اس فتنہ کو اسلام کا بہت بڑا المیہ سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی ہے اور ہر اہل مذہب ومسلک اپنے مذہب ومسلک کی صداقت پر قرآن سے استدلال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس طرح قرآن کو ژند و پاژند بنا دیا ہے۔

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو کر سکتے ہیں پاژند

مگر اس بات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس تفسیر بالرائے کا فرد جلی تو یہ ہے کہ آدمی کوئی فاسد نظریہ رکھتا ہو اور اس کی تائید و تقویت کی خاطر قرآن کے من گھڑت معنی کرے اور آیات قرآنیہ کو اپنی پسند کے معنی کا جامہ پہنائے۔ تاکہ اپنے باطل کو حق اور خطا کو صواب ثابت کرے (مفاتیح الغیب ملا صدرا شیرازی، غرائب القرآن نیشاپوری)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مفسر قرآن کا تابع نہ بنے بلکہ قرآن کو اپنی رائے کا تابع بنائے۔ اکثر مفسرین کی تفسیر بالرائے اسی نوعیت کی ہوتی ہے۔ علاوہ بریں بعض مفسرین نے درج ذیل مفاہیم کا بھی تفسیر بالرائے کے ضمن میں تذکرہ کیا ہے۔

(۱) ان پندرہ علوم عربیہ میں مہارت حاصل کئے بغیر جن سے عربی کے اسلوب اور قرآن کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن کی تفسیر کرنا جس طرح کچھ خودرہ مفسرین اپنے ذاتی خیالات کو قرآن کے سر منڈھتے ہیں۔

(۲) راسخون فی العلم کی طرف رجوع کئے بغیر متشابہ آیات کا مفہوم متعین کرنا۔

(۳) فاسد عقیدہ اور مسلک کو بنیاد قرار دے کر آیات قرآنیہ کی تفسیر کرنا۔

(۴) اپنی ذاتی پسند و ناپسند کی بنا پر قرآن کی تفسیر کرنا۔

(۵) حقیقی وارثان قرآن کی طرف رجوع کئے بغیر اور ناسخ و منسوخ، عام و خاص اور مطلق و مقید کا لحاظ کئے بغیر صرف ظواہر قرآن پر عقیدہ و عمل کی بنیاد رکھنا۔

(۶) حقیقی مفسرین کی طرف رجوع کئے بغیر اور ان کے اقوال سے مدد لئے بغیر اپنی مرضی سے معنی متعین کرنا وغیرہ وغیرہ (تفسیر اتقان وغیرہ)

چودھواں مقدمہ

تفسیر قرآن کا مفہوم اور اس کے طریقہ کار کا بیان

لغت عرب میں تفسیر کے معنی ہیں کشف المبہم یعنی غیر واضح بات کو واضح کرنا اور قرآنی آیات کے معانی و مفہوم کو کھول کر بیان کرنا۔ چونکہ قرآن میں کچھ آیات محکم ہیں اور کچھ متشابہ، کچھ مجمل، کچھ مفصل، کچھ عام، کچھ خاص، اور کچھ مطلق اور کچھ مقید وغیرہ لہٰذا وہ اس طرح عام فہم نہیں ہے کہ کسی تفسیر و تشریح کا محتاج نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا

تو پھر خدائے حکیم کو پیغمبر اسلام کو معلم قرآن بنا کر بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟ ارشاد قدرت ہے۔ ''وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ''۔ (سورہ نحل...... ۴۴) ہم نے ذکر (قرآن) کو آپ کی طرف نازل کیا ہے تا کہ آپ کھول کر بیان کریں کہ ان کی طرف کیا اتارا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پڑھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض میں شامل تھا۔ یعلمهم الكتاب والحكمة۔ وہ لوگوں کو قرآن وحکمت پڑھاتے تھے۔ (سورہ جمعہ) اور آنحضرتؐ کے بعد یہ فریضہ تعلیم وتدریس اہل بیتؑ رسالت کے سپرد ہوا۔ ''ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا'' (فاطر...... ۳۲)۔ یہ خدا کے برگزیدہ بندے کون ہیں؟ اس کی وضاحت حدیث ثقلین میں کی گئی ہے۔ ''انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله و عترتی اهلبیتی (حدیث نبوی متفق علیہ)۔

لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ قرآن بالکل آسان اور عام فہم کتاب ہے۔ جس کے سمجھنے سمجھانے کیلئے ہمیں کسی معلم ربانی یعنی نبی وامام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ شخص جو عربی زبان کی کچھ شد بد رکھتا ہے۔ وہ قرآن کے تمام مطالب ومعانی کو سمجھ سکتا ہے لہٰذا حسبنا كتاب الله (ہمارے لئے کتاب خدا ہی کافی ہے)۔

اسی طرح یہ کہنا بھی خلاف حقیقت ہے کہ قرآن بالکل ایک معمہ کی حیثیت رکھتا ہے اور عوام کیلئے بالکل ناقابل فہم کتاب ہے اور عوام ہر بات میں مخصوص ہستیوں کے کلام وبیان کے اس طرح محتاج ہیں کہ وہ ظواہر الفاظ کے معانی بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں اگر پہلی بات افراط ہے تو یہ کھلی ہوئی تفریط ہے۔ چونکہ اسلام ہر بات میں اعتدال کا قائل ہے اور حق ہمیشہ افراط وتفریط کے درمیان ہوتا ہے۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ الامر بين الامرين۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن مجید عربی میں نازل ہوا ہے اور عربی کے سمجھنے کیلئے علوم عربیہ از قسم صرف ونحو معانی وبیان اور بالخصوص ادب عربی پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ مگر صرف یہ چیز قرآن فہمی کیلئے کافی نہیں ہے' اس کے لئے شان نزول' تاریخی پس منظر' کلامی تحقیق اور فقہی تدقیق بھی لازم ہے اور مزید برآں قرآن کے سیاق وسباق اور معانی ومفاہیم میں تدبر وتفکر اور استنباط احکام میں تامل بھی اشد ضروری ہے۔ ورنہ تدبر فی القرآن اور اختلاف روایات کے وقت ان کی صحت وخطا معلوم کرنے کے لئے انہیں قرآن پر پیش کرنے کے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہ جائیںگے اور اسی نام ہے تفسیر القرآن بالقرآن ہے کیونکہ ایک بات قرآن میں ایک جگہ مجمل ہوتی ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل موجود ہوتی ہے۔ لان القرآن يفسر بعضه بعضاً۔

لہٰذا اس سلسلہ میں تدبّر فی القرآن کے بعد سب سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے بعد وارثان علوم قرآن یعنی ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ متعدد احادیث میں وارد

ہے۔ انما یعرف القران من خوطب۔قرآن کی حقیقت کو وہی بزرگوار سمجھتے ہیں جو مخاطب قرآن ہیں اور جن کے گھروں میں قرآن اترا ہے۔(صافی وبرھان)

اسی لئے فریقین کے مفسرین نے تسلیم کیا ہے کہ ''ان تفسیر القران لا یجوز الا بالاثر الصحیح والنص الصریح'' کہ قرآن کی حدیث صحیح اور نص صریح کے سوا تفسیر بالرائے کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ارشاد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

''من فسر القرآن برائہ فلیتبوا مقعدہ من النار''

جو شخص قرآن کی تفسیر محض اپنی رائے سے کرے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا۔(صافی وبرھان)

جیسا کہ آج کل کچھ لوگ اپنے جدید نظریات کو قرآن پر پیش کر کے ان کی تصحیح کرنے کی بجائے الٹا قرآن کو توڑ موڑ کر اپنے خیالات کے مطابق کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔اور خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔کا مظاہرہ کر کے اقبال کو یہ کہنے کا موقع دیتے ہیں کہ

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اور اس کا وہ روشن خیالی اور آزادروی نام رکھتے ہیں۔اگرچہ ایسے لوگ ہر دور میں رہے ہیں مگر آج کل کچھ زیادہ ہی ہیں بطور نمونہ مرزائے قادیان۔سرسید احمد خان' مولوی عبداللہ چکڑالوں اور جناب پرویز کی تحریریں اور تفسیریں دیکھی جاسکتی ہیں۔جن میں اور تو سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں ہے۔اگرچہ اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں قرآن پر اس قدر کام ہوا ہے جتنا اور کسی کتاب پر نہیں ہوا۔اور اس کی اس قدر تفسیریں علماء اسلام نے لکھی ہیں۔جس کی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی۔شکر اللہ سعیھم۔

بفضلہ تعالی شیعہ علماء وفضلاء ہر اسلامی علم کی طرح اس سلسلہ میں بھی ہراول وستہ میں نظر آتے ہیں۔انہوں نے ہر دور اور ہر عہد میں قرآن مجید کے بارے میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں تفصیلات معلوم کرنے کے خواہشمند تاسیس الشیعہ الکرام لفنون الاسلام، اور اعیان الشیعہ وغیرہ مبسوط کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں اور اردو دان طبقہ کیلئے علامہ سید علی نقی قدس سرہ کا مقدمہ تفسیر ہی کافی ووافی ہے۔یہ تفسیر فیضان الرحمن فی تفسیر القرآن بھی اسی خدمت قرآن کے سلسلہ جلیلہ کی ایک حقیر سی کڑی ہے خدا قبول فرمائے اور اسے قبول عام کی سند عطا فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

پندرھواں مقدمہ

تلاوت قرآن کے اجروثواب کا بیان

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

"نوروا بيوتكم بتلاوة القرآن ،فان البيت اذا كثر فيه تلاوة القرآن كثر خيره، و اتسع اهله واضاء لاهل السماء كما تضيئ نجوم السماء لاهل الدنيا"۔

اپنے گھروں کوتلاوت قرآن کے ساتھ منور ودرخشاں کرو۔ کیونکہ جب کسی گھر میں بکثرت تلاوت قرآن کی جائے تو اس کی خیر وبرکت زیادہ ہوتی ہے' گھر والے زیادہ ہوتے ہیں اور وہ گھر اہل آسمان کیلئے اس طرح چمکتا ہے جس طرح ستارے اہل زمین کیلئے چمکتے ہیں۔ (تفسیر صافی)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

جو شخص بغیر پڑھے کسی سے قرآن مجید کا ایک حرف سنے تو خداوند عالم اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور ایک برائی مٹا دیتا ہے اور یہی ثواب اس شخص کا ہے جو دیکھ کر ایک حرف کی آواز نکالے بغیر تلاوت کرے۔ اور جو اس کا ایک حرف سیکھے تو خدا اس کیلئے دس نیکیاں لکھ دیتا ہے دس گناہ مٹا دیتا ہے اور دس درجے بلند کرتا ہے۔ اور جو شخص بیٹھ کر نماز میں قرآن کے ایک حرف کی تلاوت کرے اس کیلئے پچاس نیکیاں لکھی جاتی ہیں' پچاس برائیاں مٹا دی جاتی ہیں۔ پچاس درجے بلند ہوتے ہیں اور جو کھڑے ہو کر نماز میں اس کی تلاوت کرے تو اس کیلئے سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ سو برائیاں مٹائی جاتی ہیں اور سو درجے بلند کئے جاتے ہیں اور جو شخص قرآن ختم کرے اس کی ایک دعا جلد یا بدیر ضرور قبول ہوتی ہے۔ (تفسیر صافی)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''الحافظ للقرآن العامل به مع السفرة الكرام البررة''۔

جو شخص قرآن کا حافظ ہو اور اس پر عامل بھی ہو وہ خدا کے مکرم فرشتوں کے ہمراہ (جنت میں) ہوگا (صافی)

وفيه كفاية لمن له دراية۔

سولہواں مقدمہ

تلاوت قرآن کے آداب ومستحبات کا بیان

قرآن مجید چونکہ خالق دو جہاں کا کلام معجز نظام ہے اور کتاب رشد وہدایت ہے اور اللہ کے نیکوکار اور پرہیزگار بندوں کیلئے موعظہ اور پند ونصیحت کی کتاب بلاغت نصاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تلاوت وقت گزار نے کیلئے نہیں کی جاتی بلکہ دنیا وآخرت کو سدھارنے' سیرت وکردار کو سنوارنے اور آدمیت وانسانیت کو نکھارنے کیلئے کی جاتی ہے تو یہ مقصد اعلیٰ جب ہی حاصل ہوسکتا ہے کہ اسکی تلاوت مکمل شرعی آداب ومستحبات کے ساتھ کی جائے جو بڑے اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید کی تعظیم وتکریم کرنا

(۲) اگر چہ قرآن حفظ ہی ہومگر دیکھ کر اس کی تلاوت کرنا افضل ہے کیونکہ قرآن مجید کے حروف پر نگاہ کرنا بھی عبادت ہے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے (اصول کافی)

(۳) وضو کرکے اور روبقبلہ ہوکر سکون واطمینان کے ساتھ تلاوت کی جائے۔

(۴) ترتیل کے ساتھ تلاوت کی جائے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے ''وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا' قرآن کی ترتیل سے تلاوت کرو (سورہ مزمل آیت۔ ۴)۔ مگر یاد رہے کے ترتیل کے معنی خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرنا نہیں (جیسا کہ عوام میں مشہور ہے) بلکہ ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ کو ان کے مقررہ مخارج سے ادا کر کے اور وقوف کا لحاظ کر کے پڑھنا ہے۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے ہے فرمایا۔ **وھو حفظ الوقوف وبیان الحروف** (تفسیر صافی)۔

(۵) تلاوت سے پہلے شیطان کے شر سے خدا سے پناہ مانگنا اور خدا کے نام سے آغاز کرنا۔ ارشاد رب العزت ہے۔ ''فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' (سورہ نحل آیت۔ ۹۸)

(۶) تلاوت کرنے سے پہلے یہ دعا پڑھی جائے۔

''اَللّٰھم بالحق انزلته ، وبالحق نزل اللّٰھُمَّ عظم رغبتی فیه و اجعله لی نورا لبصری و شفاء لصدری و ذھابا لہمی و غمی و حزنی اللھم زین به لسانی و جمل به وجھی و قو به جسدی و ثقل به میزانی وارزقنی تلاوته علی طاعتك اناء اللیل و اطراف النھار واحشرنی مع النبی وآله الا طھار'' اور ختم پر یہ دعا پڑھی جائے۔ ''اللھم اشرح با

لقرآن صدی و استعمل بالقرآن بدنی و نور بالقرآن بصری و اطلق بالقرآن لسانی و اعنی علیه ما ابقیتنی فانه لا حول و لا قوۃ لا بك''۔

مندرجہ بالا دعا حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے (مفاتیح الجنان)

(۷) پورے حضور قلب اور خشوع وخضوع کے ساتھ تلاوت کرے۔

(۸) قرآنی آیات وکلمات میں تدبر وتفکر کرے اور اس کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے کی جدوجہد کرے اور خدا سے توفیق طلب کرے۔

(۹) جس قسم کی آیت پڑھے اس کے مطابق عمل کرے یعنی توبہ واستغفار والی آیت پڑھے تو توبہ واستغفار کرے جب جنت ونار والی آیت پڑھے تو جنت کا خدا سے سوال کرے اور جہنم سے پناہ مانگے اور جب آیت سجدہ کی تلاوت کرے تو سجدہ کرے۔ الغرض جس قسم کی آیت ہو اسی قسم کی اثر پذیری کا اظہار کرے

(۱۰) کلام ومتکلم کی عظمت وجلالت کا تصور دل ودماغ میں قائم کرے۔ تلك عشرۃ کاملة۔

سترہواں مقدمہ

رموز وعلامات وقف کا بیان

قارئین کرام پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ مختلف آیات کے آخر یا وسط میں بعض علامات ہوتے ہیں' کہیں گول سا دائرہ ہوتا ہے۔ کہیں م' ج اور ز وغیرہ حروف تہجی لکھے ہوتے ہیں۔ انہیں رموز واوقاف کہا جاتا ہے۔ قرآن کی صحیح طریقہ پر تلاوت کرنے کیلئے کہ کہاں ٹھہرنا چاہیے اور کہاں نہیں؟ ان رموز وعلامات کا جاننا کسی حد تک ضروری ہے۔

(۱) گول دائرہ کسی آیت کے ختم ہونے کی علامت ہے لہٰذا قاری کو یہاں ٹھہرنا چاہیے۔

(۲) م۔ یہ وقف لازم کی علامت ہے یہاں ضرور ٹھہرنا چاہیے۔ بصورت دیگر مفہوم کے گڈمڈ ہونے کا خطرہ ہے۔

(۳) ط۔ یہ وقف مطلق کی علامت ہے یہاں ٹھہرنا چاہیے۔ مگر متکلم کا سلسلہ کلام ہنوز جاری ہے۔ مطلب مکمل نہیں ہوا۔

(۴) ج۔ یہ وقف جائز کی علامت ہے یہاں ٹھہرنا نہ ٹھہرنا جائز ہے۔ یعنی اگر ٹھہر جائیں تو بہتر ہے اور اگر نہ ٹھہریں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(۵) ز۔ یہ وقف مجوز کی علامت ہے یعنی ٹھہرنا جائز تو ہے مگر نہ ٹھہرنا بہتر ہے۔

(۶) ص۔ یہ وقف مرخص کی علامت ہے یعنی اگر کوئی تھک کر ٹھہر جائے تو رخصت ہے ورنہ ملا کر پڑھنا انسب ہے۔

(۷) صلی۔ یہ الوصل اولی کا مخفف ہے یعنی ملا کر پڑھنا اولیٰ ہے۔

(۸) صل۔ یہ قد یوصل کا مخفف ہے یعنی کبھی ملا کر پڑھا جاتا ہے یہاں ٹھہرنا بہتر ہے۔

(۹) قف۔ یہاں ٹھہرنا چاہیے یہ رمز وہاں لکھی جاتی ہے جہاں یہ اندیشہ ہو کہ قاری ملا کر پڑھے گا۔

(۱۰) ق۔ یہ قیل علیہ الوقف کا مخفف ہے۔ (کہا گیا ہے کہ یہاں وقف ہے) گو یہاں ٹھہرنا جائز ہے مگر نہ ٹھہرنا بہتر ہے

(۱۱) وقفہ۔ لمبے سکتے کی علامت ہے مگر سانس نہیں ٹوٹنی چاہیے۔

(۱۲) س یا سکتہ۔ یہاں ٹھہرنا چاہیے مگر سانس نہ ٹوٹے۔

(۱۳) لا۔ لا تقف کا مخفف ہے لا کے معنی ہیں نہیں یعنی یہاں کوئی وقف نہیں ہے۔ یہ علامت اگر کسی آیت کے اندر ہو تو وہاں ہرگز نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اور اگر کسی آیت کے خاتمہ پر ہو جیسے لا۔ تو نہ ٹھہرنا بہتر ہے۔ مگر ٹھہرنے سے بھی معنی میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔

(۱۴) ک۔ یہ علامت کذالک کا مخفف ہے۔ یعنی یہ علامت سابقہ علامت کی مانند ہے۔

(۱۵) ۰۰۰ اگر کوئی عبارت یا کلمہ ایسے تین نقطوں کے درمیان گھرا ہوا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلے تین نقطوں پر نہ ٹھہرنا (اور دوسروں پر ٹھہرنا) یا اس کے برعکس عمل کرنا (پہلے پر ٹھہرنا اور دوسرے پر نہ ٹھہرنا) جائز ہے۔ اس قسم کی عبارت کو معالقہ یا مراقبہ کہا جاتا ہے۔

(۱۶) مع۔ یہ علامت قرآن مجید کے بعض نسخوں میں موجود ہے۔ یہ معانقہ کا مخفف ہے۔ یہ علامت وہاں لکھی جاتی ہے جہاں کسی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہوں۔ ایک تفسیر کے مطابق ایک جگہ وقف ہو اور دوسری کے مطابق دوسری جگہ۔ بنابریں کسی جگہ بھی وقف کیا جا سکتا ہے۔

(۱۷) وقف النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ یہ وہاں لکھا جاتا ہے جہاں کسی راویت کے مطابق حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلاوت کرتے وقت وقف کیا ہو۔ واللہ العالم۔

اٹھارہواں مقدمہ

قرآن مجید کے متعلق بعض مفید معلومات کا بیان

(الف) قرآن مجید تیس پاروں پر مشتمل ہے۔ یہ تقسیم معنی ومفہوم کے لحاظ سے نہیں یہ بلکہ بچوں کو پڑھانے میں سہولت کے خیال کے ماتحت ہے۔ یہ تقسیم کب اور کس نے کی؟ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بظاہر یہ تقسیم عہد صحابہ کے بعد کی گئی ہے جبکہ علماء نے قرآن مجید پر اعراب لگائے علم رسم الخط مدون کیا۔ تو سہولت کی خاطر تیس دنوں کے موافق تیس پاروں پر تقسیم کر دیا (حقانی)

(ب) صحابہ اور تابعین کے عہد میں ان کا معمول تھا کہ وہ بالعموم ہفتہ میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ بنا بریں انہوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار متعین کر رکھی تھی جسے حزب یا منزل کہتے تھے چنانچہ پورے قرآن کی سات منزلیں ہیں۔

(ج) قرآن مجید کے مضامین ومطالب کے اعتبار سے اس کی تعیین رکوع سے کی گئی ہے یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہو وہاں حاشیہ پر رکوع کی علامت لکھ دی جاتی ہے۔ اس علامت کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قرآنی آیات کی ایسی درمیانی مقدار جو باآسانی ایک رکعت میں پڑھی جا سکے اور اس کے بعد رکوع کیا جا سکے۔ پورے قرآن مجید میں کل ۵۵۸ رکوع ہیں۔ اور اس کے اوپر نیچے اور اندر تین ہندسے ہوتے ہیں۔ بالائی ہندسہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ کا کونسا رکوع ہے۔ اور نیچے والے ہندسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس پارے کا کونسا رکوع ہے اور اندر والے عدد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس رکوع کی کتنی آیات ہیں۔

(د) ہر پارہ چار حصوں پر منقسم ہے پہلی چوتھائی پر الربع۔ نصف پر النصف۔ تین چوتھائی پر الثلاثہ حاشیہ پر لکھا جاتا ہے۔

(ز) قرآن مجید کی کل سورتیں ۱۱۴ ہیں جن میں سے سورہ الضحیٰ اور الم نشرح اور لایلف قریش اور الم ترکیف ہمارے نزدیک ایک ایک سورہ شمار ہوتی ہیں۔ ان سورتوں میں سے ۸۶ مکی اور ۲۸ مدنی ہیں

(ط) کوفی قراء کے نزدیک کل آیات قرآن کی تعداد ۶۲۳۲ ہے اور یہ تعداد مصر کے مصدقہ قرآن کی تعداد کے مطابق ہے۔ (تفسیر المتقین)۔ مگر تفسیر ماجدی میں بحوالہ تفسیر اتقان بقول اصح ان کی میزان ۶۲۱۶ ہے۔ (تفسیر ماجدی) اور بعض نے ۶۲۸۵ بیان کی ہے (ترجمہ فرمان) اور بعض نے کوفی قراء کے نزدیک ۶۲۳۶ بیان کی ہے اور اکثر کے نزدیک ۶۶۶۶ ہے (تفسیر حقانی)

(ف) قرآن مجید کے کل الفاظ بقول اصح ۷۷۹۳۴ اور کل حروف قرآنی کی میزان بقول اصح ۳۳۳۷۶۰ ہے (تفسیر ماجدی بحو اله تفسیر اتقان) مگر قرآن مترجم مولانا مقبول احمد میں کل تعدا د ۲۶۷۰۵۳ لکھی ہے۔واللہ العالم۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جس گروہ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جس جگہ وقف کرنا پایا گیا اس نے اس کو آیت شمار کیا اور جن کے نزدیک جگہ وقف کرنا ثابت نہ ہوا بلکہ وصل کرنا ثابت ہوا۔انہوں نے دونوں کو ایک آیت سمجھا (حقانی) (ح) قرآن مجید کے کل ضمات وفتحات اور کسرات وغیرہ کی تعداد یہ ہے۔ فتحات ۵۳۲۴۳۔کسرات ۳۹۵۸۲۔ضماً ت ۸۸۰۴۔ مدات ۱۷۷۱ انقاط ۱۰۵۶۸۴۔ تشد یدات ۱۲۵۳ (قرآن مجید مترجم مقبول)۔

انیسواں مقدمہ

قرآن سے متعلق معلومات

نمبر شمار	نام سورہ	تعداد رکوع	تعداد آیات	پارہ
1	الفاتحہ	1	7	1
2	البقرہ	40	286	1
3	آل عمران	20	200	3
4	النساء	24	177	4
5	المائدہ	21	120	6
6	الانعام	20	166	7
7	الاعراف	24	206	8
8	الانفال	10	75	9
9	التوبہ	16	129	10
10	یونس	11	109	11
11	ہود	10	123	11

12	111	12	یوسف	12
13	43	6	الرعد	13
13	52	7	ابراہیم	14
13	99	6	الحجر	15
14	128	16	النحل	16
15	111	12	بنی اسرائیل	17
15	110	12	الکہف	18
16	99	6	مریم	19
16	135	8	طٰہٰ	20
17	112	7	الانبیاء	21
17	78	10	الحج	22
18	118	6	المومنون	23
18	64	9	النور	24
18	77	6	الفرقان	25
18	227	11	الشعراء	26
18	93	7	النمل	27
20	89	9	القصص	28
20	69	7	العنکبوت	29
21	60	6	الروم	30
21	34	4	لقمان	31
21	30	3	السجدہ	32
21	73	9	الاحزاب	33
22	54	6	السبا	34

22		46	5	الفاطر	35
22		83	5	یس	36
23		182	5	والصافات	37
23		88	5	ص	38
23		75	8	الزمرد	39
24		85	9	المومن	40
24		54	6	حم السجدہ	41
24		53	5	الشوری	42
25		89	7	الزخرف	43
25		59	3	الدخان	44
25		37	4	الجاثیہ	45
26		35	4	الاحقاف	46
26		38	4	محمد	47
26		29	4	الفتح	48
26		18	3	الحجرات	49
27		45	3	ق	50
26		20	3	الزاریات	51
27		49	2	الطور	52
27		62	3	النجم	53
27		55	3	القمر	54
27		78	3	الرحمٰن	55
27		96	3	الواقعہ	56
27		29	4	الحدید	57

28	22	3	المجادلہ	58
28	14	3	الحشر	59
28	13	2	الممتحنہ	60
28	14	2	الصّف	61
28	11	2	الجمعہ	62
28	11	2	المنافقون	63
28	18	2	التغابن	64
28	12	2	الطاق	65
28	12	2	التحریم	66
29	30	2	الملک	67
29	52	2	القلم	68
29	52	2	الحاقہ	69
29	44	2	المعارج	70
29	29	2	نوح	71
29	28	2	الجن	72
29	20	2	المزمل	73
29	56	2	المدثر	74
29	4	2	القیامۃ	75
29	31	2	الدہر	76
29	50	2	المرسلات	77
30	40	2	النباء	78
30	46	2	النازعات	79
30	46	2	عبس	80

30	29	1	التکویر	81
30	19	1	الانفطار	82
30	36	1	التطفیف	83
30	25	1	الانشقاق	84
30	22	1	البروج	85
30	17	1	الطارق	86
30	19	1	الاعلیٰ	87
30	26	1	الغاشیہ	88
30	30	1	الفجر	89
30	20	1	البلد	90
30	15	1	الشّمس	91
30	21	1	اللیل	92
30	11	1	الضحیٰ	93
30	8	1	الانشراح	94
30	8	1	التین	95
30	19	1	العلق	96
30	5	1	القدر	97
30	8	1	البینہ	98
30	8	1	الزلزال	99
30	11	1	العادیات	100
30	11	1	القارعہ	101
30	8	1	التکاثر	102
30	3	1	العصر	103

104	الھمزہ	1	9	30
105	الفیل	1	5	30
106	القریش	1	4	30
107	الماعون	1	7	30
108	الکوثر	1	3	30
109	الکافرون	1	6	30
110	النصر	1	3	30
111	اللھب	1	5	30
112	الاخلاص	1	4	30
113	الفلق	1	5	30
114	الناس	1	6	30

ٹوٹل 114 'سورہ،کوع 558' آیات 6285' (قرآن مترجم فرمان علیؒ)

بیسواں مقدمہ

طریقہ آداب قرأت باعتبار مخارج

حروف	مخارج
ء۔ ہ	ابتدائے حلق سے
ع۔ ح	وسط حلق سے
غ۔ خ	انتہائے حلق سیَ
ق	زبان کی جڑ کوّے کے قریب جب نرم تالو سے لگے
ك	ابتدائے بیخ زبان اوپر کے تالو سے قاف کے مخرج سے ہٹ کر
ج۔ ش۔ ی	زبان کے درمیان اوراوپر کے تالو کے درمیان سے
ض	زبان کے کنارے اوردانتوں کی گرہ کے بیچ سے یعنی تمام کنارے زبان کے

لگاتے ہیں بائیں طرف کے اوپر داڑھوں کی جڑ سے یا دائیں طرف سے لیکن بائیں طرف آسان ہے۔

ل	زبان کی نوک کے قریب سے اور اوپر کے تالو سے
ن	زبان کے سرا اور اوپر کے دانتوں کے نیچے سے
ر	زبان کے سرا اور اوپر کے دانتوں کے نیچے سے بعد نون کے مخرج کے
ط۔و۔ت	زبان کے سرا اور اوپر کے دانتوں کی جڑ سے
ظ۔ز۔ث	زبان کی نوک اور اگلے دانتوں کے کنارے سے
س۔ص۔ذ	زبان کی نوک اور اگلے دانتوں کے کنارے سے
ف	نیچے کے ہونٹ کے اندر اور اوپر کے دانتوں کے کنارے سے
ب۔م۔و	ہونٹوں کے درمیان سے
ا	فضائے دہن سے یعنی دراصل ایک ہوا کی مانند ہے جو اندر سے نکلتی ہے

(قرآن مجید ترجمہ مقبول)

احقر محمد حسین نجفی عفی عنہ

سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا پاکستان

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ① الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ② مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ③
اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ④ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ⑤
صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ
وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪⑦

ترجمۃ الآیات

(شروع کرتا ہوں) اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے (۱) ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو سب جہانوں کا پرودگار ہے۔ (۲) جو (سب پر) بڑا مہربان (اور خاص بندوں پر) نہایت رحم کرنے والا ہے (۳) جزا سزا کے دن کا مالک (ومختار) ہے۔ (۴) (اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ (۵) ہمیں سیدھے راستے کی (اور اس پر چلنے کی) ہدایت کرتا رہ۔ (۶) راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام واحسان کیا نہ ان کا (راستہ) جن پر تیرا قہر وغضب نازل ہوا۔ اور نہ ان کا جو گمراہ ہیں۔

تشریح الالفاظ

(۱) الحمد حمد کے معنیٰ ہیں تعریف کرنا۔ (۲) رب العالمین رب کے معنیٰ ہیں مالک، سردار، اصلاح کنندہ اور تربیت کرنے والا (۳) یوم الدین دین کے معنیٰ ہیں حساب، جزا اور سزا ملت، مذہب اور حکم وغیرہ۔ (۴) ایاکَ نعبد عبادت کے معنیٰ عبادت کرنے اللہ کو ایک جاننے، ذلیل ہونے اور خضوع وخشوع کرنے کے ہیں۔ (۵) نستعین استعانت کے معنیٰ ہیں مدد طلب کرنا۔ (۶) اھدنا ہدایت کے معنیٰ ہیں رہنمائی کرنا۔ (۷) ولا الضالین ضلالت کے معنیٰ ہیں کج رہ ہونا راہ راست سے بھٹکنا اور گمراہ ہونا۔

تفسیر الآیات

اس سورہ مبارکہ کا زمانۂ نزول

مفسرین اسلام میں مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی بلکہ یہ پہلی مکمل سورہ ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سے پہلے بعض متفرق آیات نازل ہوتی تھیں جو اقراء، مزمل اور مدثر میں شامل ہیں اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ سورہ دوبار نازل ہوا۔ پہلے مکہ میں اور پھر مدینہ میں۔ اور انہوں نے سبع مثانی کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ کہ وہ دوبار نازل ہوا۔ (مجمع البیان وغیرہ)۔

سورہ الحمد کے مختلف نام

اخبار و آثار میں سورہ حمد کے مختلف نام وارد ہوئے ہیں جن میں سے مشہور نام یہ ہیں۔

(۱)۔ سورہ فاتحہ' کیونکہ قرآن مجید کا آغاز وافتتاح اسی سورہ سے ہوتا ہے۔ نیز نماز کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے۔

(۲)۔ سورہ حمد' کیونکہ اس میں خداوند عالم کی حمد وثناء کا تذکرہ ہے۔

(۳)۔ ام الکتاب' عربی زبان میں امّ کے معنی مقدم ونمایاں کے ہیں۔ یا کوئی ایسی اوپر والی چیز جس کے نیچے بہت سے توابع ہوں۔ اسی وجہ سے ماں کو ''امّ'' کہا جاتا ہے۔ بنا بریں سورہ حمد کو ام الکتاب کہنے کا مفہوم یہ ہوا کہ ایک ایسا سورہ جو تمام قرآنی مطالب ومعانی کا مرکز ومحور ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے تمام مطالب کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔

۱۔ ربوبیّت۔ ۲۔ عبودیّت۔

اور ان دونوں چیزوں کا تذکرہ بتمام وکمال سورہ حمد میں موجود ہے یا یوں سمجھئے کہ قرآن مجید کا اصلی مقصد دو باتیں ہیں۔

۱۔ اعتقاد۔ ۲۔ عمل۔

پھر اعتقاد کے دو شعبے ہیں مبدء اور معاد۔ اور عمل کے بھی دو شعبے ہیں۔ اچھے اوصاف سے اتصّاف اور برے اوصاف سے اجتناب اور سورہ حمد بالترتیب ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ ''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ''مبداء اوّل یعنی حضرت احدیّت کا اعتقاد ''مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ''میں معاد یعنی آخرت کا

اعتقا د ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ''میں اچھے اعمال سے اتصاف اور ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ''میں برے اعمال سے اجتناب۔

معلوم ہوتا ہے۔کہ سورہ حمد ایک متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح۔وہ اجمال ہے اور مجموعہ کلام مجید اس کی تفصیل۔(فصل الخطاب) بالفاظ دیگر دین وقرآن کا ماحصل چار چیزیں ہیں۔

ا۔خدائی صفات کا صحیح تصوّر۔

۲۔قانون مجازات کا اعتقاد یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہّ ہے اور قدرتی تاثیر۔اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں نیک عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور برے کا برائی۔

۳۔معاد کا یقین یعنی انسان کی زندگی اس دنیا میں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اسکے بعد بھی زندگی ہے اور جزاو سزا کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

۴۔فلاح وسعادت کی راہ اور اس کی پہچان۔اب غور کرو ان باتوں کا خلاصہ اس سورہ میں کس خوبی کیساتھ جمع کردیا گیا ہے۔(امّ القرآن)۔

(۴)السبع المثانی۔سبع اس لیے کہ اس کی آیتیں سات ہیں اور مثانی اس لیے کہ اسے ہر نماز فریضہ ونافلہ میں دو دو بار پڑھا جاتا ہے۔یا اس لیے کہ یہ سورہ دوبار نازل ہوا ہے۔

۵۔کافیہ کیونکہ یہ سورہ دوسرے سوروں سے کفایت کرتا ہے۔مگر کوئی دوسرا سورہ اس سے کفایت نہیں کرتا۔جیسا کہ عبادبن صامت حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ''امّ الکتاب عوض عن غیرھا ولیس غیرھا عوضاً عنھا''۔(مجمع البیان)۔

(۶)وافیہ کیونکہ یہ سورہ ہمیشہ مکمل طور پر نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

(۷)اساس ابن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرمایا ''ان لکلّ شئ اساساً و اساس القرآن الفاتحہ واساس الفاتحہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ''یعنی ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے اور قرآن کی بنیاد سورہ فاتحہ ہے اور فاتحہ کی بنیاد بسم اللہ ہے۔(مجمع البیان)۔

(۸)شفاء کیونکہ یہ سورہ تمام جسمانی وروحانی بیماریوں سے باعث شفاء ہے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا۔''ھی شفاء مّن کلّ داء الا السأم ''یعنی یہ سورہ موت کے سوا ہر بیماری

کا تریاق ہے۔ اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ''من لم یبرأہ الحمد لم یبر نہ شئی ''یعنی جسے سورہ حمد ٹھیک نہ کرے اسے کوئی بھی چیز ٹھیک نہیں کرسکتی۔ (مجمع البیان)۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اگر کسی مردہ پرستر بار سورہ حمد پڑھا جائے تو کچھ بعید نہیں کی وہ زندہ ہو جائے۔ (نور الثقلین)۔ فاضل حقانی رقمطراز ہیں۔ ''صحیح مسلم ونسائی وغیرہ کتابوں میں ہے کہ صحابہ سانپ' بچھو کے کاٹے پر اور مجنون اور اہل صرع (مرگی والے) پر سورہ فاتحہ پڑھا کرتے تھے اور اسی وقت مریض تندرست ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اب بھی نماز فجر کی سنتوں اور فرض کے بیچ میں اکتالیس بار ہر روز بسم اللہ کا میم الحمد کے لام سے ملا کر چالیس روز تک پڑھنا ہر کام کے لیے عمل مجرب ہے اور بیمار کو دم کر کے پلانا اور چینی یا شیشہ کے برتن پر مشک وگلاب اور زعفران سے لکھ کر چالیس روز تک بیمار کو پلانا مجرب ہے اور دردگردہ کیلئے ایک سانس سے گیارہ بار پڑھ کر دم کرنا مجرب ہے اور سریع الاثر ہے۔ مگر اعتقاد کامل اور ہمت جازم شرط ہے۔'' (تفسیر حقانی)۔ مفسر قرطبیؒ نے بسند صحیح یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ یا رسولؐ! میں جب سے اسلام لایا ہوں جسم میں درد رہتا ہے۔ فرمایا مقام درد پر ہاتھ رکھ کر تین بار بسم اللہ اور سات بار یہ دعا پڑھ۔ اعوذ بعزۃ اللہ و قدرتہ من شر ما اجدوا حذر۔

فاضل سیوطی نے اس کے پچیس نام ذکر کیے ہیں علامہ طبرسیؒ شیخ ابوالحسن جنازی کی کتاب القرأۃ کے سلسلہ سند سے ابی بن کعب سے اور وہ حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں فرمایا۔ ''ایّما مسلم قرء فا تحہ الکتاب اعطی من الا جر کانّما قرء ثلثی القرآن واعطی من الا جر کانّما تصد ق علی کل مو من و مو منۃ و فی روایۃ اخری قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کانّما قرء القرآن ''یعنی جو مسلمان شخص سورہ فاتحہ کی تلاوت کرے تو اسے دو ثلث قرآن پڑھنے اور دوسری روایت کے مطابق پورے ختم قرآن کے برابر ثواب ملے گا۔ اور اسے ہر مومن مرد اور ہر مومنہ عورت پر صدقہ کرنے کا اجر وثواب ملے گا۔ (مجمع البیان)۔

نیز ابی بن کعب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں فرمایا۔ ''والّذی نفسی بیدہ ما انزل اللہ فی التوراۃ ولا فی الانجیل ولا فی الزّبور و لا فی القرآن مثلھا و ھی امّ الکتاب و ھی السبع المثانی و ھی مقسومۃ بین اللہ و بین عبدہ و لعبدہ ما سئل''۔ یعنی مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ خداوند عالم نے توراۃ' انجیل' زبور اور قرآن میں سورہ حمد جیسی کوئی سورت نازل نہیں فرمائی۔ یہ ام الکتاب ہے۔ یہ سبع مثانی ہے اور یہ خدا اور بندہ کے درمیان

تقسیم شدہ ہے اور بندے کو وہ کچھ ملے گا' جس کا وہ سوال کرے گا (مجمع البیان)۔
اور جابر بن عبداللہ انصاری کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سورہ کو ''افضل سورۃ انزلھا اللہ فی کتابہ'' قرار دیا ہے۔

یہ سورہ اور بسم اللہ تعلیم المسئلہ ہے

مخفی نہ رہے کہ خداوند عالم نے اس سورہ میں اپنے بندوں کو تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ کسی کام کا آغاز کرنا ہو تو اس طرح کرو کہ میں رحمن ورحیم خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں اور جب مجھ سے کچھ طلب کرنا ہو تو اس طرح مجھ سے سوال کرو۔ گویا اس کے ترجمہ سے پہلے ''یوں کہو'' محذوف سمجھنا چاہیے کہ اے میرے بندو! یوں کہو۔ اس تشریح سے وہ ایراد خود بخود ختم ہو گیا جو بعض ملحدین کیا کرتے ہیں کہ اگر بسم اللہ اور سورہ حمد خدا کا کلام ہے تو خدا کس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ''کہ میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمن ورحیم ہے اور کس سے کہتا ہے۔ میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔ تو گویا خدا کسی اور خدا کے نام سے شروع کر رہا ہے اور وہ کسی اور خدا کی عبادت کرتا ہے''۔

حاصل مطلب یہ ہوا کہ خدا اپنے بندوں کو تعلیم دے رہا ہے کہ تم یوں کہا کرو۔ کہ ہم خدا کے نام سے شروع کرتے ہیں جو رحمن ورحیم ہے اور جب اپنے پروردگار سے کچھ طلب کرنا ہوتا پہلے اس کی حمد وثناء کرو پھر اپنی عبودیت اور بندگی کا اقرار کرو بعد ازاں اپنا مدعا بیان کرو۔ اس طرح جو دعا کی جائے گی امید ہے کہ وہ ضرور باب اجابت سے ٹکرائے گی۔ انشاءاللہ۔

اس سورہ کی آیات کی تعداد

واضح رہے کہ اس سورہ میں ایک رکوع' سات آیتیں' پچیس الفاظ اور ۱۲۳ حروف ہیں (ضیاء القرآن)۔

بسم اللہ کے فضائل

بِسۡمِ اللّٰہِ......الآیۃ۔

قدیم الایام سے لوگوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنے کام کا آغاز اپنے اکابر کے نام سے کیا کرتے تھے۔ کوئی خدا کے نام سے تو کوئی باپ' بیٹے اور روح القدس کے نام سے اور کوئی لات ومنات کے نام سے۔ تو

کوئی اور کسی مزعومہ خدا کے اوتار کے نام سے۔ اسلام جو کہ زمانہ جاھلیت کی رسوم ورواج کو مٹانے کے لیے آیا ہے اس نے حکم دیا کہ ہر کام کا آغاز ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' پڑھ کر خدا کے نام سے کیا جائے۔

کتب فریقین میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ فرمایا۔ ''کل امر ذی بال لم یبدء ببسم الله فھو ابتر '' یعنی ہر وہ کام جس کا آغاز بسم الله سے نہ کیا جائے وہ ناقص ہوتا ہے (الدر المنثور، المیزان)۔

جناب ابن عباس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا:

" اذاقال المعلّم للصبی قل بسم الله الر حمن الر حیم فقال الصبی بسم الله الرحمن الرحیم کتب الله برائةً للصبی و براً ئةً لابویه و برآئةً للمعلّم "

یعنی جب معلم کسی بچہ سے کہے کہو۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اور بچہ کہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو خداوند عالم بچہ کیلئے، اس کے والدین کے لیے اور معلّم کیلئے آتش دوزخ سے نجات کا پروانہ لکھ دیتا ہے۔ (مجمع البیان)

ابن مسعود سے منقول ہے۔ کہا جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم کے انیس داروغوں سے نجات عطا فرمائے وہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' پڑھے جس کے انیس حرف ہیں تا کہ خدائے تعالیٰ اس کے ہر ہر حرف کو ہر ہر داروغہ سے بچاؤ کی ڈھال بنائے۔ (مجمع البیان)

حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔

''انّ بسم الله الرحمن الر حیم اقرب الیٰ اسم الله الا عظیم من سو ا د العین الی بیاضھا''

یعنی جس قدر آنکھ کی سیاہی اس کی سفیدی کے قریب ہے اس سے زیادہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اسم اعظم سے قریب ہے۔ (عیون الاخبار)

بسم اللہ سے کام کی ابتداء کرنے کے فوائد

خدا کے نام سے کام کا آغاز کرنے کے بڑے فوائد ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(۱)۔ ایسا کرنے سے آدمی کئی برے کاموں سے بچ جاتا ہے کیونکہ جب اسے ہر کام کرنے کی ابتداء خدا کے نام سے کرنے کی عادت ہو جائے گی تو وہ برے کام کے آغاز پر یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ آیا وہ اس کام پر

خدا کا نام لے سکتا ہے یا نہ۔اس صورت میں اسے اپنے کام کی برائی کا احساس ہوگا۔

(۲)۔جب آدمی خدا کا نام لے کر کسی کام کو شروع کرے گا تو خدا اپنی تائید و تسدید اس کے شامل حال کرے گا۔اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا اور شر شیطان سے محفوظ رہے گا۔

(۳)۔اس سے بندہ کا اپنے آقا سے رابطۂ بندگی استوار ہوگا اور جب وہ ہر کام سے پہلے خدا کا نام لے گا تو اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہر ہر نعمت کا عطا کرنے والا خدا ہے' مسبّب الاسباب خدا ہے۔اس طرح خدا سے تجدید عہد ہو جائے گی اور اس پر یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ خدائے مہربان نے کائنات ارضی و سماوی کی ہر ہر چیز اس کی خدمت کے لیے لگا رکھی ہے اور یہ بات اسے سوچنے پر مجبور کرے گی کہ جب ہر چیز اس کے لیے ہے تو وہ کس کے لیے ہے؟ بقول سعدیؔ شیرازی

ابر و باد و خورشیدہ فلک درکار اند
تاتونانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار
شرط انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (سورہ بقرہ آیت۔۲۹)۔

(۴)۔اس سے انسان کی ذھنیت صحیح سمت اختیار کرے گی اور وہ غلط نقطہ سے اپنے کام کا آغاز کرنے سے بچ جائے گا۔اور بے برکتی اور شیطان کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ رہے گا اور وہ بڑی روحانی مسرت و شادمانی اور کیف ایمانی کے ساتھ کہے گا یا اللہ!

میری انتہائے نگا رش یہی ہے
تیرے نام سے ابتد اء کر رہا ہوں

سورہ برائت کے سوا بسم اللہ ہر سورہ کا جزء ہے

اس بات پر تو سب فرقہ ہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ بسم اللہ کلام الٰہی ہے اور اس پر احترام و اکرام کے تمام قرآنی احکام لاگو ہوتے ہیں۔اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ سورہ نحل میں جزء آیت ہے مگر اختلاف اس میں ہے کہ آیا وہ سورہ برائت کے سوا باقی تمام سورتوں کا جزء ہے یا یہ ہر دو سورتوں کے درمیان مستقل آیت ہے جو دو سورتوں کو الگ کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے؟ سوسرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کی احادیث صحیحہ بلکہ متواترہ کی بنا پر تمام علماء و فقہا امامیہ کا اس کے جزء سورہ ہونے پر اتفاق ہے اور مکہ و کوفہ کے قاریوں اور برادران اسلامی کے

ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی اور عبداللہ بن مبارک کا بھی یہی مذہب ہے۔(تفسیر حقانی جلد ا ص ۷ وغرائب القرآن جلد ا ص ۲۸)

باقی حضرات اسے جزءسورہ نہیں سمجھتے۔فاضل رازی نے اعتراف کیا ہے کہ چونکہ بنی امیہ آل محمد علیہم السلام کے آثار مٹانا چاہتے تھے اس لیے بسم اللہ کے پڑھنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی (تفسیر کبیر جلد ا ص ۱۶۰ طبع مصر)۔

علامہ علی نقی اعلی اللہ مقامہ لکھتے ہیں

''تواریخ واخبار سے ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ بآواز بلند پڑھنے کا طریقہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے عہد معاویہ تک برابر قائم رہا۔سب سے پہلے اس میں تغیرّ امیر شام معاویہ نے کیا اور مدینہ میں آکر جب پہلی دفعہ اس نے بغیر بسم اللہ کے اور رکوع وسجود کے لیے جھکتے وقت تکبیر کو ترک کرتے ہوئے نماز پڑھائی تو مہاجرین وانصار میں شور برپا ہو گیا کہ ''یا معاویة سرقت من الصّلوٰة این بسم الله الرحمن الرحیم والتکبیر عند الرکوع والسجود''۔یعنی اے معاویہ! تو نے نماز میں سے چوری کی۔بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کیا ہو گئی؟ اور رکوع وسجود کے وقت تکبیریں کدھر گئیں؟ مجبور ہو کر معاویہ کو بسم اللہ اور تکبیروں کے ساتھ دوبارہ نماز پڑھانا پڑی'' (فصل الخطاب)۔

علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں۔''کان معاویة شدید الشّکیمة ذا شوکة فلو لا انّ الجهر بالتسمیة کان مقرار عند کل الصحابة لم یجسر واعلی ذالك''۔یعنی معاویہ بڑے طمطراق اور شان وشوکت کے آدمی تھے تو اگر بسم اللہ کا بآواز بلند کہنا تمام صحابہ کے نزدیک متفق علیہ نہ ہوتا تو وہ اس کی جرات کبھی نہ کرتے (غرائب القرآن ج ا ص ۲۹)

مگر بعد کے مسلمانوں کی اکثریت کا عمل امیر شام ہی والے طریقہ پر ہو گیا۔جس کے برخلاف ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے نہ صرف بسم اللہ کو جزء قرآن بتایا بلکہ نمازیں (چاہے وہ اخفاتی ہوں) اسے بالجہر کہنے کی تاکید فرمائی (فصل الخطاب)۔

بسم اللہ کے فقہی احکام؟

فقہ جعفریہ کے مطابق نماز وغیرہ میں الحمدللہ اور دیگر سورتوں کے ساتھ (بجز سورہ برائت کے) بسم اللہ کا پڑھنا واجب ہے اور اگر نماز فریضہ یا نافلہ میں سورہ الحمد وغیرہ کے ساتھ بسم اللہ نہ پڑھی جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔''ولا صلوٰة الا بفاتحة الکتاب''۔

نماز جہری ہو یا اخفاتی اس کی پہلی دو رکعتوں میں بسم اللہ کا بالجہر پڑھنا مستحب ہے۔

بسم اللہ کی نحوی ترکیب

بسم اللہ تین اجزاء سے مرکب ہے باءٔ اسم اور اللہ۔ حرف باء عربی زبان میں متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تین معنی مراد لئے جاسکتے ہیں۔

ا۔ استعانت = یعنی کسی سے مدد حاصل کرنا۔ چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام سے یہی معنی مروی ہے فرمایا۔ استعین علی اموری کلھا باللہ۔ میں اپنے تمام امور میں اللہ سے مدد طلب کرتا ہوں۔ (کتاب التوحید)

۲۔ مصاحبت = یعنی کسی کا کسی کے ساتھ ہونا۔

۳۔ تبرک = یعنی کسی سے برکت حاصل کرنا۔

بنابریں نحوی ترکیب یوں ہوگی کہ باء حرف جار اور اسم مجرور اور مضاف اور اللہ مضاف الیہ اور موصوف اور الرحمن الرحیم یکے بعد دیگرے اس کی دو صفتیں۔ پس موصوف اپنی دونوں صفتوں سمیت اپنے مضاف سے ملکر حرف جار کا مجرور ہوا اور یہ حرف کسی مناسب مقام فعل جیسے ابدأ یا اقرأ وغیرہ سے متعلق ہوا اور سب جار و مجرور باہم ملکر جملہ فعلیہ ہوا۔ حرف باء کے مذکورہ بالا تین معنوں کے لحاظ سے بسم اللہ کے بالترتیب یہ معنی ہوں گے۔ ''اللہ کے نام کی مدد سے''۔ ''اللہ کے نام کے ساتھ''۔ اور تیسرا معنی اللہ کے نام کی برکت سے شروع کرتا ہوں۔ ''ابتداء کرتا ہوں'۔ پڑھتا ہوں''۔ اس طرح ارشاد قدرت۔ ''اقرأ باسم ربک'' اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ پڑھ۔ کی تعمیل بھی ہوجائے گی۔

استغاذہ کا بیان

ارشاد قدرت ہے ''فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ''(سورہ نحل آیت۔ ۹۸) (جب قرآن مجید کی تلاوت کرو تو مردود شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو)۔ اس لئے باتفاق تمام اہل اسلام نماز وغیرہ میں تلاوت قرآن سے پہلے ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم یا اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم کا پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔ اس کے بعد بسم اللہ پڑھی جائے گی۔ مخفی نہ رہے کہ یہ استعاذہ اور بسم اللہ دونوں اکٹھا پڑھنے کا استحباب صرف تلاوت قرآن کے ساتھ مختص ہے اسکے علاوہ دوسرے تمام کاموں کے آغاز میں صرف بسم اللہ کا پڑھنا کافی ہے۔

سورہ الحمد کی سات آیتیں کونسی ہیں؟

اس میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورہ الحمد کی کل آیتیں سات ہیں اب اگر بسم اللہ کو اس کی آیت قرار دیا جائے تو پھر تو ''صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ '' سے آخر تک ایک آیت شمار ہوگی۔ ورنہ بصورت دیگر ''صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ'' کو ایک آیت اور ''غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ'' کو علیحدہ آیت قرار دینا پڑے گا۔

سورہ الحمد کے مطالب کا خلاصہ

سورہ الحمد سات آیتوں پر مشتمل ہے۔ پہلی آیتوں میں خالق و مالک کی حمد و ثناء ہے' آخری آیتوں میں بندہ کی جانب سے دعا و استدعا ہے جو خود خداوند عالم نے بندہ کو تعلیم دی ہے۔ اور درمیانی آیت میں کچھ عبودیت و بندگی کا اقرار' کچھ مالک کی کبریائی اور کچھ اپنی عاجزی کا اظہار ہے۔ اور قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کے تمام مطالب و معانی کا خلاصہ سورہ فاتحہ میں مذکور ہے گویا سورہ فاتحہ ایک متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح یا وہ اجمال ہے اور پورا قرآن اس کی تفصیل۔ یا سورہ الحمد ایک دعا ہے بندہ کی طرف سے اور قرآن اس کا جواب ہے اللہ کی طرف سے بندہ دعا کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار! میری راہنمائی کر! جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ وہ ہدایت و راہنمائی ہے جس کی تو نے مجھ سے درخواست کی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اس اجمال و تفصیل کا ایک اور منظر

اس اجمال و تفصیل کا نمونہ یہ بھی ہے کہ سورہ فاتحہ میں وارد ہے۔

(اَلۡحَمۡدُ) قرآن مجید میں خداوند کریم کی تمجید' تحمید' تسبیح' تقدیس' تہلیل' تکبیر' شکر و رضا جس قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لفظ الحمد میں ان کا اجمالی خاکہ ہے۔

(لِلّٰہِ) قرآن مجید میں جس قدر صفات جلال و کمال ذات احدیت کیلئے بیان ہوئے ہیں لفظ للہ میں ان سب کا اجمال ہے۔

(رَبِّ) قرآن مجید میں جہاں جہاں ربوبیت کا تفصیلی ذکر ہے۔ لفظ رب میں وہ اجمالاً موجود ہے۔

(الۡعٰلَمِیۡنَ) قرآن مجید میں آسمانوں' زمینوں' جنوں' انسانوں' وحوش و طیور' انبیآء و اولیاء' نیکوں اور بروں بلکہ جمیع مصنوعات کی جس قدر تفصیل ہے وہ العالمین میں بند ہے۔

(الرَّحْمٰنِ) قرآن مجید میں جس قدر رزق' انعام احسان' اکرام وغیرہ مذکور ہیں لفظ الرحمٰن ان سب پر مشتمل ہے۔

(الرَّحِیْمِ) کلام مجید میں جہاں کہیں وسعت رحمت اور گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہے لفظ الرحیم سب کو شامل ہے۔

(مٰلِكِ) قرآن شریف میں جہاں بھی خدا کی قدرت' عظمت' اس کی بقاو سرمدیت اور اس کا بے مثل و بے مثال اور لاشریک ہونا مذکور ہے۔ یہ سب کچھ کلمہ مالک میں جمع ہے۔

(یَوْمِ الدِّیْنِ) پورے قرآن میں جس قدر قیامت' مواقف حساب' نعمت و جملہ احوال بہشت اور درکات جہنم' میزان و صراط وغیرہ کے تفصیلی تذکرے ہیں وہ لفظ ''یوم الدین'' میں سمائے ہوئے ہیں۔

(اِیَّاكَ نَعْبُدُ) جملہ عبادات جن کا قرآن میں ذکر ہے وہ ''ایاك نعبد'' کے اندر موجود ہیں۔

(وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) کلام اللہ میں ذکر استعانت' توکل اور طلب مدد جہاں بھی مذکور ہے۔ وہ ''ایاك نستعین'' میں مندرج ہے۔

(اِهْدِنَا) قرآن میں ہدایت' ارشاد' دعا و سوال اور تضرع وغیرہ کا جہاں ذکر ہے۔ ''اھدنا'' اس کا جامع ہے۔

(الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ) قرآن پاک میں جملہ حلال و حرام اور اوامر و نواہی اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔

(صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ) کتاب پاک میں جس قدر نیک لوگوں کے حالات' ان کے طریقے' ان کی سنتیں' سیرتیں' ان کا سب نجات اور بلندی درجات وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ان لفظوں میں اختصار کے ساتھ مندرج ہیں۔

(غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ) بنی اسرائیل کے حالات' قصص' ان کا کفران نعمت' تکذیب انبیاء و قتل انبیاء ان کا گناہوں پر اصرار اور پھر ان پر غضب خدا و عذاب کا نزول قرآن میں جتنی تفصیل سے مذکور ہے وہ غیر المغضوب علیہم میں سمایا ہوا ہے۔

(وَ لَا الضَّآلِّیْنَ) فرعونوں' جابر بادشاہوں' نصرانیوں اور مشرکوں اور گمراہوں کی پوری تفصیل کا یہ اجمالی عنوان ہے۔ پس اسی لئے سورہ فاتحہ کو تمام قرآنی سورتوں پر مقدم کیا گیا کیونکہ اجمال تفصیل سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ (انوار النجف بحوالہ خزینۃ الجواہر نہاوندی)۔

دین حق کا حاصل اور سورۂ فاتحہ!

دین حق کا ماحصل کیا ہے؟ اس موضوع پر جس قدر غور وفکر کیا جائے چار چیزوں کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔(۱) خدا اور اس کی صفات کا صحیح تصور (۲) قانون مجازات کی عالمگیریت کہ جس طرح دار دنیا میں ہر چیز کی ایک تاثیر ہوتی ہے۔ اسی طرح آخرت میں بھی انسانی اعمال کی ایک تاثیر ہے یعنی نیک عمل کی تاثیر اچھائی اور بُرے عمل کی بُرائی۔(۳) معاد اور جزاء وسزا کا معاملہ (۴) فلاح کونین اور سعادت دارین کی راہ اور اس کی معرفت جیسے امور کا اجمالی تذکرہ سورہ فاتحہ میں ہے اور تفصیل قرآن میں۔

سورہ فاتحہ کی تفسیر

اَلْحَمْدُ...الآیۃ۔

اسے اردو زبان کی تنگ دامنی ہی سمجھنا چاہیے کہ اس میں لفظ حمد کے کوئی ہم معنی لفظ موجود نہیں ہے جو اس کی تمام خصوصیات پر دلالت کرتا ہو۔ لے دے کے اردو میں لفظ تعریف ہی ملتا ہے۔ یہی نہیں حالانکہ یہ لفظ جہاں حمد کا ترجمہ ہے وہاں مدح کا ترجمہ بھی ہے۔ جبکہ مدح اور حمد میں ایک نمایاں فرق ہے کہ مدح ہمیشہ اختیاری افعال کی ہوتی بلکہ غیر اختیاری افعال کی بھی ہوتی ہے۔ جیسے ہیرے کی چمک، جگنو کی دمک، دریا کی روانی اور چاند کی درخشانی۔ مگر حمد اس ثناء جمیل کا نام ہے جو کسی ذات کے اچھے مگر اختیاری فعل پر کی جائے۔ الحمد پر جو الف لام ہے یہ استغراق کیلئے بھی ہوسکتا ہے اور جنس کیلئے بھی بنا برایں الحمدللہ کے معنی یہ ہوں گے ہر تعریف، ہر قسم کی تعریف اور سب حمد ثناء صرف اللہ کے لئے ہے۔ کیونکہ کائنات میں جو کچھ خوبی ہے یا کوئی کمال پایا جاتا ہے۔ وہ سب اسی سے ہے اور اسی کے ابر کرم کا فیض ہے اور ہر فعل خیر یا براہ راست اسی کا عمل ہے یا دوسرے کا ہے تو پھر اسی کی ترغیب اور اسی کی توفیق سے ہے۔ لہٰذا اس کی تعریف کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے۔

الغرض اس عالم رنگ وبو میں لاکھوں باکمال ہستیاں موجود ہیں اور کروڑوں حسین وجمیل چیزیں انسان کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اور اپنی تعریف وتوصیف پر مجبور کرتی ہیں لیکن اگر تھوڑا سا غور وفکر کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان چیزوں کے پس منظر میں صناع ازل کے دست قدرت کی صناعی ورعنائی کارفرما ہے۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کمال کسی قسم کا ہو اور کہیں بھی ہو۔ جمال کسی قسم کا ہو اور کسی شکل میں ہو اسی ذات والا صفات کے حسن خلقت اور حسن تدبیر کی کرشمہ سازی ہے اس لئے بظاہر تعریف کسی کی بھی کی جائے۔ اور جس رنگ میں کمی کی

جائے دراصل وہ تعریف اسی ذات ذوالجلال کی ہے جس کی قدرت واختیار کی یہ سب جلوہ نمائی ہے۔

لِلّٰہِ...الآیۃ۔

اللہ خدائے واحد و یکتا کا وہ اسم ذات ہے جو جامع جمیع صفات جمال وجلال اور کمال ہے۔ اور جس کا اطلاق کسی اور ذات پر نہیں ہوسکتا۔ اس کے سوا جتنے الفاظ واسماء اس کیلئے استعمال ہوتے ہیں وہ اسماء صفات ہیں جو اس کی کسی نہ کسی صفت اور اس کے کسی نہ کسی کمال کو ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے رحمن، رحیم، علیم حکیم اور خبیر وقدیر وغیرہ وغیرہ مگر اللہ کا لفظ ان تمام اسماء وصفات کا جامع ہے اور ان پر حاوی ہے۔ نزول قرآن سے پہلے بھی عربی زبان میں اللہ کا لفظ خدا کے لئے بطور اسم ذات مستعمل تھا جیسا کہ شعراء جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے لبید کا شعر ہے۔

الا کل شئی ما خلا اللہ باطل
و کل نعیم لا محالة زائل

قرآن نے بھی اسی لفظ کو بطور اسم ذات اختیار کیا ہے اور باقی تمام صفات کو اس کی طرح نسبت دی ہے۔ ''وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا'' (اعراف آیت ۱۸۰) اللہ کے لئے بڑے اچھے نام ہیں پس اسے انہی ناموں سے پکارو۔ ارشاد قدرت ہے۔ ''وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰه'' (لقمان آیت۔ ۲۵)۔ اگر تم ان (مشرکین عرب) سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقینا کہیں گے کہ اللہ نے۔ ہم اس اسم ذات کی اشتقاق کی لایعنی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ ''الہ'' سے مشتق ہے یا ''ولہ'' سے؟ پھر اس کے لفظی معنی کیا ہیں؟ مگر ہم صرف یہ کہنا چاہیں گے کہ بقول مولانا ابو الکلام آزاد ''سب سے قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل ''الہ'' ہے اور ''الہ'' کے معنی تحیر ودرماندگی کے ہیں پس خالق کائنات کے لئے یہ لفظ اس لئے اہم قرار پایا کہ اس کے بارے میں انسان جو کچھ جانتا ہے اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور وخوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی یہاں تک کہ وہ معلوم کرے گا کہ اس کی راہ کی ابتداء بھی عجز وحیرت ہی سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز وحیرت ہی ہے۔ (ترجمان القرآن)۔

اے بیرون از و ہم وقال و قیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من

رَبِّ...الآیۃ۔

''رب''اسم صفت ہے جس کے معنی ہیں تربیت کرنے والا۔اور تربیت نام ہے کسی چیز کو اس کی ذاتی و فطری صلاحت کے مطابق تدریجی طور پر اس کی نشوونما کرتے ہوئے اسے اس کے مناسب حال کمال تک پہنچانا۔ اللہ تعالیٰ خالق بھی ہے اور ''رب'' بھی۔ خالق کا لفظ بتاتا ہے کہ خلعت و جود عطا کرنے والا خدا ہے۔ اور ''رب'' کا لفظ بتاتا ہے کہ اس کی بقا کا ضامن اور اس پر نظر توجہ کرنے والا اور رفتہ رفتہ اسے اس کے مناسب حال حد کمال تک پہنچانے والا بھی وہی ہے۔ اور ہر ہر لحہ اس کے وجود کا فیض وجود چارسو جاری وساری ہے۔ شریعت مقدسہ کی اصطلاح میں اضافت کے بغیر علی الاطلاق یہ لفظ اللہ سبحانہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی اور کو''رب'' کہنا جائز نہیں ہے۔ اسی بنا پر ائمہ طاہرین علیہم السلام کی متعدد احادیث میں وارد ہے کہ ''لاتدعونا اربابا' خبردار! ہمیں کبھی رب نہ کہنا (مرآۃ الانوار،بحارالانوار وغیرہ)۔ کیونکہ ہر مخلوق خود تربیت کی محتاج ہے۔ لہٰذا جو مربوب ہو وہ کسی کا رب نہیں ہوسکتا۔''کما لا یخفی''۔

العالمین......الآیۃ۔

یہ''عالم'' کی جمع ہے اور ''عالم''اسم جمع ہے جن،انس، نفر، جیش اور قوم کی طرح۔ مگر اس کا کوئی واحد نہیں ہے اس کے معنی تو جمیع ماسوی اللہ کے ہیں۔ اس لحاظ سے تو پوری کائنات ایک ہی عالم ہے پھر اس کی جمع بنانے کا کیا مقصد؟ مگر عرفی طور پر ہر ہر جنس، ہر ہر نوع اور ہر ہر صنف اور مخلوقات کی ہر ہر قسم کو ایک عالم کہا جا سکتا ہے۔ اجناس جیسے عالم جمادات، عالم نباتات اور عالم حیوانات وغیرہ۔ انواع جیسے عالم ملائکہ، عالم جن اور عالم انسان وغیرہ۔ اصناف جیسے عالم عرب، عالم عجم وغیرہ۔ نیز ہر صدی کو اس کی ہر صنف کے ساتھ عالم کہا جا سکتا ہے۔ جیسے عالم قرن اول، عالم قرن دوم۔ وعلی ھذا القیاس،اقسام جیسے عالم مجردات، عالم جسمانیات، عالم علویات، عالم سفلیات، عالم لطیفات، عالم کثیفات، عالم مفردات اور عالم مرکبات وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان سب عوالم میں عالم انسان اشرف ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔

یہ عالم کس قدر ہیں؟

ایک وقت تھا کہ اس ربعِ مسکون کی سات اقلیموں کو عالمین کہا جاتا تھا۔ پھر انسان نے جب کچھ علمی آنکھ کھولی تو کہا کہ عالم چودہ ہیں (جنہیں چودہ طبق بھی کہا جاتا ہے) پھر جب کچھ علمی کروٹ لی۔ تو کہا کہ عالم چودہ ہزار ہیں پھر مزید علمی ترقی کی تو کہا کہ عالم اٹھارہ ہزار ہیں۔ جب پھر مزید شاہراہ ترقی پر قدم رکھا تو کہا کہ عالم چالیس ہزار ہیں (یہ قول جناب ابوسعید خدری کی طرف منسوب ہے) اور جناب مقاتل سے منقول ہے کہ عالم اسی

ہزار ہیں (قرطبی)۔

یہ سب قول تو آج سے صدیوں پہلے کے ہیں جبکہ فضا وخلا کی سیر اور اس کی پیمائش کے آلات اور اسباب ہنوز ایجاد نہیں ہوئے تھے مگر آج کے جدید سائنسدان تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا یہ سورج کروڑ در کروڑ سورجوں میں ایک ہے جن میں ہر ایک سورج کا دوسرے سورج سے فاصلہ روشنی کی رفتار سے کئی کئی سال کا ہے۔ اور ان سورجوں سے ایک دنیا ہمیں نظر آتی ہے جو رات کو ہمیں روشنی کے ایک بڑے بادل کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ سطح فلک کو طے کرتی ہوئی گزرتی ہے اور ہم اسے کہکشاں کہتے ہیں اور یہ عالم اپنے پورے احاطہ کے ساتھ کروڑ در کروڑ عالموں میں سے ایک ہے جن میں سے ہر ایک کا عرض وطول ہزار ہزار سال کی مسافت کے برابر ہے (رسالہ العلم والحیوۃ مطبوعہ دار المعارف مصر ۱۹۴۵ء جو ممتاز علماء فضلاء کی معاونت سے شائع ہوتا رہا ہے۔ بحوالہ تفسیر فصل الخطاب)۔

یہ بھی ۱۹۴۵ء کی بات ہے اور اب جبکہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو رہے ہیں اب تو دنیا اور بھی زیادہ ترقی کر گئی ہے اور اب تو ماہرین سائنس یہ کہہ رہے ہیں کہ قادر مطلق نے اس قدر غیر متناہی اور بڑے عوالم پیدا کئے ہیں کہ اگر ہمارے پورے نظام شمسی وقمری کو اپنے ثوابت وسیار اور سورج و چاند اور ستاروں سمیت ان کے مقابلہ میں رکھا جائے تو یوں محسوس ہوگا جیسے لق ودق صحراء میں ریت کا ایک ذرہ ہو۔ (سائنسی معلومات کی انسائیکلوپیڈیا)۔ جل الخالق

ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

سچ تو یہ ہے کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

اہل ایمان کی آنکھوں کو سائنس کی موجودہ ترقی اور روشنی دیکھ کر خیرہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہمارے پیشوایان دین اور ہادیان یقین اس وقت ہمیں ان چیزوں کی خبر دے گئے ہیں کہ جب اس سائنس اور اس ہیت کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

''ان اللہ خلق قبل آدم المعلوم عندنا مأۃ الف آدم و روی عن جعفر الصادق علیہ السلام مثلہ'

اللہ تعالیٰ نے ان آدم سے پہلے جو عام طور پر معلوم ہیں ایک لاکھ آدم پیدا کئے ہیں۔

اسی مضمون کی ایک روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔(محاضرۃ الاوائل ص ۲۳۹ طبع مصر)۔

اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا ''ان اللہ خلق الف الف عالم و الف الف آدم'' اللہ نے ہزار ہزار عالم اور ہزار ہزار آدم پیدا کئے ہیں (خصال شیخ صدوقؒ)

اس قسم کی متعدد احادث کتاب الھیئۃ والاسلام میں مذکور ہیں پہلے اس قسم کی احادیث کو متشابہات میں سے تصور کیا جاتا تھا۔ مگر موجودہ اکتشافات نے ان کے چہرہ حقیقت سے کچھ پردہ ہٹایا ہے۔''لعل اللہ یحدث بعد ذلك امراً'' یہ ہے اللہ کی شان ربوبیت جو سمك سے سماك تک اور ثریا سے ثریٰ تک تمام عالمین کی تربیت اور نشوونما کر رہا ہے۔''وما یعلم جنود ربك الا هو ویخلق ما لا تعلمون فتبارك اللہ احسن الخالقین۔''

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ...... الآیۃ۔

یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور دونوں رحمت سے مشتق ہیں اگرچہ دونوں صفت رحمت کی شدت و قوت کی ظاہر کرتے ہیں مگر ان دونوں ناموں میں دو فرق ہیں ایک یہ کہ یہ دونوں رحمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔

رحمن ورحیم کا باہمی فرق

عربی میں ''فعلان'' کا وزن عموماً ایسے صفات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں جیسے پیاسے کیلئے ''عطشان'' غضبناک کے لئے غضبان، سراسیمہ کیلئے حیران اور مست کیلئے سکران۔ لیکن ''فعیل'' کے وزن میں صفات قائمہ وثابتہ کا خاصہ ہے یعنی یہ عموماً ایسے صفات کیلئے بولا جاتا ہے جو جذبات وعوارض کی جگہ صفات قائمہ ہوتے ہیں جیسے کریم، کرم کرنے والا، عظیم بڑائی رکھنے والا، علیم علم رکھنے والا اور حکیم حکمت رکھنے والا۔ بنا بریں الرحمن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں بڑی رحمت ہے۔ اور الرحیم کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف یہ کہ رحمت ہے بلکہ جس سے ہر وقت رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور ہر آن و ہر لحہ تمام کائنات خلقت اس سے فیضیاب ہو رہی ہے (ام الکتاب)۔

دوسرا فرق جو احادیث سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ رحمن اس رحمت کو بتاتا ہے جو خالق کی طرف سے

بتقاضائے ربوبیت تمام کائنات سے متعلق ہے۔اور جس میں مومن وکافر کی تفریق نہیں ہے اس کے جلوے دنیا میں آنکھوں کے سامنے نمایاں ہیں اور رحیم اس رحمت کے اظہار کیلئے ہے جو توجہ وعنایت خاص طور پر بعض اشخاص سے متعلق ہوتی ہے اور یہ مومن سے مخصوص ہے۔جس کا نمایاں ہونا آخرت میں ہوگا۔اس کو امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان الفاظ میں بتایا ہے کہ ''الرحمن اسم خاص لصفة عامة والرحيم اسم عام لصفة خاصة ''۔(فصل الخطاب)

یعنی رحمن اسم خاص ہے جس کا اطلاق صرف اللہ کی ذات پر ہوتا ہے مگر عام صفت کے لئے ہے کہ اس کی صفت رحمانیہ تمام کائنات کو شامل ہے اور رحیم اسم عام ہے جس کا اطلاق مخلوق پر بھی ہوتا ہے۔مگر خاص صفت کیلئے ہے۔کیونکہ اس کی صفت رحیمیہ صرف اہل ایمان سے مخصوص ہے (تفسیر مجمع البیان ونور الثقلین)

یہی وجہ ہے کہ چونکہ لفظ الرحمن خدا کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے اسی لئے لفظ اللہ کی طرح اس کا تثنیہ نہیں آتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کی رحمت سے کائنات کی کوئی چیز خالی نہ ہو۔بخلاف لفظ ''الرحيم '' کے کہ چونکہ وہ مخلوق پر بھی بولا جاتا ہے اس لئے اس کا جمع وتثنیہ آتا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں خدا فرماتا ہے۔''بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ''(سورہ توبہ آیت۔۱۲۸)۔اور اہل ایمان کے متعلق فرماتا ہے۔''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ''(سورہ فتح آیت۔۲۹) وہ آپس میں بڑے رحمدل ہیں۔

مٰلِكِ...الآية۔

''مٰلِكِ'' کا مفہوم ''القادر على التصرف في ماله كيف شاء ''وہ ذات جو اپنی ملکیت میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور اسے کوئی روک ٹوک نہ سکے۔بعض قاریوں نے اسے ''ملك'' پڑھا ہے۔مگر پہلی قرائت اکثر واشہر ہے مالک ملک سے ماخوذ ہے ارشاد قدرت ہے ''هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ ''(سورہ حشر آیت۔۲۳) مالک بھی ہے اور ساری کائنات کا حقیقی ملک وبادشاہ بھی ہے۔

الدِّيْنِ...الآية۔

''الدِّيْنِ'' کے معنی ہیں مکافات اور جزاء۔حماسی کہتا ہے:

ولم يبق سوى العدوان دناهم كمادانوا۔

اور حدیث میں وارد ہے۔''كما تدين تدان ''اور چونکہ جزاء وسزا کی تعیین اعمال کی مناسبت سے ہوتی ہے اور اسی کا نام حساب ہے اس لئے بعض احادیث میں یوم الدین کی تفسیر یوم الحساب کے ساتھ مر

وہی ہے (تفسیر قمی)۔

روز جزا کی ملکیت کی خصوصیت

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح روز جزا خدا کی ہر چیز پر ملکیت ہوگی اسی طرح آج بھی تمام کائنات پر اسی کی حاکمیت وملکیت ہے۔ پھر روز جزاء کی یہ خصوصیت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ دنیا میں بھی حقیقی ملکیت تو خدا کی ہی ہے۔ مگر اس نے اپنے فضل وکرم سے عارضی اور ناقص قسم کی ملکیت انسان کو بھی عطا کر رکھی ہے اس لئے یہاں آدمی مال و دولت کا مالک ہے زمین و جائیدا کا مالک ہے اور کوٹھی وکار وغیرہ کا مالک ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ عارضی ہے اور حقیقی مالک خدا ہی ہے۔ ''لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۲۸۴)

در حقیقت مالک ہر شی خدا است
ایں اما نت چند روزہ پیش ما است

مگر انسان اس عارضی ملکیت کے غرور میں بدمست ہو کر خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ اور کہہ دیتا ہے کہ ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' (نازعات آیت۔ ۲۴) تو خداوند عالم انسان کو متوجہ کر رہا ہے۔ کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے کہ جب اس کی یہ عارضی ملکیت بھی بالکل ختم ہو جائے گی اور وہ کسی چیز کا عارضی مالک بھی نہیں رہے گا۔

ع

سب ٹھاٹھ دھرا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

''يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا'' (انفطار آیت۔ ۱۹) اس دن کوئی نفس کسی نفس کے لئے کسی چیز کا مالک نہ ہوگا۔ ''وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ'' (سورہ انفطار آیت۔ ۱۹) اس دن سب معاملہ خدا کے قبضہ قدرت میں ہوگا۔ جب ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر جائے گی تو آواز قدرت آئے گی۔ ''لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ'' (مومن آیت۔ ۱۶) آج کس کی بادشاہی ہے؟ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں اس وقت کوئی جواب دینے والا نہ ہوگا۔ لہٰذا خود خدا جواب دے گا۔ ''لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ'' (مومن ...... ۱۶) آج اس واحد و یکتا خدا کی حکومت ہے جو ہر چیز پر غالب ہے مگر اس پر کوئی غالب نہیں ہے۔ (نہج البلاغہ)

اِيَّاكَ نَعْبُدُ...الآية۔

عربی میں عبادت کے معنی ہیں کسی ہستی کے سامنے انتہائی درجہ کی عاجزی و تذلیل کا اظہار کرنا۔ اور

اصطلاح شریعت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ عجز و نیاز کی وہ آخری حد جو کوئی عبد اپنے معبود کے سامنے ادا کرے اور اسکی ادائیگی کے وقت قصد قربت بھی کرے، ظاہر ہے کہ یہ تذلیل و عاجزی کا اظہار اسی وقت عبادت کہلائے گا جب اس ہستی کو معبود یا اس کا اوتار سمجھ کر کیا گیا۔ جیسا کہ مشرکین عرب اپنے اصنام کو الٰہ جانتے تھے۔ یا ہندوستان کے مشرک لوگ بتوں کو خدا کا اوتار مانتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی ہستی کو خدا یا خدا کا اوتار نہ مانا جائے بلکہ کسی بزرگ اور محترم ہستی کا صرف کھڑے ہو کر یا قدرے جھک کر احترام کیا جائے تو یہ اس کی عبادت نہ کہلائے گی۔ بلکہ اس کی تعظیم کہلائے گی۔

ہاں البتہ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ شریعت مقدسہ اسلامیہ میں غیر اللہ کے لئے تعظیمی سجدہ حرام ہے۔ (جس کی وضاحت کسی مناسب مقام پر کی جائے گی انشاء اللہ)۔ لہٰذا اس سے اجتناب واجب ہے اسی طرح کسی بزرگ کے سامنے اس قدر بھی نہیں جھکنا چاہیے کہ رکوع سے مشابہت لازم آئے۔ ''لان الرکوع والسجود لا یکون الا للّٰہ'' کیونکہ رکوع و سجود صرف ذات خداوندی کے ساتھ مخصوص ہیں (مفاتیح الجنان)۔ خدائے حکیم نے ایاک مفعول کو مقدم کر کے تخصیص پیدا کر دی۔ ''لان تقدیم ما حقہ التاخیر یفید التخصیص'' اور بندہ کی زبان سے کہلوایا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ یعنی کسی اور کی نہیں کرتے کیونکہ شرک فی العبادۃ ناقابل معافی جرم ہے۔ '' اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ '' (نساء آیت۔۴۸)

چند فقہی مسائل

اس آیت وافی ہدایہ سے ثابت ہوا کہ خداوند عالم کے سوا اور کسی بھی ہستی کی عبادت و پرستش جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔ اب اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ پرستش رکوع و سجود کی صورت میں ہو یا اس کے نام کی منت ماننے کی صورت میں۔ اور خواہ اس کے گھر اور مزار کا خانہ کعبہ کی طرح طواف کرنے کے طریقہ پر ہو یا کسی کا نام لے کر جانور ذبح کرنے کے سلیقہ پر۔ الغرض خداوند عالم کے علاوہ کسی بھی ہستی کی عظمت اور اس سے عقیدت کی بنا پر اس کے سامنے اس انتہائی درجہ کی عاجزی اور تذلل کا اظہار کرنا جو خدا سے مخصوص ہے۔ ہرگز جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے اور صریح شرک ہے۔ اور اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں جو حلف وفاداری اٹھایا گیا ہے اس کے خلاف ہے۔

وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ...الآیۃ۔

''نَسْتَعِیْنُ'' استعانت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی سے مدد طلب کرنا ہے یہاں بھی

''ایاك''مفعول مقدم ہے جوحصر وتخصیص کا فائدہ دیتا ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

استعانت کے احکام

اب قابل غور بات یہ ہے کہ اس مدد سے کونسی مدد مراد ہے جو اللہ سے مخصوص ہے؟ یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ خالق حکیم نے انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا ہے۔اس لئے کوئی بھی آدمی اپنے تمام امور معاش و معاوتن تنہا انجام نہیں دے سکتا بلکہ وہ اپنے اکثر و بیشتر امور میں بنی نوع انسان کے تعاون کا محتاج ہے اور مادی اسباب کے تحت ہر انسان دوسرے انسان سے مدد لیتا ہے اسی بناء مالک حکم نے مسلمانوں کو امداد باہمی کا بار بار حکم دیا ہے اور وعدہ ووعید' ثواب وعقاب کے ذریعہ اس کی تحریص وترغیب دلائی ہے ارشاد فرمایا ہے۔''**وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى**''(سورہ مائدہ آیت۔۲) نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کو خیر الناس قرار دیا ہے جو انفع الناس کا مصداق ہے۔اور جو شخص نفع کی بجائے لوگوں کو نقصان پہنچائے اسے حضرت امیر علیہ السلام نے بدترین خلائق ٹھہرایا ہے۔اور اسلام کے مزاج شناس شعراء نے یہاں تک کہا ہے اور بالکل بجا کہا ہے کہ

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

بنا بریں دین حق کی نصرت کرنا' جہاد فی سبیل اللہ کر کے نبی و امام کی کمر مضبوط کرنا' اسلام کی نشر و اشاعت کرنا' گمراہ کو راہ راست دکھانا' مظلوم کو ظالم کے پنجۂ ظلم وجور سے آزاد کرانا' فقراء ومساکین کی امداد واعانت کرنا' بھوکے کو روٹی کھلانا' پیاسے کو پانی پلانا' محتاج کو قرضہ دینا اور گرفتار بلا کی اخلاقی و مادی مدد کرنا' حکیم کی طرف رجوع کرنا اور اس سے علاج کرانا وہ کار ہائے خیر اور بلند اخلاقی امور ہیں جن کی شرع انور میں تاکید مزید کی گئی ہے لہٰذا اس قسم کی باہمی مدد ونصرت کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے لہٰذا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس مدد سے جو اللہ سے مخصوص ہے مراد ان امور میں مدد طلب کرنا ہے جو انسانی قوت وطاقت اور قدرت و دسترس سے بالاتر ہیں۔جیسے پیدا کرنا' مارنا' جلانا' روزی دینا' بیمار کو شفاء دینا اور مضطر کی دعا و پکار سن کر اس کی مصیبت کو دور کرنا وغیرہ وغیرہ۔جن کو''**امور تکوینیه**''کہا جاتا ہے۔جن کی انجام دہی اور وہ بھی بطور وظیفہ اور ڈیوٹی کسی بھی مخلوق کو کسی بھی طرح سپرد نہیں کی۔نہ بطور تفویض' نہ بلحاظ توکیل اور نہ بطریق آلات وغیرہ۔''**بل له الخلق والامر تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ**''(ملک آیت۔۱)۔

لہٰذا کسی نبی ورسول یا ولی وامام سے ان امور میں یہ سمجھ کر مدد مانگنا کہ خدائے قدیر نے اپنی قدرت

سے ان امور کی انجام دہی ان سے وابستہ کی ہے۔ اور اس کو مختار مطلق سمجھ کر یا باذن اللہ لوگوں کی حاجت روائی کرنے والا سمجھ کر حرام ہے قرآن اسے شرک جلی قرار دیتا ہے۔ اور اسے مشرکوں کا عمل وطریقہ قرار دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں عام لوگوں کو انبیاء وائمہ علیہم السلام کے معجزات اور صالحین امت کے کرامات سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے مقدس ہاتھوں پر اس قسم کے خارق عادت امور کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس سے وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ خدا نے ان کاموں کی انجام دہی ان بزرگوں کے سپرد کر دی ہے۔ اور وہ یہ نہیں جانتے یا بھول جاتے ہیں کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خدائے قادر وقدیر ہوتا ہے جو لوگوں پر ان ذوات مقدسہ کی حقانیت وصداقت ظاہر کرنے کیلئے ان کے ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے۔ ان حضرات کا خدا کی بارگاہ میں دعا واستدعا کرنے کے سوا اس کام کے وجود میں لانے میں کوئی دخل واختیار نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآنی آیات اور معصومینؑ کی روایات سے یہ حقائق واضح وآشکار ہیں۔ جو حضرات ان امور کی مزید تفصیلات معلوم کرنا چاہیں وہ ہماری کتاب اصول الشریعہ فی عقائد الشیعہ کی طرف رجوع فرمائیں۔ نیز اس تفسیر میں بھی مناسب مقامات پر اس امر کی مزید وضاحت کی جائے گی۔ انشاءاللہ۔

وسیلہ اختیار کرنے کا حکم اور اس کا طریقہ کار

ہاں البتہ قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق ان امور تکوینیہ میں انبیاء وائمہ علیہم السلام کی ذوات مقدسہ سے توسل حاصل کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن ہے۔ ارشاد قدرت ہے۔ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ'' (سورہ مائدہ آیت۔ ۳۵)۔ یعنی اے ایمان والو! تقویٰ الٰہی اختیار کرو اور اس کی بارگاہ میں (رسائی حاصل کرنے کیلئے) وسیلہ تلاش کرو نیز فرمایا ہے ''وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا'' (سورہ نساء آیت۔ ۶۴) یعنی جب ان لوگوں نے گناہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اگر اس وقت وہ تمہارے پاس آجاتے اور خدا سے مغفرت طلب کرتے اور رسول (تو) بھی ان کیلئے مغفرت طلب کرتا (ان کی بخشش کی سفارش کرتا) تو یقیناً خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ اب اس توسل کا احسن واولی طریقہ کار تو یہ ہے کہ خطاب خدا سے کیا جائے اور ان حضرات کی ذوات مقدسہ یا ان کی عزت وعظمت اور ان کی عصمت وطہارت کا واسطہ دے کر یہ امور خدا سے طلب کئے جائیں۔

ہاں البتہ ان محبوبان کبریا کی بارگاہ میں بھی یہ درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ حقیقی حلال مشکلات کی بارگاہ میں سفارش کر کے ہماری حاجت برآری کرا دیں اور ہماری مشکل کی کشود کاری کرا دیں۔ اس طرح بطور وسیلہ

ان کی مدد برحق ہے اور یہ ایاک نستعین کی حلف وفاداری کے منافی نہیں ہے۔مگر ہمارے نزدیک احوطہ اور اولی بلکہ متعین یہی ہے۔کہ پہلے طریقہ پر ہی عمل کیا جائے انشاءاللہ،

ایاك نعبد و ایاك نستعین میں جمع کے صیغے استعمال کرنے کی حکمتیں

اس آیت میں جمع کے جو صیغے استعمال کے گئے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔اس میں کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں مثلاً

(۱)۔اس طرح اجتماعیت کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ نماز با جماعت نماز فرادیٰ سے،بدر جہاافضل ہے اور اگر آدمی فرادیٰ بھی پڑھے تو جمع کے صیغے استعمال کرے تا کہ ظاہر ہو کہ وہ بارگاہ خدا میں جو عرض معروض کر رہا ہے وہ اس میں اکیلا نہیں ہے بلکہ وہ تمام بنی نوع انسان کا نمائندہ ہے جو کہہ رہا ہے وہ سب کی طرف سے کہہ رہا ہے اور جو خدا سے مانگ رہا ہے وہ سب کیلئے مانگ رہا ہے۔

(۲)۔نماز افضل ترین عبادت ہے اور اس کی قبولیت کیلئے حضور قلب اور خلوص نیت شرط اولین ہے اور یہ چیز ہر آدمی کو میسر نہیں ہے۔اس لئے اس نے اپنی عبادت کو دوسروں کی عبادت میں شامل کر دیا تا کہ ان کی برکت سے اس کی نماز بھی قبول ہو جائے۔

(۳)۔یہ عبادت کیوں واجب ہے؟اس لئے کہ معبود کائنات کا خالق و مالک اور پروردگار ہے اور ظاہر ہے کہ اس محسن اعظم کا یہ احسان کسی خاص بندہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ رب العالمین ہے لہٰذا سب پر اس کی عبادت واجب ہے اسلئے بندہ کہتا ہے کہ ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

۴۔اگر واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا کہ ''ایاک اعبد'' میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں تو اس سے انانیت کا اظہار ہوتا کہ میں عبادت کرتا ہوں۔(یعنی اور کوئی نہیں کرتا) تو اس انانیت اور غرور کو ختم کرنے کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔تا کہ واضح ہو جائے کہ صرف میں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں اور بھی خدا کی عبادت کرنے والے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ...الآية۔

اس سورہ مبارکہ میں اب تک بندوں نے جو کچھ خدا کی حمد وثنا کی ہے اور اس کی مالکیت و کبریائی اور اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار کیا ہے اس کے نتیجہ میں خدا سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا واستدعا کر رہا ہے۔

ہدایت کے معنی اور اس کے اقسام

لغت میں ہدایت کے معنی راہنمائی کرنے کے ہیں۔اب یہ راہنمائی دوطرح متصور ہوسکتی ہے ایک یہ کہ راہ روکوصرف راستہ دکھا دیا جائے کہ یہ راستہ منزل مقصود کی طرف جاتا ہے اب اس پر چلنا یا نہ چلنا راہرو کا کام ہے۔دوسرے یہ کہ راہرو کو منزل مقصود تک پہنچا دیا جائے۔ جہاں تک پہلے معنی کے اعتبار سے ہدایت یعنی راہنمائی کرنے کا تعلق ہے تو وہ خداوند عالم انبیاء ومرسلین اور پیشوایان دین کے ذریعہ سے اسے ہر مسلم وکافر ہر مومن و بے ایمان اور ہر نیک وبد کو کرتا ہے۔چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔''اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا'' ہم نے ہر انسان کو راہ راست کی راہ نمائی کر دی ہے۔خواہ وہ ایمان لائے یا کفر اختیار کرے(سورہ دھر آیت۔۳)۔''وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ''ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں(سورہ بلد آیت۔۱۰)ایک اور جگہ فرماتا ہے۔''وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ''ہم نے قوم ثمود کو راہ راست کی راہنمائی کی تھی مگر اس نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی کو اختیار کیا(سورہ حم سجدہ آیت۔۱۷) بلکہ تکوینی طور پر کائنات کی ہر چیز حتیٰ کہ جمادات' نباتات اور حیوانات کو بھی راہ راست کی ہدایت کرتا ہے چنانچہ خود فرماتا ہے''اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى' خداوہ ہے جس نے پہلے ہر شے کو خلقت عطا کی اور پھر اسے مناسب حال ہدایت کی(سورہ طٰہٰ آیت۔۵۰) پھر سورہ اعلیٰ میں فرماتا ہے۔''سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَ الَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ''اپنے اس پروردگار کی تسبیح کرو۔جس نے کائنات کو پیدا فرمایا یعنی ٹھیک بنایا اور جس نے مقدر کیا اور راہنمائی کی(سورہ علق آیت۔۱،۲،۳)۔

خدا کی اسی فطری وتکوینی ہدایت وراہنمائی کا ثمرہ ہے کہ کائنات کی تمام اجناس انواع اور اصناف اپنا مجوزہ فرض بڑی خوش اسلوبی سے اپنے مقصد خلقت کو ادا کر رہی ہیں۔اور جہاں تک دوسرے معنی کے لحاظ سے ہدایت کا تعلق ہے۔تو خداوند عالم اپنے لطف وکرم سے اس کا افاضہ اپنے ان خاص بندوں پر توفیق کی صورت میں کرتا ہے جو خلوص نیت اور طلب صادق کے ساتھ خدا سے ہدایت وراہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔چنانچہ خود ارشاد فرماتا ہے''وَ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ''جو لوگ ہمارے بارے میں جدوجہد اور کاوش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت وراہنمائی کر دیتے ہیں۔(سورہ عنکبوت آیت۔۶۹)اس کیلئے ان کے لئے ہدایات الٰہیہ کا قبول کرنا اوران پر عمل درآمد کرنا بالکل آسان ہوجاتا ہے۔ایک اور جگہ فرماتا ہے۔''وَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ''جو لوگ مزید ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں ہم ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتے ہیں(سورہ محمدؐ آیت۔۱۷) یہی وہ مقام ہے جہاں بڑے سے بڑا نیکوکار و پرہیزگار بھی

ہدایت میں اضافہ وزیادتی کا طلب گار دکھائی دیتا ہے۔ ہدایت کے اسی مخصوص معنی کے لحاظ سے خدا بار بار فرماتا ہے کہ وہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔ وہ فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا ورنہ پہلے معنی کے اعتبار سے تو وہ سب کو ہدایت کرتا ہے۔ لہٰذا ان آیات میں کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں ہے اسی طرح ایک مقام پر خدا فرماتا ہے ''وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ''اے رسول! آپ صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتے ہیں (سورہ شوریٰ آیت۔ ۵۲) اور دوسرے مقام پر فرماتا ہے ''اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ'' آپ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں کر سکتے (سورہ قصص آیت۔ ۵٦)۔ یہاں بھی ان آتیوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے آپ ہدایت کرتے ہیں یہ ہدایت کے پہلے معنی کے اعتبار سے ہے۔ آپ ہدایت نہیں کر سکتے۔ یہ ہدایت کے دوسرے معنی کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ ہدایت کے اسباب وآلات پیدا کرنا اور اپنی توفیق شامل حال کرنا خدا کا کام ہے نبی ورسول کا کام نہیں ہے۔

ایک سوال اوراس کا جواب

کہا جاتا ہے کہ خدا کا وعدہ ہے ''اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ '' تم مجھ سے دعا کرو (مانگو) میں اسے قبول کروں گا (سورہ مومن آیت۔ ٦۰)۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کم از کم تمام نماز گزار خدا سے صراط مستقیم کی دعا مانگتے ہیں۔ مگر پھر بھی اکثریت گمراہی کا شکار ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ قواعد وضوابط اور مخصوص شرائط ہوتے ہیں جن کا لحاظ کئے بغیر گوہر مقصود حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح قبولیت دعا کے بھی کچھ شرائط ہیں ان کا تفصیلی بیان تو اس آیت کی تفسیر میں کیا جائیگا۔ انشاءاللہ

سر دست طلب ہدایت کے متعلق بقدر ضرورت اس قدر وضاحت کی جاتی ہے کہ ایک اور مقام پر خدائے علیم وحکیم نے صراحت فرمائی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو وہ ہدایت کے دوسرے معنی کے اعتبار سے ہدایت کی نعمت سے نوازتا ہے فرماتا ہے۔ ''الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ''۔ اے رسول میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دو۔ جو ہر کہنے والے کی بات کو توجہ سے سنتے ہیں اور پھر اس کی احسن وعمدہ بات کی پیروی کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کو خدا ہدایت کرتا ہے ایسے ہی لوگ عقلمند کہلانے کے حقدار ہیں (سورہ زمر آیت۔ ۱۸) اس ارشاد خداوندی سے واضح ہوگیا کہ وہ صرف ان لوگوں کو ہدایت عطا فرماتا ہے جو اپنے دل ودماغ اور کانوں پر اندھی تقلید اور تعصب کے پہرے نہیں بٹھاتے۔ بلکہ ان کو کھلا رکھتے ہیں اور وہ آزاد ہوتے ہیں اس لئے وہ ہر کہنے والے کی بات کو کان لگا کر اور پوری توجہ سے سنتے ہیں۔ وہ قائل کی ذات کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کی بات کو دیکھتے ہیں۔ پھر ہر سنی سنائی

بات کو آنکھیں بند کر کے قبول بھی نہیں کرتے بلکہ اسے میزان عقل پر تولتے ہیں۔ پھر اچھی بات کو لے لیتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں اور غلط بات کو پھینک دیتے ہیں اور جو بدقسمت لوگ اپنی آنکھوں پر اپنے آباء واجداد اور اسلاف کی اندھی تقلید کی پٹی باندھ لیتے ہیں اور کانوں پر ملکی وملی تعصب کے پہرے بٹھا دیتے ہیں اور عقل و خرد کو معطل کر کے اسے غور وفکر کرنے کی زحمت نہیں دیتے تو خدا بھی ایسے مورکھوں کو ہدایت کی نعمت سے نہیں نوازتا۔ ''اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (اعراف آیت۔ ۱۷۹)''۔

صراط مستقیم کیا ہے؟

صراط کے معنی ہیں راہ اور مستقیم کے معنی ہیں سیدھا۔ اس طرح صراط مستقیم کا مطلب ہوا ایسی راہ جس میں کوئی پیچ وخم نہ ہو۔

(۱) یہ صراط مستقیم حقیقی دین اسلام کی راہ ہے ارشاد قدرت ہے ''اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ''۔ خدا کے دین کو قائم رکھو (سورہ شوریٰ آیت۔ ۱۳)۔ اور اس میں جدا جدا نہ ہو جاؤ نیز فرماتا ہے ''قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا'' (سورہ انعام آیت۔ ۱۶۱)

(۲) خدا کی صحیح عبادت کرنا صراط مستقیم ہے ارشاد قدرت ہے۔ ''اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ'' (جناب عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے) اللہ میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ بس اسی کی عبادت کرو۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ (سورہ آلِ عمران آیت۔ ۵۱) ''وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ''۔ (سورہ یٰس آیت۔ ۶۱) میری عبادت کرو یہی صراط مستقیم ہے۔

(۳) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت صحیحہ کی اتباع کرنا صراط مستقیم ہے ارشاد قدرت ہے ''وَ اتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ''۔ میری پیروی کرو یہی صراط مستقیم ہے (سورہ مومنون آیت۔ ۶۱)

(۴) انبیاء ومرسلین، ائمہ طاہرین، صدیقین، شہداء، عباد اللہ الصالحین۔ یعنی خدا کے انعام یافتہ کامل انسانوں کی راہ مستقیم ہے۔

(۵) صراط مستقیم وہ سیدھی راہ ہے جس میں افراط وتفریط نہیں ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے۔

''فا ما الطرين المستقيم فى الد نيا فهو ما قصر من الغلو وارتفع عن التقصير واستقام ولم يعدل الى الباطل'' دنیوی صراط مستقیم وہ ہے جو غلو کے نیچے اور تقصیر کے اوپر ہو اور حد اعتدال پر قائم ہو جس کا باطل کی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ (تفسیر نور الثقلین)

(۶) امام برحق کی معرفت اور اس کی پیروی کرنا صراط مستقیم ہے چنانچہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے فرمایا:

صراط دو ہیں۔ ایک دنیا میں اور دوسری آخرت میں۔ دنیوی صراط مستقیم امام مفترض الطاعۃ کی معرفت اور اس کی اتباع اور اخروی صراط جہنم کا پل ہے جو شخص دار دنیا میں امام برحق کی معرفت اور پیروی کی سعادت سے محروم ہوگا۔ وہ آخرت میں پل صراط سے نہیں گزر سکے گا بلکہ پھسل کر آتش دوزخ میں گر جائیگا۔ (ایضاً)

صراط مستقیم کی مزید وضاحت

خداوند عالم نے صراط مستقیم کی مزید وضاحت کی خاطر ایجابی و سلبی پہلو سے بندہ کی زبان سے کہلوایا ہے ایجابی پہلو اس طرح کہ

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ... الآیة۔

راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام و احسان کیا ہے۔

یہ انعام یافتہ انسان کون ہیں؟

جن کو منعم حقیقی نے اپنی مخصوص نعمتوں سے نوازا ہے؟ ان کی نشاندہی خداوند عالم نے ایک دوسرے مقام پر فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ "وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ " (سورہ نساء آیت۔ ۶۹) اور جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی وہ ان لوگوں کے ہمراہ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ (وہ کون ہیں؟) انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ" (سورہ انعام آیت۔ ۹۰)۔ اس آیت مبارکہ میں چار جماعتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور انہیں خدائی انعام یافتہ قرار دیا گیا ہے۔

(۱) انبیاء: جو انسانی نوع کی ہدایت کیلئے خدا کی طرف سے آئے۔

(۲) صدیقین: جو اس طرح سچائی کے سانچے میں ڈھلے کہ سچائی کے سوا ان کے دل و دماغ میں اور کوئی بات اتر ہی نہ سکے۔

(۳) شہداء: شہید کے معنی گواہ کے بھی ہیں اور شہید راہ خدا کے بھی یعنی ایسے کامل انسان جو اپنے قول و فعل اور اپنی جان سپاری و جاں نثاری سے حق و صداقت کا پرچم بلند کرنے والے ہوں۔ (۴) صالحین۔ جو نیک

عملی کی راہ میں استقامت رکھتے ہوں اور برائی کی راہوں سے کنارہ کش ہو کر حق صداقت کے علمبردار رہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا قید تقدم و تاخر تمام کائنات کے انبیاء و صدیقین شہداء و صالحین کا راستہ ہی (حقیقی اسلام) صراط مستقیم ہے۔

مخفی نہ رہے کہ یہ چاروں اقسام محمد و آل محمد علیہم السلام کے مقدس خاندان میں مل جاتے ہیں۔ ''وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ''۔ (سورہ انعام آیت۔ ۱۵۳)۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ...الآیۃ۔

نہ ان کا راستہ جن پر تیرا قہر و غضب نازل ہوا۔ اور نہ ان کا جو گمراہ ہیں۔ یہ ہے صراط مستقیم کے ایجابی مثبت پہلو کا ضد مخالف سلبی پہلو۔ یہ انعام یافتہ گروہ کی ضد گروہ ہے۔ ظاہر ہے کہ قانون قدرت اور آئین فطرت یہ ہے کہ راست باز انسانوں کے حصہ میں انعام آتا ہے اور نافرمانوں کے حصہ میں غضب۔

یہ مغضوب علیھم اور ضالین کون ہیں؟

جن لوگوں نے راہ راست کی نعمت پائی مگر وہ اس سے منحرف ہو گئے اور غلط راہ اور شقاوت کی راہ اختیار کی۔ وہ **مغضوب علیھم** ہیں **ضالین** وہ ہیں جو راہ راست پا ہی نہ سکے اور اِدھر اُدھر بھٹک گئے۔ گویا پہلا گروہ جاحد (منکر) ہے اور دوسرا جاہل کہ پہلے گروہ نے حقیقت پا کر اس سے روگردانی کی اور دوسرا گروہ حقیقت کو پا ہی نہ سکا۔ اب رہی یہ بات کہ ان کے مصداق کون ہیں فریقین کے بہت سے اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ **المغضوب علیھم** سے مراد یہودی اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں (تفسیر طبری، درمنثور، عیاشی و صافی وغیرہ) چنانچہ یہود کے بارے میں قرآن میں وارد ہے۔ ''مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِیْرَ''۔ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اور ان پر غضبناک ہوا ہے اور ان میں بعض کو (مسخ کر کے) بندر اور خنزیر بنا دیا (سورہ مائدہ آیت۔ ۶۰)۔ ''فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ''۔ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا، اور ان کے لئے زبردست عذاب ہے (سورہ نحل آیت۔ ۱۰۶) نیز ان کے بارے میں وارد ہے ''قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ'' (سورہ اعراف آیت۔ ۷۱) بعض آیات میں بعض گناہان کبیرہ جیسے قتل مومن کے بارے میں غضب وارد ہوا ہے۔ ''وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ'' (سورہ نساء

آیت۔۹۳)۔اور نصاریٰ کے متعلق قرآن میں ہے۔" وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ "۔ان لوگوں کی پیروی نہ کرو جو خود گمراہ ہو گئے اور دوسرے بہتوں کو گمراہ کیا۔اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے (سورہ مائدہ آیت۔۷۷) بلکہ یہ ضلالت و گمراہی مطلق کفر کو بھی شامل ہے ارشاد ہوتا ہے" وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا "(سورہ نساء آیت۔۱۳۶) جو شخص خدا اور فرشتوں اس کی کتابوں اس کے رسولوں اور روز آخرت کا انکار کرے وہ بڑا گمراہ ہو گیا۔ بلکہ ضلالت کا اطلاق قرآن میں مطلق عصیان و گناہ پر بھی کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے" وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا "۔ جو شخص خدا اور رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلم کھلا گمراہ ہے (سورہ احزاب آیت۔۳۶)۔

مگر اس تفسیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ **مغضوب علیہم** صرف یہودی اور **ضالین** صرف نصاریٰ ہیں۔ بلکہ ان کا تذکرہ صرف بطور مثال کیا گیا ہے اور نیز اس لئے کہ وہ ان کے فرد کامل ہیں لہٰذا بعید نہیں ہے کہ ان کے ساتھ وہ تمام لوگ شامل ہوں جو ان کے برے صفات و عادات میں ان کے ساتھ شریک ہیں چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے کہ

"**المغضوب علیهم النصاب و الضالین اهل الشکوك والذین لا یعرفون الامام**"۔

یعنی **مغضوب علیہم** سے مراد دشمنان اہل بیت علیہم السلام ہیں اور **ضالین** سے مراد وہ لوگ ہیں جو شکوک و شبہات میں گرفتار ہیں اور معرفت امام برحق سے محروم ہیں۔ (تفسیر قمی وعیاشی)

اور ابھی اوپر ان آیات کی نشان دہی کر دی گئی ہے جن میں یہود و نصاری کے علاوہ بعض لوگوں کیلئے غضب اور ضلات کا لفظ وارد ہوا ہے۔

ایک ایراد اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک سوال کیا جاتا ہے کہ جب سورہ فاتحہ آیت ہدایت یافتہ بھی پڑھتے ہیں اور ہدایت سے منحرف بھی بلکہ نبیؐ بھی پڑھتے تھے اور امام علیہ السلام بھی۔ تو کیا ہر جگہ **اھدنا الصراط المستقیم** کے یہی معنی ہوں گے کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا؟ اس سوال کا جواب واضح ہے کہ ہر جگہ ایک معنی مراد نہیں ہوتے اور نہ ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ اضافت و نسبت کے بدلنے سے الفاظ کے معانی بھی بدل جاتے ہیں۔ بنابریں جیسا دعا مانگنے والا ہوگا اس کی حیثیت کے مطابق ہدایت کے معنی کئے جائیں گے۔ یعنی اگر کوئی غیر

ہدایت یافتہ پڑھے گا تو اس کا مطلب ہوگا ہمیں سیدھی راہ دکھا اور اگر ہدایت یافتہ پڑھے گا تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہمیں شر شیطان اور نفس امارہ کے شر سے محفوظ رکھ کر اس راہ پر ثابت قدم فرما اور اگر نبیؐ وامامؑ یا کوئی اور ثابت قدم پڑھے گا تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہماری ہدایت ومعرفت کے درجات میں مزید اضافہ فرما اور ہمیں اس کا اعلیٰ ترین مقام مرحمت فرما کیونکہ ہدایت ومعرفت کے مراتب ومدارج کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔''وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (بقرہ آیت۔۲۱۳)''۔۔۔''وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (بقرہ آیت۔۱۰۵)''۔

سورہ فاتحہ کی تعلیمی روح

اچھا اب چند لمحوں کیلئے سورہ فاتحہ کے مطالب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالوں اور دیکھو اس کی سات آیتوں کے اندر مذہبی عقائد وتصور کی جو روح مضمر ہے وہ کس طرح کی ذہنیت پیدا کرتی ہے سورہ فاتحہ ایک دعا ہے، فرض کرو، ایک انسان کے دل وزبان سے شب وروز یہی دعا نکلتی رہتی ہے۔ اس صورت میں اس کے فکر واعتقاد کا کیا حال ہوگا؟

وہ خدا کی حمد وثناء میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں، جو نسلوں، قوموں اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے بلکہ رب العالمین کی حمد میں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے اور اس لیئے تمام نوع انسانی کیلئے یکساں طور پر پروردگاری ورحمت رکھتا ہے پھر وہ اسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے لیکن تم اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت وعدالت ہی کی صفتیں اسے یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کیلئے سرتاسر رحمت وعدالت کی نمود ہے اور جو کچھ بھی ا کی نسبت جانتا ہے۔ رحمت وعدالت کے سوا کچھ نہیں ہے پھر وہ اپنا سر نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی ونیازش کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کردیتا ہے اور اس طرح دنیا کی ساری دقوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرمائیوں سے بے پرواہ ہوجاتا ہے اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر جھک نہیں سکتا۔ اب کسی سے وہ ہراساں نہیں ہوسکتا۔ اب کسی کے آگے اس کا دست طلب دراز نہیں ہوسکتا۔

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک دعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے لیکن کونسی سیدھی راہ؟ کسی حاص نسل کی سیدھی راہ، کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی حلقے کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی راہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد

اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔اس طرح ہو محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے، وہ بھی نوع انسانی کی عالم گیر برائی ہے نسل قوم ،ملک ، یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ وامتیاز کی کوئی پر چھائیں اس کے دل ودماغ پر نہیں نظر آتیں۔

غور کرو، مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن وعواطف کیلئے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے۔جس انسان کا دل ودماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا، کہ وہ کسی قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی خدا کے عالم گیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی، دوسرے یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا وہ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا اور دعوت قرآن کی اصل روح یہی ہے۔(ام الکتاب از مولانا آزاد مرحوم)

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ

اس سورہ کی وجہ تسمیہ

بقرہ کے معنی گائے کے ہیں اگرچہ یہ سورہ قرآن مجید کا بزرگ ترین سورہ ہے اور اس سورہ شریفہ میں بڑے طویل و عریض مضامین از قسم عقائد و اعمال وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔ جن کا اجمالی تذکرہ بعد ازیں کیا جارہا ہے۔ مگر چونکہ بنی اسرائیل کی گائے کے تذکرہ کو اس سلسلہ میں سوال و جواب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس لئے پورے سورہ کو اس نام سے معنون کردیا گیا۔

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا

''یہ سورہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد نازل ہوا۔ یعنی اس کا اکثر حصہ ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں نازل ہوا اور کچھ تھوڑا سا حصہ جیسے سود سے متعلقہ آیات آپ کی مدنی زندگی کے آخری آیام میں نازل ہوا اور سورہ کا خاتمہ جن آیات پر ہوا وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھیں۔ مگر مضمون کی مناسبت سے ان کو اسی سورہ میں ضم کردیا گیا۔'' (تفہیم القرآن)

''کہیں کسی مکی آیت کا شامل ہوجانا سورہ کے مدنی ہونے کے منافی نہیں ہے۔'' (تفسیر ماجدی)

اس سورہ کے مضامین کا خلاصہ

۱۔ قرآن لاریب کتاب ہے۔

۲۔ اس سے صرف متقی لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ ایمان بالغیب کی اہمیت۔

۴۔ کور باطن منافقین کی روش و رفتار کا تذکرہ۔

۵۔ متقیوں کی صفات پنجگانہ کا بیان۔

۶۔ آدم۔ حوا☆ کی خلقت اور جناب آدم علیہ السلام کی خلافت کا اعلان۔

۷۔ آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر برتری اور وجہ افضلیت۔

۸۔ ہاروت و ماروت کا قصہ۔

۹۔جناب خلیل۔خدا کی امامت کا اعلان۔

۱۰۔بنی اسرائیل کا تذکرہ اوران کے عبرت آموز حالات وواقعات۔۱۱۔من وسلوی کا نزول۔

۱۲۔فرعون اورفرعونیوں کے عبرت ناک انجام کا تذکرہ۔

۱۳۔بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی۔

۱۴۔مخصوص گائے کے ذبح کرنے اوراس کے ذریعہ مقتول کے زندہ کرنے کا تذکرہ۔

۱۵۔خدا کی عبادت کرنے نماز وزکوٰۃ وغیر کی پابندی کرنے اور والدین اوریتیموں مسکینوں سے نیک سلوک کرنے کا حکم۔

۱۶۔جناب موسیٰ۔اوران کے بعد کئی نبیوں کے آنے کا ذکر۔

۱۷۔جناب عیسیٰ علیہ السلام کی روح القدس سے تائید کرنے کا واقعہ۔

۱۸۔یہودیوں کی بے ہودہ حرکتوں پران کی سرزنش۔

۱۹۔جناب ابراہیم علیہ السلام خلیل اور جناب اسماعیل علیہ السلام اوران کی نسل سے سرکار خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کا ذکر خیر۔

۲۰۔بناء کعبہ۔

۲۱۔ملت ابراہیمی کا تذکرہ جناب ابراہیمعلیہ السلام ویعقوب علیہ السلام کا اپنی اولا دکوحقیقی مسلمان بن کرمرنے کی وصیت

۔۲۲۔تحویل کعبہ کا بیان۔

۲۳۔نماز وروزہ کے ذریعہ خدا سے مدد مانگنا۔

۲۴۔شہداء کی حیات جاوید کا بیان۔

۲۵۔حج وعمرہ اوران کے احکام۔

۲۶۔پاک وپاکیزہ چیزوں کے استعمال کرنے کا حکم اورنجس وناپاک چیز کے استعمال کی ممانعت۔

۲۷۔ہر چیز سے بڑھ کر خدا سے محبت کرنے کا تذکرہ۔

۲۸۔صرف رسمی چیزوں کی ادائیگی پرسعادت کی بنیادنہیں ہے بلکہ خدا وانبیاء علیہم السلام آخرت وغیرہ جیسی چیزوں پراعتقادرکھنےاورنماز وصدقہ وخیرات کی پابندی کرنے پر ہے۔

۲۹۔شراب اورجوّا کی حرمت اوراس کا فلسفہ۔

۳۰۔اعتکاف کا تذکرہ۔

۳۱۔جہاد فی سبیل اللہ اور اس کے قواعد واحکام۔

۳۲۔شراب اور جوا کی حرمت اور اس کا فلسفہ۔

۳۳۔امور خانہ داری اور مسائل نسواں از قسم حیض ونفاس وغیرہ امور کا بیان۔

۳۴۔طلاق اور اس کے بائن ورجعی کے اقسام اور عدت ورجوع وغیرہ کے احکام۔

۳۵۔رضاعت اور اس کی مدت اور زوجہ کے نان ونفقہ اور عدت وفات کا بیان۔

۳۶۔کچھ لوگوں کے گھروں سے نکلنے اور بحکم خدا مر جانے اور دوبارہ زندہ ہونے کا بیان۔

۳۷۔طالوت وجالوت کا قصہ۔

۳۸۔تابوت سکینہ کا تذکرہ۔

۳۹۔اطمینان قلب کی خاطر خدا کا جناب خلیل علیہ السلام کیلئے چار پرندوں کا زندہ کرنا۔

۴۰۔جناب عزیرؑ کا سو سال تک مرا رہنا اور پھر بحکم خدا زندہ ہونا۔

۴۱۔خدا کا حی وقیوم اور مدبر کائنات ہونا۔

۴۲۔سود کی حرمت کا تذکرہ۔

۴۳۔خدا کے خالق کون ومکان اور مالک زمین وآسمان ہونے کا مقدس تذکرہ۔

الی غیر ذلك من المطالب الجلیلة و المضامین الجمیلة مفسر قمی فرماتے ہیں روی ان فی البقرة خمس مأة حکم۔مروی ہے کہ سورہ بقرہ میں پانچ سو احکام موجود ہیں (تفسیر قمی)۔

اسلوب خطاب وانداز بیان

ہجرت سے پہلے جب تک حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں تشریف فرما تھے تو اکثر و بیشتر آپ کے مخاطب مشرکین عرب تھے جو بت پرست تھے اور وحی، نبوت، آخرت اور اس کے حساب وکتاب کا کوئی تصور ان کے دل ودماغ میں نہیں تھا اس لئے اسلام کی آواز ان کیلئے بالکل اجنبی تھی۔اس لئے جو سورے مکہ میں نازل ہوئے ان کا انداز بیان اصول دین کی تبلیغ اور عقائد باطلہ کی رد۔ان کو برے کاموں سے روکنا اور ان کی اخلاقی تربیت کر کے ان کی اصلاح کرنے تک محدود تھا۔مگر ہجرت کے بعد گو مدینہ کے اصل رہائشی تو انصار تھے۔ مگر وہاں چونکہ زیادہ تر زمام اقتدار یہودیوں کے ہاتھ میں تھی جو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے نبوت، قیامت اور جزا وسزا کے قائل تھے اور انصار کے ذہنوں میں بھی ان کے زیر اثر ان چیزوں کا دھندلا سا تصور موجود تھا مگر

یہودی قومی برتری کے پندار میں اس قدر بدمست تھے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے علاوہ کسی اور خاندان کو بھی نبوت مل سکتی ہے اور عملی لحاظ سے دنیا کی ایسی بدترین قوم تھے کہ دنیا کے ادنی سے مفاد کی خاطر تورات کی آیتوں کا انکار کرنے یا ان میں تغیر وتبدل کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔

لہٰذا ہجرت کے بعد ایک طرف ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا اور ان کی روش ورفتار میں انقلاب لانا مدنظر تھا اور دوسری طرف جو مختلف قبائل اسلام قبول کر چکے تھے کچھ ان کے جمع ہونے اور کچھ انصار کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے گویا مدینہ میں ایک مختصر سی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی اس لئے ضرورت تھی کہ اب اسلام کے بنیادی عقائد واصول کے ساتھ ساتھ اصول معاشرت وتمدن اور اجتماعی معلاملات اور ملکی سیاست کے بارے میں بھی رہنما اصول اور ہدایت کی تلقین وتعلیم دی جائے۔ چنانچہ اب یہ سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ جو اس سورہ میں جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ اور بہترین انداز میں قانون مکافات' عدل اجتماعی اور اسلامی سیاست کے جامع آئین وقوانین بیان کئے گئے ہیں۔

علاوہ بریں چونکہ مکہ میں مسلمان انتہائی کمزور وبے بس اور بے جان ومال تھے اور متفرق تھے اس لئے وہ کفار کے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنے رہتے تھے اور اپنی اپنی جگہ چپ چاپ ظلم سہنے کے سوا ان کے لئے اور کوئی چارہ کار نہ تھا مگر ہجرت کے بعد یہ صورت حال یکسر بدل گئی کفار کو مسلمانوں کی اجتماعی آسودگی اور قدرے خوشحالی اور روز بروز کی ترقی ایک آنکھ نہ بھائی اس لئے انہوں نے اپنی اجتماعی طاغوتی قوت سے اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا حتمی ارادہ کر لیا۔ ادھر خدائے علیم وحکیم نے بھی اہل اسلام کو کفار کا مسلح مقابلہ کرنے کی اجازت دے دی۔

اس لئے اس سورہ میں جہاد کے احکام بھی بیان کئے گئے ہیں اور مسلمانوں کو اس بات کی فہمائش کی گئی ہے کہ وہ مخالف فریق کی ظاہری شان وشوکت اور اس کی مادی قوت وطاقت سے مرعوب نہ ہوں۔ اپنی قوت کو مجتمع کریں۔ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اپنے آپ کو منظم کریں اور خداوند عالم کی ذات والا صفات پر توکل اور بھروسہ کریں۔ جب اس کی نصرت اور تائید غیبی ان کے شامل حال ہوگی تو باذن اللہ یہی مسلمان ہی مظفر ومنصور ہوں گے اور کفار ومشرکین اپنے مذموم ارادوں میں ناکام ونامراد ہوں گے کیونکہ انجام کار ناکامی کفر کا اور آخری فتح وفیروزی اسلام کا مقدر ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

''فَاِنَّ حِزْبَ اللہِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ'' (سورہ مائدہ آیت۔۵۶)، ''كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللہِ'' (سورہ بقرہ آیت۔۲۴۹)۔

یہ عنوان ختم کرنے سے پہلے یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے چلیں کہ اگر چہ نفاق کے کچھ ابتدائی آثار تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کے اواخر میں نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے مگر مدینہ پہنچنے کے بعد تو کچھ با قاعدہ منافق لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں گھس آئے تھے تا کہ فتنہ وفساد برپا کر کے اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کر سکیں۔ وہ مسلمانوں سے بھی ربط رکھتے اور ان کے مخالفین سے بھی۔ تا کہ دونوں سے فوائد حاصل کریں۔ اس لئے خداوند عالم نے اس سورہ میں جا بجا ان کے حال خسرآن مآل کی طرف اشارے فرمائے ہیں۔ اور بعد ازاں دوسری سوروں میں ان کی سرگرمیوں کی کیفیت کے مطابق ان کی سرزنش کی ہے اور مسلمانوں کو ان کے فتنہ وشر سے بچنے کیلئے راہنمائی فرمائی ہے۔

سورہ بقرہ کے فضائل

۱۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

''لکل شئی سنا ماً و سنام القرآن سورۃ البقرۃ''۔ ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن کی چوٹی سورہ بقرہ ہے۔ سو جو شخص دن کے وقت اپنے گھر میں اسکی تلاوت کرے گا تو تین دن تک شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا اور جو رات کے وقت اپنے گھر میں اس کی تلاوت کرے گا تو تین رات تک شیطان اس گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ (مجمع البیان)۔

۲۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے فرمایا۔ جو شخص سورہ بقرہ کی ابتدائی چار آیات اور اس کے بعد آیت الکرسی اور اس کے بعد والی دو آیات (ھم فیھا خالدون تک) اور بعد ازاں سور بقرہ کی آخری تین آیات پڑھے گا تو وہ خود، اس کے اہل وعیال اور اس کا مال ومنال ان حالات سے محفوظ رہیں گے جن کو وہ ناپسند کرتا ہے اور شیطان اس سے دور رہے گا اور وہ قرآن نہیں بھولے گا۔ (ثواب الاعمال)۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا: جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کی تلاوت کرے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئیگا کہ یہ دونوں سورتیں اس پر سایہ فگن ہوں گی (ثواب الاعمال)۔

اس سورہ کے آیات، رکوعات اور الفاظ وحروف کی تعداد:

اس سورہ مبارکہ کی آیات دوسو چھیاسی (۲۸۶)، رکوع چالیس (۴۰)، الفاظ چھ ہزار اکیس (۶۰۲۱) اور حرف پچیس ہزار پانچ سو ہیں۔ (تفسیر حقانی)۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الٓمّٓ ۝١ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ
فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ
الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝٣ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝٤

ترجمۃ الآیات

(شروع کرتا ہوں) اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔(۱) الف۔لام۔ میم (۲) یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس (کے کلام اللہ ہونے) میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ (یہ) ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کیلئے (۳) جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور پورے اہتمام سے نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ (میری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔(۴) اور جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے (سابقہ انبیاء پر) نازل کیا گیا۔اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔(۵)

تشریح الالفاظ

(۱) لاریب ریب کے معنی ہیں شک، تہمت اور بے اعتقادی (۲) یؤمنون ایمان کا صلہ اگر باء ہو جیسے آمن بہ تو اس کے معنی ہیں تصدیق کرنا اور اس پر ایمان لانا اور اگر اس کا صلہ لام ہو جیسے آمن لہٗ تو اس کے معنی ہیں کسی کی اطاعت اور تابعداری کرنا۔

تفسیر الآیات

یہ حروف مقطعات قرآن مجید کے انتیس سوروں کی ابتداء میں موجود ہیں کہیں ایک حرفی ہیں جیسے ص،

کہیں وہ حرفی جیسے طٰهٰ کسی جگہ تین حرفی جیسے الٓمٓ، کسی مقام پر چار حرفی جیسے الٓمٓصٓ اور کہیں پانچ حرفی جیسے کٓهٰيٰعٓصٓ جو ترتیب وار کچھ یوں ہیں۔ الم، المر، المص، آلر، آلر، آلر، آلر، آلر، آلر، کٓهٰيٰعٓصٓ، طٰهٰ، طسٓمٓ، طسٓ، طسٓمٓ، ط آلمٓ۔ آلمٓ۔ آلمٓ۔ آلمٓ۔ یٰسٓ۔ صٓ۔ آلمٓ۔ آلمٓ۔ آلمٓ۔ آلمٓ۔ عٓسٓقٓ حٰمٓ۔ حٰمٓ۔ حٰمٓ حٰمٓ۔ قٓ۔ نٓ۔

ان مقطعات میں سے اگر مکررات کو قلمزد کر دیا جائے تو ان کی تعداد چودہ ہوتی ہے جو یہ ہیں۔ الٓمٓ۔ المر، الٓمٓصٓ، الر، کٓهٰيٰعٓصٓ طٰهٰ۔ طسٓمٓ۔ طسٓ۔ یٰسٓ، صٓ۔ حٰمٓ۔ حٰمٓعٓسٓقٓ۔ قٓ۔ نٓ۔

حروف مقطعات کے مکررات کے حذف کے بعد ایک لطیف استخراج

اور اگر ان چودہ مقطعات کے بھی مکرر حروف کو حذف کر دیا جائے تو باقی چودہ حروف رہتے ہیں جو عربی حروف تہجی کے نصف ہیں جو یہ ہیں۔ ا۔ل۔م۔ص۔ ر۔ك۔ی۔ع۔ط۔ س۔ق۔ن۔ اس سے بعض نکتہ سنج حضرات نے یہ عجیب وغریب نکتہ اخذ کیا ہے کہ اگر ان فواتح سور کے مکررات کو حذف کیا جائے تو باقیماندہ حروف کو مرکب کرنے کے بعد یہ جملہ بنتا ہے ''علی صراط حق نمسکہ یا صراط علی حق نمسکہ'' علی کا راستہ حق ہے ہم اسی سے تمسک کرتے ہیں۔ یہ تفسیر نیشاپوری اور تفسیر صافی کے بیان کا خلاصہ ہے یہ کوئی منطقی برہان یا عقلی استدلال نہیں ہے۔ بلکہ ایک لطیف استخراج ہے۔ (احسن الحدیث)۔

یہ حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں۔ اگرچہ فریقین کے مفسرین نے ان حروف کے معانی و مفاہیم بیان کرنے میں بڑا زور مارا ہے اور بخیال خویش بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں کی ہیں ان کے اقوال و آراء کی تعداد ۲۲۔ ۲۳ تک پہنچتی ہے۔ مگر اس کے باوجود کسی ایک معنی ومفہوم پر متفق نہیں ہو سکے اور نہ ہی علم ویقین کے ساتھ کوئی حتمی رائے قائم کر سکے ہیں۔ اسی بنا پر محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ حروف ان متشابہات میں سے ہیں کہ جن کی حقیقی تاویل خدا جانتا ہے یا راسخون فی العلم جانتے ہیں۔ علامہ طبرسی فرماتے ہیں۔ 'هذا هو المروی عن ائمتنا علیهم السلام''۔ یہی بات ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہے۔ (مجمع البیان)۔ بعض روایات میں ان حروف کے بعض مفاہیم بیان کئے گئے ہیں۔ جیسے الم کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے۔ انا الله الملك'' میں اللہ بادشاہ ہوں۔ • تفسیر عیاشی) مگر اس روایت کی سند قابل اعتماد نہیں ہے۔ تفسیر قمی میں لکھا ہے ''هو حرف من حروف اسم الله الاعظم المتقطع فی القرآن الذی یولفه النبی والامام فاذا دعا به اجیب''۔ یہ اللہ کے اسم اعظم کے کچھ حروف ہیں جو قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں جب نبی وامام انہیں ترتیب دے کر ان کے ذریعہ سے دعا

کرتے ہیں تو وہ قبول ہوجاتی ہے۔(تفسیر قمی)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حروف ہمارے لئے ایک سربستہ راز ہیں اور حبیب و محبوب کے درمیان کچھ راز و نیاز کی باتیں ہیں سچ ہے کہ

میان عاشق و معشوق رمزے است
کراما کاتبین را ہم خبر نیست

لہٰذا ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم ان پر ایمان تولائیں۔مگر ان کے حقیقی معنی ومفہوم کو خدا' مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے سپرد کریں۔البتہ شواہد وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوب بیان نزول قرآن کے وقت عربوں میں بھی رائج تھا اور وہ حروف مقطعات کو اپنے کلام میں استعمال کرتے تھے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

لا تحسبی انا نسینا الا یجاف
قلت لها قفی فقالت لی قاف

یہاں قاف قف کا مخفف ہے۔یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں کسی مخالف نے یہ ایراد نہیں کیا تھا کہ یہ کیا بے معنی حروف ہیں جو قرآنی سورتوں کے آغاز میں لکھے اور بولے جاتے ہیں؟؟ لہٰذا ان حروف کے معانی ومفاہیم متعین کرنے کیلئے ہمیں کسی مغز ماری کی ضرورت نہیں ہے۔

ذٰلِكَ......الآية۔

بعید کے اشارہ کیلئے استعمال ہوتا ہے جبکہ هذا قریب کے اشارہ کیلئے ہوتا ہے تو یہاں بظاہر تو هذا استعمال کرنا چاہیے تھا کیونکہ قرآن قریب ہے جیسا کہ ایک اور جگہ اس طرح وارد ہے۔ هذا کتاب انزلناه مبارك... مفسرین نے اس کی مختلف توجیہیں بیان کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ قران گو بظاہر قریب ہے مگر اپنے علوِ مرتبہ اور بلندی شان کے اعتبار سے عمومی سطح سے بہت بلند اور دور ہے۔اس لئے ذالك استعمال کیا گیا اس لئے ہم نے ترجمہ میں دونوں باتوں کو مدنظر رکھ کر یہ ترجمہ کیا ہے۔یہ (قرآن) وہ کتاب ہے۔

الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ......الآیة۔

حسب ظاہر تو یہ جملہ خبریہ ہے جس کے ساتھ یہ خبر دی جارہی ہے۔کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔یعنی اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں ہے حالانکہ یہ واقع کے خلاف ہے ایسے بدقسمت لوگ اس وقت بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں جو اپنی کوتاہ اندیشی' کم علمی اور تنگ نظری کی وجہ سے قرآن مجید کے کلام

اللہ ہونے میں شک کرتے تھے۔جیسا کہ ارشادقدرت ہے۔''وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا ''۔لہٰذا یہ جملہ خبر یہ نہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی فوق العادت فصاحت و بلاغت' تاریخی واقعات کی صحت وصداقت' اخبار غیبیہ کی حقانیت' اپنے انوکھے طرز استدلال واحتجاج اور ایک کامل واکمل عادلانہ نظام شریعت اور اخلاق عالیہ کی تعلیم وتلقین کی بنا پر اس قابل نہیں ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ کیا جائے۔لہٰذا جو شخص بھی اپنی آنکھوں سے تعصب اور اندھی تقلید کی پٹی اتار کر اس میں معمولی سا بھی غور وفکر کرے گا اور تھوڑا سا تدبر وتامل کرے گا اسے اس کے کلام اللہ ہونے میں ذرہ بھر شک وشبہ باقی نہیں رہے گا۔الاعلی اکمہ لم یبصر القمرا۔

هُدًى...الآية۔

ہدایت کے معنی اور اس کے اقسام کی تفصیل اهدنا الصراط المستقیم میں گزر چکی ہے اس آیت اور اس قسم کی بیسوں آیات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید دین وعقیدہ' احکام اور اخلاق اور ہدایت کی کتاب ہے۔وہ انسانوں کیلئے ہدایت نامہ اور مکمل دستور حیات ہے جو من جانب اللہ بندوں کی ہدایت وراہنمائی کیلئے نازل کی گئی ہے۔جیسا کہ ارشادقدرت ہے۔''کتاب انزلناہ الیك لِتخرِجُ الناس من الظلمات الی النور''۔یہ کتاب ہم نے اس لئے آپ کی طرف نازل کی ہے کہ آپ لوگوں کو ظلمت کفر سے نکال کر نور اسلام میں داخل کریں''هذا بصائر من ربکم ورحمة''۔یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے بصیرت ورحمت ہے۔

قرآن طبعی علوم کی کتاب نہیں ہے

یہ تاریخ' سائنس' ہیت' فزکس' ریاضی وغیرہ (طبعی علوم) کی کوئی کتاب نہیں ہے اور اگر بموجب لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین اس میں ان علوم وفنون کی طرف کچھ لطیف اشارات پائے جاتے ہیں یا کائنات کی بعض چیزوں کے بارے میں بعض حقائق علمیہ بیان کئے گئے ہیں تو وہ ضمنی حیثیت سے بیان کئے گئے ہیں اور اس سے بھی مقصد صرف خالق کون ومکان اور اس کی حکمت بالغہ وقدرت کاملہ کی طرف لوگوں کی ہدایت وراہنمائی کرنا ہے وبس جیسا کہ ارشادقدرت ہے۔

''سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ''ہم ان کو آفاق والنفس میں (اپنی ہستی) کی نشانیاں دکھائینگے تاکہ اُن پر واضح ہوجائے کہ اس (خدا) کا وجود برحق ہے۔(حم سجدہ

آیت۔ ۵۳)

یہ درست ہے کہ قرآن ان طبعی علوم وفنون کے حاصل کرنے کی مسلمانوں کی ترغیب دیتا ہے اور کائنات ارضی وسماوی میں غور وفکر کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ یہ انہی علوم کی کوئی کتاب ہے۔ ان علماء وفضلاء نے سخت غلطی کی ہے جنہوں نے ہر دور میں قرآن کو طبعی علوم اور سائنس وہیت سے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔ سائنسی نظریات ادلتے بدلتے رہتے ہیں مگر قرآنی حقائق ومعارف تغیر پذیر نہیں ہیں کبھی سائنس دانوں نے کہا زمین ساکن ہے تو فوراً ان علماء نے قرآن کو توڑ موڑ کر ثابت کر دیا کہ قرآن بھی یہی کہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ زمین متحرک ہے۔ تو ان حضرات نے بھی جھٹ اپنی ذہنی تخریج سے کہہ دیا کہ جی ہاں قرآن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح انہوں نے غیر شعوری طور پر قرآن واسلام کو نقصان پہنچایا اور لوگوں کو قرآن سے بدظن کیا اور ان کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ قرآنی حقائق تغیر پذیر ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

قرآن بنص قرآن "ھدی للناس" (تمام لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی) کیلئے نازل کیا گیا ہے اور اس میں نیک وبد اور کافر ومسلمان وغیرہ کی کوئی تفریق نہیں ہے تو پھر یہاں اسے ھدی للمتقین کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عالم الغیب خدا نے خبر دی ہے کہ اس سے فائدہ صرف وہی لوگ حاصل کرینگے جن کے دلوں میں خوف وخشیت الٰہی ہوگا۔ جس طرح حضرت رسول خدا رحمۃ اللعالمین ہیں مگر ان کی اس رحمت سے فیض یاب صرف وہی خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جو شدائد قیامت سے خائف وترساں ہیں "انما انت منذر من یخشاھا" باران رحمت کی رحمت والطافت میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ مگر اس سے فائدہ ہر زمین اپنی اپنی ذاتی استعداد کے مطابق اٹھاتی ہے۔

با ران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در زار لالہ روید ودر شور بوم و خس

بالکل اسی طرح

نا کس بتر بیت نشو دا ے حکیم کس؟

تقویٰ کا لغوی واصطلاحی مفہوم

لغت میں تقویٰ کے معنی ہیں ڈرنا اور بچنا اور اصطلاح میں تقویٰ خدا کے خوف وخشیہ کی اس قلبی کیفیت کا

نام ہے جواس کی حاکمیت وسلطنت‘اس کی قدرت وتمکنت‘اس کی نفع ونقصان رسانی کی قوت وقدرت اوراس کے ہر جگہ اور ہروقت حاظر وناظر ہونے کے علم ویقین سے انسانی دل ودماغ میں پیدا ہوتی ہے۔

تقویٰ کی پہچان کے علامات:

تقویٰ کا تعلق چونکہ براہ راست دل ودماغ سے ہے۔اب کس کے دل میں یہ کیفیت ہے اورکس کے دل میں نہیں ہے؟ ظاہر بینوں کیلئے اس کی پہچان کیلئے شریعت مقدسہ میں چند علامات مقرر کی گئی ہیں مثلاً یہ کہ

۱۔جس کے دل ودماغ میں یہ کیفیت ہوگی وہ خلوت وجلوت میں یکساں شریف اور پابند احکام ہوگا۔

۲۔وہ ان کارہائے خوب کو بجالائے گا جن کو شریعت مقدسہ نے واجب قرار دیا ہے اوران برے کاموں سے اجتناب کرے گا جن کو شرع انور نے حرام قرار دیا ہے۔

۳۔جن کاموں سے خدانے بندہ کو منع کیا ہے وہ اسے وہاں موجود نہیں پائیگا اورجن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہاں اسے مفقود نہیں پائیگا۔ کما قال بعضهم التقویٰ ان لا یر اك الله حیث نهاك و لا یفقدك حیث امرك (مجمع البیان)۔

۴۔اس میں وہ پنجگانہ صفات جلیلہ پائے جائینگے جن کا ان آیتوں میں خدائے حکیم وعلیم نے تذکرہ فرمایاہے۔

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ......الاٰیة۔

(الف) ایمان بالغیب

لغت میں ایمان کے گوظاہری معنی تصدیق کے ہیں۔مگر عام تصدیق اورایمان میں ایک باریک فرق ہے اوروہ یہ ہے کہ تصدیق عام ہے اوراس کا تعلق محسوسات ومشاہدات سے بھی ہوتا ہے اورغیر محسوسات سے بھی مگر ایمان کا تعلق صرف غیر محسوسات کے ساتھ ہوتا ہے اوروہ بھی محض پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی صفات پر بھر پور اعتماد کی وجہ سے۔لہٰذا ان پر اعتماد کرکے ان کے کلام وبیان کو تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے اوراصطلاح شریعت میں ایمان کا مفہوم ہے۔تصدیق بالجنان‘اقرار باللسان و عمل بالارکان۔اورعند التحقیق اس کی حقیقت بسیط ہے یعنی عقائد حقہ کی تصدیق قلبی کا نام ایمان ہے مگر لسانی اقرار اس کا کاشف ہے اورعمل اس کی پختگی کا شاہد ہے۔غیب ان امور کو کہا جاتا ہے جونہ تو بدیہی طور پر معلوم ہوں اورنہ ہی حواس خمسہ سے ان کو محسوس ومعلوم کیا جا سکے۔”وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ“۔(انعام آیت ۵۹) خدا کے

پاس غیب کی کنجیاں ہیں اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ بلکہ اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ آسمانی وحی ہوتی ہے اور وہ بھی اس کی زبان سے جس کی نبوت و رسالت عقل و شرع سے ثابت ہو چکی ہو جیسے قیامت اور اس کے واقعات' جنت' دوزخ' ملائکہ' حور العین' ابلیس' حساب قبر و برزخ اور امام زمانہ علیہ السلام کی غیبت اور ان کا ظہور وغیرہ وغیرہ۔ اور ایک اعتبار سے خدا اور اس کی صفات جلال و جمال پر ایمان بھی (جو غیب الغیوب ہے) اسی ایمان بالغیب میں داخل ہے۔ اگرچہ وہ عقل کی گرفت سے ماوراء نہیں ہے۔

متقین کی مرکزی صفت یہی ایمان بالغیب ہے اور یہ ایمان بالغیب ہی ہے جو دین و ایمان کی روح اور جان ہے کہ اس محسوس و مشاہد عالم سے ماوراء ایک اور عالم ہے جسے عالم آخرت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جو اس غیب پر ایمان نہیں رکھتا وہ صرف یہی نہیں کہ متقی نہیں ہے بلکہ وہ مسلمان ہی نہیں ہے اب رہی یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی علم غیب جانتا ہے یا نہیں؟ اور اگر جانتا ہے تو کس قدر؟ اور آیا اس جاننے کی صورت میں اسے عالم الغیب کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی تحقیق کسی مناسب مقام جیسے پارہ نمبر ۴ کی آیت ''وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ............'' (سورہ آل عمران آیت۔۱۷۹) کی تفسیر میں پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ......الاٰية۔

(ب) اقامۃ صلوٰۃ

نماز ان ضروریات دین میں سے ایک ہے جن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج متصور ہوتا ہے۔ اس کا قائم کرنا واجب ہے۔ جو عمداً نہ پڑھے وہ بحکم قرآن مشرک ہے' بفرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافر ہے اور ائمہ اھل بیت علیہم السلام کے کلام کے مطابق محروم الشفاعہ ہے۔ فروع دین میں سے نماز ایک اہم فریضہ ہے۔ اس کی قبولیت پر دوسرے تمام اعمال و عبادات کی قبولیت کا دار و مدار ہے۔ متعدد احادیث میں وارد ہے:

''اول ما يسئل عن العبد يوم القيامة الصلوٰة فان قبلت قبل ما سواها و ان ردت ردما سواها''۔ یعنی قیامت کے دن (اصول عقائد کے سوال و جواب کے بعد) پہلا سوال نماز کے بارے میں کیا جائیگا سو اگر نماز قبول ہو گئی تو دوسرے تمام اعمال بھی قبول ہو جائینگے اور اگر نماز مسترد ہو گئی تو دوسرے سب اعمال رد کر دیئے جائینگے۔ (وسائل الشیعہ وغیرہ)۔

روز محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسش نماز بود

بنابریں اقامہ صلوۃ کے معنی صرف نماز پڑھنا نہیں ہیں بلکہ اسکے ظاہری و باطنی حدود و قیود کے ساتھ اور پابندی اوقات کے ساتھ اسے ادا کرنا اوراس پر مداومت کرنا ہے۔ظاہری حدود و قیود سے مراد اس کے واجبات، مستحبات اورآداب ہیں اور باطنی حدود و قیود سے مراد خشوع وخضوع اور کامل حضور قلب ہے۔ارشاد قدرت ہے:

''قد افلح المو منون الذین ھم فی صلوا تھم خا شعون۔''وہ اہل ایمان فلاح پا ئینگے جوخشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ......الآية

(ج) انفاق فی سبیل اللہ

اجتماعی فرائض یعنی حقوق العباد میں سے ایک اہم فریضہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔اگر چہ تمام مفسرین نے اس سے راہ خدا میں حلال مال خرچ کرنا مرادلیا ہے کہ اللہ نے ان کو جو رزق حلال عطا فرمایا ہے اس میں سے زکوٰۃ وفطرہ اور صدقہ دیتے ہیں مگر بعض احادیث اہلبیت علیہم السلام کے پیش نظر اس سے عموم بھی مستفاد ہوتا ہے چنانچہ بروایت محمد بن مسلم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''و مما علمنا ھم یبثون''ہم نے ان کو جو علم دیا ہے وہ اس کی اشاعت کرتے ہیں۔(تفسیر قمی وعیاشی)

اور معانی الاخبار کی روایت میں اسکے ساتھ یہ تتمہ بھی مذکور ہے۔''و مما علمنا ھم من القرآن یتلون''ہم نے جو انہیں قرآن کا علم دیا ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں بنابریں بعید نہیں ہے کہ اس رزق سے ہر قسم کا جسمانی وروحانی رزق مرادلیا جائے اور بعض مفسرین کی اس تفسیر کو صحیح تسلیم کیا جائے کہ خدا کی ہر نعمت کی زکوٰۃ الگ الگ ہے چنانچہ مال ودولت کی زکوٰۃ تو وہی عام زکوٰۃ وفطرہ ہے، عہدہ ومرتبہ کی زکوٰۃ محتاجوں کی دادرسی اور مطلب برآری کرنا ہے علم کی زکوٰۃ اس کی نشر واشاعت کرنا اور جاہلوں کو پڑھانا ہے۔ہدایت کی زکوٰۃ بے ہدایت لوگوں کی راہنمائی کرنا ہے اور قوت وطاقت کی زکوٰۃ کمزوروں کی مدد ونصرت کرنا اور ان کو ظالموں کے پنجہ ظلم واستبداد سے نجات دلانا ہے اور حکومت وسلطنت کی زکوٰۃ نظام عدل وانصاف قائم کرنا ہے وغیرہ وغیرہ (تفسیر صافی وتفسیر سید شہر)۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ......الاٰية۔

(د) ایمان بما انزل الیك و ما انزل من قبلك

متقیوں کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ جو قرآن وشرع اسلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے یا جو کچھ آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ آیت ختم نبوت کی بیّن دلیل ہے

اس آیت میں بھی اور اس کے علاوہ جہاں بھی قرآن مجید میں آسمانی وحی اور کتب پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کردہ اور آپ سے پہلے والی وحی اور کتب پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ کہیں بھی آپؐ کے بعد والی وحی یا کتاب پر ایمان لانے کا حکم یا ذکر نہیں ہے۔ جس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح وآشکار ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کی وحی آخری وحی اور آپ کی کتاب آخری کتاب ہے ورنہ ظاہر ہے کہ اگر آپؐ کے بعد کوئی وحی یا کتاب نازل ہونے والی ہوتی تو ضرور اس پر ایمان لانے کا حکم اور اس کا ذکر بھی ہوتا۔ مگر پورے قرآن میں اس بات کا کہیں کوئی نام ونشان بھی موجود نہیں ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کی ناقابل رد دلیل ہے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ...... الاٰیۃ۔

(ح) ایمان بالآخرۃ۔

آخرت پر ایمان واذعان۔ اگرچہ آخرت پر ایمان وایقان ایمان بالغیب میں داخل ہے مگر ایمان بالآخرت کی اہمیت کے پیش نظر اس کا علیحدہ صراحتاً ذکر کیا گیا ہے۔ یہ آخرت پر ایمان ہی وہ عقیدہ ہے جو آدمی کو دنیا میں ظلم وعدوان اور ہر قسم کے گناہ وعصیاں سے باز رکھتا ہے۔ اگرچہ اس میں آدمی کا کتنا ہی بڑا دینوی فائدہ ہو اور اس کو صداقت وسچائی عدالت وانصاف' دیانت وامانت اور ایثار وقربانی کا دامن تھامنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں اس کا دینوی نقصان ہی ہو۔ الغرض عقیدہ وہ راسخ ہوتا ہے جس کا انسان کی عملی زندگی پر اثر نمایاں نظر آئے۔ لہٰذا اگر آخرت پر ایمان کے عقیدہ کا انسان کی عملی زندگی میں کوئی اثر نظر نہ آئے اور اس میں اعتدال کا جلوہ دکھائی نہ دے تو پھر ماننا پڑیگا کہ یہ صرف زبانی اقرار ہے مگر قلبی طور پر انکار ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ہدایت پر قائم ہیں اور یہی ہیں جو آخرت میں فوز وفلاح پائینگے۔

آیات القرآن

أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۵ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۶
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ
غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۷ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ
وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۸ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ
وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۹ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ
فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۱۰
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ
مُصْلِحُوْنَ ۱۱

ترجمۃ الآیات

یہی لوگ اپنے پروردگار کی ہدایت پر (قائم) ہیں اور یہی وہ ہیں جو (آخرت میں) فوز وفلاح
پانے والے ہیں۔ (۵) (اے رسول) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا۔ ان کیلئے برابر ہے۔
آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ بہر حال وایمان نہیں لائیں گے۔ (۶) خدا نے ان کے
دلوں اوران کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اوران کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اور (آخرت
میں) ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (۷) اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روز
آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ (۸) خدا اور اہل ایمان کو دھوکہ
دے رہے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے سوا کسی کو دھوکہ نہیں دیتے۔ مگر انہیں اس کا (احساس) نہیں
ہے۔ (۹) ان کے دلوں میں (نفاق کی) ایک بیماری ہے۔ سو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا

دی ہے اور ان کے (مسلسل) جھوٹ بولنے کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(۱۰)اور جب ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔(۱۱)

تشریح الالفاظ

(۱)المفلحون یہ فلاح سے مشتق ہے اور فلاح کے معنی ہیں مقصد میں کامیاب ہونا' کام کا درست ہونا اور نجات پانا

(۲)غشاوۃٌ اس لفظ کے معنی ہیں پردہ اور ڈھکنا (۳)یخادعون یہ خدع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں دھوکہ دینا اور دغابازی کرنا۔

تفسیر الآیات

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ......الآیۃ۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیتیں ایسے خالص اہل ایمان کے بارے میں ہیں جو ظاہراً و باطناً مومن ہیں۔اس کے بعد والی دو آیتیں خالص اہل کفر کے بارے میں ہیں جو ظاہراً و باطناً کافر ہیں اس کے بعد والی تیرہ آیتیں ان منافقین کے متعلق ہیں جو ظاہر میں تو مسلمان نظر آتے ہیں۔مگر باطن میں کافر ہیں کیونکہ ان میں اقرار لسانی تو ہے مگر تصدیق جنانی (قلبی) نہیں ہے جو لازمہ اسلام ہے۔

کفر کیا ہے اور کن چیزوں کے انکار سے آدمی کافر بنتا ہے؟:

سو واضح ہو کہ لغت عرب میں کفر کے معنی جہاں چھپانے اور ناشکری کرنے کے ہیں وہاں اس کے ایک معنی انکار کرنا بھی ہیں۔لہٰذا جو شخص اصول اسلام جو کہ توحید' نبوت اور قیامت ہیں ان سب کا یا ان میں سے کسی ایک کا جان بوجھ کر انکار کرے وہ کافر ہے اور کافر کا بھی فرد کامل ہے یا وہ ضروریات اسلام جن پر تمام اسلامی فرق و مسالک کا باوجود اپنے باہمی اختلافات کے اتفاق ہو۔جیسے نماز پنجگانہ کا وجوب ان کی رکعتوں کا سترہ ہونا' ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت' حج کا وجوب' زکوٰۃ کی فرضیت اور مودۃ اہل بیت علیہم السلام کا وجوب وغیرہ وغیرہ۔ پس جو شخص ضروریات اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کرے وہ کافر ہے۔اگرچہ اسلامی طریقہ پر سلام کرے اور

روبقبلہ ہوکر نماز بھی پڑھے اور اپنے مسلمان کہلانے پر اصرار بھی کرے۔ الغرض جو کچھ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی طرف سے لائے ہیں اور وہ قطعی طریقہ سے ثابت ہے اس کے انکار کرنے کا دوسرا نام کفر ہے۔

مخفی نہ رہے کہ ایمان کی طرح شدت وضعف میں کفر کے بھی کئی مراتب ہیں۔ سب یکساں نہیں ہیں بہرحال اس آیت میں خداوند عالم نے اپنے ازلی وابدلی علم کی بنا پر خبر دی ہے کہ یہ لوگ اپنی ضد وہٹ دھرمی اور کج روی سے جس طرح کفر وفجور پر ڈٹے ہوئے ہیں وہ اس سے باز نہیں آئینگے اور ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔

اب یہ بات تو واضح ہے کہ اس سے عام کفار مراد نہیں ہیں تو پھر وہ کون خاص کافر ہیں؟ جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے ظاہر یہ ہے کہ اس سے مکہ کے بعض بڑے بڑے کفار وسردارن قریش مراد ہیں جو اسلام کا انکار کرنے اور شمع اسلام کو گل کرنے میں سب سے پیش پیش تھے۔ جن میں کچھ جنگ بدر میں واصل جہنم ہوئے اور کچھ بعد والی جنگوں میں کیفر کردار کو پہنچے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر تمام کفار کی یہی حالت ہوتی تو پھر رشد و ہدایت اور اسلام وایمان کا دروازہ بند ہوجاتا اور انبیاء ومرسلین علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہوجاتا اور ان کا آنا عبث ہوکر رہ جاتا۔ ''تعالی اللّٰہ عن ذلک علوا کبیراً. اور جب کوئی کافر اسلام نہ لاتا تو شجر اسلام کس طرح پھلتا' پھولتا اور پروان چڑھتا اور یہ کافر جو اسلام لائے اور مسلمانوں کی تعداد بڑھی یہ سب کچھ کس طرح روبعمل آتا؟؟

خَتَمَ اللّٰهُ...... الآیة۔

کسی چیز پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باہر کی کوئی چیز اس کے اندر داخل نہ ہوسکے اور اندر کی کوئی چیز باہر نہ نکل سکے۔ بنابرایں اگر اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو پھر تو وہ ایمان نہ لانے اور کفر اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ جبکہ یہ بات مسلمات عقل وشرع کے سراسر خلاف ہے عدلیہ کے برحق مسلک کہ انسان فاعل مختار ہے کے صحیح اسلامی نظریہ کے بالکل منافی ہے۔

بنابریں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کی بدعملیوں' ہٹ دھرمیوں' کج رویوں اور کفر کیشیوں کی وجہ سے جو حالت ہوگئی ہے۔ تمثیلی شکل میں اسے بیان کیا جارہا ہے کہ جس طرح حفظان صحت کے اصولوں کو مسلسل پائمال کرنے کی وجہ سے بعض اعضاء جیسے معدہ وغیرہ اس طرح بیکار ہوجاتے ہیں کہ ان کے وجود وعدم میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا بالکل اسی طرح روحانی قوتوں کے حفظان کے چند اصول ہوتے ہیں جن کی مسلسل خلاف ورزی کرنے سے وہ روحانی قوتیں اس طرح ناکارہ ہوجاتی ہیں کہ دل ودماغ میں حق وباطل کے درمیان تمیز کرنے اور آنکھوں سے عبرت انگیزی اور کانوں سے نصیحت آموزی کی صلاحیت سلب ہوجاتی ہے۔ تو گویا اب ان اعضاء کا وجود وعدم برابر ہوگیا ہے۔ اور وہ اس طرح شل ہوکر رہ گئے ہیں کہ گویا ان کے دلوں اور کانوں پر مہر

لگ گئی ہے۔اور آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔

لیکن مشاہدہ شاہد ہے کہ نہ ان کی آنکھوں پر کوئی پردہ ہوتا ہے اور نہ کانوں پر کوئی مہر۔تو ماننا پڑے گا کہ ان کے دلوں پر کوئی مادی مہر نہیں ہے۔ یہ مجاز ہے اور استعارہ و کنایہ ہے اور اگر فی الواقع کوئی ایسی خاص علامت ہے جو سیاہ نقطہ کی طرح ان کے دل و دماغ میں پائی جاتی ہے۔ جسے ملائکہ یا اولیاءاللہ دیکھ کر پہنچان جاتے ہیں کہ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسا کہ اس مضمون کی ایک روایت حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے۔(عیون الاخبار)۔

تو یہ بھی ان کے کفر و فجور اور بغض و عناد اور گناہ و عصیاں کا نتیجہ و ثمرہ ہے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

''بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ''(بلکہ خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے)۔سورہ نساء آیت۔ ۱۵۵

اس سے واضح ہوا کہ اس حقیقی یا مجازی مہر لگنے کا سبب ان کا کفر ہے اور مہر اس کا نتیجہ ہے ان کا کفر اس مہر لگنے کا ثمرہ و نتیجہ نہیں ہے یعنی پہلے مہر نہ تھی۔ اگر لگی تو ان کے کفر و انکار کی وجہ سے لگی ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

''بَلْ سكة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ''۔یعنی جو برے اعمال اور کرتوت وہ کیا کرتے تھے ان کا زنگ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا۔(سورہ مطففین آیت۔ ۱۴)

یہ کہیں زنگ، کہیں پردہ اور کہیں مہر کی تعبیر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی ضد، ہٹ دھرمی، کج روی، کج اندیشی اور بدعملی کی وجہ سے ان سے ایمان اختیار کرنے اور راہ راست پر آنے کی توفیق ہی سلب ہوگئی ہے فہم لا یومنون یہ آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں ان کے گناہ و عصیاں، ظلم و عدوان اور کفر و انکار کی سزا ہے کہ ان سے اصلاح احوال کی توفیق ہی سلب کر لی گئی ہے اور اس طرح ان کے دل و دماغ، چشم و گوش کی تمام قوتیں اور ان کی توانائیاں ناکارہ اور ختم ہوگئی ہیں اور ہر داعی حق چشم بصیرت سے ان کی حالت دیکھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے اور ان کا آئینہ دل اس قدر میلا کچیلا ہوگیا ہے کہ اب اس میں آفتاب ہدایت کے نور کو اپنے اندر منعکس کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔

مخفی نہ رہے کہ ان تین اعضاء کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ علم و معرفت حاصل کرنے کا مرکز قلب ہے اور اس کے ظاہری وسائل و ذرائع دیدہ و گوش ہیں اور ایسے بدبختوں کیلئے زبردست عذاب ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ یہاں قلب سے مراد وہ مضغۂ گوشت نہیں ہے جو سینہ کے اندر ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ چیز ہے

جوارادہ، تعقل اور احساس کا مرکز ہے جسے محاورہ عرفی اور عام بول چال میں دل کہا جاتا ہے۔ جوارادی افعال کا مصدر ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ.........الآیۃ۔

قبل ازیں یہ حقیقت بیان کی جا چکی ہے کہ اس آیت سے لے کر تیرہ (۱۳) آیات تک منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے (تفسیر صافی و برھان) ان آیات شریفہ میں منافقین کی منافقانہ اور دوعملی روش و رفتار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اسلام میں منافقوں کے وجود اوران کی ضرر رسانیوں کا تذکرہ

حقیقت الامر یہ ہے کہ آغاز اسلام سے لے کر آج تک اسلام اور مسلمانوں کو جس قدر ضرر وزیاں اس اندرونی دشمن نے مار آستین بن کر پہنچایا ہے اتنا بیرونی دشمنوں و کفار و مشرکین نے نہیں پہنچایا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حین حیات میں منافقوں کا وجود ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس پر تاریخی شہادتوں کے علاوہ خود قرآن کی مختلف آیات بلکہ پوری سورتیں شاہد عادل کے طور پر موجود ہیں۔ البتہ معمولی سا اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا اسلام میں یہ بیماری ہجرت کے بعد مدینہ میں پیدا ہوئی یا مکہ میں اس کی ابتداء ہوگئی تھی؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ہجرت سے پہلے منافقین کا نشان نہیں ملتا (ضیاء القرآن)۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا آغاز ہجرت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی میں ہو گیا تھا۔ جس میں بعد ازاں برابر اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ آنحضرتؐ کے آخری دور حیات میں یہ ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ صاحب ضیاء القرآن نے مکہ میں منافقین کے نشان نہ ملنے کی یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس وقت مسلمان ہونا ہر قسم کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بننا تھا اور اس لئے کسے کیا پڑی تھی کہ ایسے دین کیلئے مصیبتوں کو دعوت دے جس پر اسکا ایمان ہی نہیں ہے بظاہر یہ استدلال خاصا وزنی نظر آتا ہے لیکن اگر دنیاداروں کے حالات و کوائف پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ آنے والی متوقع آسودگی و خوشحالی اور اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کیلئے ابتداء میں بڑی بڑی زحمتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ طالبعلم کی محنت، کسان کی زحمت، تاجر کی مشقت اور ایک سیاستدان کی سال ہا سال کی تگ و دو اور کدو کاوش اسی فطری جذبہ کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اوائل اسلام میں مسلمان بننا ہر قسم کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بننا تھا، مگر ایک تو یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی تھی بلکہ بعد ازاں حالات قدرے بدل گئے تھے اور دوسرے کچھ لوگوں کو راہب نے خبر دی تھی کہ عنقریب مکہ میں ایک

دعویدار نبوت ظاہر ہوگا اور تمہیں ان کی وجہ سے بڑے دنیوی فوائد حاصل ہوں گے (تاریخ الخلفاء، سیرت حلبیہ، صواعق محرقہ وغیرہ)۔

لہٰذا انہوں نے اس طمع میں اسلام کا اظہار کیا اور کچھ لوگ ان کی تحریک پر اسلام میں داخل ہوئے اور کچھ لوگ حالات کا رخ دیکھ کر اور متوقع فتوحات وغنائم کی امید پر ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' کہتے ہوئے اسلام کی کشتی پر سوار ہو گئے اور پھر سایہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چمٹے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

منافقین کی مختلف اقسام کا بیان

مشہور اسلامی سکالر مولانا مودودی ہمارے اس متعلقہ مسئلہ کے بارے میں سور بقرہ کے پیش لفظ میں آنحضرت کی مدنی زندگی کے دور کے متعلق لکھتے ہیں ''دعوت اسلامی کے اس مرحلہ میں ایک نیا عنصر بھی ظاہر ہو گیا تھا اور یہ منافقین کا عنصر تھا۔ اگرچہ نفاق کے ابتدائی آثار مکہ کے آخری زمانہ میں بھی نمایاں ہونے لگے تھے مگر وہاں صرف اس قسم کے منافق پائے جاتے تھے جو اسلام کے برحق ہونے کے معترف تھے اور ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے لیکن اس کے لئے تیار نہ تھے کہ اس حق کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی اور اپنے دنیوی تعلقات کا انقطاع اور ان مصائب وشدائد کو بھی برداشت کرلیں جو اس مسلک حق کو قبول کرنے کے ساتھ ہی نازل ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قسموں کے منافق بھی اسلامی جماعت میں پائے جانے لگے۔ ایک قسم کے منافق وہ تھے جو قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض فتنہ برپا کرنے کیلئے جماعت مسلمین میں داخل ہو جاتے تھے۔

دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو اسلامی جماعت کے دائرہ اقتدار میں گھر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اس میں دیکھتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں میں بھی اپنا شمار کرائیں اور دوسری طرف مخالفین اسلام سے بھی ربط رکھیں تاکہ دونوں طرف کے فوائد سے متمتع ہوں اور دونوں طرف کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان متردد تھے انہیں اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نہ تھا مگر چونکہ ان کے قبیلہ یا خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہو چکے تھے اس لئے یہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ شامل تھے جو امر حق کہنے کی حیثیت سے تو اسلام کے قائل ہو چکے تھے مگر جاہلیت کے طریقے، اوہام اور رسمیں چھوڑنے اور اخلاقی پابندیاں قبول کرنے اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بار اٹھانے سے ان کا نفس انکار کرتا تھا۔ سورہ بقرہ کے نزول کے وقت ان مختلف اقسام کے منافقین کے ظہور کی محض ابتداء تھی۔ اسی لئے اللہ

تعالی نے ان کی طرف اجمالی اشارات فرمائے ہیں بعد میں جتنی جتنی ان کی صفات اور حرکات نمایاں ہوتی گئیں اسی قدر تفصیل کے ساتھ بعد کی سورتوں میں ہر قسم کے منافقین کے متعلق ان کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہد ایات بھیجی گئیں۔''۔(تفہیم القرآن جلد ا صفحہ ۴۸)

اس موضوع پر ہمیں مزید کچھ خامہ فرسائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ولا ینبئك مثل خبیر۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت منافقین موجود تھے:

ہم یہاں صرف اس قدر واضح کرنا چاہیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے ساتھ منافقین کا خاتمہ نہیں ہو گیا تھا بلکہ وہ برابر موجود تھے فاضل شبلی نعمانی رقمطراز ہیں اور جب آنحضرتؐ کی وفات واقع ہوئی تو مدینہ منافقوں سے بھرا پڑا تھا۔صحابی رسولؐ حذیفہ یمانی کہا کرتے تھے کہ:

''ان المنافقین الیوم شر منھم علی عھد النبی کانوا یومنئذٍ یسرون و الیوم یظھرون''۔آج کل کے منافق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور سے بھی بدتر ہیں وہ اس وقت پوشیدہ طور پر ریشہ دوانیاں کرتے تھے مگر آج کھل کر کھیل رہے ہیں۔(بخاری جلد ۴ ص ۱۴ طبع مصر)

چنانچہ اس اثنا میں اسلام، مسلمانوں اور خاص طور پر خاندان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جو کچھ سلوک ہوا وہ انہی لوگوں کی کارستانیوں کی داستان خونچکان ہے۔والی اللہ المشتکی۔

منافق کسے کہا جاتا ہے؟:

منافق اس کو کہا جاتا ہے کہ جو زبان سے اسلام کا اقرار کرے مگر دل سے انکار کرے۔اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی اور سچا مسلمان بننے کیلئے صرف زبانی اسلام کا اقرار کرنا اور اس کے ظاہری احکام پر عمل کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ قلبی تصدیق کا ہونا بھی ضروری ہے۔اور چونکہ منافقین میں یہ تصدیق نہیں پائی جاتی اس لئے ان کے دعوائے اسلام وایمان کے باوجود خداوند عالم ان کے دعوی کو جھوٹ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے''وما ھم بمو منین''۔یہ مومن نہیں ہیں۔

يُخٰدِعُوْنَ اللهَ......الآية

منافق لوگ اپنی دوغلی چال اور منافقانہ روش ورفتار سے بظاہر تو اہل ایمان اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فریب ودھوکہ دیتے تھے کہ وہ اس طرح کی روش اختیار کرکے اہل اسلام اور مخالفین اسلام کی نگاہوں میں ہر دلعزیز بن جائینگے۔مگر خداوند عالم رسول کو دھوکہ دینے کو خود خدا کو دھوکہ دینا قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ خدا

اوراہل ایمان کو کیا دھوکہ دینگے وہ توان کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے کیونکہ وہ عالم الغیب والشھادہ ہے اور جب وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی منافقانہ سازشوں کی اطلاع دے دیتا ہے اور پھر آپ مسلمانوں کو بتا دیتے ہیں اور اس طرح ان کی منافقت کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوٹ جاتا ہے تو ان کی فریب کاری کا وزر و بال خود انہی پر پڑتا ہے اور وہ اس طرح ذلیل وخوار ہو جاتے ہیں کہ نہ ادھر کے رہتے ہیں اور نہ ادھر کے رہتے ہیں مگر ان احمقوں کو اس کا شعور نہیں ہے۔

فِیْ قُلُوْبِہِمْ......الآیۃ

جس طرح مختلف جسمانی و بدنی بیماریاں ہوتی ہیں کوئی چھوٹی اور کوئی بڑی۔ جن کی وجہ سے آدمی کا مزاج حد اعتدال سے نکل جاتا ہے اور نظام صحت میں خلل پڑ جاتا ہے اسی طرح کچھ روحانی بیماریاں بھی ہوتی ہیں کوئی معمولی اور کوئی بڑی سخت جن کی وجہ سے نفس انسانی کے کمال میں خلل واقع ہو جاتا ہے انہی بڑی سخت روحانی بیماریوں میں سے ایک بیماری نفاق بھی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ ''۔ اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھادی ہے۔ البقرہ۔۱۰

خدا کے ان کی اس بیماری کو بڑھانے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ خدا ان کو اپنی توفیق سے محروم رکھتا ہے اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ بیماری بڑھ جاتی ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی اس روش سے اسلام، بانی اسلام اور اہل اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں مگر اس کے برعکس جب خدائے قدیر ان کی شان و شوکت اور عزت و عظمت میں اور اضافہ کر دیتا ہے تو یہ اس سے کڑھتے اور جلتے ہیں جس سے ان کی بیماری میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

الغرض اس بیماری میں اضافہ کرنے کی نسبت خدا کی طرف مجازی ہے حقیقی نہیں ہے۔ ان کے مسلسل جھوٹ بولنے کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنا اسلامی نقطۂ نگاہ سے کس قدر سنگین گناہ ہے۔

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ......الآیۃ۔

چونکہ منافقین ہر وقت فتنہ وفساد پھیلانے اور آتش بغض وعناد فروزاں کرنے میں کوشاں رہتے ہیں اور ان کے برخود غلط ہونے کا عالم یہ ہے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ کیونکہ زمین خدا میں فتنہ وفساد پھیلانا قتل مومن سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ ''اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ'' (سورہ بقرہ آیت۔۱۹۱)۔ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں خدا فرماتا ہے، درحقیقت یہی مفسد ہیں جو خود بھی شک

وانکار کی وجہ سے برباد ہو چکے ہیں اور اپنی مفسدانہ سرگرمیوں کی وجہ سے دوسروں کو بھی خراب و برباد کر رہے ہیں مگر انہیں اس کا احساس نہیں ہے۔

آیات القرآن

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ
هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ
مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ⑮ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ
نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ
ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ⑰

ترجمۃ الآیات

خبردار۔ درحقیقت وہی فساد پھیلانے والے ہیں لیکن انہیں شعور نہیں ہے۔ (۱۲) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟ خبردار۔ یہی لوگ خود بیوقوف ہیں لیکن جانتے نہیں ہے (۱۳) اور یہ لوگ جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ان (مسلمانوں) سے تو ہم صرف مذاق کر رہے ہیں (۱۴) خود اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے

اورانہیں ڈھیل دے رہا ہے اور وہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹک رہے ہیں۔
(۱۵) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی۔ سونہ توان کی تجارت سو
دمند ہوئی اور نہ ہی انہیں ہدایت نصیب ہوئی۔ (۱۶) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے
آگ روشن کی اور جب آگ نے اس کے گردونواح کو روشن کر دیا ہے تو اللہ نے ان کی روشنی
(بینائی) سلب کر لی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا اب انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ (۱۷)

تشریح الالفاظ

(۱) السفھاء — یہ سفیہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں بے وقوف

(۲) مستھزءون — استھزاء کے معنی ہیں ٹھٹھا کرنا۔

(۳) فما ربحت — ربح کے معنی ہیں نفع اور فائدہ

تفسیر الآیات

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ......الآیۃ

اسلام کا اظہار تو یہ منافقین بھی کرتے تھے۔ مگر ان کے قول وفعل کا تضاد اور ان کے اعمال وافعال کی دورنگی دیکھ کر جب مخلص مسلمان از راہ ہمدردی ونصیحت ان سے کہتے تھے کہ تم اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح اور (مخلص اور سچے) لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ جواب میں کہتے تھے کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں۔ جو یک رنگ ہو کر صرف ایک طرف کے ہو کر رہ گئے ہیں اصل عقلمند تو ہم ہیں جو دونوں سے فوائد حاصل کر رہے ہیں کہ اگر کافروں کا فتح ہوئی تو ہم ان کے بھی ساتھی ہیں اور اگر مسلمانوں کو فتح وفیروزی حاصل ہوئی تو ہم ان کے بھی ہمراہ ہیں اسی کا نام تو سیاست ہے خدا فرماتا ہے حقیقی بے وقوف اور احمق تو یہی منافق ہیں جنہوں نے چندروزہ فانی عیش وآرام کو جاودانی زندگی کے مفاد پر قربان کر کے اسے ترجیح دی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اچھوں کو برا اور مخلص اہل ایمان اور اہل حق کو احمق و بے وقوف کہنا باطل پرستوں کا پرانا طریقہ کار رہا ہے۔ اور وہ بھی رو برو نہیں کہتے بلکہ پس پشت کہتے ہیں اور بدزبانی وگلہ گوئی کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں اور اگر سامنے آئیں تو تملق وچاپلوسی سے کام لیتے ہیں اور بچھے جاتے ہیں اور اس طرح صلح کل بن کر مصلحت کے نام پر اپنی منافقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں مگر ان کی عقل پر پتھر پڑے ہوتے ہیں کہ وہ جانتے نہیں ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ......الآية۔

یہ ہے منافقین کی دوغلی اور دوہری پالیسی کی مکمل تصویر کہ جب مخلص اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں اور کفار کے سرغنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اور مسلمانوں سے مذاق کر رہے ہیں۔ خدا فرما رہا ہے کہ اللہ ان سے مذاق کرتا ہے۔

اللهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ......الآية۔

خداوند عالم کی ذات استہزاء، تمسخر اور مکر و فریب جیسے مذموم کاموں سے منزہ و مبرا ہے لہٰذا جب اس قسم کے الفاظ اسکے بارے میں استعمال کئے جائیں تو اس وقت ان الفاظ کے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو مخلوق کے متعلق ان سے مراد لئے جاتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی لفظ کے معنی متعین کرتے وقت اس کی نسبت و اضافت کو بڑا دخل ہوتا ہے لہٰذا جب اس قسم کے الفاظ خدا کے بارے میں استعمال ہوں تو ان کا مطلب ان کاموں کی سزا دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے ثابت کیا ہے کہ ''اصل الاستهذاء الانتقام'' یعنی استہزاء کا مفہوم انتقام لینا ہے یعنی اللہ ان کو ان کی اس حرکت کی سزا دیتا ہے اور ان سے انتقام لیتا ہے اور اس قسم کے لفظوں کا خدا پر اطلاق علم بدیع کی صنعت مشاکلہ کی بنا پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معنی کو دوسرے معنی والے لفظ سے اس لئے ادا کرنا کہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ واقع ہوئے ہیں جیسے:

''وَ مَكَرُوۡا وَ مَكَرَ اللهُ ط وَ اللهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ'' (سورہ آل عمران آیت۔ ۵۴)۔

''وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا'' (سورہ شوریٰ آیت۔ ۴۰)

''فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۹۴)

یہاں خدا نے مکر کی سزا کو مکر، برائی کی سزا کو برائی اور ظلم کے بدلہ کو ظلم سے تعبیر کیا ہے حالانکہ ظلم اور برائی کی سزا عدل و انصاف کہلاتی ہے اس میں کوئی برائی نہیں ہوتی ہے بہرحال وہ لوگ بخیال خویش خدا سے تمسخر کرتے ہیں اور خدا ان کو ان کی اس شرارت کی یہ سزا دیتا ہے کہ دنیا میں ان پر اسلام کے احکام جاری کرتا ہے اور آخرت میں ان سے کفار والا سلوک کرے گا اور انہیں ابدی جہنم میں جھونکے گا۔

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِىۡ......الآية۔

خدائے حکیم نے یہاں منافقوں کی حالت زار، ان کی ذہنی و فکری کشمکش اور سراسیمگی کو دو مثالیں دے کر

اجاگر کیا ہے پہلی مثال ان منافقین کی ہے جو اپنے نفاق میں بالکل راسخ تھے اور محض دنیوی مفاد کی خاطر اظہار اسلام کیا تھا۔ ورنہ اسلام سے انہیں دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا ان کی مثال آگ روشن کرنے والے اور اس سے کچھ استفادہ کرنے والے اور پھر اندھا ہو جانے کی سی ہے بالکل اسی طرح ان منافقین نے کفر کو چھپا کر اسلام کا اظہار کیا اور اس کے بعض فوائد حاصل کئے جیسے نکاح' میراث اور مال و جان کا تحفظ وغیرہ لیکن منافقت کی موت مرنے سے ظلمت عذاب میں گرفتار ہو گئے۔ یا خدا نے جب ان کے نفاق کا پردہ چاک کر دیا تو وہ اہل ایمان میں ذلیل و رسوا ہو گئے اور ابدی سعادت حاصل نہ کر سکے۔

دوسری مثال ان منافقین کی ہے جو فی الجملہ اسلام کی حقانیت سے متاثر تو تھے مگر دنیوی اغراض فاسدہ کے تحت اس سعادت کو حاصل نہ کر سکے۔ ان کی مثال اس موسلا دھار بارش اور اس کی تاریکی میں گرفتار شخص کی سی ہے کہ جس طرح آدمی اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔ (حالانکہ وہ سراسر رحمت ہے اور زمین کی حیات کا باعث ہے) اور اس سے بھاگتا ہے مگر اندھیرا اسے بھاگنے نہیں دیتا اور بجلی کی چمک سے بھی پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسی طرح منافقین اسلام اور قرآن کو پسند نہیں کرتے (حالانکہ وہ سراسر رحمت ہیں اور دلوں کی حیات ابدی کا موجب ہیں) وہ اس سے بھاگتے ہیں مگر بھاگ بھی نہیں سکتے۔ لہٰذا طوعاً کرھاً اس کا اظہار کرتے ہیں مگر اس کے فوائد و برکات سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے کبھی (جب امن کی حالت ہو تو) چلتے ہیں اور کبھی (جب جہاد کا وقت آئے تو) رک جاتے ہیں یا جب فتح ہوتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں اور جب شکست ہوتی ہے تو رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور جب کفار و منافقین کی مذمت سنتے ہیں تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں کہ کہیں ان کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔

بالآخر خدا انہیں ان کی منافقانہ روش و رفتار پر ذلیل و رسوا کر دیتا ہے جو پہلے دن بھی کر سکتا تھا مگر وہ عجلت سے کام نہیں لیتا ہے بہرکیف ارشاد خداوندی ہے کہ یہ منافقین دنیا میں تو استعارہ و کنایہ کے طور پر بہرے' گونگے اور اندھے ہیں مگر آخرت کے دن اور آتش دوزخ کی لپیٹ میں آ کر صحیح معنوں میں بہرے' گونگے اور اندھے ہو جائینگے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

''وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ط مَاْوٰاهُمْ جَهَنَّمُ''۔ یعنی قیامت کے دن ہم ان کو اندھا محشور کریں گے اور وہ اس وقت اندھے' گونگے اور بہرے ہوں گے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت۔ ۹۷) یہ ہے خلاصہ اس تفسیر کا جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے۔ (برھان)

آیات القرآن

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ
ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ
حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾ یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ
اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ
قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی
كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ
وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ
فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ
الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمۃ الآیات

پس وہ ایسے بہرے، گونگے اور اندھے ہیں کہ اب (گمراہی سے راہ ہدایت کی طرف) نہیں لوٹیں گے۔ (۱۸) یا (پھر ان کی مثال ایسی ہے جیسے) آسمان سے زوردار بارش برس رہی ہو جس میں تاریکیاں ہوں۔ اور گرج چمک بھی اور وہ گرنے والی بجلیوں سے مرنے کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں۔ حالانکہ اللہ ہر طرف سے کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ (۱۹) قریب ہے کہ بجلی (کی چمک) ان کی آنکھوں کو اچک لے (انہیں خیرہ کردے) جب بجلی ان کیلئے اجالا کرتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت و بصارت (سننے اور دیکھنے کی طاقت) کو زائل کر دیتا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۰) اے لوگو! اپنے

اس پروردگار کی عبادت (پرستش) کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انہیں بھی جو تم سے پہلے ہو گذرے تا کہ تم پرہیزگار بن جاوٗ۔ (۲۱) وہی (پروردگار) جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا اور آسمان کا شامیانہ لگایا (اور اسے چھت بنایا) اور آسمان (بلندی) سے پانی برسایا۔ اس سے تمہاری روزی کے لئے کچھ پھل برآمد کئے سوجان بوجھ کر (کسی کو) اللہ کا ہمسر و شریک نہ بناوٗ۔ (۲۲)۔

تشریح الالفاظ

(۱) صمٌ بکمٌ عمیٌ صمٌ اصم کی جمع ہے جس کے معنی بہرے کے ہیں بکمٌ ابکم کی جمع ہے جس کے معنی گونگے کے ہیں اور عمیٌ اعمی کی جمع ہیں جس کے معنی اندھے کے ہیں (۲) کصیّب صیبٌ کے معنی ہیں بارش والا بادل

(۳) انداداً یہ ندٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مثل اور نظیر

تفسیر الآیات

یَاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا ...الآیۃ۔

خداوند عالم جب سابقہ بیس آیات میں مومنین کافرین اور منافقین کے صفات حالات اور واقعات کا تذکرہ فرما چکا تو اب تمام بنی نوح انسان کو اپنی عبادت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے جو انسان کی خلقت کی غرض وغایت ہے اور جس کی خاطر قرآن نازل ہوا ہے۔

عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی بقدرت ضرورت سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بذیل آیہ ''ایاك نعبد و ایاك نستعین'' میں وضاحت کی جاچکی ہے خدا کی عبادت کیوں کی جائے؟ اس لئے کہ وہ ہمارا پروردگار ہے' ہمارا مالک ومختار ہے اور پالنہار ہے اور ہمارا اور ہمارے آباء واجداد کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے اس نے ہمیں ان انفسی احسانات کے علاوہ کچھ آفاقی انعامات سے بھی نوازا ہے۔ اس نے ہمیں آرام پہچانے اور زندگی کی گاڑی با آسانی چلانے کی خاطر زمین کا بچھونا بچھایا اور آسمان کا سائبان لگایا' بادلوں سے بارش برسائی اور اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس سے ہر قسم کی پیداوار پیدا کر کے ہماری روزی کا انتظام فرمایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاجروں کی طرح جنت کے طمع ولالچ میں یا نوکروں کی طرح جہنم کے خوف وڈر کی وجہ سے خدا کی عبادت نہیں کرنی

چاہیے بلکہ خدا کو منعم و محسن اور لائق عبادت سمجھ کر آزاد بندوں کی طرح اس کی عبادت کرنی چاہیے (جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے)۔

اس عبادت کی غرض کیا ہے؟ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ قرآن نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" (تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ) اور پرہیزگار بن کر جنت الفردوس کے حقدار بن جاؤ۔ اس سورہ کے آغاز میں بذیل "هدى للمتقين" تقویٰ کی لغوی وشرعی حقیقت اور متقیوں کے صفات پر گفتگو کی جا چکی ہے مزید برآں گزارش ہے کہ اتباع ہوا وہوس کی ضد کا نام تقویٰ ہے اور اگر ہم حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم اور ہر عبادت کا مقصد انسان کے اندر روح تقویٰ کا پیدا کرنا اور بیدار کرنا ہے۔ روزہ رکھنے کا مقصد تقویٰ ہے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۸۳) حج کرنے کا ہدف تقویٰ ہے "فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (سورہ حج آیت۔ ۳۲)"۔

زیر بحث آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی ساری عبادات' کا منشا تقویٰ کا حصول ہے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" اسلام میں معیار فضلیت تقویٰ ہے۔ "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ" (سورہ حجرات آیت۔ ۱۳)۔ خدا عمل اہل تقویٰ کے قبول کرتا ہے "قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (سورہ مائدہ آیت۔ ۲۷)"۔ اللہ کے محب اہل تقویٰ ہیں۔ "اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (سورہ انفال آیت۔ ۳۴)" اللہ کے محبوب اہل تقویٰ ہیں۔ "اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (سورہ توبہ آیت۔ ۴، ۷)"

حضرت علی۔ کے غلام اہل تقویٰ ہیں۔ لا نہ امام المتقین۔ قرآن سے فیض والے اہل تقویٰ ہیں "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" (سورہ بقرہ...... ۲) آخرت میں کامیاب ہونے والے اہل تقویٰ ہیں "وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (سورہ اعراف...... ۱۲۸)" اور سب سے بڑھکر جنت الفردوس میں جانے والے اہل تقویٰ ہیں "اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ" (سورہ طور...... ۱۷)۔ بہر نوع محسن و منعم حقیقی کے ان تمام احسانات و انعامات کے تقاضے دو ہیں ایک یہ کہ ہم صرف اسی کی خالص عبادت کریں۔ اعبد و الله مخلصين له الدين کسی اور کی عبادت نہ کریں دوسرے یہ کہ اس کی توحید خالص کا اقرار کریں اور کسی اور کو اس کا مقابل اور شریک نہ بنائیں۔ "فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا" (سورہ بقرہ آیت۔ ۲۲)۔ کیونکہ خدا والے کام کوئی اور انجام نہیں دے سکتا جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔

"اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ

مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ''۔اللہ وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہاری روزی کا بندوبست کیا ہے پھر (ایام زندگی پورے ہونے پر) تمہیں موت کا مزا چکھاتا ہے پھر تمہیں زندہ فرمائے گا۔ (اے مشرکو) جن کو تم خدا کا شریک بناتے ہو ان میں کوئی ایسا ہے جو خدا والے یہ کام انجام دے سکے؟ (پھر خود جواب دیتا ہے) خدا اس سے پاک ہے جو کچھ مشرک اس کے بارے میں کہتے ہیں۔ (سورہ روم آیت۔۴۰)

پھر مقام ربوبیت اور شان الوھیت کی مزید وضاحت پارہ نمبر ۲۰ کے پہلے رکوع میں کی گئی ہے جہاں پورے پندرہ ایسے کام تفصیل سے گنوائے گئے ہیں جو مقام الوہیت سے مخصوص ہیں ان آیات محکمات سے روز روشن کی طرح یہ حقیقت واضح و آشکار ہوتی ہے کہ جو شخص ان امور کی نسبت کسی بھی مخلوق کی طرف دیتا ہے وہ بنص قرآن مشرک ہے اور جو مشرک ہے وہ بنص قرآن نجس ہے ''اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ''(سورہ توبہ آیت ۲۸)۔ اور جو بوجہ شرک نجس ہے۔ اس پر بنص قرآن جنت حرام ہے ''مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ ''(سورہ مائدہ آیت۔۷۲)۔لہٰذا اگر رطب و یابس کے کسی مجموعہ میں کوئی ایسی روایت پائی جاتی ہے جس سے کسی غیر اللہ کا خالق و رازق ہونا ظاہر ہوتا ہے تو مخالف قرآن و اسلام ہونے کی وجہ سے اسے غالیوں ونصیریوں کی من گھڑت سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینکا جائیگا جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار کی جلد ہفتم میں' فاضل لکھنوی نے استقصاء الافحام میں اور دوسرے اعلام نے اپنی تحقیقی کلامی کتابوں میں اس امر کی صراحت فرمائی ہے اس موضوع کی دیگر تفصیلات معلوم کرنے کے خواہشمند حضرات ہماری کتاب احسن الفوائد اور اصول الشریعہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

ایک ضروری وضاحت

آگے بڑھنے سے پہلے زمین وآسمان کی حقیقت اور دیگر بعض دوسری کائناتی چیزوں کی حقیقت کے بارے میں اجمالاً اس قدر عرض کر دینا فائدہ سے خالی نہیں ہے کہ'' قرآن مجید میں زمین وآسمان اور دیگر کائنات عالم کا جو ذکر ہے وہ اس مقصد کیلئے نہیں ہے کہ ان کی حقیقتوں اور ماہیتوں کو بیان کیا جائے بلکہ ایک تو ان کے افادی پہلوؤں کو جو بنی آدم سے متعلق ہیں نمایاں کر کے اللہ کی نعمتوں کا احساس کرانا منظور ہے اور دوسرے ان کی عظمت اور حیرت انگیز خلقت کی طرف توجہ دلا کر خالق کی عظمت وقدرت کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہے۔ زمین چاہے کروی ہو اور چاہے مسطح بہر حال جہاں تک ہمارے لئے اس کے کارآمد اور محسوس پہلو کا تعلق ہے وہ ایک بچھونے ہی کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں خاص توجہ دلانے والا جزء یہ ہے کہ یہ بچھونا کس نے قرار دیا؟ ظاہر ہے کہ اسی نے

جس نے زمین کو خلق فرمایا اسی طرح آسمان وہ کوئی ٹھوس جسم ہے یا سیال مادہ ہے اسے قرآن کچھ نہیں بتاتا۔ بے شک اس کی محسوس شکل جو ہر آنکھ کے سامنے ہے وہ یہی ہے کہ وہ ہمارے سروں پر ایک چھت کی طرح بلند ہے بس اسی کو سامنے رکھ کر اس کے خالق کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اس کو سائنس اور ریاضی کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی حقیقتوں کو معلوم کرنے کے میدان میں فہم بشری کو تگ ودو کی پوری آزادی حاصل ہے۔ السماء کی لفظ جو پہلی دفعہ ہے وہ تو آسمان کے معنی میں ہے اور دوسری جگہ اس کی سمت یعنی اوپر کا رخ مقصود ہے۔ عربی میں بلندی کے رخ کی ہر شے کو سماء کہتے ہیں''۔ (فصل الخطاب)

سبحان اللہ۔ قرآن نے توحید کے نازک مسئلہ کو کس طرح فطری اور دلنشین اور موثر انداز میں ذہن نشین کرایا ہے جس سے عوام وخواص یکساں مستفید ہوتے ہیں بخلاف فلسفہ؍ حکمت کی کتابوں کے اور ان کی فنی باریکیوں، بھاری بھر کم علمی اصطلاحات اور پیچیدہ استدلالات کے کہ وہ انسان کے دل ودماغ کو مرعوب تو کر سکتے ہیں مگر اسے دولت یقین وایمان سے لبریز نہیں کر سکتے۔ سچ ہے۔

پائے استدلالیاں چوبین بود
پائے چوبین سخت بے تمکین بود

آیات القرآن

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٢٣ فَاِنْ لَّمْ
تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ
اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝٢٤ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ
قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ
اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڰ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٢٥

ترجمۃ الآیات

اور جو کچھ (قرآن) ہم نے اپنے بندہ (خاص) پر نازل کیا ہے اگر تمہیں اس (کے کلام اللہ ہونے) میں شک ہے تو تم اس کے مانند ایک ہی سورہ لے آؤ۔ اور اگر تم سچے ہو تو ایک اللہ کو چھوڑ کر اپنے سب حمایتیوں و ہم نواؤں کو بھی بلا لو۔ (۲۳) لیکن اگر تم یہ کام نہ کر سکو اور ہرگز ایسا نہیں کر سکو گے تو پھر (دوزخ کی) اس آگ سے ڈرو۔ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔ (۲۴) اور (اے رسول) ان لوگوں کو خوشخبری دے دو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ کہ ان کیلئے (بہشت کے) ایسے باغ ہیں کہ جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں جب بھی انہیں ان (باغات) سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ (اس کی صورت دیکھ کر) کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں (دنیا میں) کھانے کو مل چکا ہے حالانکہ انہیں جو دیا گیا ہے وہ (صورت میں دنیا کے پھل سے) ملتا جلتا ہوگا (ذائقہ الگ ہوگا) اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان (بہشتوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۵)

تشریح الالفاظ

(۱) شھداء کم یہ شہید کی جمع ہے جس کے معنی ہیں گواہ، گواہی میں امین، اللہ کی راہ میں مارا جانے والا، حمایت کار

(۲) وقود وقود کے معنی ہیں ایندھن

تفسیر الآیات

قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ خالدہ ہے

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی صحت و صداقت کا وہ معجزہ ہے جو آپ کے اعلان نبوت سے لے کر آج تک معجزہ تھا، معجزہ ہے اور آفتاب قیامت کے طلوع ہونے تک معجزہ رہے گا۔ معجزہ جو کہ اعجاز سے ہے جس کے لغوی معنی عاجز کرنے والا کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں خدائے قدیر کے اس

خارق عادت (مجرائے طبیعی کے خلاف) فعل کا نام ہے جسے وہ اپنے کسی نبی یا اس کے وصی کے دعوائے نبوت و وصایت کے وقت بطور سند ان کی نبوت و وصایت کی صداقت ثابت کرنے کی غرض سے اس کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے (کتب کلامیہ)

یہی وجہ ہے کہ اس کی نسبت خدا کی طرف بھی ہوتی ہے اور معجز نما (نبیؑ و امامؑ) کی طرف بھی۔ ہاں البتہ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہ نسبت خدا کی طرف حقیقی ہوتی ہے کیونکہ وہی اپنی قدرت کاملہ سے یہ معجزہ ظاہر کرتا ہے اور نبی و امام کی طرف مجازی ہوتی ہے کہ ان کی دعا و استدعا پر ظاہر ہوتا ہے خدائے حکیم نے ہر نبی کو اس کے زمانہ کی ضرورت کے مطابق معجزہ دیا ہے۔

خداوند عالم جہاں قادر ہے وہاں علیم بھی ہے اور جہاں علیم ہے وہاں حکیم بھی ہے اس لئے اس نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے مختلف اعصار و ادوار میں ہر ہر نبی کو وہ معجزہ دیا (ظاہر فرمایا) جس کی اس دور میں ضرورت تھی۔ الغرض جس عہد میں جس چیز کا زیادہ چرچا تھا اور جس پر لوگ زیادہ فخر و ناز کرتے تھے اس دور کے نبی کو اسی قسم کا معجزہ دے کر ان لوگوں کا غرور و پندار خاک میں ملا دیا چنانچہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے دور میں سحر و ساحری کا بڑا زور تھا تو خدائے علیم و حکیم نے جناب موسیٰ کو ید بیضا اور عصاء کے اژدھا بننے کا معجزہ دے کر سب جادوگروں کو عاجز کر دیا جب عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب و حکمت کا بڑا چرچا تھا تو خدائے خبیر و قدیر نے ان کو نابینے کو بینا اور مردے کو زندہ کرنے کا معجزہ دے کر سب طبیبوں اور حکیموں کو عاجز و درماندہ کر دیا اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد معدلت انگیز میں لوگوں کو اپنی فصاحت و بلاغت، طاقتِ لسانی اور قادر الکلامی پر بڑا فخر و ناز تھا اور اسے ہی سرمایہ افتخار قرار دیا جاتا تھا حتی کہ عرب اپنے مقابلہ میں کل کائنات کو اعجم (گونگا) سمجھتے تھے تو قادر و قیوم خدا نے آنحضرت کو فوق العادہ فصاحت و بلاغت کا وہ شاہکار (قرآن) عطا فرمایا جس نے تمام فصحاء و بلغاء کی زبانوں پر تالے لگا دیئے چنانچہ خداوند عالم نے تمام منکرین رسالت کو عموماً اور عالم عرب کو خصوصاً چیلنج کیا کہ اگر تمہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک ہے تو اس جیسی کوئی کتاب بنا کر لاؤ۔

جب کچھ مدت تک انتظار کرنے کے باوجود ایسی کتاب نہ لا سکے تو قرآن نے یہ کہہ کر ان کی غیرت و حمیت پر تازیانہ لگایا کہ

"قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ"۔ (کہہ دیجئے کہ اگر تمام انس و جن متحد ہو کر بھی کوشش کریں کہ اس جیسی کتاب لائیں تو ہرگز نہیں لا سکیں

گے)۔(سورہ بنی اسرائیل آیت ۔۸۸)

مگراس کے باوجود جب وہ ایسا نہ کر سکے تو قرآن نے اپنے چیلنج میں قدرے نرمی کرتے ہوئے دوسرا علان فرمایا کہ

''فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ''(سورہ ھود آیت ۔۱۳)

کہ اگر پورے قرآن جیسی کتاب نہیں لا سکتے تو اس اس جیسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لاؤ۔یہ دوسرا تازیانہ تھا جوان کی جوادطبع کو مہمیز کرنے کیلئے انہیں لگایا گیا مگر وہ اسے بھی شیر مادر کی طرح پی گئے۔تو جب خداوند عالم نے بموجب ''دروغگو را باید تا خانہ اش رسانید''اس چیلنج کو یہاں تک نرم کردیا کہ فرمایا:

''اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ''۔جو کچھ خدا نے اپنے بندہ(خاص) پر نازل کیا ہے۔(اس کے کلام اللہ ہونے میں) اگر تمہیں کچھ شک ہے تو اس کے مانند ایک سورہ ہی لے آؤ۔(سورہ بقرہ آیت ۔۲۳)

یہاں خدا نے ان کو ایک اور تازیانہ عبرت رسید کیا۔فرمایا: ایک اللہ کو چھوڑ کر اپنے سب حمایتوں اور ہم نواؤں کو بھی بلالو۔اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔مگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے اور نہ قیامت تک کر سکیں گے۔

لہٰذا جب تم انفرادی واجتماعی کوشش وکاوش سے بھی ایسا نہ کر سکو تو پھر تسلیم کرلو کہ یہ کسی فوق البشر طاقت کی قدرت کا کرشمہ ہے۔قرآن مجید کی بعض سورتیں تو دوسو چھیاسی آیتوں پر مشتمل ہیں جیسے سورہ بقرہ اور بعض صرف تین آیتوں پر مشتمل ہے جیسے سورہ العصر تو مخالف اسلام طاقتوں کیلئے کتنا ہی سہل طریقہ تھا۔کہ کم از کم تین آیتوں کی کوئی سورہ بنا کر پیش کر دیتے تو اس طرح جہاں قرآن کے اس چیلنج کا جواب ہوجاتا وہاں اسلام وقرآن کی صداقت کا خاتمہ بھی ہوجاتا۔مگر مشاہدہ شاہد ہے کہ مشرق ومغرب کے دشمنان اسلام وقرآن چودہ سو سال کی مسلسل جدوجہد اور کدوکاوش کے باوجود آج تک جبکہ پندرھویں صدی کا بیسواں سال بھی قریب الاختتام ہے اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے اور نہ ہی قیامت تک دے سکیں گے انشاء اللہ۔

تو آیا اس کے بعد بھی قرآن کے کلام اللہ ہونے'اسلام کے دین برحق ہونے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برحق نبی ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے؟ اور کسی بھی منصف مزاج شخص کے لئے انکار کی کچھ گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ اس لئے خدا ایسے لوگوں کو یہ دھمکی دینے میں حق بجانب ہے کہ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

قرآن کے وجوہ اعجاز

اب رہی اس بات کی تحقیق کہ قرآن کن وجوہ کی بنا پر معجزہ ہے؟ اس سلسلہ میں اختلاف فکر ونظر پایا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل ہم نے مقدمہ میں شرح و بسط سے بیان کر دی ہے۔ یہاں اجمالاً اس قدر عرض کیا جاتا ہے کہ قرآن کی اعجازی حیثیت کے بارے میں مختلف علماء کے آراء ونظریات مختلف ہیں۔ کوئی اسے فوق العادت فصاحت و بلاغت کی وجہ سے معجزہ سمجھتا ہے تو کوئی اس کی فوق العادہ تاثیر بے نظیر کو وجہ اعجاز قرار دیتا ہے۔ کوئی اس کے بیان کردہ قصص و حکایات کی صحت وصداقت کو اس کے کلام اللہ ہونے کی دلیل سمجھتا ہے تو کوئی اخبار غیبیہ کی حقانیت کو اس کی حقانیت کا بین ثبوت جانتا ہے اور کوئی اس کے انوکھے طرز استدلال واحتجاج کو اس کے خالق فطرت کے کلام معجز نظام ہونے کا برہان قرار دیتا ہے اور کوئی اس کے کامل واکمل عادلانہ نظام شریعت اور اس کے تعلیم کردہ اخلاق عالیہ کو اس کے کلام خدا ہونے کی ناقابل رد دلیل تصور کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

عباراتنا شتی و حسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معجزہ خالدہ عطا کرنے کی وجہ

چونکہ انبیاء ماسلف کی نبوتیں محدود زمان و مکان کیلئے تھیں اس لئے خدائے حکیم نے ان کو معجزات بھی وہ عطا فرمائے جو صرف ان انبیاء کے عین حیات تک باقی رہے چنانچہ آج نہ جناب خلیل خدا ہیں اور نہ ان کا معجزہ گل وگلزار نہ جناب موسیٰ۔ ہیں اور نہ ان کا ید بیضاء وعصا۔ اور نہ جناب عیسیٰ علیہ السلام دار دنیا میں موجود ہیں نہ ان کا معجزہ ابراء اکمہ و احیاء موتی۔ لیکن چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت خاتمیہ مکان وزمان کے حدود و قیود سے ماوراء تھی اور ان کی نبوت نے صبح قیامت تک باقی رہنا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ ان کو دوسرے جز وقتی معجزات کے علاوہ ایک ایسا معجزہ خالدہ بھی عطا کیا جاتا جس کی اعجازی حیثیت قیامت تک برقرار ہے۔ بس یہ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہی معجزہ خالدہ ہے۔

اچھی چیز کا شوق اور بری چیز کا خوف انسانی فطرت میں داخل ہے

اچھی چیز کی طلب اور اسے حاصل کرنے کی خواہش بری چیز سے نفرت اور اس سے بچنے کی تمنا خالق حکیم نے ہر شخص کی فطرت میں ودیعت کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص خود نیک ہو یا بد فطرتاً اچھی خوراک، اچھی پوشاک، اچھی سواری، اچھے مکان۔ اچھے ساز وسامان، اچھے بیوی بچوں، اچھے مذہب، اچھے نبی وامام کا خو

اہشمند نظر آتا ہے اور ہر شخص خواہ نیکوکار ہو یا بدکار، بری پوشاک، برے مکان، بری جائیداد، بری اولاد اور برے یار سے نفور و گریزاں نظر آتا ہے اور چونکہ ملت و مذہب کی مذہبی تعلیم کے مطابق جنت سب سے اچھی جگہ کا نام ہے اور جہنم سب سے بری جگہ کا نام۔ اس لئے ہر شخص خواہ وہ پرہیزگار ہو یا بدکار جنت کا طلبگار نظر آتا ہے اور جہنم سے پناہ مانگتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انسان کے اسی فطری جذبہ کے تحت ہر ملت و مذہب کے مذہبی لٹریچر میں بڑے دلآویز انداز میں جنت کی رغبت اور اس کا شوق دلایا گیا ہے اور بڑے خوفناک انداز میں جہنم سے نفرت اور اس کا خوف دلایا گیا ہے۔

خدا نے بھی انسان کے اس فطری جذبہ کی عکاسی کرتے ہوئے فرمایا:

''اَيَطۡمَعُ كُلُّ امۡرِیٴٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّدۡخَلَ جَنَّةَ نَعِيۡمٍ''۔ ہر شخص کے اندر یہ طمع ولالچ پایا جاتا ہے کہ اسے جنت نعیم میں داخلہ مل جائے۔ (سورہ معارج آیت۔ ۳۸)

یہ الگ بات ہے کہ جدھر سب لوگ جانا چاہتے ہیں ادھر بہت کم خوش قسمت لوگ جائیں گے اور جدھر کوئی بھی نہیں جانا چاہتا ادھر بہت زیادہ بدبخت لوگ جائیں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا سادہ اور صاف جواب یہ ہے کہ جنت میں جانا تو سب لوگ چاہتے ہیں مگر اکثر لوگوں کو جنت میں جانے کا طریقہ کار معلوم نہیں ہے اور جہنم سے بچنا تو سب چاہتے ہیں مگر اکثر لوگوں کو اس سے بچنے کا سلیقہ معلوم نہیں ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جنت میں جانے اور جہنم سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟

اسلام میں نجات کا دارومدار ایمان اور اچھے کام پر ہے

اگر مختلف ملل و مذاہب کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اہل مذاہب نے اس سوال کا جواب قدرے مختلف دیا ہے یعنی بعض مذاہب نے عقیدہ و ایمان پر زیادہ زور دیا ہے اور عمل کو نظر انداز کر دیا ہے اور بعض نے عمل و کردار کو زیادہ اہمیت دی ہے اور عقیدہ و ایمان کو نظر انداز کر دیا ہے تمام ادیان عالم میں سے دین اسلام ہی واحد دین فطرت ہے جس نے اخروی نجات کے حصول اور جنت میں دخول اور جہنم سے بچاؤ کیلئے ایمان اور نیک کام (عمل صالح) کو یکساں اہمیت دی ہے اور اس گوہر مقصود کو حاصل کرنے کیلئے دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے جسے شک ہو وہ پورے قرآن اور پورے دفتر احادیث کا بنظر غائر اور عمیق نگاہ سے مکرر سہ مکرر مطالعہ کرے ہر جگہ اسے ایمان کے ساتھ نیک کام اور نیک کام کے ساتھ ایمان کا التزام نظر آئیگا کسی جگہ بھی نہ صرف ایمان پر دخول جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اور نہ ہی صرف عمل پر جنت کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ نجات کیلئے صرف عقیدہ و ایمان کافی ہے یا کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس مقصد کیلئے

صرف عمل صالح اور نیک کام کافی ہے تو محتاط سے محتاط لفظوں میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے شخص نے یا تو قرآن و حدیث کو پڑھا نہیں ہے اور اگر پڑھا ہے تو پھر اسے سمجھا نہیں ہے۔ ورنہ سارا قرآن اور پورا دفتر حدیث اس حقیقت سے چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

نجات کے سلسلہ میں ایمان اور نیک کام کا باہمی فرق

ہاں البتہ فرق صرف اس قدر ہے کہ اگر کسی شخص میں ایمان ہے۔ مگر کچھ عملی کمزوریاں پائی جاتی ہیں تو خدا کے فضل سے شفعاء کی شفاعت سے یا پھر سزا بھگت کر آخر کار جنت میں داخل ہونے کا نہ صرف امکان ہے بلکہ یقین ہے۔ یعنی ایسا شخص ہرگز مخلد فی النار نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کسی شخص میں ایمان نہیں ہے بلکہ کفر، شرک یا نفاق کی وجہ سے بے ایمان ہے۔ تو وہ ہزار نیک عمل کرے وہ بہر حال مخلد فی النار ہی ہوگا اور اس صورت میں اس کی نجات کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے فرمایا:

''وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ''۔ (اے رسول) ان لوگوں کو جنت الفردوس کی بشارت دے دو جو ایمان لائے اور اس کے ساتھ ساتھ اچھے عمل بھی کئے۔ (سورہ بقرہ آیت۔ ۲۵)

پس اس بشارت عظمیٰ کے استحقاق کیلئے دونوں چیزوں کا وجود ناگزیر ہے اس کے بغیر کوئی اس کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔ بس جہنم سے مکمل نجات کیلئے ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ہونا ضروری ہے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

علامہ سید علی نقی لکھنوی لکھتے ہیں:

''مژدہ کے مستحق کون ہیں؟ وہ جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم میں کسی ایک جگہ بھی جنت اور نعیم آخرت کی بشارت صرف ایمان پر مرتب نہیں کی گئی ہے بلکہ ہر جگہ ایمان کے ساتھ اعمال صالح کا ادا کرنا ضروری سمجھا ہے۔ اس کے بعد کاش ان کی آنکھیں کھلیں جو صرف جماعت مومنین کا لقب اختیار کر کے اپنے کو اعمال صالحہ سے بے نیاز سمجھ لیتے ہیں اور ''مومن'' ہونے کے بعد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی کے بغیر ہی نعمات بہشت کے خواب خوشگوار میں مست ہیں اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف اعمال کی پابندی کرنا اور اصول عقائد کی خبر نہ رکھنا بھی صرف نجات کیلئے کافی نہیں ہے''۔ (فصل الخطاب)

جنت کی بعض نعمتوں کا تذکرہ

خداوند کریم نے جنت کی بے شمار نعمتوں میں سے یہاں صرف دو نعمتوں کا اجمالی تذکرہ فرمایا ہے۔ ایک جنت کے پھلوں کا دوسرا ازواج مطہرات کہ۔ جب بہشتیوں کو جنت میں کھانے کیلئے پھل دیئے جائیں گے تو وہ ان کو دیکھتے ہی کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو ہمیں پہلے بھی (دنیا میں) مل چکے ہیں۔ مگر جب وہ کھائیں گے تو وہی مزہ پائیں گے۔ جس سے ان کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

الغرض دنیا و آخرت کے پھلوں کا ظاہری رنگ وروپ ایک جیسا ہوگا مگر آخرت کے پھلوں کی لذت دنیا کے پھلوں سے بدرجہا زیادہ ہوگی۔ بلکہ ان کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ ہوگی۔ اور تسکین جسم و جان کیلئے زوجائیں ملیں گی خواہ وہ جنت کی حور العین ہوں یا دنیا کی مومن خواتین۔ وہ سب جہان سے اپنے حسن و جمال میں بے مثال ہوں گی۔ وہاں تمام نسوانی کثافتوں اور اخلاقی نجاستوں سے بھی پاک و پاکیزہ ہوں گی۔ اور پھر یہ بہشتی لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے نہ وہاں موت کا کھٹکا ہوگا اور نہ وہاں سے نکالے جانے کا کوئی اندیشہ ہے۔ جس سے ان کی لذت کرکری ہو جائے جیسا کہ دنیائے فانی میں ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس لئے وہ بڑے آرام و اطمینان سے وقت گزار دیں گے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (سورہ حدید آیت۔ ٢١)۔

آیات القرآن

إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ
كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللهِ مِنْۢ
بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي
الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٢٧﴾ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللهِ وَكُنْتُمْ
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾

هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾

ترجمۃ الآیات

بے شک اللہ اس بات سے ہرگز نہیں شرماتا کہ (کسی مطلب کی وضاحت کیلئے) مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی حقیر چیز) کی مثال بیان کرے۔ پس جو لوگ مومن ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ (مثال یقینا) حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایسی مثال سے اللہ کا کیا مقصد ہے؟ اللہ ایسی مثال سے بہت سوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے اور وہ گمراہی میں نہیں چھوڑتا مگر فاسقوں (نافرمانوں) کو (۲۶) جو خدا سے مستحکم عہد و پیمان کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں اور جس (رشتہ) کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے وہ اسے توڑتے ہیں۔ اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں (دراصل) یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (۲۷) بھلا تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو۔ حالانکہ تم مردہ (بے زبان) تھے تو اسی نے تمہیں زندہ کیا (جاندار بنایا) پھر وہی تمہیں موت دے گا پھر وہی تمہیں زندگی دے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۲۸) وہی تو وہ (اللہ) ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے پھر آسماں کی طرف توجہ فرمائی تو سات آسمان ہموار و استوار کر دیئے۔ اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (۲۹)

تشریح الالفاظ

(۱) بعوضه — اس لفظ کے معنی ہیں مچھر

(۲) الفاسقین — یہ فسق سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بدکاری اور نافرمانی

(۳) ینقضون — نقض سے مضارع کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں عہد کو پختگی کے بعد توڑنا اور خراب کرنا

(۴)الخاسرون یہ خسارے اورحسران سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گھاٹا اُٹھانا اور ہلاک ہونا

تفسیر الآیات

اِنَّ اللّٰہ لَایَسْتَحْیٖ......الآیۃ

انسان کا دل و دماغ چونکہ حسیات سے زیادہ مانوس ہے۔اس لئے وہ معقولات کو سمجھنے کیلئے ہمیشہ محسوسات کا سہارا لیتا ہے اور اس طرح حقائق کو بآسانی سمجھ لیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خالق فطرت جا بجا مختلف حقیقتیں لوگوں کو سمجھانے اور ان کے ذہن نشین کرانے کیلئے مثالوں سے کام لیتا ہے۔چنانچہ خود فرماتا ہے:

''وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَ مَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ'' (سورہ عنکبوت آیت۔۴۳)۔

(ہم مثالیں دیتے تو سب لوگوں کیلئے ہیں مگر ان کو سمجھتے وہی لوگ ہیں جو کچھ علم وعقل رکھتے ہیں)

چنانچہ جب اس نے اپنے اسی دستور کے مطابق منافقین کی حالت زار بتانے کیلئے مذکورہ بالا دو مثالیں دیں۔مشرکین کی زجر وتوبیخ کرتے ہوئے مکھی کی مثال دی کہ

''اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ '' (سورہ حج آیت۔۷۳)

جو لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ سب کے سب اکٹھے ہو کر بھی ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے۔

یا جیسے کفار ومشرکین کی سرزنش کرتے ہوئے ان کو مکڑی کی مثال دی:

'' مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ'' (سورہ عنکبوت آیت۔۴۱)

جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا سرپرست ٹھہراتے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے

تو ''بموجب خوئے بدرا بہانہ بسیار'' انہوں نے ان مثالوں کو قرآن کے کلام اللہ نہ ہونے کی دلیل بنالیا کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا وہ اس میں ایسی حقیر چیزوں کی مثال نہ دیتا۔خداوند عالم ان کے جواب میں فرماتا ہے یہ کہ اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ کسی مطلب کی وضاحت کیلئے مچھر یا اس سے بھی زیادہ کسی حقیر چیز جیسے مکھی کی مثال دے کیونکہ یہ بات اس کی شان کے منافی نہیں ہے۔اس لئے کہ مثال کا مقصد کسی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا تو وہ مقصد کبھی کسی بڑی چیز کی مثال سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی کسی حقیر چیز کی مثال

سے مثلاً اگر خدا بتوں کی عاجزی کی مثال مکھی سے نہ دیتا کہ وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر اڑ جائے تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔ تو کیا شیر یا ہاتھی سے دیتا کہ وہ تو اتنے عاجز ہیں کہ ایک شیر یا ہاتھی بھی نہیں بنا سکتے؟ معلوم ہوا کہ ایسے احمقانہ ایراد اور بودے اعتراضات وہی کج فطرت، کند ذہن اور بے سلیقہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جن کے دل و دماغ میں بات سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی ورنہ

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو موتی کی طلب ہے کہ صدف کی

نیز اس قسم کی مثالوں سے بعض اوقات لوگوں کا امتحان لینا بھی مقصود ہوتا ہے کہ ان حقیقتوں کو سمجھ کر اور ان کو تسلیم کر کے اپنے ایمان کا ثبوت کون پیش کرتا ہے اور اپنی ناسمجھی سے ان پر بودے اور رکیک ایراد کر کے اپنی جہالت و ضلالت کا ثبوت کون فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ ایسی ہی مثالوں سے بہت سے لوگ ہدایت حاصل کرتے ہیں اور بہت سوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے اور یہ گمراہی انہی لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو فاسق و فاجر ہوتے ہیں۔

يُضِلُّ بِهٖ......الآية

مفسرین میں قدرے اختلاف ہے کہ یہاں ''يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا'' آیا یہ کفار کے قول کا تتمہ ہے۔ جنہوں نے ان مثالوں کی دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا تھا ''مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا''۔ کہ اللہ کا اس مثال سے کیا مقصد ہے؟ کہ بہت سوں کو اس سے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے۔ کیونکہ

ع

كلام العدى ضرب من الهذيان۔

اور اگر یہ خداوند کا کلام ہے (كما هو الظاهر) کیونکہ کفار کا کلام ''مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا'' پر ختم ہوگیا۔ اور یہ کلام خدا کی جانب سے ان کے ایراد کا جواب ہے تو اس صورت میں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے گمراہ کرنے کی نسبت خدا کی طرف کیوں دی ہے؟ اس قسم کی اور بھی بعض آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جن کا ترجمہ بالعموم یہی کیا جاتا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور یہ ترجمہ کرنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر خدا گمراہ کرتا ہے تو پھر گمراہ ہونے والے کا قصور کیا ہے؟ اور اگر خدا خود گمراہ کرے اور خود ہی بدراہ کرے اور پھر جہنم میں بھی جھونکے۔ تو کیا یہ کھلم کھلا ظلم نہیں ہے؟ اور کیا خدا

ظالموں پر لعنت نہیں کرتا اور کیا اس کا یہ فرمان نہیں ہے کہ ''مَا اللہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ'' خدا اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا (سورہ مومن آیت ۔ ۳۱)۔

دین میں جبر وتفویض نہیں ہے بلکہ اصل معاملہ ان کے بین بین ہے

بہر حال یہ بات علم کلام میں نا قابل رد دلائل و براہین سے ثابت کی جا چکی ہے۔ کہ دین میں نہ جبر ہے کہ بندہ بالکل مجبور ہو اور نہ ہی تفویض ہے کہ بندہ بالکل مطلق العنان اور آزاد ہو بل الامر بین الامرین حق ان دونوں نظریوں کے بین بین ہے۔ یعنی خدا نے انسان کو نیکی اور بدی کی قوت دیکر فاعل مختار بنا دیا ہے کہ چاہے تو نیکی کرے اور چاہے تو بدی کرے مگر اسے اپنے حال پر بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ اس کا امتحان لینے کی خاطر داخلی طور پر ایک طرف اسے عقل سلیم عطا کی ہے جو نیکی کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور دوسری طرف نفس امارہ بھی اس میں ودیعت کیا ہے جو برائی کی طرف دعوت دیتا ہے پھر خارجی طور پر ایک طرف نبی و امام جیسے ہادی پیدا کئے ہیں اور دوسری طرف شیطان جیسے گمراہ کنندہ کو خلق فرمایا ہے اور پھر انسان کو ان میں سے جس کا چاہے حکم مانے جس کا چاہے نہ مانے اس کا اختیار دیا ہے۔

''قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ'' حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ (سورہ کہف آیت ۲۹)

ہاں البتہ اسکی توفیق وخذلان بھی اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یعنی اگر بندہ عقل اور نبی و امام کا حکم مان کر نیکی کرنے کا ارادہ کرے تو توفیق الٰہی اس کے شامل حال ہوتی ہے اور ایسے غیبی اسباب مہیا ہو جاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے بندہ بآسانی وہ نیکی کر گزرتا ہے اور اگر بندہ نفس امارہ اور شیطان کا حکم مان کر برائی کرنا چاہے تو خدا اس سے اپنی توفیق سلب کر لیتا ہے جسے خذلان کہا جاتا ہے۔ اور پھر انسان بآسانی برائی کر گزرتا ہے۔

بنا بریں اگر قرآن وسنت میں کوئی ایسی آیت یا روایت پائی جائے جو موہم جبر ہو یعنی جس سے جبر ظاہر ہوتا ہو تو اسے متشابہہ سمجھ کر اس کی ایسی معقول تاویل کرنا لازم ہوگی جس سے اس کا آیات محکمات اور عقلی مسلمات سے ظاہری تصادم ختم ہو جائے۔ بھلا شیطان بھی گمراہ کرے (فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (سورہ بقرہ آیت ۔ ۳۶)) فرعون بھی گمراہ کرے۔ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ (سورہ طٰہٰ آیت ۔ ۷۹)۔ اور سامری بھی گمراہ کرے اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (سورہ طٰہٰ آیت ۔ ۸۵) اور العیاذ باللہ خدا بھی گمراہ کرے تو

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے ؟

پھر ان میں فرق کیا رہ جائے گا؟۔

موہم جبر آیات کی دو معقول تاویلیں

بنابریں یہاں دو تاویلیں کی جاسکتی ہیں۔(۱) چونکہ ان لوگوں کی گمراہی بظاہر اس مثال کی وجہ سے عمل میں آئی جو خدا نے دی تھی اس لئے مجازاً ان کی گمراہی کی نسبت خدا کی طرف دے دی گئی وباب المجاز واسع (۲) جیسا کہ آیت کے آخری حصہ سے واضح ہے کہ خدا فاسقوں فاجروں کو گمراہی میں چھوڑ تا ہے۔لہٰذا جب آدمی اپنی کج روی اور غلط اندیشی سے گمراہی کو اختیار کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو خدا اس سے اپنی توفیق سلب کر لیتا ہے اور پھر اس طرح انسان بآسانی گمراہ ہو جاتا ہے:

''وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ'' خدا ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیتا ہے انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔(سورہ بقرہ آیت۔۱۷)

یہی تاویل حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے مروی ہے۔(عیون الاخبار)

یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے کئی آیات میں اضلال اور ازاغہ کی نسبت اپنی طرف مکلفین کے عمل بد کی مکافات کے طور پر دی ہے ارشاد ہوتا ہے ''فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ'' جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔(سورہ صف......۵)''كَذٰلِكَ يُضِلُّ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ'' اسی طرح خدا اس کو گمراہی میں چھوڑتا ہے جو اسراف کرنے اور شک کرنے والا ہو۔(سورہ مومن آیت۔۳۴)

خود ہماری زیر بحث آیت میں فرمایا کہ ''وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ'' کہ وہ اس سے گمراہی میں نہیں چھوڑتا۔مگر ان فاسقوں کو جو ''يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ'' جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے پختہ عہد و پیمان کو (عالم الست وغیرہ میں) توڑتے ہیں۔اور اس کی عبادت و اطاعت سے منہ موڑتے ہیں اور خلق و خالق کے وہ تعلقات (حقوق اللہ اور حقوق العباد) جن کو جوڑنے کا اللہ نے انہیں حکم دیا ہے وہ انہیں توڑتے ہیں۔اور مزید برآں خود گمراہ ہو کر اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر کے زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔دراصل یہی بد بخت نقصان اٹھانے والے ہیں۔الحمد للہ علی وضوح الحق و الحقیقتہ۔

فاسق کا مفہوم

مخفی نہ رہے کہ فقہی اصطلاح میں فاسق اس شخص کو کہا جاتا ہے جو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے یا گناہ صغیرہ پر اصرار کرے اور چونکہ فسق کے لغوی معنی خارج ہونے کے ہیں یعنی جو اللہ کی اطاعت سے خارج ہو جائے اور ظاہر ہے یہ خروج کبھی کفر و شرک کے ذریعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔اس لئے کبھی کافر کو بھی فاسق کہہ دیا جاتا ہے۔

''ومن کفر بعد ذلك فاولئك هم الفاسقون۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰه ...الآية

اس آیت مبارکہ میں خدائے حکیم اپنے منکرین کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ تم کس طرح خدا کی ہستی کا انکار کرتے ہو جس کے وجود کی ہزاروں آفاقی وانفسی نشانیوں اور دلیلوں کے علاوہ تم خود سب سے بڑا شاہکار ہو۔

اتزعم انك جرم صغير
و فيك انطوى العالم الاكبر

تم بے جان تھے۔اس نے تم میں جان ڈالی پھر موت دے گا پھر زندہ کرے گا بعدازاں میدان حشر میں لائے گا۔الغرض جس نے تمہیں دو موتوں اور دو حیاتوں کے مرحلہ سے گزارا ہے۔پھر تیسری بار زندہ کر کے میدان حشر میں لائے گا۔

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں

ایک یہ کہ یہاں دو موتوں اور دو حیاتوں سے کونسی موت وحیات مراد ہے؟ محقق مفسرین نے پہلی موت سے وہ موت مراد لی ہے جو نفخ روح سے پہلے نطفہ ومضغہ وغیرہ کی شکل میں ہوتی ہے جبکہ آدمی کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہوتا اور دوسری موت سے مراد وہ طبعی موت ہے جو اپنے مقررہ وقت پر ہر شخص کو آتی ہے اور پہلی زندگی سے مراد یہ دنیوی زندگی ہے جو نفخ روح سے شروع ہوتی ہے اور دوسری زندگی سے وہ برزخی زندگی مراد ہے جو دوسری موت کے بعد قبر میں شروع ہوتی ہے (جس میں نکیرین کا سوال وجواب اور فشار قبر اور شدائد برزخ کا سامنا کرنا ہے) اور اس دوسری زندگی سے قیامت کی زندگی مراد لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے بعد ارشاد قدرت ہے **ثم الیہ ترجعون** پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔اہل علم جانتے ہیں کہ ''**ثم**'' کی لفظ تراخی اور بعد مدت کیلئے آتی ہے یعنی اس حیات کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔مگر جلدی نہیں۔اور یہ جب ممکن ہے۔ دوسری زندگی قبر کی زندگی تسلیم کی جائے۔اور ''**ثم الیہ ترجعون**'' سے قیامت کی زندگی مراد لی جائے اور اگر ''**ثم یحییکم**'' سے قیامت کی زندگی مراد لی جائے تو پھر **ثم الیہ ترجعون** کا کیا محل باقی رہ جاتا ہے؟ کیونکہ حشر میں تو قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد لوگ فوراً بارگاہ رب العزت میں پہنچ جائیں گے جو لوگ برزخ اور اس کے واقعات قبر اور نکیرین کے سوال وجواب کا ثبوت قرآن سے طلب کرتے ہیں۔ان کے لئے اس آیت میں لمحہ فکریہ ہے۔دوسرے یہ کہ جب خداوند عالم یہاں اپنے احسانات گنوا رہا ہے۔تو پھر موت کو اس میں

شامل کرنے کا کیا مطلب ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موت بھی محسن حقیقی کا ایک بہت بڑا احسان ہے ورنہ ۔۔۔ع

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ؟

''تَبَارَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ لا نِالَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ ...'' اور یہ موت ہی ہے جو آدمی کو دنیا کے جھمیلوں سے نکال کر آخرت کی ابدی زندگی اور جنت الفردوس کی طرف لے جاتی ہے۔(سورہ ملک آیت۔۱،۲)

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ...الآیة

انسان کے اشرف المخلوقات اور افضل الموجودات ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ خالق کائنات نے زمین کی تمام چیزیں حضرت انسان کیلئے پیدا کی ہیں۔انسان ہی مخدوم ہے اور باقی ہر چیز اس کی خادم۔لہٰذا اب یہ اس کا کام ہے کہ ہر چیز سے خدمت لے اور اس سے استفادہ کرے اور یہ بات آدم علیہ السلام اور ملائکہ کے قصہ سے بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا نے کس طرح انسان کو مخدوم بنایا۔اب اگر انسان اپنے مرتبہ و مقام کو خود بھول جائے۔اور مخدوم ہوکر خادم بن جائے اور کائنات کا مطلوب ہوکر دنیا کی حقیر چیزوں کا طالب بن جائے۔بلکہ اس قدر راہ راست سے بھٹک جائے اور اپنے مقام و مرتبہ سے اس قدر نیچے آجائے کہ اپنے خالق و مالک اور محسن اعظم کی چوکھٹ کو چھوڑ کر جمادات،نباتات اور حیوانات کو اپنا معبود بنا کر،ان کی پرستش کرتا ہوا نظر آئے کبھی بتوں کو سجدہ کرے تو کبھی جنڈیوں کا طواف کرے اور کبھی گاؤ ماتا کی پوجا پاٹ کرے؟ یاللعجب؟ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں ہے اور اگر کوئی چیز ضرر رساں ہے جیسے مضر صحت اشیاء اور زہریلے جانور وغیرہ تو اگر ان کی خلقت کے فوائد و نقصانات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی خیر کا پہلو ان کے شر کے پہلو پر غالب نظر آئیگا۔جس کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔بہرحال یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ۔۔۔۔۔۔ع

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

چیزوں میں اصل اباحت پر استدلال

علماء کے فتاویٰ میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔کہ اشیاء عالم میں اصل اباحت ہے کہ ہر چیز کو مباح سمجھا جائے جب تک اس کی حرمت کسی شرعی دلیل سے ثابت نہ ہو جو اس کے قائل ہیں وہ اسی آیت سے استدلال

کرتے ہیں کہ:

''هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (سورہ بقرہ آیت ۲۹)''

نیز حدیث شریف میں بھی وارد ہے کہ

''کل شئی مطلق حتی یرد فیه نهی''

ہر چیز مطلق ہے جب تک اس کے بارے میں نہی وارد نہ ہو (وسائل الشیعہ)

اس کے بالمقابل دوسرا قول یہ ہے کہ اشیاء میں اصل حرمت ہے جب تک قرآن وسنت سے کسی چیز کا حلال ہونا ثابت نہ ہو وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز کے انسان کے فائدے کیلئے پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حلال بھی ہو و ھو الاحوط۔ اور اگر خلق لکم میں ''لام'' کو سببیہ قرار دیا جائے کہ زمین کی ہر چیز انسان کی وجہ سے اور اس کے سبب سے پیدا کی گئی ہے یعنی مقصود بالذات انسان ہے اور باقی چیزیں اس کے طفیل میں پیدا ہوئی ہیں تو اس بنا پر اس آیت کا اس اختلافی مسئلہ سے ربط ہی ختم ہو جاتا ہے۔ واللہ العالم۔

ثُمَّ اسْتَوٰی......الآیة

پھر خداوند عالم آسمان کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ جب استوی کا صلہ ''الی'' ہو تو اس کے معنی متوجہ ہونے کے ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلقت آسمان سے پہلے ہوئی ہے۔ جبکہ دوسری جگہ ارشاد قدرت ہے:

''وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا'' (نازعات آیت۔ ۳۰) یعنی آسمانوں کے بعد زمین کو بچھایا۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ زمین کی خلقت تو پہلے عمل میں آئی تھی مگر اسے بچھایا اور قابل استفادہ خلقت آسمان کے بعد کیا گیا تھا (تفسیر کاشف)

اور صاحب فصل الخطاب نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ:

''آسمان ایک واحد شکل میں زمین سے پہلے خلق ہوا۔ اس کے بعد زمین کی تخلیق ہوئی اور زمین کی خلقت کے بعد پھر آسمان کو سات طبقوں پر تقسیم کیا گیا۔ اسی لئے ''استوی'' کے لفظ کے ساتھ ''السماء'' بطور مفرد آیا ہے اور اس کے بعد سبع سموات کی صورت میں اس کے درست کئے جانے کا ذکر ہے''۔ (فصل الخطاب)

آسمان کے ٹھوس ہونے یا صرف حدّنظر ہونے کا بیان:

اب رہی اس بات کی تحقیق کہ آسمان کوئی ٹھوس چیز ہے یا صرف حدنظر کا نام ہے اور اگر حدنظر کا نام ہے تو اس سے آگے کیا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن خاموش ہے کئی بار اس حقیقت کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید سائنس یا ھیئت کی کوئی کتاب نہیں ہے کہ تخلیق کائنات سے بحث کرے قرآن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان اس کائنات ارض وسماء میں غور وفکر کرے اور اس کے خالق و مالک کے وجود اور اس کی قدرت کا اقرار کرے اور اس کی عبادت واطاعت کرے اور اس کے بے کراں انعامات کا شکریہ ادا کرے۔

سات آسمانوں کا تذکرہ

خداوند عالم نے آسمانوں کی تعداد سات بتائی ہے جن کے نام اور اجمالی حالات سے اہل علم واقف ہیں کہ اہل بیت علیہم السلام نے سات آسمانوں سے مشہور سات سیاروں کے مدار مراد لئے ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) کرہ قمر (۲) کرہ عطارد (۳) کرہ زہرہ
(۴) کرہ شمس (۵) کرہ مریخ (۶) کرہ مشتری
(۷) کرہ زحل۔

اب اگر تحقیق جدید سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ ان کی تعداد نو ہے یعنی سات سابقہ بشمول نیپچون اور پلوٹو تو قرآن اس کی نفی نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ بات علم الاصول میں ثابت کی جا چکی ہے کہ عدد کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا (جبکہ شرط کا علی الاشہر اور صفت کا علی الاظہر مفہوم ہوتا ہے) مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ میری ملکیت میں سات کتابیں ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس سے زیادہ کا مالک نہیں ہے اور بنا بریں ہو سکتا ہے کہ سات آسمانوں کا خصوصی ذکر کرنے کا مقصد یہ ہو کہ ان میں کچھ ایسی خصوصیات ہوں جو دوسروں میں نہیں ہیں۔ واللہ العالم بحقائق الکائنات التی یضیق عن احصائها نطاق البیان و الکلام۔ وھو بکل شئی علیم۔

آیات القرآن

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا
اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝۳۰ وَعَلَّمَ اٰدَمَ
الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ
هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝۳۱ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا
عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۝۳۲ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ
بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ
اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُوْنَ۝۳۳

ترجمۃ الآیات

(اے رسول وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ (جانشین) بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو (خلیفہ) بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا۔ اور خون ریزی کرے گا۔ حالانکہ ہم تیری حمد وثناء کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس (پاکیزگی بیان) کرتے ہیں۔ فرمایا: یقیناً میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (۳۰) اور اس (اللہ) نے آدم کو (تمام چیزوں کے) نام سکھائے۔ پھر ان کو (جن کے نام سکھائے تھے) فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو (کہ تم خلافت کے زیادہ حقدار ہو) تو مجھے ان اشخاص کے نام بتاؤ۔ (۳۱) انہوں نے کہا (نقص وعیب سے) تیری ذات پاک ہے۔ ہمیں اس کے سوا جو تو نے ہمیں تعلیم دیا ہے (سکھایا ہے) اور مزید کچھ علم نہیں ہے بے شک تو بڑا علم والا اور بڑی حکمت والا ہے (۳۲) فرمایا: اے آدم! ان کو ان کے نام بتاؤ۔ تو جب آدم نے ان (فرشتوں) کو ان کے نام بتا دیئے تو خدا نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے سب مخفی رازوں کو جانتا ہوں اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کر رہے ہو اور وہ بھی جو تم (اندرون دل) چھپائے ہوئے تھے (۳۳)۔

تشریح الالفاظ

(۱)یسفك الدماء یہ سفک سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بہانا

(۲)ماتبدون وماتکتمون بداوابداء کے معنی اظہار کے ہیں اور (۳) کتمان کے معنی اخفا کے ہیں۔

تفسیر الآیات

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ......الایۃ۔

خداوندعالم نے ہمیں بے شمار رحمتوں سے نوازا ہے ان میں سے بعض اہم نعمتوں جیسے ہمیں خلعت وجودعطا کرنے ہمیں زندہ رکھنے کیلئے زمین وآسمان پیدا کرنے اور ہمارے فائدہ کیلئے کل کائنات بنانے کا مختصر لفظوں میں تذکرہ کرنے کے بعد یہاں ہمارے بابا آدم علیہ السلام کی خلقت اوران کے بے پایاں علم وفضل اوران کی خلافت الٰہیہ کی نعمت کا تذکرہ فرمارہا ہے اور گویا اس پیرایہ میں زبان حال سے فرمارہا ہے کہ تم بھلا کس طرح اس منعم ومحسن خدا کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں ان بے پایاں عنایات وانعامات سے نوازا ہے۔آگے بڑھنے سے پہلے یہاں چند چیزوں پر فی الجملہ تبصرہ کرنا ضروری ہے جس سے آنے والے حقائق کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

۱۔لفظ ''اذ'' کی تحقیق

یہ لفظ ظرف مکان ہے یہ کسی گذشتہ واقعہ کی یاددلانے کے موقع پر آتا ہے جس طرح اذا کسی مستقبل کے واقعہ پر آتا ہے۔یہ فعل مقدر جیسے ''اذکر'' سے محلاً منصوب ہے جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ تصور کرو۔یاد کرو۔اس کے بعد کسی ایسے واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔جو مخاطب کے علم میں ہوتا ہے اور اگر اس کے علم میں نہ ہو تو کم ازکم متکلم کو تو اس کی واقعیت کا اس طرح قطعی علم ہوتا ہے کہ وہ ایک معلوم حقیقت کے طور پر اس کا حوالہ دے سکتا ہے (تفسیر ماجدی وتدبر قرآن)

اس بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ لفظ ''اذ'' سے آغاز کردہ واقعہ کا ہمیشہ مخاطب کے علم میں ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کی طرف توجہ مبذول کرانا ہوتا ہے کہ وہ اسے معلوم کرے اوراس کے نتائج وعواقب میں غور وفکر کرے۔

۲۔لفظِ ’’ملائکہ‘‘ کی تحقیق

لفظ ’’ملائکہ‘‘ جس کے معنی ہیں فرشتے یہ لفظ ’’ملئك‘‘ کی جمع ہے کثرت استعمال کی وجہ سے ہمزہ گرادیا گیا اور اس کی زبر ’’لام‘‘ کی طرف منتقل کر دی گئی اس طرح وہ لفظ ’ملك‘‘ بن گیا ’’ملئك یا الو که (اس بنا پر کہ یہ لفظ اسی سے مشتق ہے) کے معنی پیغامبر کے ہیں جس کا ترجمہ فرستادہ اور فرشتہ ہے چونکہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں تک پیغام رسانی ملائکہ سے ہی متعلق ہے اور وہی اس کام پر مامور ہیں اگر چہ ڈیوٹی سب کی نہیں بلکہ ان میں سے بعض کی ہے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے: ’’اللّٰہ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ‘‘

خدا فرشتوں اور انسانوں میں سے پیغام رساں منتخب کرتا ہے (سورہ حج آیت۔۷۸)

لہٰذا مجازاً سب کو ملائکہ کہہ دیا گیا اور یہ نام ملک اسم جنس بھی ہوسکتا ہے جس کا فرشتوں کے تمام اقسام پر اطلاق ہوتا ہے۔(مجمع البیان)

(۳) فرشتوں پر ایمان کے جزءِ ایمان ہونے اور ان کی حقیقت کا بیان:

دنیا کے ہر قدیم وجدید مذہب میں کسی نہ کسی طرح ملائکہ کے وجود پر ایمان رہا ہے اور بالخصوص دین اسلام میں تو ملائکہ کے وجود پر ایمان رکھنے کو جزء ایمان قرار دیا گیا ہے' قرآن مجید کی آیات متکاثرہ اور احادیث متواترہ ان کے وجود پر دلالت کرتی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟ جو امر قرآنی آیات اور معصومی روایات سے پایہ ثبوت تک پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اجسام لطیفہ نورانیہ رکھتے ہیں اور مختلف شکلیں اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ انبیاء ومرسلین ان کو ظاہری آنکھوں سے بھی دیکھتے تھے ان کو جسم وجسمانیات سے بالکل مجرد قرار دینا' یا عقول یا نفوس فلکیہ یا صرف قوی اور طبائع سے ان کی تاویل کرنا راہ ہدایت سے انحراف کرنے کے مترادف ہے۔اور ایسا کرنا ہرگز روا نہیں ہے جیسا کہ حضرت علامہ مجلسیؒ نے رابع عشر بحار الانوار میں افادہ فرمایا ہے اور برادران اسلامی کے قاضی دوانی نے شرح عقائد اور علامہ تفتازانی نے بھی شرح مقاصد میں ایسا ہی افادہ فرمایا ہے:

’’ان لملآئکۃ اجسام لطیفۃ نورانیۃ قادرۃ علی التشکلات المختلفۃ‘‘

۴۔ملائکہ کی کثرت تعداد

خلاق عالم نے اس قدر کثیر تعداد میں ملائکہ پیدا کئے ہیں کہ ان کی تعداد کو اس کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"والذی نفسی بیدہ لملآئکۃ اللہ فی السّموات اکثر من عد التراب فی الارض وما فی السماء موضع قدم الا و فیہا ملك یسبحہ و یقدسه......الآخر" مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ زمین میں مٹی کے ذروں سے بھی آسمانوں میں فرشتے زیادہ ہیں آسمانوں میں قدم رکھنے کی بھی کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ موجود نہیں ہے جو اس کی تسبیح و تقدیس کر رہا ہے (انوار نعمانیہ وغیرہ)

۵۔ فرشتوں کے مختلف اقسام

آیات و روایات سے فرشتوں کی مختلف قسمیں ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً

(۱) کچھ انبیاء و مرسلین تک خدائی پیغام پہنچاتے ہیں "اللهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا" (سورہ حج آیت۔۷۵)

(۲) کچھ حاملین عرش الٰہی ہیں "اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ" (سورہ مومن آیت۔۷)

(۳) کچھ ملائکہ جنت ہیں "الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ" (سورہ رعد آیت۔۲۳)

(۴) کچھ ملائکہ دوزخ ہیں "وَ مَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً" (سورہ مدثر آیت۔۳۱)

(۵) کچھ کراماً کاتبین ہیں "يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ" (سورہ رعد آیت۔۱۲)

(۶) کچھ ملائکہ محافظین ہیں "وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً" (سورہ انعام آیت۔۶۱)

(۷) کچھ ملائکہ حساب و کتاب ہیں جن کو نکیرین کہا جاتا ہے

(۸) کچھ ملائکہ موت وحیات ہیں "قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ" (سورہ سجدہ آیت۔۱۱)

(۹) کچھ ملائکہ بحار و قفار و امطار ہیں جو دریا بہاتے اور بارش برساتے ہیں

(۱۰) کچھ ملائکہ مدبرات الامر ہیں "فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا" (سورہ نازعات آیت۔۵)

گویا یہ وہ خدا کے آلات و اسباب ہیں جن سے خدا اپنی سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔ اور یہ اس کے اہل کار ہیں۔ یہ خدا کے رشتہ دار یا اس کے شریک کار نہیں ہیں۔ جیسا کہ بعض جاہل لوگ خیال کرتے ہیں۔

۶۔فرشتے معصوم ہیں

تمام ارباب ملل و مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فرشتے معصوم ہیں جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:'بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾'۔(سورہ انبیاء آیت۔۲۶،۲۷)

یہ فرشتے خدا کے وہ مکرم اور عبادت گذار بندے ہیں جو کسی قول وفعل میں اس کے حکم سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ایک اور جگہ فرماتا ہے:

''لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ''(سورہ تحریم آیت۔۶)

اللہ نے ان کو جو حکم دے دیا ہے وہ اس میں اس کی معصیت و نافرمانی نہیں کرتے۔

اگر چہ مشہور یہی ہے کہ فرشتوں کی عصمت بالکل اجباری ہے لہٰذا اگر وہ بالفرض گناہ کرنا بھی چاہیں تو کر نہیں سکتے۔مگر اس صورت میں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اگر فی الواقع ایسا ہی ہے تو پھر ان کا کمال کیا ہے اور ان کی مدح وثناء کرنے کا محل کیا ہے؟ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ تو واقعاً وہ نہیں کر سکتے جیسے وہ گناہ جن کا تعلق خورد ونوش یا جنسی خواہش سے ہے۔کیونکہ یہ چیز خالق نے ان میں خلق ہی نہیں کی۔مگر جہاں تک دوسرے بعض علمی وعملی گناہوں کا تعلق ہے تو اس کے امکان واختیار کی نفی کرنا مشکل ہے اگر چہ مقام عمل میں وہ گناہ کرتے نہیں ہیں واللہ العالم۔

۷۔خدا نے فرشتوں سے یہ گفتگو کس عنوان سے کی تھی کہ ''میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں''؟

یہ بات قابل غور وفکر ہے کہ خداوند عالم نے کس انداز اور کس عنوان سے فرشتوں سے یہ گفتگو کی تھی۔ مشورہ لینے کیلئے؟ اذن طلب کرنے کیلئے؟ یا محض ان کو اطلاع دینے کیلئے؟ ظاہر ہے کہ یہاں یہی آخری بات ہی درست ہے کہ خداوند عالم نے اپنے ارادہ سے فرشتوں کو مطلع فرمایا ہے۔پہلی دونوں شقیں باطل ہیں کیونکہ خدا بے نیاز ہے وہ کسی سے مشورہ لینے یا اپنے کسی کام میں کسی سے اجازت لینے کا ہرگز محتاج نہیں ہے۔خدا نے انساں کی آمد اور اس کی خلقت کا اعلان کر دیا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کا خلیفہ کس کا جانشین؟ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ آدم اور بنی آدم کی خلقت سے پہلے زمین میں نسناس نامی ایک مخلوق موجود تھی۔جس کی حد سے زیادہ عصیاں کاریوں اور سیاہ کاریوں کی وجہ سے خدائے قہار نے اسے

ہلاک و برباد کردیا۔ اوران کی جگہ جناب آدم اوران کی اولادکو پیدا کیا۔ لہٰذا یہ نسناس کے جانشین ہیں۔(۲) جو کچھ وارثان علم قرآن کے ارشادات اور فریقین کے محقق مفسرین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں خدا کی نیابت و جانشینی مراد ہے کہ اس کی زمین میں رشد وہدایت کیلئے خدا کی نیابت کرے کسی کا خلیفہ اور جانشین وہ ہوتا ہے جو اس کی سلطنت میں اس کے نائب کی حیثیت سے اس کے احکام پر عمل کرائے۔ اور اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ یہ اعلان سن کر ملائکہ نے بھی دبے لفظوں میں اپنے استحقاق خلافت کی خواہش ظاہر کی ہے۔

۸۔فرشتوں نے کس بنا پر کہا تھا تو اسے پیدا کر رہا ہے اور خلیفہ بنا رہا ہے جو خون ریزی کرے گا اور فساد پھیلائے گا

یہ بات غور طلب ہے کہ فرشتوں کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی تھی؟ اس سوال کے مفسرین اسلام نے مختلف جوابات دیے ہیں۔

(۱) بعض مفسرین کے اقوال اور بعض آثار سے مستفاد ہوتا ہے کہ انہوں نے سابقہ مخلوق (نسناس) کی عصیاں کاریوں کو بچشم خود دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ مخلوق بھی اسی طرح گل کھلائے گی۔

(۲) بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ انہوں نے انسان کی متضاد چیزوں (جیسے آب وآتش اور خاک وہوا وغیرہ) اور متخالف قومی (غضبیہ وشہویہ وغیرہ) سے خلقت دیکھ کر یہ خیال کیا تھا (۳) بعض محققین کی تحقیق یہ ہے کہ خود خداوند عالم نے ان کو انسان کے حالات وکوائف سے فی الجملہ آگاہ فرمایا تھا۔ جب انہوں نے خداوند عالم سے جناب آدم علیہ السلام کی خلقت وخلافت کا اعلان سنا تو انہوں نے خدا سے ان کے حالات کے بارے میں استفسار کیا اور خدا نے ان کو انسان کے مفصل حالات بتائے۔ (روح المعانی)

ورنہ وہ عالم الغیب نہیں تھے یہی توجیہ احسن اور ملائکہ کے حالات کے زیادہ مطابق ہے۔

۹۔اب رہی اس بات کی تحقیق کہ آیا فرشتوں کی یہ بات بطور اعتراض تھی یا بطور استفہام؟

کہ انہوں نے یہ جان کر کہ انسان خون ریزی بھی کرے گا اور فساد بھی پھیلائے گا اور پھر خلیفہ اللہ بھی ہوگا۔ اس پر اپنے قلبی اضطراب اور تعجب کا اظہار کیا تھا اور اس کی خلقت میں مصلحت ایزدی معلوم کرنا چاہی تھی؟ حقیقت الامر یہ ہے کہ چونکہ فرشتے معصوم ہیں۔ لہٰذا وہ خدا پر اعتراض کریں؟ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا

جا سکتا۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنی عقل اور اپنے علم کے مطابق کہ معصوم اور تسبیح و تقدیس الٰہی کرنے والی مخلوق کی موجودگی میں ایسے انسان کو خلیفہ اللہ بنانے میں کیا حکمت ہے؟ اس کے بارے میں خدا سے استفہام کیا تھا وبس۔ خدا نے یہاں اجمالی جواب دینے پر اکتفا کیا کہ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ بعد ازاں جناب آدم علیہ السلام کا علمی تفوق ظاہر کر کے ان کے اس عہدہ کے لئے حقیقت ثابت فرمائی جس کا فرشتوں نے بھی اعتراف کیا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا......الآية

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ خداوند عالم نے جو اسماء آدم کو تعلیم دے تھے اس سے مراد کیا ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ جب خدا نے علم کے ذریعہ جناب آدم اور فرشتوں کا امتحان لیا۔ تو چاہیے تو یہ تھا کہ دونوں کو اکٹھی تعلیم دیتا پھر امتحان لیتا۔ لیکن صرف آدم علیہ السلام کو تعلیم دی اور فرشتوں کو دی ہی نہیں تو پھر امتحان لینے کا کیا جواز؟

سو پہلے امر کے متعلق عرض ہے کہ عام مفسرین نے کائنات کی تمام اجناس' جمادات' نباتات اور حیوانات' انواع' اصناف اور ان کے افراد کے نام مراد لئے ہیں کہ خدا نے جناب آدم علیہ السلام کو کائنات کی تمام بڑی چھوٹی اشیاء کے نام سکھائے اور بعض آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور بعض مفسرین نے ان اسماء سے مراد ان کے مسمیات ان کے حقائق خواص اور صفات مراد لئے ہیں۔ (مجمع البیان, صافی, المیزان, معانی الاخبار)

اور بعض حضرات نے ان سے مخصوص ذوات مقدسہ کے اسماء گرامی مراد لئے ہیں۔ جس کی تائید مزید اس بات سے ہوتی ہے کہ ''ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ''۔ میں ھم کی ضمیر اور ھؤلاء کا اشارہ بتاتا ہے کہ یہ کچھ صاحبان عقل شخصیتیں ہیں اور امتحان اس بات کا لیا جا رہا ہے کہ ان مسمیات کو دیکھ کر ان کے ناموں کی تطبیق کر کے بتاؤ کہ کس کا کیا نام ہے۔ بعض اخبار و آثار سے مستفاد ہوتا ہے کہ وہ شخصیتیں سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کی تھیں۔ (برہان و نور الثقلین وغیرہ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حافظہ کا نہیں۔ بلکہ ذہانت و فطانت کا امتحان ہے۔ جس میں انسان فرشتوں سے افضل ثابت ہوا ہے۔ (الاء الرحمٰن بلاغی وغیرہ) اور پہلی دو تفسیروں کے مطابق ذوی الارواح والعقول مخلوق کی دوسری مخلوق پر اس کے شرف و مجد کی بنا پر غلبہ دے کر ذوی العقول والے ضمائر و اشارات استعمال کئے گئے ہیں۔

بظاہران دونوں تفسیروں میں کوئی تضادنہیں ہے۔آخر کائنات کی ہر چیز میں یہ ذوات مقدسہ بھی داخل ہیں۔تو اگر بعد میں ان کا خصوصی تذکرہ ہے تو اسے **تخصیص بعد التعمیم** کا نام دیا جاسکتا ہے۔ واللہ العالم۔اور جہاں تک دوسرے امر کا تعلق ہے کہ خدا نے فرشتوں کو یہ تعلیم کیوں نہیں دی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں میں اپنی ساخت,مزاج اور جبلت کے مطابق اس بات کی اہلیت ہی نہیں تھی کہ وہ کائنات کی ہر چیز کا نام,اس کی حقیقت اور خاصیت کو سمجھ سکیں اور پھر معلومات سے مجہولات کا استخراج کرسکیں۔مگر انسان میں اس کی ساخت,فطرت اور جبلت ومزاج کی وجہ سے اس قسم کے علم کے حاصل کرنے کی اہلیت ولیاقت پائی جاتی ہے اور وہ پایاں ناپذیر علمی وعقلی استعداد کا مالک ہے اور یہی بات خداوند عالم ثابت کرنا چاہتا تھا کہ فرشتے اس عہدہ کے اہل نہیں ہیں۔

بہر حال جب اس علمی امتحان میں جناب آدم کامیاب ہوگئے تو ملائکہ نے اعتراف کرلیا کہ:''سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ''(سورہ بقرہ آیت۔۳۲)

اور تسلیم کرلیا کہ جس کا علم وفضل زیادہ ہے خلیفۃ اللہ بننے کا زیادہ حقدار وہی ہے۔اس پر خداوند عالم نے فرمایا:''' میں نے نہیں کہا تھا کہ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے'' اور''اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ''(سورہ مائدہ آیت۔۹۹)اور میں وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو(کہ تم تسبیح وتقدیس کرتے ہو) اور وہ بھی جو تم (اندرون دل) چھپائے ہوئے تھے(کہ شاید اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق خلق نہیں کہ جو ہم سے افضل ہو۔لہٰذا اس خلافت کے ہم زیادہ حق دار ہیں)۔(تفسیر عیاشی وصافی)۔

قرآنی معیار خلافت

اس قرآنی واقعہ سے واضح وآشکار ہوا ہے کہ خلیفہ بنانا خدا کا کام ہے وہ جسے چاہتا ہے اس عہدۂ جلیلہ پر فائز کرتا ہے۔گہنگار مخلوق تو درکنار معصوم مخلوق بھی اجماع کرکے کسی کا انتخاب نہیں کرسکتی اور پھر اس قرآنی واقعہ سے یہ بھی روشن ہوتا ہے کہ خدا جسے اس منصب جلیل کیلئے منتخب کرتا ہے وہ سب سے افضل واعلیٰ ہوتا ہے اور یہ کہ معیار افضلیت اسلامی وقرآنی نقطہ نگاہ سے علم,ایمان,عمل وتقویٰ اور قوت وطاقت ہے۔اسی بنا پر مذہب شیعہ خلافت الٰہیہ کے نصّی ہونے کا قائل ہے۔نہ اجماعی وشورائی وغیرہ کا۔

''وَاللهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ''اللہ بہتر جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون؟(سورہ بقرہ آیت۔۲۲۰)

اگر مدتوں تک شب وروز ہمراہ رہنے کے باوجود فرشتوں کو معلوم نہیں ہوسکا کہ ابلیس جن ہے یا فرشتہ؟

تو عام انسانوں کو کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ انسانی لباس میں ابلیس کون ہے اور حقیقی انسان کون؟ بنابریں خلیفہ کا انتخاب خدا ہی کر سکتا ہے اور یہ بات بالبداہت معلوم ہے کہ اگر جاہلوں کا مجموعہ جاہل ہوتا ہے اور اندھوں کا مجموعہ اندھا تو گنہگاروں کا مجموعہ گنہگار ہی ہوگا نہ کہ عصمت شعار۔ لہٰذا یہ حدیث صحیح نہیں ہے کہ امت غلطی پر اجماع نہیں کر سکتی۔ اس حساس اور نازک موضوع کی جملہ تفصیلات و جزئیات معلوم کرنے کے خواہشمند حضرات ہماری کتاب اثبات الامامت کی طرف رجوع فرمائیں۔

آیات القرآن

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى
وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا
فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ
وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ
كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا
مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

ترجمۃ الآیات

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ ابلیس کے سوا سب سجدہ میں گر گئے۔ اس نے انکار و تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ (۳۴) اور ہم نے کہا اے آدم۔ تم اور تمہاری بیوی دونوں بہشت میں رہو۔ اور اس سے جہاں سے تمہارا دل چاہے مزے اور فراغت کے ساتھ کھاؤ۔ لیکن اس (مخصوص) درخت کے پاس نہ جاؤ

(اس کا پھل نہ کھانا) ورنہ تم زیاں کاروں میں سے ہو جاؤ گے۔(۳۵) تب شیطان نے (اس درخت کے باعث) ان کے قدم پھسلائے۔اورانہیں اس (عیش وآرام) سے نکلوادیا جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا اب تم (زمین پر) اتر جاؤ ایک دوسرے کے دشمن ہو کر اور تمہارے لئے زمین میں ایک خاص وقت تک ٹھہرنے اور فائدہ اٹھانے کا سامان موجود ہے۔ (۳۶) اس کے بعد آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ دعا کے کلمات (حاصل کئے) تو اس نے ان کی توبہ قبول کی کیونکہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔(۳۷) ہم نے کہا تم سب اس سے اتر جاؤ۔ اس کے بعد اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے۔تو ان کیلئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے(۳۸)۔

تشریح الالفاظ

(۱)ابیٰ اباء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں انکار کرنا (۲) رغدًا اس کے معنی فراخ زندگی گزارنے والا

(۳)اهبطوا یہ هبوط سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اترنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا

تفسیر الآیات

اسجدوا لآدم...الآیۃ

جب جناب آدم علیہ السلام کا علمی تفوق اور ان کی ہر طرح افضلیت ثابت ہوگئی تو خداوند عالم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ چنانچہ سب ملائکہ بشمول جبرائیل میکائیل واسرفیل وغیرہ سب کے سب نے سجدہ کیا مگر شیطان نے تکبر کی وجہ سے ابا وانکار کیا۔اور خدا کے اس سوال پر کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا۔خدا کے حکم کو یوں چیلنج کیا کہ

''خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (سورہ اعراف آیت۔۱۲)''

تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا فرشتوں میں سے نہ تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی تصریح موجود ہے کہ: ''کان من الجن فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّه'' یہ شیطان جنوں میں سے تھا سو اپنے پروردگار کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ (سورہ کہف آیت۔۵۰)

اور بخیال خویش یہ سمجھا کہ آگ خاک سے افضل ہوتی ہے کیونکہ وہ اوپر کی جانب جاتی ہے اور خاک نیچے کی طرف۔ اور اپنی ناسمجھی سے یہ نہ سمجھا کہ آگ خائن ہوتی ہے۔ اس میں جو چیز ڈالی جائے وہ اسے جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ اور خاک امین ہوتی ہے کہ اگر ایک دانہ اس کے سپرد کیا جائے تو وہ سات سو دانے واپس لوٹاتی ہے۔ لہٰذا وہ وقت معلوم تک ملعون و مطرود قرار دیا گیا۔ یہاں کچھ وکلائے ابلیس بموجب مدعی سست و گواہ چست اس کی بے جا وکالت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب یہ حکم صرف فرشتوں کو تھا اور شیطان جن ہونے کی وجہ سے اس حکم میں شامل ہی نہ تھا تو اگر اس نے سجدہ نہیں کیا تو اس کا کیا قصور تھا؟ اس شبہ کا جواب واضح ہے کہ یہاں قاعدۂ تغلیب کی بنا پر یقیناً اس کو یہ حکم شامل تھا جب اکثر و افضل کو حکم تھا تو بطریق اولیٰ اقل اور مفضول کو بھی شامل تھا کیونکہ اوامر و احکام وغیرہ میں ہمیشہ مغلوب غالب کے تابع ہوتا ہے جس طرح قرآنی احکام میں ہر جگہ مذکر کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں جب کہ بالاتفاق ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ اور اس بات کی سب سے بڑی دلیل کہ یہ حکم اس کو بھی تھا۔ ایک تو یہ ہے کہ اس کے سجدہ نہ کرنے پر خدا نے اس سے پوچھا کہ تجھے سجدہ کرنے سے کیا امر مانع ہوا؟ اور دوسری یہ کہ شیطان کا جواب میں یہ عذر پیش نہ کرنا کہ بوجہ جنّ ہونے کے یہ حکم تو اس کے شامل حال ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس کا خلقت کی بحث کو چھیڑنا اور ابلیسی قیاس کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ حکم اسے شامل ہے۔

نیز خدائے رحمن اور شیطان کے اس سوال و جواب سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اصل خلقت معیار فضیلت نہیں ہے کہ کون نوری ہے؟ کون ناری ہے؟ اور کون خاکی ہے؟ اس بحث کا آغاز ابلیس لعین نے کیا تھا جس کے مریدان باصفا آج تک اس کی پیروی کرتے ہوئے انہی لایعنی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ نوری کون اور خاکی کون؟ خدائے حکیم نے تو پہلے دن ہی نوریوں کو خاکی کے سامنے سجدہ ریز کر کے اس بحث کا خاتمہ کر دیا تھا کہ اصل خلقت معیار فضیلت نہیں ہے۔ بلکہ علم معیار فضیلت ہے جیسا کہ آدم علیہ السلام اور ملائکہ کے قصہ سے عیاں ہے۔ عمل و تقویٰ ہے جیسا کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (سورہ حجرات آیت۔۱۳)'' سے ظاہر ہے ایمان و عمل صالح ہے جیسا کہ ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (سورہ بیّنہ آیت۔۷)'' سے واضح ہے اور قوت و طاقت ہے جیسا کہ ''اِنَّ اللّٰه

اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (سورہ بقرہ آیت۔ ۲۴۷)'' سے آشکار ہے۔

یہ سجدہ کس قسم کا تھا؟

یہ سابقہ بحثیں تو ضمنی حیثیت کی تھیں اصل بات جو یہاں اہم ہے وہ یہ ہے کہ یہ سجدہ جو فرشتوں سے کرایا گیا، کس قسم کا تھا؟ کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ سجدہ کی دو قسمیں ہیں

(۱) تعظیمی (۲) تعبدیدی

جو مخلوق میں سے کسی بزرگ شخصیت کو کیا جائے اسے سجدہ تعظیمی کہا جاتا ہے اور جو عبادت کے طور پر خدا کو کیا جائے اسے سجدہ تعبیدی کہا جاتا ہے۔ علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اس قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ جناب آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کی خاطر کرایا گیا تھا۔ اور اسی حوالہ سے علامہ سید علی نقی نے بھی فصل الخطاب میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ مگر انہوں نے بھی اور جس مفسر و محدث نے بھی اس قول کو اختیار کیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ وضاحت ضرور کی ہے کہ یہ تعظیمی سجدہ صرف سابقہ شریعتوں اور امتوں میں جائز تھا۔ شریعت اسلامیہ میں ہر قسم کا سجدہ خدا کی ذات سے مخصوص ہے۔ چنانچہ

(۱) علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''محتمل است کہ سجدہ تحیت در امم سابقہ مجوز بودہ باشد, دریں امت حرام شدہ'' (حیات القلوب جلد اول)

(۲) اور علامہ سید علی حائریؒ فرماتے ہیں:

''ورایں سجدہ تعظیمی در امم سلف جاری و ساری الی نزول واذا حییتم بتحیۃ'' بود پس بہ سبب آں سلام مقرر شدہ (لوامع التنزیل جلد ۱)

(۳) اور علامہ علی نقی فرماتے ہیں:

''بے شک اسلام میں اس طریقہ تعظیم کا استعمال غیر اللہ کیلئے ممنوع ہو گیا ہے لیکن قبل الاسلام اس کی ممانعت نہ تھی'' (فصل الخطاب جلد ۱)

(۴) فاضل بریلوی اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

''سجدہ تحیت پہلی امتوں میں جائز تھا ہماری شریعت میں منسوخ کیا گیا۔ اب کسی کیلئے جائز نہیں''۔ (کنز الایمان حاشیہ نمبر ۱۴ ص ۹)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جس بزرگ نے بھی امم سابقہ میں اس سجدہ تعظیمی کے جواز کا تذکرہ کیا ہے یا

اس کے جواز کا احتمال ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس بات کی صراحت کردی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں یہ سجدہ حرام ہے۔ اور اس کی جگہ اب سلام‘ مصافحہ اور معانقہ مقرر ہوا ہے۔ صرف فاضل طباطبائی نے المیز ان میں یہ لکھا ہے کہ:

’’یستفاد منه جواز السجود لغیر الله فی الجمله اذا کان تحیة و تکرمة للغیر ...الخ‘‘

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است؟

مگر جہاں تک ہماری ناچیز تحقیق دقیق کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ سجدہ وہ ذاتی عبادت ہے جو ہر شریعت میں خدا سے مختص رہا ہے اور غیر اللہ کو سجدہ کرنا شرک ہے جس کی حرمت ذاتی ہے جو تخصیص کے بھی قابل نہیں ہے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ہر شریعت میں سوائے اللہ کے حرام رہا ہے۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ عبادت کے معنی کسی ہستی کے سامنے انتہائی درجہ کی عاجزی و تذلل کے اظہار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب ہر قسم کی عبادت ذات خداوندی کیلئے مخصوص ہے جیسا ایاک نعبد کا مفاد ہے۔ تو پھر سجدہ کس طرح کسی اور کیلئے روا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تحقیقی قول یہ ہے کہ خداوند عالم نے جناب آدم علیہ السلام کو قبلہ قرار دے کر اپنی ذات کو سجدہ کرایا تھا۔ جیسا کہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا: کان السجود لله و کان آدم قبلة۔ (احتجاج طبسی)

نبود سجدہ ایشاں از برائے آدم بلکہ آدم قبلہ ایشاں بود از برائے خدا سجدہ می کردند وامر نمود حق تعالیٰ کہ بجانب او روا ورند۔ (حیات القلوب ج اص ۴۲ طبع ایران)۔

فرشتوں کا یہ سجدہ جناب آدم علیہ السلام کیلئے نہیں تھا۔ بلکہ آدم ان کے قبلہ تھے خدا نے ان کو حکم دیا تھا کہ جناب آدم علیہ السلام کی طرف منہ کریں (اور سجدہ خدا کو کریں)۔ بنابریں یہ سجدہ آدم علیہ السلام کو قبلہ سمجھ کر کیا گیا تھا اور جناب یعقوب علیہ السلام، ان کی زوجہ اور ان کی اولاد کا سجدہ۔ جو انہوں نے جناب یوسف علیہ السلام کو زندہ اور وہ بھی مصر کے تخت حکومت پر متمکن دیکھ کر کیا تھا وہ سجدۂ شکر تھا جو بارگاہ خدا میں کیا تھا۔ سجدۂ تعظیمی نہ تھا۔ بنابرایں ’خرّوا له‘‘ میں جو’لام ‘‘ ہے وہ ’’لام‘‘ سببیه ہے کہ انہوں نے جناب یوسف علیہ السلام کی وجہ سے (خدا کو) سجدہ کیا تھا۔ ورنہ ماں باپ اور (باپ بھی نبی) باپ بیٹے کو تعظیمی سجدہ کریں اور بیٹا خاموش رہ جائے۔ (العیاذ باللہ) اس طرح کیا جناب یوسف علیہ السلام کے اخلاق و نبوت پر حرف نہیں آئے گا؟؟ ’’فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (سورہ یونس آیت۔ ۳۵)‘‘

ایک شبہ کا ازالہ

علامہ سید علی نقی نے اس سجدہ کے سجدہ تعظیمی ہونے پر اس چیز سے استدلال کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ بھی اس کے شاہد ہیں کیونکہ سجدہ کی اضافت ''لام'' کے ساتھ ہوئی ہے (لام) جو مسجود کا پتہ دیتی ہے۔ قبلہ کیلئے ''الیٰ'' آنا چاہئے ''لام'' نہیں۔ (فصل الخطاب)

اس کا جواب واضح ہے کہ عربی زبان میں ''لام'' بمعنی ''الیٰ'' استعمال ہوتی رہتی ہے جیسا کہ شاعر کے اس شعر میں استعمال ہوئی ہے۔

ما کنت احسب ان الامر منصرف
عن بنی ھاشم ثم عن ابی الحسن
الیس اول من صلی لقبلتکم
و اعرف النّاس بالقرآن والسنّن

مجھے یہ وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ خلافت جناب ہاشم کے خاندان سے اور بالخصوص جناب ابوالحسن علی علیہ السلام کے ہاتھ سے چلی جائے گی۔ کیا حضرت علی علیہ السلام وہ پہلے شخص نہیں ہیں جنہوں نے تمہارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے؟ اور کیا وہ سب لوگوں سے زیادہ قرآن و سنت کے عالم و عارف نہیں ہیں؟

یہاں ''لقبلتکم'' میں ''لام'' بمعنی ''الیٰ'' استعمال ہوئی ہے۔ تفصیل کیلئے مغنی وغیرہ نحو کی کتب مبسوطہ دیکھی جاسکتی ہیں اور جہاں تک اسلام میں سجدہ تعظیمی و تکریمی کے غیر اللہ کیلئے حرام ہونے کا تعلق ہے تو یہ چیز عیاں راچہ بیان کی مصداق ہے۔ اور سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کے کلام و فرمان اور ان کی سیرت و کردار اور ان کے اخلاق و اطوار سے روز روشن سے بھی زیادہ واضح و آشکار ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اگر اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا روا ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں''۔ (اصول کافی)

ان ذوات مقدسہ کے حین حیات میں کئی لوگوں نے ان کو سجدہ کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی اور ہمیشہ یہی فرمایا کہ ہر قسم کا سجدہ ذات خداوندی کے ساتھ مختص ہے (کتب سیر و سوانح) بے شک اسلام بزرگ شخصیتوں کی تعظیم و تکریم کا حکم دیتا ہے اس سے منع نہیں کرتا۔ مگر اس نے ہر چیز کے کچھ حدود و قیود مقرر کئے ہیں اور وہ ہر معاملہ میں اعتدال کا دامن تھامنے کا حکم دیتا ہے اس لئے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کی تعظیم مین اس قدر جھکا جائے کہ رکوع و سجود سے مشابہت لازم آئے جو کہ ذات خداوندی سے مخصوص

ہیں اس موضوع کی مزید تفصیلات معلوم کرنے کے خواہشمند حضرات ہماری کتاب احسن الفوائد اور اصلاح الرسوم کی طرف رجوع فرمائیں۔

عصمت انبیاء کا بیان

اسْكُنْ اَنْتَ...الآية

اس بات پر تمام امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ جناب آدمعلیہ السلام نبی تھے اور انبیاء کی عصمت کے بارے میں بدقسمتی سے امت مسلمہ میں قدرے اختلاف ہے اور کچھ مسلمان ان کے گناہ وعصیاں کے قائل ہیں, کچھ کبیرہ وصغیرہ میں فرق کرتے ہیں۔ کچھ عمدی وسہوی میں اور کچھ علمی وجہلی میں اور کچھ قبل وبعد نبوت میں تفریق کے قائل ہیں مگر جس بات پر فرقہ حقہ اثناءعشریہ اور دیگر محققین اسلام کی رائے مستقر ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین مہد سے لحد تک ہر قسم کے اعتقادی زیغ وضلال ,اور ہر قسم کے عملی گناہ وعصیاں۔ اور اپنی تمام مقدس عملی زندگی میں ہر قسم کے زلل وخلل سے معصوم ومحفوظ ہوتے ہیں۔''**لا يعصون الله ما امرهم و هم بامره يعملون**'' اور ان ذوات مقدسہ کی عصمت وطہارت پر بے شمار عقلی وشرعی ادلہ وبراہین جن قائم ہیں کا ایک شمہ ہم نے بھی احسن الفوائد واثبات الامامت میں بیان کر دیا ہے۔ باقی سب دلائل وبراہین کو چھوڑ کر یہاں صرف ایک عقلی اور ایک شرعی دلیل کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عصمت انبیاء کی ایک عقلی دلیل

جب نبی ورسول لوگوں کی اعتقادی وعملی اصلاح احوال کیلئے ,اور انہیں شیطان کے چنگل سے آزاد کرانے اور خالق دوجہان کے اوامر ونواہی کی تعمیل کرانے کیلئے آتے ہیں تو اگر خدانخواستہ وہ خود شیطان کی اطاعت شعاری اور خدائے رحمن کی معصیت کاری کرنے لگ جائیں تو پھر بموجب۔۔۔۔۔ع

چوں کفر از کعبہ بر خیز د کجاماند مسلمانی

اور جب خود راہبر گمراہ ہوجائے تو پھر

آں خویشتن است کرا رہبری کند ؟

کیا اس طرح ان کی بعثت عبث و بے کار نہیں ہوجائیگی اور پھر اس کا مقصد کیا باقی رہ جائیگا؟ **تعالى الله عن ذلك علوا كبيراً**۔

عصمت انبیاء کی ایک شرعی دلیل

قرآن کا بیان ہے کہ شیطان کے سجدہ سے انکار کرنے اور اس کے ملعون ومطرود قرار پانے کے بعد اس کے اور خدا کے درمیان کچھ مکالمہ ہوا تھا۔ شیطان نے کہا تھا بارالہا تو نے مجھ پر لعنت کر کے راندہ بارگاہ تو بنا دیا ہے۔ میں بھی تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا اور سب کو گمراہ کروں گا۔ خدا نے فرمایا تھا بے شک تو اپنا سارا زور لگا لینا۔ ''اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَكَ عَلَیۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ''۔ جو میرے مخلص بندے ہوں گے ان پر تیرا کوئی بس نہیں چلے گا (سورہ حجر آیت۔ ۴۲)۔ اور آخر کار شیطان نے بھی یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ ''اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ'' میں تیرے مخلص بندوں کے سوا باقی سب کو گمراہ کروں گا (سورہ حجر آیت۔ ۴۰)۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شیطان نبیوں، رسولوں اور اماموں کو بھی معاذ اللہ گمراہ و بدراہ کر سکتا ہے اور وہ اس کے دام ہمرنگِ زمین میں پھنس کر خدا کی معصیت کاری کر سکتے ہیں تو پھر خدا کے وہ مخلص بندے کون ہیں جو ابلیس کی تلبیس سے محفوظ ہیں؟ لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا کے مخلص بندے یہی انبیاء و مرسلین اور ان کے اوصیاء منتجبین صلوات اللہ علیہم اجمعین ہیں نہ کوئی اور۔ لہٰذا اگر قرآن مجید میں کچھ ایسی آیات پائی جاتی ہیں۔ جن سے ان ذوات مقدسہ کے گناہ وعصیاں کا وہم وخیال پیدا ہوتا ہے تو ان کو متشابہ سمجھ کر ان کی کوئی ایسی معقول توجیہ وتاویل کرنا لازم ہوگی جس سے ان عقلی وشرعی مسلمہ عقیدہ کے ساتھ ان کا یہ ظاہری تضاد وتصادم ختم ہو جائے۔

وہ آیات جن سے جناب آدم علیہ السلام کا گنہگار ہونا ثابت کیا جاتا ہے۔

یہاں جناب آدم علیہ السلام سے متعلقہ آیات جن سے ان کے گناہ وعصیاں پر استدلال کیا جاتا ہے ان کا تذکرہ اور بڑے اختصار کے ساتھ ان کا جواب پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) ان کو ایک مخصوص درخت کے پاس جانے سے روکا گیا تھا۔ مگر وہ اس کے پاس گئے جب کہ نہی حرمت کیلئے ہوتی ہے۔

(۲) خدا نے فرمایا تھا اگر اس درخت کے قریب گئے تو ظالم بن جاؤ گے جبکہ ظلم گناہ ہے۔

(۳) شیطان نے ان کو پھسلایا۔

(۴) جناب آدم علیہ السلام کیلئے لفظ عصیاں وغوایت استعمال ہوا ہے فعطی ربه و غوی اور عصیاں کے معنی گناہ کے ہیں۔

(۵) جناب آدم علیہ السلام کا لباس اتر گیا، جنت سے نکالے گئے اور مفارقت حوا میں گرفتار ہوئے یہ گناہ کی سزا نہیں تو اور کیا ہے؟

(۶) جناب آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور خدا نے توبہ قبول کی ظاہر ہے کہ توبہ گناہ سے ہی کی جاتی ہے۔

(۷) جناب آدم علیہ السلام نے توبہ کے الفاظ میں کہا تھا'' وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (سورہ اعراف آیت۔۲۳)'' اور ظاہر ہے کہ خسارہ گناہ کے ارتکاب سے ہی ہوسکتا ہے

ان ایرادات کے مختصر مگر جامع جوابات

ذیل میں بڑے اختصار کے ساتھ ان اشکالات کے ترتیب وار مختصر مگر جامع جوابات پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) نہی ہمیشہ حرمت کیلئے نہیں آتی۔جس کی خلاف ورزی حرام و باعث گناہ وعصیاں ہوتی ہے۔ بلکہ یہ نہی کبھی تنزیہی وارشادی بھی ہوتی ہے جس کی خلاف ورزی حرام نہیں ہوتی بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے ترک اولی لازم آتا ہے اور دنیا میں زحمت ومشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب مالک غلام سے کہے لاتزن ولاتسرق۔ زنا نہ کر اور چوری نہ کر۔ تو یہ نہی تحریمی ہوگی اور اس کی مخالفت حرام اور جب کہے کہ لا تشتر ھذاا الثوب۔ یہ کپڑا نہ خرید۔ تو یہ نہی ارشادی ہوگی کہ کپڑا خراب ہے۔ اگر خریدے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ یہاں بھی خدا نے فرمایا تھا:

هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ (سورہ طٰہٰ آیت۔۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹)''

یہ شیطان تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے یہ تمہیں جنت سے نہ نکلوائے۔ ورنہ زحمت ومشقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تمہیں اس میں بھوک نہیں لگتی (دنیا میں لگے گی) یہاں ننگے نہیں ہوتے ہو (یعنی دنیا میں لباس اتر جائے گا) اس میں تمہیں پیاس نہیں لگتی (دنیا میں لگے گی) اس میں تمہیں دھوپ نہیں لگتی (دنیا میں دھوپ لگے گی)

چنانچہ اس درخت کا پھل کھانے سے یہ سب کچھ ہوا۔ یہ کسی گناہ کی سزا نہیں تھی بلکہ اس درخت کے پھل کا اثر وضعی تھا جو ظاہر ہوا۔ اور اسی ضرروزیاں سے محفوظ رہنے کیلئے خدا نے راہنمائی کی تھی کہ اس کے قریب نہ جانا ورنہ زحمت اٹھانا پڑے گی۔

(۲) ظلم کے ایک معنی ہیں وضع الشئ فی غیر محلہ ہے کہ کسی چیز کا بے محل رکھنا۔ اور دوسرے معنی

ہیں نقصان وزیاں اٹھانا جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

''كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا (سورہ کہف آیت۔۳۳)''

وہ دونوں باغ ہر وقت پھل دیتے تھے اور کسی چیز کی کمی نہیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے جناب آدم علیہ السلام کا ظاہری نقصان تو ہوا کہ جنت سے نکلنا پڑا۔ مگر اس طرح ہر نقصان اٹھانا حرام تو نہیں ہوتا نہ وہ ظلم علی النفس تھا جس سے آدمی جہنم کا مستوجب ہوتا ہے اور نہ ہی ظلم علی الغیر تھا جس سے آدمی ظالم قرار پاتا ہے۔

(۳) شیطان کے پھسلانے کی اس سے بڑھکر اور کوئی حقیقت نہیں ہے کہ'' قاسمهما ای لکما لمن الناصحين'۔ کہ اس نے خدا کے نام کی قسم کھائی تھی کہ میں خلوص نیت سے نصیحت کر رہا ہوں۔ مگر جناب آدم علیہ السلام وحوّا نے یہ خیال کر کے کہ بھلا کوئی مخلوق خالق کے نام کی جھوٹی قسم بھی کھاسکتی ہے؟ اس کی قسم پر اعتماد کر لیا اور درخت کے قریب چلے گئے حالانکہ ان کے شایان شان اور ان کیلئے اولی یہ تھا کہ براہ راست خدا سے رابطہ قائم کر کے اس سے دریافت کر لیتے کہ بارالہا کیا شیطان نے سچی قسم کھائی ہے یا جھوٹی۔ مگر ایسا نہ کیا اسی کا نام اصطلاح شریعت میں ترک اولی ہے جو گناہ نہیں ہوتا۔ مخفی نہ رہے کہ شیطان جنت میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ باہر کھڑے ہو کر بآواز بلند (ناداھما) جناب آدم وحوا علیہم السلام سے کلام کیا تھا۔

(۴) عصیاں کے معنی خلاف ورزی کے ہیں۔ اب اس کا دارومدار امر و نہی کے وجوبی وتحریمی یا ارشادی وتنزیہی ہونے پر ہے۔ لہٰذا امر وجوبی اور نہی تحریمی کی خلاف ورزی حرام ہے اور گناہ ہے مگر امر ارشادی اور نہی وتنزیہی کی خلاف ورزی صرف ترک اولی کہلاتی ہے اور ہم پہلے اشکال کے جواب میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ نہی تنزیہی وارشادی تھی لہٰذا اس طرح یہ خلاف ورزی ترک اولی قرار پائے گی نہ کہ گناہ۔ باقی رہا لفظ ''غوٰی'' تو جس طرح اس کے معنی گمراہی کے ہیں اسی طرح اس کے ایک معنی ناکامی کے بھی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس مقصد کی خاطر جناب آدم علیہ السلام نے اس نہی ارشادی کی خلاف ورزی کی تھی اس مقصد کے حاصل کرنے میں ناکام ہوئے (ہمیشہ جنت میں رہنے کی بجائے الٹا جنت سے نکلنا پڑ گیا)

(۵) پہلے اشکال کے جواب میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ لباس کا اترنا، بول و براز کی حاجت کا ہونا اور پھر جنت سے نکلنا اور زحمت اٹھانا اس درخت کا اثر وضعی تھا۔ کسی گناہ کی سزا نہیں تھی۔ جس طرح زہر خواہ عمداً کھائی جائے خواہ سہواً ہو اس کا اثر اس سے جدا نہیں ہوتا۔ ان الشئ اذا وجد وجد بأثاره لان اثر الشئ لا ینفك عن الشئ۔

(۶) توبہ ہمیشہ گیاہ وعصیاں سے ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک مندوب ومستحب امر کے ترک یعنی ترک اولی پر بھی ہوتی ہے کیونکہ حسنات الا برار سئیات المقربین (کہ نیک لوگوں کی نیکیاں بھی مقرب بارگاہ لوگوں کیلئے گناہ متصور ہوتی ہیں) توبہ کے لفظی معنی رجوع کرنے کے ہیں جس طرح ایک گنہگار گناہ کرکے توبہ و انابہ کرتا ہے اسی طرح ایک مقرب بارگاہ ترک اولی کر کے اوراس کا خمیازہ بھگت کر اللہ کی بارگاہ میں رجوع کرتا ہے۔ کیونکہ مقربین بارگاہ ایک مستحب کام کے ترک کو وہ اہمیت دیتے ہیں جو عام گنہگار فعل حرام کے ارتکاب کو بھی نہیں دیتے اوراس بات کا بین ثبوت حضرت امام زین العابدینعلیہ السلام کی وہ دعائے توبہ ہے۔ جو صحیفہ کاملہ میں موجود ہے۔

(۷) توبہ کے الفاظ کا جواب ابھی سابقہ چھٹے اشکال کے جواب سے واضح وعیاں ہے اعادہ تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

ضروری وضاحت

اس بات میں فی الجملہ اختلاف ہے کہ وہ مخصوص درخت کس چیز کا تھا؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ گندم کا تھا۔ بعض کا خیال ہے انگور کا تھا بعض انجیر کا بتاتے ہیں اور بعض کھجور کا وغیرہ وغیرہ۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ان روایات میں سے کونسی روایت صحیح ہے؟ فرمایا سب صحیح ہیں کیونکہ جنت کا درخت دینوی درختوں کی مانند نہیں ہوتا کہ اس پر ایک ہی پھل لگتا ہے۔ بلکہ وہ ایسا ہوتا ہے کہ جنتی جس پھل کے کھانے کی خواہش کرتا ہے وہی پھل اس پر لگ جاتا ہے۔ (عیون الاخبار، بحارالانوار)

فائدہ

فَتَلَقّٰى اٰدَمُ ......الآیۃ۔

وہ کلمات کون سے تھے جن کی برکت سے جناب آدمعلیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی؟ اس میں مختلف قول ہیں

(۱) وہی دعا تھی جو قرآن مجید میں مذکور ہے۔ "رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ"۔ (سورہ اعراف آیت۔ ۲۳)

(۲) حدیث میں ہے کہ وہ یہ دعا تھی:

"لا اله الا انت سبحانك اللّٰهم بحمدك عملت سوء و ظلمت نفسي فاغفر لي

وتب علی انك انت التواب الرحیم "۔(اصول کافی ۔۳)

(۳) پنجتن پاک ؑ کا واسطہ دے کر بارگاہ رب العزت میں توبہ کی تھی۔ (اصول کافی , عیاشی و صافی ۔ کذافی الدرالنثور)

قُلْنَا اهْبِطُوْا......الآیۃ۔

بظاہر یہ خطاب جناب آدم وحوا اور ابلیس کو ہے۔ سجدہ سے لبا وانکار کے بعد اگر چہ شیطان کو بزم ملائکہ سے تو نکال دیا گیا تھا۔ مگر ہنوز وہ مکانی طور پر عالم بالا ہی میں تھا۔ مگر اب جھوٹی قسم کھانے اور وسوسہ انگیزی کرنے کے بعد عالم بالا سے نکال دیا گیا۔ بہر حال جناب آدم وحوا کا وہاں سے اخراج تو ان کے اقدام کا اثر وضعی اور لازمی نتیجہ تھا۔ مگر شیطان کا اخراج اس کی اس حرکت شنیعہ اور شرارت کی سزا تھی۔ اور ان کی باہمی عداوت کا مطلب واضح ہے کہ جناب آدم وحوا علیہم السلام اور شیطان کے درمیان ایسی عداوت ہوگی جو نسلاً بعد نسل بھی چلتی رہے گی۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (سورہ بقرہ آیت ۔۱۶۸)۔

بہر حال جناب آدم وحوا + کا درخت کے قریب جانا اور اس کا پھل کھانا اور اس کے نتیجہ میں اس کے اثر وضعی کا مرتب ہونا اور ان کے جلدی جنت سے نکلنے کا یک ظاہری سبب بن گیا ورنہ حقیقت الامر تو یہ ہے کہ جناب آدم علیہ السلام پیدا ہی خلافت ارضی کے لئے کئے گئے تھے۔ (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً)۔ لہٰذا اپنے اس مقصد خلافت کی تکمیل کیلئے ایک نہ ایک دن بدیر یا سویر انہیں دنیا میں تشریف تو ضرور لانی تھی اور ایک خاص وقت تک اس معمورہ ہستی اور اس عالم آب وگل میں رہ کر فریضہ تبلیغ وہدایت انجام دینا تھا اور دنیا کے ہم وغم اور رنج والم سے اپنا حصہ پانا تھا۔ کیونکہ قید حیات اور بند غم لازم وملزوم ہیں۔

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى...الآیۃ

اس کے بعد اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا اس کیلئے کوئی رنج والم اور حزن وملال نہ ہوگا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حزن وملال اور رنج والم سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ خدا کی فرمانبرداری اور ہادیان برحق کی اطاعت گزاری ہے وبس۔ اور جو کفر اختیار کریں گے اور آیات الٰہیہ کو جھٹلائیں گے وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

آیات القرآن

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ﴿۳۹﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ
اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا
بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ
وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ
وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ
مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴿۴۶﴾

ترجمۃ الآیات

اور جو کفر اختیار کریں گے اور ہماری آیتوں (نشانیوں) کو جھٹلائیں گے وہی لوگ دوزخ والے ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (۳۹) اے بنی اسرائیل (اولاد یعقوب) میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی اور تم مجھ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کرو میں بھی تم سے کئے ہوئے اپنے عہد کو پورا کروں گا اور تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ (۴۰) اور اس کتاب (قرآن) پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) نازل کی ہے۔ جو اس (تورات) کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے اولین منکر نہ بنو اور آیتوں کو (ان میں تحریف کرکے) تھوڑی قیمت (دنیوی مفاد) پر فروخت نہ کرو۔ اور مجھ ہی سے (میری

نافرمانی سے) ڈرو۔(۴۱) اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور جانتے بوجھتے ہوئے حق کو نہ چھپاؤ۔(۴۲) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور (میری بارگاہ میں) رکوع کرنے (جھکنے) والوں کے ساتھ رکوع کرو (باجماعت نماز ادا کرو)۔(۴۳) کیا تم دوسرے لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب خدا کی تلاوت کرتے رہتے ہو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔(۴۴) اور (مشکلات و مصائب کے وقت) صبر (روزہ) اور نماز کے ذریعہ (خدا سے) مدد مانگو اور یہ (نماز) یقیناً بہت گراں ہے سوائے ان بندوں کے جو خشوع و خضوع رکھنے والے ہیں۔(۴۵) اور (بارگاہ خداوندی میں) عاجزی کرنے والے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنے پروردگار کا سامنا کرنا ہے (اس کے حضور پیش ہونا ہے) اور (آخرکار) اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔(۴۶)

تشریح الالفاظ

(۱) فارھبون یہ رھب سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ڈر اور خوف

(۲) لاتلبسوا یہ لبس سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی امر کو مشتبہ اور خلط ملط کرنا

(۳) علی الخاشعین یہ خشوع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عاجزی کا اظہار کرنا اور فروتنی کرنا

تفسیر الآیات

بنی اسرائیل کا تذکرہ اور ان کے عروج وزوال کی داستان

یابنی اسرائیل...الآیۃ۔

خداوند عالم نے اس سورہ کے آغاز سے لے کر اب تک بنی آدم کو (جن میں مومن، کافر اور منافق سب داخل ہیں) خدا اور رسول اور آسمانی کتابوں اور آخرت پر ایمان لانے، اس کی عبادت و اطاعت کرنے کی عمومی دعوت دی ہے اور دیگر بعض متعلقہ مسائل جیسے خلقت آدم و حوا اور ان کے ہر سہ طبقات، ان کے حالات و کوائف، پھر نیکو کاروں کو جنت الفردوس کی بشارت اور بدکاروں کو جہنم کی نذارت کے تذکرہ کے بعد خاص طور پر بنی

اسرائیل کا ذکر شروع کیا ہے اور یہ ذکر آیت نمبر ۴۰ سے لے کر مسلسل آیات نمبر ۱۲۳ چودھویں رکوع کے بعد تک چلا گیا ہے اور ان کو اسلام کی طرف راغب و قائل کرنے کیلئے پہلے ان کی خاندانی شرافت کا تذکرہ کیا ہے , بعد ازاں ان کو روکا ٹوکا گیا ہے۔ اور پھر ان کو راہ راست پر آنے اور اس پر چلنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسرائیل دو لفظوں سے مرکب ہے۔ اسراء اور ایل۔ عبرانی زبان میں ''اسراء'' کے معنی ہیں عبد اور قوت اور ''ایل'' کے معنی ہیں اللہ۔ تو اس طرح اسرائیل کے معنی ہوئے عبداللہ یا قوۃاللہ۔ یہ جناب یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے جو حضرت ابراہیمعلیہ السلام کے فرزند جناب اسحاق علیہ السلام کے فرزند تھے۔ خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو متوجہ کیا ہے کہ وہ عبداللہ یعنی خدا کے عبادت گزار بندے کی اولاد ہیں۔

مجمع البیان میں لکھا ہے کہ عرب جناب اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اسی لئے خدا فرماتا ہے؟:

''مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ (سورہ حج آیت۔ ۷۸)''

اور اکثر عجم جناب اسحاق کی اولاد ہیں۔ جناب یعقوبعلیہ السلام اپنی اولاد سمیت اپنے اصلی وطن فلسطین شام سے ہجرت کر کے اپنے فرزند یوسف علیہ السلام کے پاس مصر میں تشریف لے گئے تھے۔ جہاں وہ اس عہد کے فرعون کے وزیر تھے۔ اور پھر وہاں صدیوں تک بڑے عروج پر رہے۔ مگر بعد میں فراعنہ مصر نے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ گرائے۔ ان کے بیٹوں کو قتل کیا اور بیٹیوں کو اپنی خدمت کیلئے زندہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے آکر انہیں فرعونیوں کے ظلم و استبداد سے آزاد کرایا۔ بالاخر جناب یوشع وصی موسیٰ علیہ السلام کے دور میں وہ واپس فلسطین آئے اور جناب یوشع کے بعد ان سے کئی نبی ہوئے مگر آخر کار ان کی کج رفتاریوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ان پر حملہ کر کے انہیں تہس نہس کر دیا۔ ان کی حکومت ختم کر دی بہت سوں کو قتل اور بہت سوں کو قید کیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ ایران نے بخت نصر اور اس کی حکومت کو ختم کیا اور پھر قریباً دو سو سال تک بنی اسرائیل ایران کے ماتحت رہے پھر رومیوں کے زیر تسلط چلے گئے مگر انہوں نے شورش برپا کی لیکن رومیوں نے اسے دبا دیا۔ اور بزور شمشیر انہیں فلسطین سے نکال دیا اس طرح وہ تتر بتر ہو گئے۔ کچھ مصر میں چلے گئے کچھ لبنان اور سوریہ میں اور کچھ عراق وحجاز وغیرہ کے ممالک میں چلے گئے۔۔ (تفسیر کاشف)۔

یہاں تک کہ اب ۱۹۴۸ء میں عالم استعمار واستکبار نے مسلمانوں کے خلاف ایک منظم سازش کے تحت مختلف اطراف واکناف سے یہودیوں کو یکجا کر کے مسلمانوں کے عین وسط میں ان کی حکومت قائم کر دی۔ جوانہی کے سہارے اور انہی کی بیساکھیوں پر تا حال چل رہی ہے۔ مگر تا بہ کے؟

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا۔

نزول قرآن کے عہد میں یہ بنی اسرائیل دو مذہبوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ایک یہود جو حضرت موسیٰ علیہ السلام تک انبیاء کو مانتے تھے اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کرتے تھے۔ دوسرے نصاریٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صرف نبی بلکہ خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ان دونوں قوموں کو مسلمانوں سے مذہبی اختلاف کے علاوہ یہ تعصب وعناد بھی تھا کہ اسلام کا نبی ان کی قوم سے نہیں آیا بلکہ نسل اسماعیلعلیہ السلام سے آیا ہے۔ خداوند عالم گویا ان کے اسی رویہ ونظریہ کا جواب دیتے ہوئے اپنے احسانات گنوا کر جو اس نے ان کے ساتھ کئے تھے فرماتا ہے کہ تم نے مسلسل کفران نعمت کیا۔لہٰذا اگر خدا نے تم سے یہ نعمت نبوت سلب کر کے کسی دوسری قوم کو اس کے شکرانۂ نعمت کے صلہ میں نوازا ہے تو تم چین بجبیں کیوں ہوتے ہو؟۔ بنی اسرائیل (یہود) کو خصوصی خطاب کرنے اور ان کو اس قدر اہمیت دینے میں بظاہر یہ حکمت کارفرما نظر آتی ہے کہ زمانہ نزول قرآن کے وقت عام اقوام عالم میں عموماً اور عالم عرب میں خصوصاً یہودیوں کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔قریباً ہزار سال تک ان میں سلسلۂ نبوت جاری وساری رہا ان میں ہزاروں نبی پیدا ہوئے۔اس لئے اردگرد کے عام لوگ ان سے اس قدر مرعوب تھے کہ کہتے تھے کہ اگر یہود نے اسلام قبول کیا تو ہم بھی قبول کر لیں گے۔ نیز خدائے حکیم یہود کی داستان عروج وزوال سنا کر مسلمانوں کو بھی تنبیہ کرنا چاہتا ہے کہ اگر خدا اور رسول کی اطاعت کرتے رہو گے اور اتحاد وتنظیم کا دامن تھامے رہو گے تو عزت وعظمت, سطوت وسلطنت تمہارا مقدر رہے گی اور اگر عصیاں کاری, غلط کاری اور کج رفتاری اختیار کرو گے اور انتشار وخلفشار کا شکار ہو جاؤ گے تو تمہاری شامتِ اعمال صورتِ نادر بھی اختیار کر سکتی ہے۔اور اس طرح

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(لاقدر اللہ)

بنی اسرائیل پر خدا کے حسانات کا اجمالی تذکرہ

اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ ...الآیۃ۔

''**نعمتی**''اسم جمع ہے جس کا اطلاق قلیل وکثیر دونوں پر ہوتا ہے۔ یہاں خداوند عالم نے ان بعض احسانات وانعامات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو اس نے مخاطبین کے آباء واجداد پر کئے تھے (جبکہ باپ دادا پر احسان ان کی اولاد پر بھی احسان ہوتا ہے) جیسے

(۱)ان میں سے بہت سے انبیاء مبعوث کئے۔

(۲)ان پر بہت سی آسمانی کتابیں نازل کیں جن میں تورات، زبور، انجیل بھی شامل ہیں۔

(۳)ان کوفرعون اورفرعونیوں کے ظلم وجور سے نجات دلائی۔

(۴)ان کے سب سے بڑے دشمن فرعون کواس کے لاؤلشکر سمیت غرق کیا۔

(۵)ان پر آسمان سے من وسلوی نازل کیا۔

(۶)ان کے لئے پتھر سے پانی کا چشمہ جاری فرمایا۔

(۷)ان کیلئے دریا میں راستہ بنایا۔

(۸)ان کوعہد سلیمان میں سلطنت عطافرمائی۔

(۹)بادل کوان پر سایہ فگن کیا۔

(۱۰)ان کووہ کچھ دیا جوکسی اورکونہیں دیا۔''وَآتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ''(سورہ مائدہ آیت۔۲۰)

ان احسانات کے چند تقاضے ہیں؟

ان احسانات کے چند تقاضے ہیں جن میں سے ایک تقاضا یہ ہے کہ ''تم مجھ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کرو''

اس عہد و پیمان سے کیا مراد ہے؟

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْۤ......الآیۃ۔

اکثر مفسرین نے اس سے وہ عہد و پیمان مراد لیا ہے جو خدا نے تورات میں ان سے لیا تھا کہ میں آخر میں ایک عظیم الشان نبی بھیجوں گا۔جس کی یہ علامات ہونگی جب وہ آجائیں تو ان پر ایمان لانا کیونکہ جو ان پر ایمان لائے گا اسے دوگنا اجر وثواب دیا جائیگا۔اور جو ان پر ایمان نہیں لائیگا اسے دوگنا عذاب کیا جائیگا۔توتم اپنا وعدہ پورا کرو۔اس پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاؤ۔میں اپنا وعدہ پورا کرونگا کہ تمہیں دوہرا اجر وثواب عطا کروں گا۔''وھوالمروی عن ابن عباس وھوالموافق لسیاق القرآن''۔

وعدہ کی وفا واجب ہے

علاوہ دوسرے دلائل کے خود اسی آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ وعدہ کر کے اسے پورا کرنا واجب ہے

ارشاد قدرت ہے: ''وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ج اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً'' ۔عہد و پیمان کی ایفاء کروں۔ کیونکہ (قیامت کے دن) اس کے بارے میں باز پرس کی جائیگی ۔(بنی اسرائیل آیت ۔ ۳۴)

خدا فرماتا ہے تم مجھ سے کئے ہوئے وعدے پورے کرو۔ میں تم سے کئے ہوئے وعدے پورے کروں گا۔ خدا کا وعدہ ہے کہ تم دعا کرو۔ میں قبول کروں گا۔ ''اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (سورہ مومن آیت۔ ٦٠)'' مگر بعض اوقات دعاؤں کے قبول نہ ہونے کا یک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اس سے کئے ہوئے وعدے پورے نہیں کرتے اس لئے وہ بھی اپنا وعدہ پورا نہیں کرتا (کمافی عدۃ الداعی عن الصادق علیہ السلام)

وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ......الآية۔

اور دوسرا تقاضا یہ ہے کہ تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ بنی اسرائیل کے علماء واحبار کو ایمان لانے سے سب سے جو بڑا امر مانع تھا وہ یہ تھا کہ اگر انہوں نے سابقہ دین کو چھوڑ کر دین اسلام اختیار کر لیا۔ تو عقیدت مندوں کا ہجوم چھٹ جائیگا۔ اور اس طرح ان کا کافی نقصان وزیاں ہوگا۔ خدا فرماتا ہے۔ اس بات سے مت ڈرو۔ البتہ مجھ سے ڈرو۔ جس کے قبضہ قدرت میں تمہارا سود وزیاں اور نفع ونقصان ہے۔ ایک ضعیف و کمزور انسان سے ڈرنے کا کیا مطلب جو ''لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا (سورہ فرقان آیت ۔ ۳)'' کا مصداق ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ......الآية۔

تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس کتاب (قرآن) پر ایمان لاؤ۔ جو میں نے (اب نازل کی ہے جو تمہاری کتاب (تورات) کی تائید کرتی ہے۔ اور تم اس کے اولین منکر نہ بنو۔ یعنی میرے احسانات وانعامات کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم سب سے پہلے ایمان لاتے اور اگر ایسا نہیں کیا۔ تو کم از کم سب سے پہلے کافر تو نہ بنو۔ تاکہ دوسرے لوگوں کے کفر میں مبتلا ہونے کا سبب نہ بن جاؤ۔ ورنہ ان کے کفر کا وبال بھی تمہاری گردن پر ہوگا۔

دوسروں کی نیکی یا گناہ کا سبب بننے والا اس نیکی یا برائی میں برابر کا شریک ہوتا ہے

اس آیت سے نیز دوسری بہت سی آیات وروایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو شخص کسی نیکی یا بدی کا سنگ بنیاد رکھے وہ اس نیکی یا بدی کرنے والوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ان کے ثواب یا عذاب میں کوئی کمی واقع ہو۔ (بحاالانوار وغیرہ)

وَلَا تَشْتَرُوْا ...الآیۃ۔

چوتھا تقاضا یہ ہے کہ میری آیتوں کو تھوڑی قیمت (دنیوی مفاد) پر فروخت نہ کرو۔ یہود کے علماء واحبار ایک تو اپنے دنیوی مفاد کیلئے حق وحقیقت اور آیات وہدایات خداندی کا انکار کرتے تھے, دنیوی مفاد کی خاطر اپنی کتابوں میں تحریف اور تغییر کر دیتے تھے اور الفاظ وعبارات اور علامات میں ردو بدل کر دیتے تھے۔ جیسا کہ حی ابن اخطب اور کعب بن اشرف کے بارے میں وارد ہے (مجمع البیان)

خدا نے انہیں اس غلط روش سے روکا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بہت قیمت پر فروخت کرو۔ بلکہ اس کا صاف وصریح مطلب یہ ہے کہ دین برباد کر کے جتنا بڑا دنیوی مفاد بھی حاصل کرو گے وہ اس کے مقابلہ میں تھوڑی قیمت متصور ہوگی۔ لہٰذا صرف مجھ سے ڈرو (تاکہ فوز وفلاح پاؤ)۔

دین فروشی حرام ہے

اس آیت اور اس جیسی کئی آیات وروایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ دین فروشی کی طرح دین وعبادت کے کاموں جیسے اذان دینے, نماز باجماعت پڑھانے, مجالس سید الشہداء علیہ السلام پڑھنے اور قرآن ودینیات پڑھانے پر اجرت طے کر کے لینا بھی حرام ہے۔ اس موضوع کے دیگر تفصیلات ہماری کتاب اصلاح المجالس اور اصلاح الرسوم میں دیکھی جائیں۔

وَلَا تَلْبِسُوا ......الآیۃ۔

پانچواں تقاضا یہ ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔ اور جانتے بوجھتے ہوئے حق کو نہ چھپاؤ۔ یہود کو چونکہ اس وقت عرب میں مذہب کی نمائندگی کا مقام حاصل تھا لوگ ان سے نبی عربی کی بابت پوچھتے تھے اور وہ بڑے معصومانہ انداز میں کوئی ایسی شوشہ کی بات کہہ دیتے جس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اور آپ کا مشن لوگوں کی نظر میں مشتبہ ہو جائے اپنے وعظوں میں وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ حق پرست بنو اور حق کا ساتھ دو۔ مگر عملاً جب خود ان کیلئے حق کا ساتھ دینے کا وقت آیا تو وہ حق کا ساتھ نہ دے سکے۔ (تذکیر القرآن)

اگرچہ یہ آیتیں (وَلَا تَشْتَرُوْا ...وَلَا تَلْبِسُوا) بظاہر یہود کے علماء واحبار کی مذمت میں نازل ہوئی ہیں۔ مگر بموجب المورد لا یخصص الوارد۔ اس کی زد میں وہ سب لوگ آجاتے ہیں جو اس قسم کی روش ورفتار کا مظاہرہ کرتے ہیں خصوصاً وہ نام نہاد علماء جو اپنے جھوٹے وقار کے تحفظ, دنیوی مال ومتاع کے حصول اور عامۃ الناس کی نگاہوں میں مکرم ومحترم بننے کی خاطر دین پر سودے بازی کرتے ہیں۔ دنیا کے عوض دین فروشی

کرتے ہیں اورحق کوحق اور باطل کو باطل کہنے سے ہچکچاتے ہیں بلکہ حق و باطل کوآپس میں گڈمڈ کر کے خودبھی گمراہ ہوتے ہیں اوردوسروں کوبھی گمراہ کرتے ہیں۔وَ هُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ(سورہ یوسف آیت۔۱۵)۔

وَ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ......الآية۔

اس کا چھٹااورساتواں تقاضا یہ ہے کہ نماز قائم کرو(جو بدنی عبادات میں سے افضل عبادت ہے)اور زکوۃ ادا کرو(جو مالی عبادات میں افضل عبادت ہے)اوررکوع کرنے والوں کےساتھ رکوع کرو۔نماز وزکوۃ کی اہمیت اوران کی عظمت پر بقدرضرورت اسی سورہ کے آغاز میں بذیل آیت ''وَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُم يُنۡفِقُوۡنَ' تبصرہ کیا جاچکا ہے۔''وَارۡكَعُوۡا ''میں نماز باجماعت کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔اور انفرادی عبادت کواجتماعی عبادت میں ضم کرنے کاحکم دیا جارہا ہے۔جس کی اسلام میں ایک خاص اہمیت ہے۔

اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ......الآية۔

اس آیت میں گو بظاہرتو خطاب یہود کےعلماء واحبار کو ہے مگراس کی زد میں ہرقوم وملت کے وہ سب مذہب کے اجارہ داربھی آتے ہیں جن کی گفتار ورفتار میں تضاد ہوتا ہے جوزبانی طور پر کہتے کچھ اور ہیں اورعملی طور پر کرتے کچھ اورہیں۔الغرض جوصرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔کردار کے غازی نہیں ہوتے۔حضرت رسولخداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرمایا کہ:

''شب معراج میرا گزرکچھ ایسےلوگوں کے پاس سے ہوا۔جن کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کاٹے جا رہے تھے۔میں نے ان کے بارے میں جبرائیل سے پوچھا۔انہوں نے بتایا:

''هوء الاء الخطباء من امتك يا مرون الناس بالبر و ينسون انفسهم''(یہ آپ کی امت کے وہ خطیب ہیں جولوگوں کونیکی کاحکم دیا ہے کرتے تھےمگراپنے آپ کوبھلائے رکھتے تھے)۔(مجمع البیان، قرطبیؒ)

ایسے ہی واعظان غیرمتعظ کے بارے میں حافظ شیرازی نے کہا تھا۔

وا عظاں کیں جلوہ بر محراب و منبری کنند
چو بخلوت می روند آں کا ر دیگری کنند
مشکلے دا رم ز د انشمند مجلس باز پرس
توبہ فر مایاں چرا ر خو د توبہ کمتری کنند

افلا تعقلون !کیاتم عقل سے کام نہیں لوگے؟ بے شک امر بالمعروف اورنہی عن المنکر اسلامی

فرائض میں سے ایک بہت بڑا اہم فریضہ ہے مگر اسے موثر بنانے کی شرط اعظم امر و نہی کرنے والے کا خود اپنے امر و نہی پر کار بند ہوتا ہے کہ جس کام کے کرنے کا دوسروں کو کہے پہلے خود اس پر عمل کرے اور جس کام سے دوسروں کا روکے پہلے خود اس سے رکے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کی بات لوگوں کے دلوں سے اس طرح پھسل جائے گی جس طرح صاف وشفاف پتھر سے بارش کا پانی پھسل جاتا ہے۔ سچ ہے

ما یخرج من القلب یقع فی القلب و ما یخرج من اللسان لم یتجاوز الاذان

یعنی

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

بہر حال اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جو باعمل نہ ہو وہ دوسروں کو بالکل امر و نہی اور وعظ و نصیحت نہ کرے خود عمل کرنا علیحدہ واجب ہے اور دوسروں کو عمل کی تلقین کرنا علیحدہ واجب۔ تو ایک کے ترک کرنے سے دوسرے کا ترک کرنا تو لازم نہیں آتا بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ واعظ اور مبلغ کو باعمل و باکردار ہونا چاہیے تاکہ اس کا موعظ اور اس کی نصیحت نتیجہ خیز ثابت ہو۔

وَاسْتَعِیْنُوْا ......الآیۃ

اس کا آٹھواں تقاضا یہ ہے کہ (مشکلات ومصائب کے وقت) صبر (روزہ) اور نماز کے ذریعہ (خدا سے) مدد مانگو۔ اس میں قدرے اختلاف ہے کہ یہ خطاب بنی اسرائیل کو ہی ہے یا اہل اسلام کو؟ فاضل طبرسی فرماتے ہیں کہ اولی یہ ہے کہ اس میں تمام مکلفین کو شامل قرار دیا جائے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

صبر سے مراد روزہ ہے۔ فرمایا جب آدمی پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ استعینو ابالصبر والصلوۃ (تفسیر عیاشی وصافی)

اور انہی حضرت سے مروی ہے فرمایا کہ:

جب کسی شخص کو دنیا میں ہموم وغموم میں سے کوئی ہم وغم لاحق ہو تو وضو کر کے مسجد میں داخل ہو اور دو رکعت نماز پڑھ کر ازالہ غم کی دعا کرے کیا تم نے ارشاد خداوندی نہیں سنا فرماتا ہے۔ استعینو بالصبر و الصلوۃ (مجمع البیان وعیاشی)

پس جب نماز و روزہ کا سہارا لے کر پروردگار عالم کی بارگاہ میں رجوع کیا جائے تو اس کی توفیق شامل

حال ہوتی ہے اور مشکلات ومصائب کے دور و کافور ہونے کی کوئی صورت نکل آتی ہے

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ......الآية۔

مگر یہ نماز یا روزہ سے سہارا لینا، بہت ہی گراں ہے سوائے ان کے جو خشوع وخضوع رکھنے والے ہیں۔یعنی بارگاہ خداوندی میں عاجزی کرنے والے ہیں ارشاد قدرت ہے:''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ'۔ وہ اہل ایمان کامیاب ہوں گے جو خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں (سورہ مومنون آیت۔۱،۲)

خشوع وخضوع کا تعلق دل ودماغ سے ہے مروی ہے کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا جس کے اعضاء وجوارح میں سکون وٹھہراؤ نہیں تھا۔حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی حالت دیکھ کر فرمایا۔''**لو خشع قلبه لخشعت جوارحه**''اگر اس کے دل میں خشوع (عجز وانکسار) ہوتا تو اس کے اعضاء میں سکون ہوتا (وسائل الشیعہ)۔

اس خشوع کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس جوہر گرانمایہ کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نماز گزار اپنے دل ودماغ میں تصور قائم کرے کہ وہ سلطان السلاطین اور احکم الحاکمین کے دربار میں کھڑا ہے لہٰذا وہ جو کچھ زبان سے کہہ رہا ہے یا جو کچھ اعضاء سے کر رہا ہے اس کی طرف متوجہ ہو اور اس میں غور وفکر کرے اور اس طرح کھڑا ہو جس طرح ایک بندہ ذلیل اپنے مولائے جلیل کی بارگار میں کھڑا ہوتا ہے۔حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب ابوذرؓ سے فرمایا تھا:

''يا اباذر اعبد ربك كانك تراه وان لم تكن تراه فانه يراك'

اے ابوذر! اس طرح اپنے پروردگار کی عبادت کر کہ گویا اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے (عین الحیات از علامہ مجلسیؒ)

پھر اس کی کرم نوازیوں پر بھی غور کرے اور اپنی کوتاہیوں اور حیلہ سازیوں پر بھی۔نیز اس سلسلہ میں سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام کی نماز اور ان کے خشوع وخضوع کے واقعات پر بھی نگاہ رکھے اور اپنی ہر نماز کو اس طرح پڑھے کہ گویا یہ اس کی آخری نماز ہے............۔

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ......الآية۔

جو سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنے پروردگار کا سامنا کرنا ہے۔(اس کے حضور پیش ہونا ہے) اور آخر کار اس کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔آیت میں لفظ ظن وارد ہے''اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ''۔جبکہ لغوی اور منطقی طور پر کسی

چیز کے دو پہلوؤں میں سے راجح جانب کوظن اور مرجوح کو وہم کہا جاتا ہے۔مگر علماء لغت کے نزدیک یہ لفظ متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے بمعنی گمان بھی اور بمعنی علم ویقین بھی جیسے اس شعر میں استعمال ہوئی ہے۔

فقلت ظنوا بألفی مد جج
سر اتهم فی الفا رس المسر د

چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''یوقنون انهم یبعثون و الظن منهم یقین'' جو یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے خدا کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے ان کا ظن بھی یقین ہوتا ہے۔(توحید٬ احتجاج٬ عیاشی)۔

آیات القرآن

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۴۷ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا
يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۴۸ وَاِذْ
نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ۴۹ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۵۰ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ
الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۵۱ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۵۲

ترجمۃ الآیات

اے بنی اسرائیل۔میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا جہاں کے لوگوں پر فضلیت دی۔(۴۷) اور اس دن (قیامت) سے ڈرو جب

کوئی کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گا اور نہ ہی کسی کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی۔ اور نہ کسی سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا۔ اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔ (۴۸) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی تھی۔ جو تمہیں بدترین عذاب کا مزہ چکھاتے تھے (یعنی) تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو (اپنی خدمت گذاری کیلئے) زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی بڑی سخت آزمائش تھی۔ (۴۹) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو شگافتہ کیا (اسے پھاڑ کر تمہارے لئے راستہ بنایا) اور تمہیں نجات دی اور تمہارے دیکھتے دیکھتے فرعونیوں کو غرق کر دیا ہے۔ (۵۰) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے (تورات دینے کیلئے) چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر تم نے ان کے بعد گوسالہ (بچھڑے) کو (معبود) بنالیا۔ جبکہ تم ظالم تھے۔ (۵۱) پھر ہم نے اس (ظلم) کے بعد بھی معاف کر دیا۔ تا کہ تم شکر گزار بنو (۵۲)

تشریح الالفاظ

(۱) لاتجزی — جزاء کا صلہ جب عن ہو تو اس کے معنی فائدہ پہچانے کے ہوتے ہیں

(۲) عدل — لفظ عدل کے جہاں ایک معنی انصاف کے ہیں وہاں دوسرے معنی مثل اور نظیر کے ہیں۔

(۳) یسومونکم — یہ سوم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کو کسی کام کی تکلیف دینا

(۴) العجل — اس کے معنی ہیں بچھڑا

تفسیر الآیات

قرآن میں تکرار کی حکمت

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ......الآیۃ

اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو۔۔۔۔ چھ سات آیتوں کے بعد پھر سابقہ بات کی

تکرار اور اس طرح قرآن مجید میں بعض چیزوں کی بار بار کی تکرار ان کی تاکید پر دلالت کرتی ہے۔اس بار بار کی تکرار اور تذکر کے اعادہ کی اثر آفرینی نا قابل انکار حقیقت ہے ارشاد قدرت ہے۔''وَ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ ذاریات آیت۔۵۵)''بار بار یاد دلاؤ کیونکہ بار بار کی یاد دہانی اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ......الآیة

چوتھے پارہ میں کنتم خیر امۃ کی تفسیر میں واضح کیا جائیگا کہ علی الاطلاق خیر الامم ہونے کا اعزاز خداوند عالم نے امت محمدیہ کو عطا فرمایا ہے اور یہاں جو بنی اسرائیل کی عالمین پر افضلیت کا تذکرہ کیا گیا ہے تو وہ انہی چند مخصوص نعمتوں کی وجہ سے ہے۔جو ان آیات میں مذکور ہیں (جن کو ہم نے اجمالاً آیت نمبر ۴۰ کی تفسیر میں یکجا بیان کر دیا ہے) ظاہر ہے کہ کسی کی کسی جزئی افضلیت سے اس کا علی الاطلاق دوسروں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔بنا بریں عالمین کو اپنے اصلی معنوں میں بحال رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اور اگر بالفرض اس افضلیت سے افضلیت مطلقہ مراد لی جائے تو پھر عالمین کی لفظ میں تصرف کرنا پڑے گا اور اس سے بنی اسرائیل کے عہد کے عالمین مراد لینے پڑیں گے۔(تفسیر صافی)

کیونکہ افضلیت مطلقہ کا تاج خداوند عالم نے امت محمدیہؐ کے سر پر رکھ دیا ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا......الآیة

اس دن سے مراد عام مفسرین نے قیامت کا دن مراد لیا ہے مگر بعض نے اس سے موت کا دن مراد لیا ہے۔کہ موت کسی طرح بھی ٹل نہیں سکتی (صافی) کسی بھی مجرم کے بچاؤ کے یہی چند طریقے ہوا کرتے ہیں۔ (۱) بدلہ (۲) سفارش (۳) معاوضہ (۴) کسی کی مدد۔خداوند عالم نے یہاں ان سب طریقوں کی نفی کر دی ہے۔ جبکہ ایک گنہگار مومن کیلئے ان میں سے بعض طریقوں کا ثابت ہونا مسلم ہے بنا بریں تمام مفسرین نے یہاں نفس سے کافر مراد لیا ہے کسی مناسب مقام (جیسے آیۃ الکرسی کی تفسیر میں) شفاعت کا حقیقی مفہوم اور اسلام میں اس کی حیثیت اور اس کے اثبات کی وضاحت کی جائیگی۔انشاءاللہ۔

اس قسم کی بعض آیات کو دیکھ کر جو بعض مسلمان شفاعت کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں ان کا یہ طریقہ کار درست نہیں ہے۔کسی بھی موضوع و مسئلہ کے تمام مثبت و منفی پہلوؤں کا مکمل جائزہ لینے کے بعد کوئی نظریہ قائم کرنا چاہیے یہاں سب سے پہلے اور اہم بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی شفاعت کی نفی کی گئی ہے ان میں سے اکثر و بیشتر مقامات تو وہ ہیں جہاں اس سے کفار و مشرکین مراد ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن میں

کہیں شفاعت کی نفی کی گئی۔ ہے (جیسے یہ آیت) اور کہیں اس کا اثبات کیا گیا ہے۔ جیسے "مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ (سورہ بقرہ آیت۔ ۲۵۵)"

اب قرآن میں اختلاف تو ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا علماء محققین نے اس ظاہری اختلاف و تنافی کو اس طرح ختم کیا ہے کہ جہاں شفاعت کی نفی کی گئی ہے۔ وہاں خدا کے اذن و اجازت کے بغیر شفاعت مراد ہے اور جہاں اس کا اثبات کیا گیا ہے وہاں اس سے خدا کے اذن و اجازت کے ساتھ شفاعت مراد ہے۔

وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ...... الآیۃ

یہاں منعم حقیقی نے اپنے ان انعامات کی فی الجملہ تفصیل بیان کرنا شروع کی ہے جن سے اس نے مختلف اوقات میں بنی اسرائیل کو نوازا تھا۔ ان میں سے ایک احسان عظیم یہ تھا کہ اس نے بنی اسرائیل کو فرعون اور فرعونیوں کے بدترین مظالم سے نجات دلائی۔ وہ بدترین عذاب یہ تھا کہ ان سے جبری مشقت کے دشوار ترین کام لئے جاتے تھے کسی سے ذاتی خدمت لی جاتی' کسی سے کھیتی باڑی کرائی جاتی اور کسی سے گارا اور اینٹ کا کام لیا جاتا اور جو کام کرنے کے قابل نہ ہوتا تھا اس سے بھاری بھر کم جزیہ (ٹیکس) وصول کیا جاتا تھا۔ جس کے ادا نہ کرنے پر اسے سخت سزا دی جاتی تھی اور ان سب مظالم میں سے سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ ان کے بیٹوں کو قتل کر دیا جاتا اور بیٹیوں کو خدمت گذاری کیلئے زندہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔

فرعون کے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا سبب

اس سفاکانہ اور بے رحمانہ قتل و غارت کا سبب عام مفسرین اسلام نے یہ لکھا ہے کہ ایک بار فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ بیت المقدس (شام) کی جانب سے آگ کا ایک زبردست شعلہ آیا جس نے مصر کے قبطی خاندان کے تمام گھروں کو جلا کر بھسم کر دیا۔ مگر بنی اسرائیل کے گھروں کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ جب اس نے معبروں اور کاہنوں سے اپنے اس خواب کی تعبیر دریافت کی تو انہوں نے اسے بتایا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جس کے ہاتھ سے تو بھی تباہ ہوگا اور تیری سلطنت بھی برباد ہوگی۔ چنانچہ اس نے احتیاطی تدبیر کے طور پر حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ پیدا ہوا سے قتل کر دیا جائے اور بچیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔ اس کام کیلئے مخصوص دائیاں مقرر کی گئیں۔ چنانچہ ہزارہا بچے ناحق قتل کئے گئے مگر اس کے باوجود نہ فرعون ہلاکت سے بچ سکا۔ اور نہ اس کی سلطنت تباہ ہونے سے بچ سکی۔ قادر مطلق نے جس بچہ سے یہ کام لینا تھا' نہ صرف اسے پیدا کیا۔ اور اس کی حفاظت کا انتظام کیا بلکہ خود فرعون کے گھر اس کی تربیت کا اہتمام کیا۔ سچ ہے۔

تد بیر کند بندہ تقد یر کند خندہ

اور بالاخروہی ہوتا ہے' جومنظور خدا ہوتا ہے (مجمع البیان ۔روح المعانی)۔

(۵۱)وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ......الآیۃ۔

فرعونی حکومت کے مظالم سے نجات دلا نے کیلئے خالق کے حکم سے جناب موسیعلیہ السلام اسرائیلیوں کو ہمراہ لے کر مصر کی سرزمین سے نکلے کہ اپنے آبائی وطن شام وفلسطین کی طرف روانہ ہوجائیں ۔جب فرعون کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی فوج کو ساتھ لے کر ان کے تعاقب کیلئے نکلا وہ لوگ اتفاق سے شب کی تاریکی میں راستہ بھول کر دریا کے قریب پہنچ گئے تھے کہ پس پشت سے فرعونی لشکر آ گیا اب یہ لوگ پریشان ہوئے کہ آگے دریا ہے اور پیچھے دشمن کی فوج ۔وحی خداوندی سے جناب موسیعلیہ السلام نے تمام قوم کو حکم دیا کہ وہ بلا تامل دریا کی طرف قدم بڑھا دیں ان کے قدم بڑھاتے ہی دریا کا پانی بیچ میں سے پھٹ گیا اس کی بڑی بڑی موجیں دیواروں کی طرح ادھر ادھر کھڑی ہوگئیں اور موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کے ساتھ اس طرف کے ساحل تک پہنچ گئے ۔مگر جب فرعون اپنے لشکر سمیت دریا کے حدود میں پہنچ گیا۔تو دونوں طرف سے پانی کی موجیں پلٹ پڑیں اور انہوں نے تمام لشکر کو غرق کر دیا۔(فصل الخطاب)

سچ ہے

غرے کو غرق کرتا ہے دریائے رو د میں
بے کس کو رزق دیتا ہے دشمن کی گو د میں

یہ ہے جناب موسیعلیہ السلام کا معجزہ' جو عادت اور نیچر کے خلاف ضرور ہے مگر محال عقلی نہیں ہے جو مسبب الاسباب کی قدرت قاہرہ سے وجود میں آتا ہے۔

لفظ آل کی تشریح

مخفی نہ رہے کہ آل جو آل یوؤل سے ماخوذ ہے۔جس کی اصل اھل ہے اسی وجہ سے آل کی تصغیر اھیل آتی ہے جس کے معنی ہیں کسی کے قریبی رشتہ دار۔ہاں البتہ استعمال کے مقام میں ان دولفظوں میں یہ فرق ہے کہ آل کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جنہیں کوئی دینی یا دنیوی شرف حاصل ہو۔جبکہ اہل عام ہے۔اور اہل کے معنی و مفہوم میں اسلامی مسالک میں اختلاف مشہور ہے کہ کچھ مسلمان اس سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخصوص قرابتدار مراد لیتے ہیں او کچھ آپ کی بیویاں' کچھ اصحاب مراد لیتے ہیں اور کچھ اس سے امت کے تمام

سچے پیروکار مراد لیتے ہیں تو جو لوگ آل کے آخری معنی مراد لیتے ہیں وہ بڑے شد و مد کے ساتھ اسی آیت (وَ اَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ) سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ ہزاروں لوگ جو فرعون کے ساتھ بحر قلزم یعنی بحر احمر میں غرق ہوئے جنہیں خدا نے آل فرعون کہا وہ سب نہ اس کی اولاد تھے اور نہ قریبی رشتہ دار، بلکہ اس کے پیروکار تھے۔ یہ استدلال اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ فرعون کو ایک خاص شخص سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا۔ جس طرح ایران کے ہر بادشاہ کو کسریٰ اور روم کے ہر بادشاہ کو ہرقل اور قیصر حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی، یمن کے بادشاہ کو تبع اور ترک کے بادشاہ کو خاقان کہا جاتا تھا۔ تو یہ سارے قبطی پہلے فرعون کی نسل در نسل سے تھے جس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا اس بیان سے واضح و عیاں ہو گیا کہ یہاں بھی لفظ آل اپنے حقیقی معنی قریبی رشتہ دار میں ہی استعمال ہوئی ہے۔

(۵۲) وَاِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤی ......الآیۃ۔

مفسرین اسلام بیان کرتے ہیں کہ فرعون اور فرعونیوں کی ہلاکت و بربادی کے بعد جب بنی اسرائیل صحیح و سلامت واپس مصر پہنچ گئے تو خدا نے اپنی حکمت کاملہ کے تحت ان سے تورات اور شریعت کے عطا کرنے کا وعدہ کیا اور اس کے لئے پہلے ذی القعدہ کی تیس راتیں منتخب کیں، مگر بعد ازاں اس میں بداء واقع ہو گیا اور اس میں ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں شامل کر کے انہیں چالیس راتیں قرار دے دیا (عیاشی و برہان)۔ چنانچہ یہ تفصیل سورہ اعراف میں مذکور ہے:

''وَ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّ اَتۡمَمۡنٰہَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّہٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً'' اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا اور اسے مزید دس راتوں سے مکمل کیا اس طرح ان کے پروردگار کا وعدہ چالیس راتوں کا ہو گیا۔ (اعراف۔ آیت۔ ۱۴۲)

اس آیت میں جس کی تفسیر کی جا رہی ہے دونوں میعادوں کا مجموعہ بیان کیا گیا ہے۔

بداء کا مختصر بیان

جس طرح حالات و ظروف کی تبدیلی سے شرعی احکام میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے جسے نسخ کہا جاتا ہے اسی طرح حالات و کوائف کے بدلنے سے تکوینی امور میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے اسے بداء کہا جاتا ہے بہر حال جناب موسیٰ علیہ السلام تیس راتوں کا وعدہ کر کے اور اپنی غیبت اور عدم موجودگی کے دنوں میں اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کر کے اور قوم کو بتا کے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کا حکم

دے کر کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ مگر یہ بداء قوم موسیٰعلیہ السلام کیلئے ذریعہ ابتلاء ہوگیا۔ یعنی جب تیس راتوں کے بعد جناب موسیٰعلیہ السلام واپس نہ آئے تو سامری نامی شخص کا داؤ چل گیا اور وہ گوسالہ جو اس نے سونے چاندی سے بنایا تھا اور اس میں جبرائیل کے گھوڑے کے سموں کے نیچے والی خاک ڈالی تھی جس پر سوار ہو کر انہوں نے فرعون اور اس کے لشکر کو دریا میں قدم رکھنے کی ترغیب دی تھی اور سامری نے وہ خاک اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ اس نے قوم سے کہا کہ جس خدا سے موسیعلیہ السلام کو وہ طور پر کلام و مناجات کرنے اور توراۃ لینے کیلئے گئے تھے۔ وہ اب واپس نہیں آئیں گے البتہ موسیٰ علیہ السلام کا وہ خدا خود چل کر تمہارے پاس آ گیا ہے جو یہ گوسالہ ہے۔

باوجودیکہ جناب ہارونعلیہ السلام انہیں اس شرک جلی سے منع کرتے رہے مگر قوم نے ایک نہ سنی اور اس کی بہت بڑی تعداد (جو احادیث میں ستر ہزار مروی ہے) اس بچھڑے کو خدا مان کر اس کی پرستش اور پوجا کرنے لگی اور چالیس دن کے بعد جب جناب موسیٰعلیہ السلام واپس تشریف لائے تو قوم کی اکثریت شرک جلی جیسے ظلم عظیم میں گرفتار ہو چکی تھی۔ انہوں نے جناب ہارونعلیہ السلام سے پوچھا کہ تمہاری موجودگی میں میری قوم گمراہ ہوگئی؟ انہوں نے کہا ''اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ (سورہ اعراف آیت۔ ۱۵۰)'' میں نے تو اپنا فرض ادا کیا اور ان کو منع کیا تھا مگر قوم نے مجھے کمزور سمجھ لیا۔ اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اس طرح توبہ کرو کہ ایک دوسرے کو قتل کرو (جس کی تفصیل بعد ازیں آ رہی ہے) اس کے بعد خدا نے انہیں معاف کر دیا تاکہ شکرگزاری کریں۔

آیات القرآن

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝۵۳ وَاِذْ قَالَ
مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ
فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ
بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَالتَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝۵۴ وَاِذْ قُلْتُمْ
يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۵ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ

تَشۡکُرُوۡنَ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡغَمَامَ وَاَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡمَنَّ
وَالسَّلۡوٰی ؕ کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ ؕ وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰکِنۡ
کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ﴿۵۷﴾

ترجمۃ الآیات

اور (وہ وقت یاد کرو) جب (فرعون تم پر ظلم کر رہے تھے تو) ہم نے موسیٰ کو کتاب وفرقان عطا کی تاکہ تم ہدایت حاصل کرو (۵۳) اور (وہ وقت یاد کرو) جب (موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا) اے میری قوم۔ یقیناً تم نے گوسالہ کو (معبود) بنا کر اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے خالق کی بارگاہ میں (اس طرح) توبہ کرو۔ کہ اپنی جانوں کو قتل کرو۔ یہی (طریقہ کار) تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس صورت میں اس نے تمہاری توبہ قبول کی۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا' نہایت رحم والا ہے۔ (۵۴) اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا اے موسیٰ! اس وقت تک ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک ظاہر بظاہر (اعلانیہ) خدا کو دیکھ نہ لیں۔ سو (اس پر) تمہارے دیکھتے بجلی نے تمہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ (۵۵) پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں زندہ کیا تاکہ (اس احسان کے بعد) تم شکر گزار بن جاؤ۔ (۵۶) اور ہم نے (صحراء میں) تمہارے اوپر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ نازل کیا (اور کہا) کہ ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور ان لوگوں نے (ناشکری کرکے) ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے (۵۷)

تشریح الالفاظ

(۱) الی بارئکم — یہ برء اور بروء سے مشتق ہے جس کے معنی عدم سے وجود میں لانے کے ہیں

(۲) الغمام — اس کے معنی ہیں بادل

تفسیر الآیات

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى...الآية۔

بعض مفسرین نے کتاب سے تورات مراد لی ہے اور فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا) سے معجزہ مراد لیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ہی چیز (تورات) کے دو عنوان ہیں اور فرقان کا کتاب پر عطف کرنا گویا موصوف پر صفت کا عطف ہے۔ جیسا کہ سورۂ انبیاء ۴۸ میں کتاب کو فرقان، ضیاء اور ذکر کہا گیا ہے۔ "وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ"

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى......الآية۔

جب جناب موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر کوہ طور سے واپس آئے اور قوم کی حالت زار دیکھی تو ان کی زجر و توبیخ کی اور انہیں توبہ کرنے کا حکم دیا اور اس دور میں شرک جو ظلم عظیم ہے کی توبہ یہ تھی کہ مجرم کو قتل کیا جاتا تھا جس طرح کہ ہماری شریعت مقدسہ میں بھی بعض گناہوں جیسے قتل عمد، فساد فی الارض، ارتداد فطری اور محصن و محصنہ کے زنا کی توبہ و سزا قتل مقرر ہے اب اس قتل کرنے کا طریقہ کیا تھا؟ اس سلسلہ میں دو قسم کی روایتیں ملتی ہیں۔

(۱) گوسالہ پرستوں کو حکم دیا گیا کہ اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں اور شمشیر بکف ہو کر ایک دوسرے کو قتل کریں چنانچہ اس طرح ہزارہا لوگ تہ تیغ ہو گئے ابھی کچھ لوگ زندہ تھے کہ خدائے توّاب نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان کو معاف کر دیا اس طرح جو قتل ہو گئے وہ شہید اور جو بچ گئے وہ تائب قرار پائے۔

(۲) جن بارہ ہزار افراد نے جناب ہارون علیہ السلام کی اطاعت کی تھی اور گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا ان کو حکم دیا گیا کہ شمشیر بکف ہو کر گوسالہ پرستی کرنے والوں کو قتل کریں۔ چنانچہ جب انہوں نے باختلاف روایات کم و بیش دس ہزار افراد کو قتل کیا تب خدا نے ان کو توبہ قبول کی (قمی وصافی)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس آئے اور تورات لائے اور بتایا کہ میں نے وہاں خدا سے کلام کیا ہے تو قوم نے مطالبہ کیا کہ جب تک ہم روبرو خدا کو نہ دیکھ لیں اور اپنے کانوں سے کلام الٰہی اور اس کی تصدیق نہ سن لیں۔ تب تک آپ کی یہ بات ہرگز نہیں مانیں گے کہ یہ کتاب خدا ہے اور آپ کلیم اللہ ہیں۔ جناب موسیٰ علیہ السلام نے بڑا سمجھایا کہ خدا ان آنکھوں سے نظر نہیں آتا (صافی)۔ بلکہ اسے اس کی آیات و آثار سے پہچانا جاتا ہے مگر جب وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے تو جناب موسیٰ۔ نے اپنی کثیر التعداد قوم میں سے انتخاب در

انتخاب کے بعد ستر آدمیوں کو منتخب کیا جیسا کہ ارشاد قدرت ہے ''وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا''۔(اعراف۔ ۱۵۵)۔ ہماری وعدہ گاہ کی جانب لیجانے کی خاطر موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا۔ جو بظاہر ساری قوم سے بہتر و برتر تھے۔ جب ان کو ہمراہ لے کر کوہ طور پر گئے تو ان کو دامن کوہ میں چھوڑ کر خود آگے تشریف لے گئے۔ اور خدا سے مکالمہ فرمایا جس کی آواز ان لوگوں نے بھی سنی۔ مگر اس کے باوجود خدا کے دیدار پر اصرار کیا اور جناب موسیٰؑ نے مجبوراً سوال کیا اس پر خدا نے از راہ عتاب ان لوگوں پر بجلی گرائی جس سے وہ جب ہلاک ہو گئے اور جناب موسیٰؑ غش کھا کر گر گئے۔ جب جناب موسیٰؑ کو افاقہ ہوا تو عرض کیا۔ بارالہا! جب قوم کہے گی کہ تو نے ہمارے ستر آدمی ہلاک کروائے تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ لہٰذا انہیں زندہ کر تو خدا نے انہیں زندہ کیا تا کہ شکر گزاری کریں۔

اس واقعہ کے نتائج:

اس واقعہ سے کئی امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) خدا کے قہر و غضب کے اس مظاہرہ سے ظاہر ہے کہ خدا کے دیدار کا مطالبہ کرنا ایک امر محال کا مطالبہ ہے جو خدا کی عظمت اور شان ربوبیت کے سراسر منافی ہے اور اس میں دنیا و آخرت کی تفریق بالکل بے جا ہے۔ ارشاد قدرت ہے۔ ''قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ ()سورہ اعراف آیت۔ ۱۴۳''۔(اللہ نے) کہا: تو کبھی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔

(۲) معجزہ فعل خدا ہوتا ہے جسے نبی یا وصی کی دعا و استدعا پر خدا اس کے ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ معجزہ مردہ کا زندہ کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ جو اگر چہ عادت و نیچر کے خلاف ضرور ہے مگر خلاف عقل یا محال عقلی نہیں ہے۔

(۳) جب جناب موسیٰؑ کے دور میں کئی آدمی ایک بار مر کے دوبارہ زندہ ہو چکے ہیں اسی سورہ کی آیت نمبر ۲۵۹ میں جناب عزیر علیہ السلام کے سو سال تک مرے رہنے اور پھر زندہ ہونے کا واقعہ مذکور ہے تو اگر جناب امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور کے وقت کچھ لوگ زندہ ہوں تو اس میں کیا تعجب ہے۔ ادل دلیل علی امکان الشئی وقوع الشئی۔ جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جو کچھ سابقہ امتوں میں ہوا ہے وہ اس امت میں بھی وقوع پذیر ہو کر رہے گا''۔(درمنشور، کنزالعمال وغیرہ)۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ......الآیۃ

بنی اسرائیل کے قصہ کے آغاز پر ہم یہود کی مختصر تاریخی روائیداد قلم بند کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ جناب یعقوب علیہ السلام (جن کا لقب اسرائیل ہے) اوران کی اولاد کا اصلی وطن فلسطین شام تھا جس سے وہ جناب یوسف علیہ السلام کی وزارت مصر کے دور میں مصر چلے گئے اور پھر صدیوں تک وہاں بڑے عروج پر رہے۔ چونکہ ان کے مصر چلے جانے کے بعد عمالقہ نے شام پر قبضہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی تو اب مدتوں کے بعد فرعون اور فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد خدا نے انہیں حکم دیا کہ اپنے وطن جا کر عمالقہ سے جہاد کر کے اپنے اصلی وطن کو ان سے آزاد کراؤ اور وہاں جا کر آزادی اور عزت وعظمت کے ساتھ زندگی گزارو" **وادخلوا الارض المقدسه** "۔مقدس زمین (شام) میں داخل ہو جاؤ انہوں نے عمالقہ کی قوت اور اپنی کمزوری کا بہانہ بنا کر جہاد کرنے سے انکار کر دیا اور یہاں تک کہہ دیا'۔ (مائدہ آیت۔ ۲۴) آپ اپنے پروردگار کو ساتھ لے کر ان سے جنگ کریں ہم یہاں بیٹھے ہیں (جس کی تفصیل سورہ مائدہ آیت رکوع ۸ میں بیان کی جائیگی۔ انشاءاللہ)

خدا نے ان کو اس حکم عدولی کی یہ سزا دی کہ پورے چالیس سال تک وادی تیہ کے ریگستان میں سرگرداں ہو کر خاک چھانتے رہے اور پریشان پھرتے رہے۔حالانکہ یہ مقام سینکڑوں میلوں تک پھیلا ہوا کوئی بڑا امید ان نہیں تھا۔ بلکہ قریباً دس میل مصر وشام کے درمیان ایک صحراء تھا۔ چونکہ خداوند عالم کو ان کا امتحان وابتلا مقصود تھا اس لئے وہ راستہ بھول جاتے۔ چنانچہ دن بھر سفر کرتے اور جب شام ہوتی تو دیکھتے کہ وہ جہاں سے چلے تھے ہنوز وہیں موجود ہیں۔

اس طرح چالیس سال بیت گئے۔ چونکہ میدان تیہ چٹیل میدان تھا جہاں نہ کوئی عمارت تھی نہ کوئی بڑا درخت اور نہ کوئی سائبان۔ نہ کوئی پانی کا چشمہ تھا اور نہ کوئی کھانے کا سامان۔اب چاہیے تو یہ تھا کہ یہ لوگ اس بے سروسامانی کے عالم میں مرمٹ جاتے۔مگر اس حالت میں بھی خدائے مہربان نے اپنی عنایات بے پایاں کا سلسلہ جاری رکھا اور نہ صرف زندگی کی تمام ضروریات بلکہ سہولیات کا بھی اپنی قدرت کاملہ اور اپنے خصوصی لطف وکرم سے انتظام کر دیا۔دھوپ سے بچنے کیلئے ابر کا سائبان بنا دیا۔ پیاس بجھانے کیلئے پتھر سے چشمے بہا دیئے۔

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ...الآیۃ۔

اور بھوک دور کرنے کیلئے من وسلویٰ کا اہتمام کر دیا۔اگرچہ من وسلوی کی پوری حقیقت تو معلوم نہیں مگر اہل لغت اور اہل تفسیر کی توضیح وتشریح سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ من ترنجبین کی قسم کی ایک

شھد سے بھی زیادہ شریں شکرتھی جو صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک مختلف بوٹیوں پر گر کر جم جاتی تھی جسے یہ اتار لیتے تھے اور سلوی بھونے ہوئے بٹیر کی قسم کی کوئی خاص لذیز غذا تھی۔ جو جزیرہ نمائے سینا کا خاص پرندہ ہے۔ یہ رات کے وقت نازل ہوتا تھا۔ جس سے ان لوگوں کا بآسانی وقت گزر جاتا اور بغیر کسی محنت و مشقت کے خورد و نوش کا سامان ہو جاتا بقولے یہ بٹیرے ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے اور ان سے بھاگتے نہیں تھے اور یہ ان کو پکڑ کر ذبح کر کے کھاتے تھے اور بعض آثار کے مطابق قادر مطلق نے کپڑوں کا بطور اعجاز یہ انتظام کیا کہ وہ نہ میلے ہوتے تھے نہ پھٹتے تھے اور بچوں کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتے بھی جاتے تھے۔ (تفسیر قرطبی)۔ واللہ العالم۔

آیات القرآن

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا
وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ۝٥٨ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ
فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝٥٩
وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ
فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝٦٠ وَاِذْ
قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا
مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا
وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا
مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ
وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

ترجمۃ الآیات

اور (یاد کرو وہ وقت) جب ہم نے کہا کہ اس بستی (بیت المقدس یا اریحا) میں داخل ہو جاؤ اور اس میں سے جہاں سے چاہو (اور جو چاہو) مزے سے با فراغت کھاؤ۔ (پیو) اور دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اور حطۃ (بخشش) کہتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔ ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور ہم نیکی کرنے والوں کو کچھ زیادہ ہی (ثواب) عطا کرینگے۔ (۵۸) مگر ان ظالموں نے وہ بات (حطّہ) جو ان سے کہی گئی تھی اسے ایک اور بات سے بدل دیا (اور حطۃ کی بجائے حنطۃ کہا) لہٰذا ہم نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر آسمان سے بڑا عذاب نازل کیا۔ (۵۹) اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کیلئے (خدا سے) پانی مانگا۔ تو ہم نے کہا اپنا عصا چٹان پر مارو جس کے نتیجہ میں بارہ چشمے پھوٹ نکلے اس طرح ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا۔ (ہم نے کہا) خدا کے دیئے ہوئے رزق سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ایک ہی (قسم کے) کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ اس لئے آپ اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ وہ (من وسلویٰ کی بجائے) ہمارے لئے وہ چیزیں نکالے (پیدا کرے) جو زمین اگاتی ہے جیسے ساگ پات، ترکاری، کھیرا، ککڑی، مسور اور لہسن پیاز۔ موسیٰ نے کہا کیا تم کمتر وکہتر چیز لینا چاہتے ہو اس کے بدلہ میں جو برتر و بہتر ہے۔ اچھا شہر میں اتر پڑو۔ بے شک (وہاں) تمہیں وہ کچھ مل جائیگا جو تم مانگتے ہو۔ اور (انجام کار) ان پر ذلت وخواری اور افلاس وناداری مسلط ہو گئی۔ اور وہ (اللہ کی نشانیوں) کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے (اور یہ اس لئے بھی ہوا) کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے (سرکشی کرتے تھے) (۶۱)

تشریح الالفاظ

(۱)حطۃٌ حطہ کے معنی بخشش کے ہیں

(۲)رجزًا من السماء رجز کے معنی عذاب اور گندگی کے ہیں

(۳)ولا تعثوا یہ عثی اور عثیان سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کفر' فساد یا غرور میں مبالغہ

(۴)یعتدون اس کا مصدر اعتداء ہے جس کے معنی تجاوز کرنے کے ہیں اور جب اس کا صلہ علی ہو تو پھر اس کے معنی ظلم ہوتے ہیں

تفسیر الآیات

ادْخُلُوا ......الآیۃ۔

بالآخر اللہ کر کے بیت المقدس (یا بروایت اریحا نامی بستی) تک پہنچے (جسے عمالقہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کئے گئے وعدہ کے مطابق خالی کر کے چلے گئے تھے)۔تو انہیں حکم دیا کہ اس کے باب حطہ سے ''حطّۃ'' (انہیں بخش دے) کہتے ہوئے سجدہ کناں (جھک کر) اس کے اندر داخل ہو جاؤ۔ مگر یہ شریر اس قدر ابتلاء وآزمائش۔ اور رب کریم کی اس قدر نوازشات کے بعد بھی شرارت اور حکم عدولی سے باز نہ آئے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ...الآیۃ

دونوں حکموں کی خلاف ورزی کی اور سجدہ ریزی و گردن جھکا کر داخل ہونے کی بجائے سینوں کے بل گھسٹ کر (مگر گردن تان کر) داخل ہوئے اور حطۃ کا مذاق اڑاتے ہوئے حنطۃ (ہمیں گندم دے) کہا جس کی پاداش میں خدا نے ان شریروں اور ظالموں پر بڑا سخت عذاب نازل فرمایا۔بعض اخبار و آثار کے مطابق وہ طاعون کی بیماری تھی جس سے ایک ساعت میں ان کے شیوخ واکابرین سے چوبیس ہزار آدمی لقمہ اجل بن گئے۔ اور ان کی چھوٹی اولادیں باقی رہ گئیں اس طرح ان لوگوں سے علم وعبادت منتقل ہو گئے۔ (تفسیر مجمع البیان)۔

اور ایک روایت کے مطابق دن کے بعض حصے میں ایک لاکھ بیس ہزار ایسے آدمی طاعون کی بیماری سے ہلاک ہو گئے جن کے بارے میں یہ بات خدا کے علم میں گزر چکی تھی کہ وہ نہ ایمان لائیں گے' نہ توبہ کریں گے

اورنہ ہی ان کی نسل سے کوئی مومن پیدا ہوگا۔(صافی)

فائدہ

کتب فریقین میں حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے۔''علی باب حطة ''۔(عمدة البیان)اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔

''نحن باب حطتکم ''۔ہم ہی تمہاری بخشش کا دروازہ ہیں۔(مجمع البیان)

بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْن......الآیة

یہ سب کچھ ان کے فسق وفجور کی وجہ سے ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کسی قوم پر بلا سبب کوئی عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ یہ سب کچھ ان کے برے اعمال وافعال کا نتیجہ ہوتا ہے۔سچ ہے

''اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سورہ رعد آیت۔۱۱)''۔

جب تک بندے اپنی حالت خود تبدیل نہ کریں تب تک خدا بھی ان کی حالت تبدیل نہیں کرتا۔

دعا اور حدیث وغیرہ میں الفاظ کے اندر ردوبدل کرنے کا شرعی حکم؟

دعا اور حدیث وغیرہ میں الفاظ کے اندر ردو بدل کرنے کا شرعی حکم؟۔ بنی اسرائیل کے لفظ حطة کو حنطة کے ساتھ بدلنے اور خدا کے ان پر عذاب نازل کرنے کی مناسبت کے پیش نظر بعض بڑے مفسرین جیسے رازی وغیرہ نے یہاں ضمنی طور پر یہ بحث چھیڑی ہے کہ ادعیہ وغیرہ میں الفاظ کا ادلنا بدلنا جائز ہے۔یا نہ؟ ہم بھی یہاں اس بحث کا خلاصہ بیان کئے دیتے ہیں کہ بعض اوقات الفاظ ومعانی دونوں مطلوب خدا ہوتے ہیں جیسے اذان اور نماز اور اسکے اذکار اور قرآن اور اس کی آیات وعبارات تو یہاں تو کسی قسم کا تغیر وتبدل قطعاً جائز نہیں ہے اور بزرگان دین سے منقول دعاؤں کی بھی قریباً قریباً یہی کیفیت ہے کہ وہاں بھی الفاظ کو خواص کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔جس کی رعایت کرنا ضروری ہوتی ہے دعائے غریق کے بارے میں وارد ہے کہ

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''جو شخص ہر نماز کے بعد ایک بار دعاء غریق پڑھے گا اس کا ایمان سلامت رہے گا''۔

راوی نے پوچھا: وہ دعا غریق کیا ہے؟

فرمایا یہ ہے۔

''یااللہ یا رحمن یا رحیم یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك''۔

راوی نے اسے دہرایا تو یوں پڑھا ''یا مقلب القلوب والابصار''

امام علیہ السلام نے فرمایا: یقینا خدا مقلب القلوب و الابصار ہے مگر تو اس طرح پڑھ جس طرح میں کہہ رہا ہوں ''یا مقلب القلوب''۔ (مفاتیح الجنان وغیرہ)۔

اور جہاں اصل مقصد صرف معنی و مفہوم ہوتا ہے الفاظ نہیں ہوتے جیسے اخبار و آثار تو وہاں ایک زباں دان رمز شناس اور ماہر کلام شخص کیلئے بنا بر اشہر و اظہر حدیث کا نقل بالمعنی کرنا جائز ہے اگر چہ اصل الفاظ کے ساتھ نقل کرنا افضل و اولیٰ ہے ''لان رب راو للحدیث یر وی الی من افقه منه''۔ الفاظ میں اس قسم کا ردو بدل کرنا جس سے اصل مطلب ہی بدل جائے وہ بہر حال حرام اور ناجائز ہے۔ رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ جب ایک لفظ بدلنے والوں پر خدائے قہار نے عذاب نازل فرمایا تو ان دین فروش لوگوں کا حشر کیا ہوگا جو اس کے دین کے عقائد کو تبدیل کرتے ہیں' اعمال کو خراب کرتے ہیں اور معاملات کو برباد کرتے ہیں الغرض وہ خود گمراہ ہیں ہی اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى......الآیۃ

یہاں خداوند عالم ان بعض واقعات کی تفصیل بیان فرما رہا ہے جو وادی تیہ میں پیش آئے جن میں سے بعض کا ہم اجمالاً تذکرہ کر چکے ہیں ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس وادی (جزیرہ نمائے سینا) میں چونکہ پانی دستیاب نہیں تھا۔ جب ان لوگوں کو پیاس لگی اور جناب موسیٰ علیہ السلام سے پانی مانگا تو جناب موسیٰ نے اپنی قوم کیلئے خدا سے پانی طلب کیا تو خدا نے حکم دیا کہ چٹان پر اپنا عصا مارو جب انہوں نے ایسا کیا تو اس سے بنی اسرائیل کے قبائل کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ جن سے ہر قبیلہ نے سیراب ہو کر پانی پیا اور پھر یہ سلسلہ وادی تیہ کے دوران قیام برابر جاری رہا کہتے ہیں کہ وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔

پادری دین اسٹیلے نے انیسویں صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافیائی تحقیق کیلئے خود فلسطین کی سیاحت کی اور اپنے مشاہدات و تحقیقات کو ''Siniperstine'' کے نام سے شائع کیا۔ اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔ ''یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور راس سفسفہ کے قریب لیجا کی وسیع وادی میں واقع ہے اس میں شگاف اور دراڑ جا بجا پڑے ہوئے ہیں۔ ''سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کیلئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے یہ اشارہ انہی شگافوں کی طرف ہے۔ ص ۸ ۳ ۔ ۷ ۳۔ (بحوالہ تفسیر ماجدی)

واضح رہے کہ جناب یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے اور ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک قبیلہ تھا ان کو

انتظامی معلاملات میں علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا سب کے حاکم اور افسر بھی الگ الگ تھے۔اس لئے بارہ چشمے نکلے تھے اور ہر چشمہ سے ایک قبیلہ پانی پیتا تھا۔ ارشاد ہوا کھاؤ یعنی من وسلوی اور پیو یعنی اس چشمہ کا پانی مگر زمین میں فساد نہ پھیلاؤ یہ بھی جناب موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے جو مجرائے طبیعی اور نیچر کے ضرور خلاف ہے۔ مگر عقل کے خلاف نہیں ہے اور قادر مطلق کی قدرت سے خارج نہیں ہے اور اس کا انکار کرنا جہل و نادانی اور بے ایمانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى......الآیۃ۔

اس وقت کو یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے پروردگار سے کہیے کہ ہمارے لئے ساگ پات، ترکاری، کھیرا، ککڑی، گہیوں مسور اور لہسن و پیاز پیدا کرے جس کا خدا نے وہ جواب دیا جو قرآن میں مذکور ہے کہ تم کمتر و کہتر چیز لینا چاہتے ہو اس کے بدلہ میں جو بہتر و برتر ہے یہ انسانی فطرت ہے کہ ایک غذا کھاتے کھاتے اس کا جی بھر جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ جن حالات سے دوچار تھے وہ انہی لوگوں کی سرکشی اور بے راہ روی کا نتیجہ تھے کہ خدا نے فرمایا تھا اب چالیس سال تک یہیں سرگردان و پریشان پھرتے رہو۔ تم پر ارض مقدس میں داخلہ حرام ہے۔ تو ان حالات میں جو کچھ مل رہا تھا وہ بھی غنیمت تھا انہیں صبر و شکر کے ساتھ اس پر اکتفا کرنا چاہیے تھا نہ یہ کہ یہ ناز ونخرے کرتے۔ اور مختلف کھانوں کی فرمائشیں کرتے۔ بہرحال جناب موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ یہ چیزیں یہاں کہاں؟ کسی شہر میں جا کر اترو۔ وہاں تمہیں وہ مل جائیگا جو تم مانگ رہے ہو۔ مگر ابھی تم کس طرح جا سکتے ہو۔ تم تو ہنوز یہاں سزا بھگت رہے ہو۔

یہود کی ذلت ومسکنت کا تذکرہ

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ......الآیۃ۔

اور سب کچھ بلا وجہ نہیں ہوا بلکہ اس لئے ہوا کہ وہ آیات الہیہ کا انکار کرتے تھے اور انبیاء جیسے جناب شعیب علیہ السلام، زکریا علیہ السلام اور یحییٰ وامثالھم کو ناحق قتل کرتے تھے۔ ذلت ومسکنت کا مفہوم یہ ہے کہ یہود جس قدر بھی سرمایہ دار بن جائیں وہ جہاں بھی ہوں گے اقوام عالم کی نگاہ میں ذلیل ہی سمجھے جائیں گے جس کا مشاہدہ شاہد ہے اور ان کے چند افراد چاہے جس قدر مالدار ہو جائیں ان کے عوام دوسری اقوام عالم سے زیادہ غریب ونادار ہی ہوں گے۔ اور بقول علامہ سید علی نقیؒ واقعہ یہ ہے کہ ایک سود خوار قوم کتنی ہی دولت مند یا پامردی پامردی ہمسایہ کی حکومت کی بھی مالک ہو جائے پھر بھی دنائت نفس اور محتاجی کے احساس سے بلند نہیں

ہوسکتی (فصل الخطاب)۔

بعض مفسرین نے اس مسکنت سے قلبی مسکنت مراد لی ہے۔ کہ یہود کو خدا کی وہ مار ہے کہ وہ سرمایہ دار ہوتے ہوئے بھی فقیر القلب ہوتے ہیں اور حرص ولالچ کی وجہ سے وہ محتاج ہی رہتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''الغنی غنی النفس'' (تونگری تو دل کی تونگری ہے) مجمع البیان

مگر کوئی یہودی دل کا تونگر نظر نہیں آتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

تو نگری بدل است نہ بمال
بز ر گی بعقل است نہ بسال

یہود کی اس ذلت ومسکنت کی مزید وضاحت ہم ایک دوسری متعلقہ آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے اور وہ یہ ہے ''ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ'' (آل عمران آیت۔ ۱۱۲)۔ اور وہیں حبل من اللہ اور حبل من الناس کی بھی پوری توضیح وتشریح کی جائیگی۔ کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس استثناء کا کیا مفہوم ہے فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

آیات القرآن

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمۃ الآیات

بے شک جو لوگ مومن، یہودی، نصرانی اور صابی (ستارہ پرست) کہلاتے ہیں۔ (غرض) جو کوئی بھی (واقعی) اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ تو ان (سب) کیلئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر وثواب (محفوظ) ہے اور ان کیلئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے (۶۲) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے (کوہ) طور کو تم پر اٹھا کر (اور لٹکا کر) یہ عہد و پیمان لیا تھا کہ ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے (تورات) اسے مضبوطی سے پکڑو۔ اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو (اس پر عمل کرو) تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ (۶۳) پھر تم اس (پختہ عہد) کے بعد پھر گئے سوا گر تم پر اللہ کا خاص فضل وکرم اور اس کی خاص رحمت نہ ہوتی تو تم سخت خسارہ (گھاٹا) اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے (۶۴)

تشریح الالفاظ

(۱) **والصابئین** یہ صابی کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ستارہ پرست

تفسیر الآیات

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ...... الآیۃ۔

کچھ خوش فہم، وسیع المشرب اور ہر دلعزیز بننے کے شائق لوگ جو وحدت ادیان کے قائل ہیں وہ بمو جب **کلمة حق یراد بها الباطل** بڑے شد ومد کے ساتھ اس آیت مبارکہ سے اپنے زعم باطل پر استدلال کیا کرتے ہیں کہ اخروی فوز وفلاح کیلئے دین اسلام کو یا خدا کو عادل یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت یا اہل بیت علیہم السلام کی امامت کو ماننے کی کوئی شرط نہیں ہے بس اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنا اور نیک عمل کرنا کافی ہے ایسے ہی لوگوں پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

قل للذی یدعی فی العلم فلسفة
حفظت شیئاً و غابت عنك اشیاء

ایسے لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے بنابریں اگر اخروی فوز وفلاح اور نجات کیلئے صرف خدا و آخرت کے دن پر ایمان رکھنا اور نیک عمل کرنا کافی ہوتو پھر ان سب آیات کا کیا کیا جائیگا جن میں کہیں خدا کو عادل جاننے کہیں پیغمبر اسلام کو نبی اور خاتم الانبیاء ماننے کہیں اہل بیت نبوت' سے بطور اجر رسالت محبت کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ بنابریں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس آیت میں خداوند عالم نجات کے تمام ٹھیکیداروں اور جنت کے اجارہ داروں کو دعوت عام دے رہا ہے کہ تم کہتے ہو جنت میں وہ جائیگا جو یہودی ہوگا یا جو نصرانی ہوگا۔ یا۔ یا۔ یا۔

ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی خدا و آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا۔ وہ خواہ مسلمان ہو یا یہودی یا نصرانی یا صابی وغیرہ۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ ایمان باللہ کیا ہے اور اس کا تقاضا کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو اللہ پر ایمان لائیگا وہ اس کی صفات جلال و جمال پر بھی ایمان لائے گا اور اس کی صفات کمال میں سے ایک عظیم صفت اس کا عادل ہونا بھی ہے اور یہ وہ قطب آسیا ہے جس کے اردگرد سارے دین کی چکی گھومتی ہے۔

اور جب خدا اور اس کی عدالت پر ایمان لائے گا تو اس کے کلام کو بھی مانے گا۔ اور جب وہ فرمائے گا کہ ''محمد رسول اللہ ﷺ'' تو پھر ان کی نبوت پر بھی ایمان لانا پڑے گا اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی مانے گا تو پھر ان کے فرمان 'من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کو ولی و امام بھی ماننا پڑ یگا۔ اور قیامت کا ذکر تو صراحتاً آ گیا اور یہی تو اصول ایمان ہیں اور جب ان کے ساتھ واجبات شرعیہ پر عمل کرے گا اور محرمات الٰہیہ سے دامن بچائے گا تو پھر بموجب **والذین آمنوا وعملوا الصّٰلحات اولٰئك اصحٰب الجنة هم فیها خالدون** ایسے ہی لوگ جنت الفردوس میں جائیں گے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ ازل سے ابد تک دین ہمیشہ ایک رہا ہے اور شریعت' منہاج اور نسک یعنی احکام اور طریقہ ہائے عبادت اور طرز بود و ماند حالات وظروف اور لوگوں کے بدلنے سے بدلتے رہے ہیں مگر ہر دین کے اصول ہمیشہ تین رہے ہیں توحید' نبوت' اور قیامت اور جب سب ادیان کے آخر میں دین اسلام اپنے مخصوص احکام و نظام کے ساتھ آ گیا تو اب خداوند عالم نے واضح اعلان کر دیا ہے کہ

''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ '' (سورہ آل عمران آیت۔ ۱۹)

(جو دین خدا کا پسندیدہ اور اس کے نزدیک قابل قبول اور نجات کا ضامن دین ہے وہ صرف اسلام ہے)

مزید برآن دوٹوک الفاظ میں اعلان کر دیا کہ:

''وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ''(سورہ آل عمران آیت۔۸۵)

جو شخص دین وشریعت اسلام کو چھوڑ کر کسی بھی اور دین کو اختیار کرے گا اس کا دین ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا (اور اسے آخرت میں نقصان وزیاں اٹھانا پڑے گا)

ان حقائق سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح وآشکار ہوگئی کہ اُخروی فوز وفلاح حاصل کرنے اور جنت الفردوس میں داخل ہونے کیلئے دین اسلام اختیار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ والحمدللہ۔

مخفی نہ رہے کہ صائبہ ایک قوم ہے جو خدا وآخرت اور بعض انبیاء کا اقرار کرتی ہے مگر اس کا عقیدہ ہے کہ ستارے خیر وشر اور صحت ومرض وغیرہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے وہ ستارہ پرستی کرتی ہے۔ اور سب سے پہلے ستارہ پرستی کا ارتکاب نمرود کی قوم نے کیا تھا۔ جن کی طرف جناب خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ کو بھیجا گیا تھا۔ (تفسیر کاشف)۔

اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ......الآیۃ۔

جب جناب موسیٰ تورات لے کر کوہ طور سے واپس آئے اور قوم کو بتایا کہ میں خدا کی جانب سے تورات لایا ہوں جو تمہارے لئے ذریعہ ہدایت اور منارۂ نور ہے اور اس میں حلال وحرام کے احکام ہیں تو انہوں نے اس کا انکار کیا تب خدا نے کوہ طور کو ان پر بلند کیا۔ (جس کی تفصیلی کیفیت معلوم نہیں ہے) اور ان سے اسکے تسلیم کرنے پر ہر قلبی وبدنی قوت وطاقت سے عمل کرنے کا عہد وپیمان لیا۔

ایک ایراد اور اس کا جواب

کہا جاتا ہے کہ جب دین میں جبر نہیں ہے تو پھر خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسا کرنے سے جہاں خدا کی قدرت کاملہ کا اظہار مقصود ہے وہاں ان لوگوں کو فی الجملہ خوفزدہ کرنا مطلوب بھی ہے۔ مگر اس سے وہ جبر واکراہ لازم نہیں آتا جس سے انسان کا اختیار سلب ہو جائے اگر خدا ایسا کرتا تو پھر دنیا جہاں میں کوئی بھی کافر نظر نہ آتا سب ایمان لے آتے ''وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ کُلُّہُمۡ جَمِیۡعًا''(سورہ یونس آیت۔۹۹)

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ سختی ایمان لانے پر نہ تھی بلکہ پہلے اقرار کر کے اب بغاوت ظاہر کرنے اور اسے کچلنے کیلئے یہ کاروائی کی گئی تھی اور ظاہر ہے کہ کسی بھی حکومت کے باغی کیلئے دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ (۱)۔

اطاعت (۲)۔ یا پھر قتل

ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ ......الآیة

ان لوگوں کی ڈھٹائی اور بے حیائی قابل دید ہے کہ اس قدر تاکید اور اہتمام وانتظام کے باوجود اس عہد و پیمان سے منحرف ہوگئے سچ ہے۔

جنہیں ہوڈوبنا وہ ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

پھر خدا کا فضل وکرم ان کے شامل حال ہوا اور نہ خسارا اٹھانے والوں میں سے ہوجاتے۔

آیات القرآن

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِیۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡکُمۡ فِی السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ کُوۡنُوۡا
قِرَدَةً خٰسِـِٕیۡنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلۡنٰهَا نَکَالًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا وَمَوۡعِظَةً
لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۶﴾ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا
بَقَرَةً ؕ قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ
الۡجٰهِلِیۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنۡ لَّنَا مَا هِیَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوۡلُ
اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِکۡرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیۡنَ ذٰلِکَ ؕ فَافۡعَلُوۡا مَا
تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوۡلُ
اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیۡنَ ﴿۶۹﴾

ترجمة الآیات

اور یقیناً تمہیں ان لوگوں کا تو علم ہے جنہوں نے تم میں سے یوم السبت (ہفتہ کے دن) کے بارے میں زیادتی کی۔ (اور اس دن شکار کرکے قانون شکنی کی) تو ہم نے ان سے کہا کہ تم دھتکارے ہوئے بندر بن جاؤ (۶۵) پس ہم نے اس واقعہ کو اس زمانہ کے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کیلئے (سامان) عبرت اور پرہیزگاروں کیلئے نصیحت بنادیا (۶۶) اور (اس وقت

کو یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ کہنے لگے آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں فرمایا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کی میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔(۶۷) انہوں نے کہا ہماری خاطر اپنے پروردگار سے التجا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ گائے کیسی ہو؟ (موسیٰ نے) کہا وہ (اللہ) فرماتا ہے کہ وہ نہ بالکل بوڑھی ہو اور نہ بالکل بن بیاہی بچھیا۔ بلکہ ان دونوں کے بین (اوسط عمر کی ہو) جو حکم تمہیں دیا جا رہا ہے اسکی تعمیل کرو (۶۸) کہنے لگے کہ ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا وہ (اللہ) فرماتا ہے کہ وہ ایسے شوخ گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے کا جی خوش کر دے (۶۹)

تشریح الالفاظ

(۱) قردۃ　　القرد کے معنی ہیں بندر

(۲) خاسئین　　یہ خسأ اور خسوٴ سے مشتق ہے جس کے معنی دھتکارنے کے ہیں

(۳) فارضٌ　　اس کے معنی پرانے اور موٹے کے ہیں

(۴) عوانٌ　　اس کے معنی ادھیڑ عمر کے ہیں

تفسیر الآیات

یوم السبت کی حرمت پائمال کرنے کے نتیجہ میں ایک قوم کے مسخ ہونے کا تذکرہ

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ......الآیۃ۔

شریعت موسوی میں یوم السبت (بروز سینچر) خاص عبادت اور ذکر الٰہی کا دن تھا۔ اس دن ان کیلئے دنیا کا کاروبار اور شکار کرنا اس قدر حرام اور سخت ممنوع تھا کہ اس کی خلاف ورزی کرنے کی سزا قتل تھی۔ مگر کچھ لوگوں نے یہ حیلہ سازی اور فریب کاری کی کہ جمعہ کے دن دریا کے کنارے گڑھے کھودتے اور پھر چھوٹی چھوٹی نالیوں

کے ذریعہ انہیں دریا سے ملاتے اس طرح ہفتے کے دن مچھلیاں ان گڑھوں میں جمع ہو جاتیں اور اتوار کے دن وہ ان کا شکار کرتے یعنی ان کو پکڑ لیتے ۔ اس حیلے بہانے سے ان لوگوں نے خدا کے حکم کو بے اثر بنا دیا۔ ان کی اس نا شائستہ حرکت پر خداوند عالم ان پر اس قدر غضبناک ہوا کہ ان کو مسخ کر کے بندر بنا دیا احادیث میں وارد ہے کہ جس مخلوق کو خدا مسخ کرتا ہے وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہتی بلکہ ہلاک ہو جاتی ہے اور نہ ہی آگے اس کی نسل چلتی ہے البتہ خدا اس کی شکل وصورت پر اور مخلوق پیدا کرتا ہے (خصال شیخ صدوق)

اس طرح خدا نے ان لوگوں کو ذلیل ورسوا کر کے ہلاک وبرباد کر دیا۔ قرآن کے انداز بیان ''تمہیں معلوم ہیں وہ............لوگ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت اس واقعہ کا یہود میں چرچا تھا۔ خدا نے اس واقعہ کو اس عہد اور بعد میں آنے والوں کیلئے سزا اور درس عبرت قرار دیا ہے کہ وہ ایسے کاموں سے احتراز کریں ورنہ ان کے ساتھ بھی ایسا سلوک ہوسکتا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ بعض جدید مفسرین نے اس مسخ کی یہ تاویل کی ہے کہ ان کی طبعی اور اخلاقی حالت بندروں جیسی ہوگئی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ حقیقی طور پر مسخ ہوئے تھے۔ جیسا کہ قرآن کے ظاہری الفاظ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے اور اخبار وآثار سے بھی یہی واضح وآشکار ہوتا ہے پھر تاویل کی کیا ضرورت؟ یہ واقعہ کہاں واقع ہوا؟ قرآن میں تو صراحت نہیں مگر بعض روایات سے دریا کے کنارے ایلہ نامی بستی کا نام ملتا ہے جیسا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے (مجمع البیان)

یہ واقعہ کس دور میں رونما ہوا؟ مشہور یہ ہے کہ جناب داؤد کے زمانہ میں ہوا۔ اس واقعہ ہائلہ سے واضح ہوتا ہے کہ مختلف حیلوں بہانوں سے شرعی احکام کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہے ہاں البتہ بعض فقہی حیلے ایسے میں ہیں جن کا شرعی نقطہ نگاہ سے جواز ثابت ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی......الآیۃ

اس قصہ کی شان نزول میں دو روایتیں ملتی ہیں

ایک یہ کہ بنی اسرائیل کے ایک نیکوکار آدمی کو اس کے ناہنجار، چچازاد بھائی نے جائیداد کے لالچ میں قتل کر دیا اور پھر اسکی لاش کو دوسرے گروہ کے دروازہ پر ڈال دیا اور خود اسکے خون کا مدعی بن بیٹھا۔ (عیاشی از حضرت امام رضا علیہ السلام)

دوسری یہ کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کے باپ سے پہلے اسکے چچا زاد نے رشتہ طلب کیا مگر لڑکی کے باپ نے انکار کر دیا۔ پھر بنی اسرائیل کے ایک نیک آدمی نے رشتہ طلب کیا تو لڑ

کی کے باپ نے ہاں کر دی۔ جس پر پہلے شخص نے مشتعل ہو کر لڑکی کے باپ کو قتل کر دیا۔ اور پھر اس کے خون کا مدعی بن بیٹھا (مجمع البیان از حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام)۔

الغرض اس غیر معمولی واقعہ سے شورش بپا ہو گئی لوگ ایک دوسرے پر اس قتل کا الزام لگانے لگے۔ بالا خر جناب موسی علیہ السلام کی خدمت میں رجوع کیا گیا تو انہوں نے بظاہر تو اس قتل کا معمہ حل کرنے کیلئے خدا کے حکم کے مطابق ان کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کا کوئی ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو مگر دراصل اس مخصوص گائے کے مالک کو مالی فائدہ پہنچانا مقصود تھا جو صالح تھا اور اپنے باپ سے بڑا اچھا سلوک کرتا تھا جس کا یہ عمل خدا کو بہت پسند آیا تھا۔ چونکہ قتل کا یہ معمہ حل کرنے میں حسب ظاہر گائے ذبح کرنے کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے قوم نے کہا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں فرمایا میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں سے ہو جاؤں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذاق اور تمسخر کرنا جاہلوں کا شیوہ وشعار ہے۔

بہر حال پھر قوم نے وہ سوال و جواب شروع کیا جس کا تذکرہ ان آیات میں کیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار سے درخواست کریں کہ وہ کھول کر بتائے کہ وہ گائے کیسی ہے؟۔ بالاخر ان صفات کی گائے بنی اسرائیل کے اسی صالح جوان آدمی کے ہاں سے ملی جسے بڑی بھاری بھر کم قیمت ادا کر کے خریدا گیا۔ اور جب اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارا گیا تو وہ بحکم پروردگار زندہ ہو گیا۔ اور جب اس سے پوچھا گیا کہ تجھے کس نے قتل کیا ہے تو اس نے اپنے چچازاد کا نام بتایا (جو اس کے خون کا مدعی بنا بیٹھا تھا) اور کہا جن کو میرے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا ہے وہ بے قصور ہیں چنانچہ اصلی قاتل کو قتل کر دیا گیا۔ (قمی و نور الثقلین)

ضروری وضاحت

متعدد روایات میں وارد ہے کہ جب بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ ایک گائے ذبح کرو (جیسا کہ ''بقرۃ'' کی تنکیر سے بھی واضح ہے) اگر وہ لوگ کوئی سی گائے ذبح کر دیتے اور کٹ حجتیوں سے کام نہ لیتے تو اس سے مطلب براری ہو جاتی۔ مگر ان کے بلا جواز سوال و جواب اور ان کی کٹ حجتیوں نے ان کا قافیہ حیات تنگ کر دیا۔ اور آخر کار قرعہ فال ایک ایسی گائے پر پڑا جو ہزاروں میں ایک تھی اور جب اسکی قیمت طے کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو اسی گائے کی کھال بھر سونا ادا کرنا پڑا جو ان کی اس غلط روش کی سزا تھی وہ تو حیلوں بہانوں سے اس حکم کو ٹالنا چاہتے تھے مگر خدا نے کافی وشافی جواب دے کر ان کو طوعاً و کرھاً تعمیل پر آمادہ کر دیا ''وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۷۱) جب کہ وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اس میں یہ درس پوشیدہ ہے کہ آدمی کو لا یعنی قیل وقال اور غلط جواب وسوال سے احتراز کرنا چاہیے اور ہر بات کو بنی اسرائیل کی گائے نہیں بنانا چاہیے اور ایسا کر

کے خواہ مخواہ اپنے لے قافیۂ حیات تنگ نہیں کرنا چاہیے واللہ الموفق۔

آیات القرآن

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ۝۷۰ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ
الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ
جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ۝۷۱ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا
فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۝۷۲ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ
بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَعْقِلُوْنَ۝۷۳ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ
قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا
يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝۷۴

ترجمۃ الآیات

وہ بولے ہماری طرف سے۔ اپنے پروردگار سے عرض کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو چونکہ یہ گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی ہے؟ اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم (اس گائے تک) صحیح راستہ پا جائیں گے (۷۰) (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا وہ (پروردگار) فرماتا ہے کہ ایسی گائے ہے جو سدھائی ہوئی نہیں ہے۔ نہ زمین کو جوتتی ہے اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہے۔ وہ صحیح سالم اور بے عیب ہے (اور ایسی یک رنگی ہے کہ) اس میں کوئی داغ دھبہ نہیں ہے اس پر پکار اٹھے۔ اب آپ ٹھیک بات لائے غرض اب انہوں نے اسے ذبح کیا جبکہ وہ ایسا کرتے معلوم نہیں

ہوتے تھے (۷۱) اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا۔ اور پھر اسکے بارے میں باہم جھگڑنے لگے (ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے) اور اللہ اس چیز کو ظاہر کرنے والا تھا جسے تم چھپا رہے تھے (۷۲) (اس لئے) ہم نے کہا کہ اس گائے کا کوئی ٹکڑا اس (مقتول کی لاش) پر مارو) اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو (۷۳) (اے بنی اسرائیل) پھر اس کے بعد تمہارے دل ایسے سخت ہو گئے کہ گویا وہ پتھر ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت کیونکہ پتھروں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو خدا کے خوف وخشیت سے گر پڑتے ہیں۔ اور تم لوگ جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے غافل (بے خبر) نہیں ہے (۷۴)

تشریح الالفاظ

(۱) لاذلولٌ — ذلول کے معنی جلد رام ہونے والی یعنی سدھائی ہوئی

(۲) ثم قست — یہ قسو اور قساوت سے مشتق ہے جس کے معنی سخت اور ٹھوس ہونے کے ہیں

تفسیر الآیات

كَذٰلِكَ يُحْيِ......الآية۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسب الحکم ان لوگوں نے گائے کا ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارا تھا اور اس نے زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام ونشان بتایا تھا خدا اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے وہ قادر مطلق ویسے بھی قاتل کا نام بتا سکتا تھا اور گائے کا ٹکڑا مارے بغیر بھی مقتول کو زندہ کر سکتا تھا۔ مگر ایسا نہ کیا اور گائے ذبح کرائی اسکے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ومصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جس کا جاننا ہمارے لئے ضروری نہیں ہے اور یہاں تو پھر بھی حدیثوں سے پتہ چل گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے صالح جوان کو مالی فائدہ پہنچانا مقصود تھا۔ نیز اس طرح جناب موسیٰ کی صداقت کا معجزہ دکھانا مطلوب تھا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ ......الآية۔

چاہیے تو یہ تھا کہ سابقہ آیات بینات' معجزات قاہرات اور خدا کی قدرت اور حضرت موسیٰ کی صداقت کی یہ نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کے دل نرم اور ایمان سخت ہو جاتے مگر اس کے برعکس ہوا یہ کہ ان کے دل پتھر بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ انسان بھی ایک عجیب طرفہ معجون ہے جب ترقی کرنے پر آ جاتا ہے تو مخدوم ملائکہ بن جاتا ہے۔

فرشتوں سے افضل ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اور جب تنزل پر بضد ہو جاتا ہے تو پھر حیوانوں سے بلکہ پتھروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ''او'' کا لفظ جس کے معنی عموماً اردو میں ''یا'' کے کئے جاتے ہیں جب خدا کے کلام میں آ جائے تو وہاں اظہار شک کیلئے نہیں ہوتا۔ بلکہ ''بلکہ'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے اس آیت میں ہے کہ پھر تمہارے دل سخت ہو گئے گویا پتھر ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت یا جیسے اس آیت میں ''وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ''۔ ہم نے ان (یونس) کو ایک لاکھ بلکہ اس سے زیادہ آدمیوں کی طرف بھیجا (سورہ صافات آیت۔ ۱۴۷)۔ جیسے ''قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى'' دو کمان بلکہ اس سے بھی کم (سورہ نجم آیت۔ ۹)۔ بعد ازاں خدائے حکیم نے ان کے دلوں کے پتھر سے زیادہ سخت ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ پتھر میں تکوینی طور پر اثر پذیری کی تین خصوصیات پائی جاتی ہیں

(۱) وہ پھٹ جاتا ہے پھر کبھی اس سے زیادہ پانی نکلتا ہے جس سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔

(۲) کبھی اس سے تھوڑا سا پانی نکلتا ہے۔

(۳) پتھر جلال الٰہی سے گر پڑتے ہیں پتھر کے پہلے دو اثر تو مشاہدہ سے ثابت ہیں باقی رہ جاتی ہے۔ تیسری خاصیت کہ پتھر خوف خدا کے زیر اثر نیچے بھی آ پڑتے ہیں۔ تو ممکن ہے کہ جمادات میں بھی اس قدر حس ہو جس کا ہمیں احساس نہیں ہے جس طرح ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے ''وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ'' (سورہ بنی اسرائیل آیت۔ ۴۴) مگر ہمیں اس کا شعور نہیں ہے مگر ان کے دل ایسے سخت ہیں کہ ان پر کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کلام خدا کا اور نہ معجزات انبیاء کا۔ پتھروں سے پھر بھی تھوڑا یا زیادہ لوگوں کو کوئی فائدہ پہنچ جاتا ہے مگر ان کے دل ایسے ہیں کہ نہ ان سے کسی اور کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود انہیں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہیں لطف یہ ہے کہ خود بنی اسرائیل پتھروں کے بعض مناظر (جیسے پتھر سے بارہ چشمے پھوٹنے کے) بچشم خود دیکھ بھی چکے تھے۔ سچ ہے۔ ''وَ

مَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنۡ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ (سورہ یونس آیت۔۱۰۱)"۔

آیات القرآن

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِهٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴿۷۶﴾ اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ﴿۷۷﴾ وَمِنۡهُمۡ اُمِّیُّوۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ﴿۷۸﴾ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ ٭ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِیَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ فَوَیۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا کَتَبَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ وَوَیۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا یَکۡسِبُوۡنَ﴿۷۹﴾

ترجمۃ الآیات

(اے مسلمانو) کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لائیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی گذرا ہے جو اللہ کا کلام سنتا تھا اور پھر اسے سمجھنے کے بعد دیدہ دانستہ اس میں تحریف (ردوبدل) کردیتا تھا (۷۵) اور (یہ منافق لوگ) جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم ان (مسلمانو) کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے (توراۃ) میں تم پر ظاہر کی ہیں تاکہ وہ انہیں تمہارے پروردگار کے حضور تمہارے خلاف بطور حجت پیش کریں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے (۷۶) کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے

جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں (۷۷) اور ان (یہود) میں کچھ ایسے ان پڑھ بھی ہیں جو بے بنیاد امیدوں اور جھوٹی آرزوں کے سوا کتاب (تورات) کا کچھ بھی علم نہیں رکھتے) اور وہ صرف خام خیالیوں میں پڑے رہتے ہیں۔ (۷۸) سو خرابی و بربادی ہے ان لوگوں کیلئے جو اپنے ہاتھوں سے (جعلی) کتاب (تحریر) لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے (آئی) ہے تا کہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت (دنیوی فائدہ) حاصل کریں پس خرابی ہے ان کیلئے ان کے ہاتھوں کی لکھائی پر اور بربادی ہے ان کیلئے ان کی اس کمائی پر (۷۹)

تشریح الالفاظ

(۱) الیحاجو کم یہ حجاج اور محاجہ سے مشتق ہے جس کے معنی جھگڑا کرنے کے ہیں

(۲) امیون یہ امّی کی جمع ہے جس کے عام معنی تو ان پڑھ اور بے پڑھے لکھے کے ہیں مگر اس کے ایک دوسرے معنی ام القریٰ یعنی مکہ کا رہائشی بھی ہیں

(۳) امانی یہ امنیہٌ کی جمع ہے جس کے معنی آرزو اور خواہش کے ہیں ٦

تفسیر الآیات

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ......الآیۃ۔

مسلمانوں سے خطاب ہے اور یہ استفہام انکاری ہے کہ کیا ان حالات میں بھی تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ یہودی تمہارے کہنے سے ایمان لائیں گے۔ جبکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہو گزرا ہے جو اللہ کا کلام سنتا تھا اور پھر اسے سمجھنے کے بعد دیدہ دانستہ اسمیں تحریف کر دیتا تھا۔

تحریف کا مفہوم اور اس کی قسمیں

تحریف (ردوبدل) کی دو قسمیں ہیں (۱) لفظی کہ الفاظ میں اس طرح ردوبدل اور ترمیم کرنا کہ جس سے معنی و مفہوم بدل جائے (۲) معنوی کہ الفاظ کے صاف و صریح مطلب کی غلط تاویل کر کے اسے کہیں سے کہیں لے جانا۔ یہاں دونوں قسم کی تحریف مراد ہو سکتی ہے۔ اگرچہ من بعد ما عقلوہ۔ کہ لفظ معنوی تحریف

سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے صاحب مجمع البیان لکھتے ہیں:

”فی ھذہ الا یۃ دلا لۃ علی عظم الذنب فی تحریف الشرع وھو عام فی اظھار البدع فی الفتاوی و القضایا وجمیع امور الدین۔اس آیت سے شریعت میں تحریف کرنے کے گناہ کی سنگینی پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے عام اس سے کہ وہ تحریف بدعتوں کا اظہار کر کے کی جائے یا غلط فتوی دے کر یا غلط فیصلہ کر کے یا باقی شرعی امور میں ردو بدل کر کے“ (مجمع البیان)

بلکہ ایسے ضال و مضل لوگوں کی غوایت و گمراہی کا اثر صرف ان کی ذات یا ان کے عہد کے لوگوں پر ہی نہیں پڑتا۔ بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی پڑتا ہے۔ کما لا یخفی۔

منافقین یہود کی بعض کارستانیوں کا تذکرہ

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ......الآیة

یہاں سے یہود کے منافقین کا حال شروع ہو رہا ہے حقیقت الامر یہ ہے کہ قرآن مجید میں سب انبیاء سے زیادہ ذکر حضرت موسی علیہ السلام کا ہوا ہے اور تمام امتوں سے زیادہ تذکرہ ان کی امت (بنی اسرائیل) کا ہو اہے۔اس قوم کے حالات وواقعات اور قصص و حکایات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم تمام اقوام عالم سے زیادہ اکھڑ مزاج، تندخو، دنیوی مادی لذائذ میں منہمک اور اُخروی نعمات و برکات سے غافل قوم تھی۔سارا قرآن ان کی مذمت سے لبریز نظر آتا ہے آپ سابقہ بیانات میں ان کی مذمت پڑھ چکے ہیں او راب ان آیات میں ان کی منافقانہ روش ورفتار اور دوغلی چال ڈھال ملاحظ کر رہے ہیں۔ان لوگوں نے مادی جلب منفعت اور دنیوی فوائد کے حاصل کرنے کی خاطر کون سا پاپڑ ہے جو نہیں بیلا۔

(۱) تورات میں لفظی و معنوی تحریف کر کے حقائق کو انہوں نے چھپایا۔

(۲) تورات کی جن آیات میں پیغمبر اخر الزمان۔اوران کی علامات وصفات کا تذکرہ تھا ان پر پردہ ڈالا تا کہ مسلمان ان کے خلاف اتمام حجت نہ کر سکیں اور ان کے مفادات پر زد نہ پڑے۔

(۳) تدلیس و تلبیس سے کام لیا۔اپنی ذاتی تحریروں کو کلام خدا ظاہر کیا اور حقیقی کلام خدا کو جھٹلایا۔

(۴) من پسند مفروضے قائم کر کے اپنا دل بہلایا اور عامۃ الناس کو گمراہ کیا۔

(۵) دین پر سودے بازی کی یعنی دین بیچ کر دنیا کمائی وغیرہ وغیرہ۔

ذیل میں ان اجمالی امور کی تفصیل آ رہی ہے۔اس آیت میں ان کے نفاق کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ جب

وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو اپنے ایمان واخلاص کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ ہماری کتابوں میں پیغمبر اسلام کی پیشن گوئیاں مذکور ہیں جن کو پڑھ کر ہم مسلمان ہوئے ہیں اور جب تنہائی میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دوسرے ان کی زجر وتوبیخ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک مسلمانوں کو دھوکہ دینے کیلئے ان کے سامنے اسلام کا اظہار کرو۔ مگر انہیں اپنی کتابوں کی معلومات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علامات نہ بتاؤ۔ ورنہ وہ ان باتوں کو تمہارے رب کے سامنے تمہارے خلاف دلیل کے طور پر پیش کریں گے اور تمہیں لاجواب کردیں گے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ......الآية۔

یہ یہودیوں کے عوام کا ذکر ہے جو بے بنیاد اور جھوٹی آرزوؤں کے سوا تورات وغیرہ اور دین ومذہب کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں ہاں وہ اپنی من گھڑت خیالی باتوں میں مگن رہتے ہیں کہ ہم ہی جنت میں جائیں گے۔ اور اگر جہنم میں گئے بھی تو صرف گنتی کے چند دن کیلئے جائیں گے۔ ہم اللہ کے محبوب ہے۔ اور ہم انبیاء اللہ کی اولاد ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جس کی تفصیل آئندہ آیات میں مذکور ہے) اگر بنظر انصاف آج کے اہل اسلام اور اہل ایمان کے عوام کا جائزہ لیا جائے۔ تو وہ بھی ایسے ہی واہیات خیالات میں مست نظر آتے ہیں انہیں نہ اصلاح عقائد کی فکر ہے اور نہ اعمال کی بجا آوری اور درستگی کا کوئی خیال ہے۔ بس کوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کے امتی ہونے پر نازاں ہے تو کوئی محبت اہل بیت علیہم السلام کے دعوی پر فرحاں۔ حالانکہ یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ ہر چیز کا کوئی تقاضا ہوتا ہے تو پیغمبر اسلام کے امتی اور اہلبیت کے محب ہونے کا بھی ایک لازمی تقاضا ہے اور وہ ہے ان کی اتباع واطاعت اور پیروی کرنا جو نجات کیلئے اشد ضروری ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ۔ (سورہ آل عمران آیت۔ ۳۱)

فَوَيْلٌ لَّهُمْ......الآية

یہاں سے یہود کے خواص یعنی علماء کا ذکر شروع ہورہا ہے۔ ہلاکت ہے ان کیلئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور پھر تھوڑے سے معاوضہ کی خاطر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور توریت میں تحریف اب کوئی اختلافی یا نزاعی مسئلہ نہیں رہا دوست دشمن سب ہی کو اب تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ کلام الہٰی نہیں اور اسکے دوست زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ انسانوں کی تصنیف ہے کسی جامد سے جامد یہودی میں بھی یہ ہمت باقی نہیں کہ توریت کو قرآن مجید کی طرح تنزیل لفظی قرار دے۔ زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خاصان خدا نے الہام خداوندی سے مشرف ہوکر اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب وتالیف دیا۔ اور

خدائے تعالیٰ کی جانب اس کا انتساب صرف مجازاً یا بالواسطہ ہے حقیقی اور براہ راست کے مفہوم میں نہیں ہے پھر وقتاً فوقتاً جو تصحیفات ہوتی رہی ہیں وہ بالفرض کسی مصلحت یا ضرورت سے ہی ہوئی ہوں۔ بہرحال نفس ان کے وقوع کا اعتراف کھلے خزانے سب کو ہے اور بائبل کی تنقید ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے جرمن فرنچ انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر تیار ہو چکی ہیں اور مقالات ومضامین کا تو شمار ہی نہیں۔ پھر فن بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ انتقاد فن انتقاد تاریخی وغیرہ اور ہر شاخ کے الگ الگ ماہرین پیدا ہو رہے ہیں عرب کے امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے چودہ سو سال پیشتر ہی اہل کتاب کی کتاب کو (جو لفظی ترجمہ ہے بائبل کا) تمام تر محرف و ناقابل اعتماد قرار دے دیا تھا (تفسیر ماجدی)۔

آیات القرآن

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۧ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

ترجمۃ الآیات

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ گنتی کے چند دنوں کے سوا دوزخ کی آگ ہمیں چھو بھی نہیں سکتی (اے رسول) آپ ان سے کہیے! کیا تم نے خدا سے کوئی عہد و پیمان لے لیا ہے کہ خدا کبھی اپنے عہد

کی خلاف ورزی نہیں کرے گا ؟ یا اللہ کے ذمہ وہ بات لگا رہے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔(۸۰) کیوں نہیں (چھوئے گی) جو بھی برا کام کرے گا اور اس کا گناہ (چاروں طرف سے) اسے گھیر لے گا یہی لوگ دوزخی ہیں جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔(۸۱) اور جو لوگ ایمان لائے اور (اس کے ساتھ ساتھ) نیک عمل بھی کئے یہی لوگ بہشتی ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔(۸۲) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ ماں باپ سے (خصوصاً) رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے (عموماً) نیک سلوک کرنا اور سب سے اچھی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکواۃ ادا کرنا۔ مگر تم میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا باقی سب اس (عہد) سے پھر گئے اور تم ہو ہی روگردانی کرنے والے (۸۳)

تشریح الالفاظ

(۱) ایکسبون   یہ کسب سے مشتق ہے جس کے معنی کمائی کے ہیں خواہ وہ علم ہو یا مال ہو خواہ نیکی ہو یا بدی

(۲) میثاق   اس کے معنی عہد و میثاق کے ہیں

تفسیر الآیات

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا ......الآیۃ۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ ہم نے حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں صرف چالیس دن تک بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ لہٰذا ہمیں صرف چالیس دن تک آتش دوزخ میں رکھ کر سزا دی جائیگی۔ اس کے بعد کوئی یہودی چاہے جتنا بدکردار ہو وہ جہنم سے باہر آ جائے گا۔ خدا ایسے لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ کیا تم نے خدا سے کوئی ایسا معاہدہ کر رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ خلاف ورزی نہیں کرے گا یا محض خدا پر تم افترا پردازی کر رہے ہو؟۔ کیوں نہیں جو بھی برا کام کریں گے اور ان کی خطا کاری انہیں گھیر لے گی وہ دوزخی ہیں (یہ ہمارا قانون ہے) اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا......الآية

جو کچھ اس آیت شریفہ میں بیان کیا گیا ہے یہی پورے قرآن، ہادیان اسلام، بزرگان دین بالخصوص سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام کی تعلیم وتلقین کا خلاصہ ولب لباب ہے کہ فلاح کونین اور نجات دارین بالخصوص اخروی فوز وفلاح کیلئے دو امور لازم اور اشد ضروری ہیں۔ ایک ایمان اور دوسرا نیک کام۔ اس بات کی وضاحت بقدر ضرورت اسی سورہ کی آیت نمبر ۲۵ ''وبشر الذین آمنوا'' کی تفسیر میں کی جا چکی ہے۔ وہاں رجوع کیا جائے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ......الآية

دو آیتوں کے بعد پھر بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہو گیا ہے یہاں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے تذکرہ میں اکثر وبیشتر خطاب اور روئے سخن حضرت ختمی مرتبت کے زمانہ کے یہود کی طرف ہے۔ جبکہ اصل واقعات ان کے آباء واجداد کے ساتھ پیش آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اسلاف کے کام وکلام پر راضی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

''من رضی بفعل قوم فهو منهم''۔

یعنی جو شخص کسی قوم کے فعل پر خوش ہو وہ اسی قوم سے شمار ہوتا ہے۔ (متفق علیہ)۔

بہرحال وہ عہد و پیمان جو بنی اسرائیل سے لیا گیا اس کی بڑی بڑی شقیں یہ تھیں (۱) خداوند عالم کی عبادت کریں اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ (۲) ماں باپ کا احترام کریں (۳) رشتہ داروں سے صلہ رحمی کریں (۴) یتیموں اور مسکینوں سے احسان وبھلائی کریں (۵) لوگوں سے اچھے انداز میں گفتگو کریں (۶) نماز قائم کریں۔ (۷) زکواۃ ادا کریں (۸) ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں (۹) ایک دوسرے کو جلا وطن نہ کریں (۱۰) اگر قوم کا کوئی آدمی دشمن کے ہاتھ قید ہو جائے تو اسے فدیہ دے کر آزاد کرائیں وغیرہ وغیرہ............ یہ ضروری نہیں کہ یہ عہد و پیمان کسی علیحدہ صورت میں لیا گیا ہو۔ بلکہ انبیاء ومرسلین پر ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ گویا خدا سے عہد کر رہے ہیں کہ انبیاء کی تعلیمات پر عمل درآمد کریں گے جن میں یہ باتیں موجود ہیں اور یہ باتیں اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں

(1) سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں عبادت کے مفہوم اور اس کے خدا کے ساتھ مختص ہونے پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔

ماں باپ سے احسان کرنے کا حکم

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا......الآية

(2)اسلام نے ماں باپ کوعزت واحترام کا جو بلند مقام عطا کیا ہے اس کی ادیان عالم میں کہیں مثال نہیں ملتی ارشاد قدرت ہے:

''وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلاَّ تَعْبُدُوْآ اِلَّآ اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا' (اے رسول) آپ کے پروردگار کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ عبادت صرف اسکی بجالاؤ اوراحسان وبھلائی اپنے ماں باپ سے کرو(بنی اسرائیل آیت۔۲۳)

اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ معرفت توحید اوراس کی عبادت کے بعد دوسرا درجہ والدین کے ساتھ احسان کرنے کا اوران کے اکرام اوراحترام کرنے کا ہے اسی وجہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''جوشخص خدا کی عبادت توکرے مگر والدین کے ساتھ احسان نہ کرے تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے خدا کی عبادت ہی نہیں کی''(خصال)

ارشادرب العزت ہے:

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾

اگرتمہارے سامنے ان(والدین) میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کی منزل کو پہنچ جائیں توخبردار انہیں اف بھی نہ کہنا اورانہیں جھڑکنا بھی نہیں اوران سے شریفانہ گفتگو کرواور عاجزی کے ساتھ ان کیلئے اپنے کاندھے جھکاؤ اوران کے حق میں دعا کرواے پروردگار ان پر اس طرح رحمت نازل فرما جس طرح انہوں نے میرے بچپن میں مجھ پر شفقت کی ہے(بنی اسرائیل آیت۔۲۳۔۲۴)۔

حدیث قدسی میں وارد ہے فرمایا:

''یقال للعاق اعمل ما شئت فانی لا اغفرلك ابدا''ماں باپ کے نافرمان سے کہا جاتا ہے جو چاہے عمل کرلے میں ہرگز تیری مغفرت نہیں کرونگا(سابع عشر بحارالانوار)

حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:''جنت کی خوشبو پانچ سوسال کی راہ تک آتی

ہے مگر والدین کا نافرمان اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا''۔(اصول کافی)

حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''ان امراك ان تخرج من اھلك وما لك فافعل فان ذالك من الایمان''یعنی اگر تیرے والدین تجھے حکم دیں کہ اپنے اہل وعیال سے باہر ہو جا اور اپنے مال سے دستبردار ہو جا تو ایسا ہی کر کہ ایسا کرنا (کمال) ایمان کی علامت ہے(اصول کافی)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ والدین کے ساتھ احسان کا کیا مطلب ہے؟

فرمایا: ہر حالت میں ان کا ادب واحترام مدنظر رکھا جائے اور ان کی ضرورت کا خود خیال رکھا جائے۔ اور اگر وہ بلا وجہ بھی ماریں تو زبان سے کلمہ اف بھی نہ کہا جائے اور ان کے حق میں دعا کی جائے ''رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىۡ صَغِيۡرًا''(اصول کافی)

الغرض! جب تک وہ کسی خلاف شرع بات کا حکم نہ دیں تب تک ان کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے اور نافرمانی حرام۔''وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَـيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا''۔ (سورہ لقمان آیت۔۱۵)۔

منصور بن حازم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کرتے ہیں ما افضل الاعمال ؟سب اعمال سے افضل عمل کونسا ہے۔

فرمایا:''الصلوة لوقتها والبر بالوالدین والجهاد فی سبیل الله''۔

(۱)نماز کو وقت فضیلت پر پڑھنا (۲)والدین سے نیکی کرنا

(۳)اور راہ خدا میں جہاد کرنا (اصول کافی)۔

وَّذِی الۡقُرۡبٰى......الآیة

ماں باپ کی طرف سے جو قرابتدار اور رشتہ دار ہوتے ہیں ان سے احسان وبھلائی کرنا' ان سے صلہ رحمی کرنا اور وہ اگر برائی بھی کریں تو ان سے اچھائی کرنا بھی شرعاً واخلاقاً واجب ولازم ہے۔اور قطع رحمی کرنے کی شریعت مقدسہ میں سخت ترین الفاظ میں مذمت وارد ہوئی ہے یہاں تک وارد ہے کہ قطع رحمی کرنیوالے کے ناک میں جنت کی خوشبو بھی نہیں پہنچے گی۔(الوانی) وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ۔(سورہ نساء آیت۔۱)

وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ......الآیة

(3)اللہ کی سب مخلوق سے عموماً اور انسانوں سے خصوصاً اور ان میں سے بھی یتیموں اور مسکینوں سے

بالاخص مہر ومحبت اور شفقت ورأفت غرضیکہ ہر طرح سے حسن سلوک کرنے پر قرآن وسنت میں بہت ہی تاکید مزید وارد ہوئی ہے یتیم اسے کہا جاتا ہے جو بچپن میں سایہ پدری سے محروم ہو جائے۔ اور یہ سلسلہ اس کی بلوغت تک برقرار رہتا ہے۔ یہاں تک حدیث میں وارد ہے کہ:

''جو شخص کسی یتیم کے سر پر شفقت و پیار سے ہاتھ پھیرے تو اس کے سر کے جس قدر بال اس کے ہاتھ کے نیچے آئیں گے ان کی مقدار کے مطابق خداوند عالم اس کے گناہ معاف کرے گا اور نیکیاں درج فرمائے گا'' (انوار نعمانیہ)

مسکین اسے کہا جاتا ہے جو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گذر اوقات کیلئے نان ونفقہ نہ رکھتا ہو لہٰذا اس سے بھلائی کرنا اس کے مالی حقوق از قسم زکوٰۃ وغیرہ ادا کرنا اور اس کی ہمدردی کرنا شرعاً واخلاقاً لازم ہے۔ عبادت کا جزو اعظم یہ ہے کہ۔

کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انسان

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا......الآیۃ۔

(4) تمام لوگوں سے یعنی چاہے مومن ہوں یا بے ایمان۔ کافر ہوں یا مسلمان۔ اور نیکوکار ہوں یا بدکار۔ اچھی بات کرنے' اخلاق ومروت سے پیش آنے اور نرم لب ولہجہ میں گفتگو کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ ارشاد قدرت ہے:

''وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ''۔

اہل کتاب سے بھی مجادلہ کرو تو احسن طریقہ سے کرو۔ (سورہ عنکبوت آیت۔۴۶)

دعوت وتبلیغ حق کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے کہ:

''اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ'''یعنی اللہ کے راستہ کی طرف حکمت ودانائی اور احسن طریقہ سے لوگوں کو دعوت دو۔ (سورہ نحل آیت۔۱۲۵)

کئی واعظ وعظ ونصیحت کرنے میں بڑا سخت وکرخت لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا حکیم نے جب جناب موسیٰ وہارون علیہم السلام کو فرعون کے پاس ارشاد وانذار کے لئے بھیجا تھا تو انہیں ہدایت کی تھی کہ ''قو لا لہ قو لاً لیناً''یعنی اس سے نرم لہجہ میں بات کرنا تو آج کا مبلغ جس قدر عظیم کیوں نہ ہو وہ موسی وہارون علیہم السلام سے افضل تو کجا ان کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہے اور آج کا مخاطب جس قدر بھی گیا گذرا ہو فرعون سے زیادہ برا تو کیا اس کے برابر بھی برا نہیں ہے تو پھر اس سخت وکرخت لہجہ کا جواز کیا ہے؟ حضرت

امام محمد باقر علیہ السلام سے اچھی بات کہنے کا مفہوم یہ مروی ہے کہ:
''لوگوں سے وہ بات کہو جوان سے اپنے لئے کہلوانا پسند کرتے ہو کیونکہ خداوند عالم مومنین پر لعن وطعن کرنے، ان کو گالیاں دینے، فحش گوئی کرنے والے اور جھگڑالو کو دشمن سمجھتا ہے جبکہ حلیم و بردبار اور عفیف و پرہیزگار کو دوست جانتا ہے''۔ (کافی وعیاشی)۔

وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ......الآية

(5) نماز قائم کرنے،

(6) اور زکوٰۃ ادا کرنے کی فضیلت و اہمیت اسی سورہ کی ابتدا میں بیان کی جا چکی ہے۔ وہاں رجوع کیا جائے۔

آیات القرآن

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ
تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ
عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾

ترجمۃ الآیات

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا' ایک دوسرے کو اپنے وطن سے (نکال کر) بے وطن نہ کرنا۔ پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو (۸۴) پھر تم ہی وہ ہو۔ جو اپنوں کو قتل کرتے ہو۔ اور اپنے بھائی بندوں کے کچھ لوگوں کو ان کے وطن سے نکال بھی دیتے ہو اور ان کے خلاف گناہ اور ظلم و زیادتی کے ساتھ سازش کرتے ہو اور جتھے بندی کرتے ہو (ان کے مخالفین کی مدد کرتے ہو) اور (پھر لطف یہ ہے کہ) اگر وہی لوگ دشمنوں کے ہاتھوں قید ہو کر تمہارے پاس آ جائیں۔ تو تم ہی فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو۔ حالانکہ ان کا وطن سے نکالنا تم پر حرام تھا۔ کیا تم کتاب (توراۃ) کے ایک حصہ (فدیہ دینے) پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ (جلاوطن کرنے کی حرمت) کا انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو ایسا کرے اس کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف لوٹا دیے جائیں اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے غافل (بے خبر) نہیں ہے (۸۵) یہ وہ (بدقسمت) لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کی (ابدی زندگی) کے عوض دنیوی (فانی) زندگی خرید لی ہے پس نہ ہی ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائیگی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائیگی (۸۶)

تشریح الالفاظ

(۱) تظاھرون — یہ ظہار و مظاہرہ سے مشتق ہے جس کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے

(۲) اساری — یہ اسیر کی جمع ہے جس کے معنی قیدی کے ہیں

(۳) تفادوھم — یہ فداء و مفاودت سے مشتق ہے جس کے معنی فدیہ لے کر چھوڑنا یا فدیہ دے کر چھوڑنے کی طلب کرنا ہیں

تفسیر الآیات

(۸۳) لَا تَسۡفِکُوۡنَ......الآیة۔

(7) ایک دوسرے کو قتل نہ کریں۔

(۸۴) وَ لَا تُخۡرِجُوۡنَ فَرِیۡقًا......الآیة۔

(8) ایک دوسرے کو بے گھر یعنی جلاوطن نہ کریں۔

(۸۵) تُفٰدُوۡهُمۡ......الآیة۔

(9) قوم کا کوئی آدمی دشمن کے ہاتھوں قید ہوجائے تو فدیہ دے کر اسے چھڑائیں۔ یہ احکام تورات میں مذکور تھے مگر بنی اسرائیل نے اس آخری فدیہ دے کر قیدی کو چھڑوانے والے عہد کو تو برقرار رکھا مگر ساتویں اور آٹھویں عہد کو بالکل پس پشت ڈال دیا یعنی بڑی بے دردی سے ایک دوسرے کو قتل کیا اور بے تحاشا ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر اور جلاوطن بھی کیا اس اجمال کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے کہ مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں مشرکین عرب کے دو مشہور قبیلے اوس وخزرج اور یہود کے دو قبیلے بنی قریظ اور بنی نضیر آباد تھے۔ اوس و خزرج میں پرانی دشمنی تھی قریباً ایک صدی سے ان کے درمیان جنگ وجدال کی آگ شعلہ زن تھی۔ جو رحمۃ اللعالمین نے ان کے اسلام لانے کے بعد بجھائی تھی وہ اکثر و بیشتر آپس میں لڑتے تھے۔ تو بنی قریظ اوس اور بنی نضیر خزرج کے حلیف و ہم قسم تھے۔

چنانچہ جب بھی اوس وخزرج میں جنگ چھڑتی تھی تو بنی قریظ اوس کی اور بنی نضیر خزرج کی مدد و نصرت کو نہ صرف دوڑ کر آتے بلکہ اپنے ان حلیفوں کے ساتھ ملکر اپنی قوم کے آدمیوں کو یعنی بنی قریظ بنی کی نضیر اور بنی نضیر بنی قریظ کے آدمیوں کو قتل بھی کرتے اور گھروں کو مسمار کرکے ان کو گھروں سے بے گھر بھی کرتے۔ مگر عین حالت میں جب مغلوب فریق کے آدمی غالب فریق کے ہاتھ اسیر ہوجاتے۔ تو فریق مخالف کے یہودی فدیہ دے کر ان اسیروں کو رہائی دلوا دیتے تھے۔ اور اگر کوئی پوچھتا کہ تم اس طرح کیوں کرتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے کہ قوم کے اسیر کو آزاد کرانا ہم پر تورات میں واجب قرار دیا گیا ہے خداوند عالم ان آیات میں ان کے اسی تضاد کی مذمت کررہا ہے۔ کہ جس طرح تورات میں اسیر کو آزاد کرانے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں ایک دوسرے کو قتل کرنے اور جلا وطن کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے۔ کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ اس

سے یہ درس ملتا ہے کہ بعض من بھاتی باتوں کا اقرار اور ناپسند باتوں کا انکار کرنا اور دوغلی روش ورفتار اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اور جو ایسا کرے گا وہ اسی زجر وتوبیخ کا مستوجب قرار پائیگا جو یہود کیلئے کی گئی ہے کہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہوگا۔ جس طرح بنی قریظ اور بنی نضیر ہوئے تھے کہ مسلمانوں سے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے اول الذکر قتل وقید ہوئے اور ثانی الذکر ملک شام کی طرف جلا وطن کئے گئے تھے۔ اور آخرت میں سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ وما اللہ بغافل عما تعملون۔ ان لوگوں کی خوش فہمیاں۔ (کہ معدودے چند دنوں کے سوا انہیں دوزخ کی آگ مس بھی نہیں کرے گی) ان کی یہ آرزوئیں کچھ کام نہیں آئیں گی' نہ ان کی سزا میں کوئی تخفیف کی جائیگی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائیگی۔

اس امت کے یہود کا تذکرہ

حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا یہ آیت ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے خدا کے عہد و پیمان کو توڑا اور اللہ کے نبیوں کو جھٹلایا اور اس کے ولیوں کو قتل کیا بعد از اں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میری امت کے یہودی وہ لوگ ہیں جو میری طاہر ومطہر اور صاحب فضل وکمال اولاد کو قتل کریں گے۔ میری شریعت کو تبدیل کریں گے اور میرے بیٹوں حسن وحسین علیہم السلام کو شہید کریں گے۔ جس طرح یہود نے جناب زکریا۔ ویحیٰی کو شہید کیا تھا۔ خدا نے ان پر یہود کی طرح لعنت کی ہے''۔

نیز فرمایا

''قیامت سے پہلے خدائے قدیر میرے مظلوم شہید بیٹے حسین علیہ السلام کی ذریت سے ایک ہادی و مہدی کو بھیجے گا جس کے محبوں کی تلواریں ان ظالموں کی بقیہ اولاد کو واصل جہنم کریں گی'' (صافی وعاشر بحار الانوار)۔

آیات القرآن

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا

كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ
بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ
مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ
بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ
بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴿۹۰﴾

ترجمة الآيات

البتہ ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) عطا کی۔ اور ان کے بعد ہم نے پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطا کیں اور روح القدس کے ذریعہ سے ان کی تائید کی۔ (اس کے باوجود جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفسانی کے خلاف کوئی حکم لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے تکبر کیا سو بعض کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر ڈالا۔ (۸۷) اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوئے ہیں (ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا) نہیں۔ بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے (اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے) اس لئے وہ کم ہی ایمان لائیں گے (۸۸) اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو ان کے پاس والی کتاب (تورات) کی تصدیق کرتی ہے باوجودیکہ اس کے آنے سے پہلے خود یہ لوگ کافروں کے خلاف اس کے ذریعہ سے فتح و ظفر طلب کیا کرتے تھے۔ مگر جب وہ (کتاب) ان کے پاس آ گئی جسے وہ پہچانتے تھے تو اس کا انکار کر دیا۔ پس کافروں (منکروں) پر اللہ کی لعنت ہو۔ (۸۹) سو کس قدر بری ہے وہ چیز جس کے عوض ان لوگوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا ہے کہ محض اس ضد اور سرکشی کی بنا پر اللہ کی نازل کردہ کتاب کا انکار کر دیا اس نے اپنے بندوں میں سے ایک خاص بندہ (نبی خاتمؐ) پر اپنے فضل و کرم سے کیوں (وحی

نبوت و کتاب) نازل کر دی؟ پس وہ اس روش کے نتیجہ میں (خدا کے) غضب بالائے غضب کے سزاوار ہوئے اور کافروں کیلئے ذلت آمیز عذاب ہے (۹۰)

تشریح الالفاظ

(۱) قلوبنا غلف یہ اغلف کی جمع ہے قلب اغلف اس دل کو کہا جاتا ہے جس پر اس طرح غلاف چڑھا ہوا ہو کہ نہ کچھ سمجھے اور نہ یاد رکھے (۲) بغی کے معنی ظلم، نافرمانی اور سرکشی کے ہیں

تفسیر الآیات

(۸۶) الۡبَیِّنٰتِ...الآیۃ۔

بینات بینہ کی جمع ہے۔ جس کے لغوی معنی حجت اور واضح دلیل کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں انبیاء و مرسلین کے معجزات کو بنیات کہا جاتا ہے جس طرح حضرت موسیٰ کے مشہور نو عدد معجزات کو بینات کہا گیا ہے اسی طرح یہاں جناب عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو بینات کا نام دیا گیا ہے جیسے باذن اللہ مردوں کو زندہ کرنا۔ اندھے کو بینا کرنا اور کوڑھے کو شفاء دینا وغیرہ۔

وَاَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ...الآیۃ۔

روح القدس کی لفظ کا چونکہ مختلف اشیاء پر اطلاق ہوتا ہے اس لئے مفسرین میں قدرے اختلاف ہے کہ یہاں اس سے کیا مراد ہے؟ عام مفسرین نے اس سے جبرئیل امین علیہ السلام کو مراد لیا ہے اور علامہ طبرسیؒ نے اسے ''اقوی الاقوال'' قرار دیا ہے اور اس کی تائید مزید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں ایک مقام پر جبرئیل علیہ السلام کو روح القدس بھی کہا گیا ہے ارشاد قدرت ہے:

''نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ'' (سورہ شعراء آیت۔ ۱۹۳)

مگر وارثان علم قرآن ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے اخبار و آثار میں غور و فکر کرنے سے جو حقیقت واضح و آشکار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ روح القدس نہ عام ارواح میں سے کوئی روح ہے اور نہ عام فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ۔ وہ ایک ایسا خاص فرشتہ ہے جو شان و شوکت میں جبرئیل و میکائیل علیہم السلام سے بھی زیادہ جلیل القدر ہے۔ جو سابقہ انبیاء کے بھی ہمراہ رہا ہے اور بعد ازاں سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر ہمراہ رہا ہے

اور آپ کے بعد یکے بعد دیگر ہمیشہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ ان کے دور ہائے امامت میں بغرض تائید و تسدید موجود رہا ہے۔ اگرچہ مصلحت ایزدی کے تحت کبھی کبھار ان سے علیحدہ بھی ہو جاتا تھا متعدد روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند عالم انبیاء وائمہ علیہم السلام کے علاوہ بھی تائید حق کرنے والوں کی کبھی کبھار روح القدس سے تائید ونصرت کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے درباری شاعر حسان بن ثابت سے فرمایا تھا:

''یا حسان لا تزال مویدا بروح القدس ما کنت مادحاً لنا''

اے حسان جب تک تو ہماری مدح وثناء کرتا رہے گا اس وقت تک روح القدس سے تیری تائید ہوتی رہے گی (تنقیح الرجال وغیرہ)

اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ہشام بن الحکم سے فرمایا تھا:

''لا تزال مویدا بروح القدس ما نصر تنا بلسانك''

یعنی اے ہشام! جب تک تو اپنی زبان سے ہماری نصرت کرتا رہے گا اس وقت تک روح القدس سے تیری تائید ہوتی رہے گی (اصول کافی)

یہ جو بحث وتمحیص کے وقت بعض اوقات اہل حق کی زبان وقلم پر ایسی لاجواب دلیلیں آ جاتی ہیں جن سے مدمقابل کا ناطقہ بند ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ روح القدس کی تائید کا کرشمہ ہوتا ہے۔ وبس یہی وہ روح القدس ہے جس سے مختلف اوقات میں خدائے قدیر نے جناب عیسیٰ علیہ السلام کی تائید ونصرت کی تھی (بصائر الدرجات، سابع بحار الانوار، مراۃ العقول۔ الوافی وغیرھا)۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ...الآیۃ

غلف، اغلف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جس پر غلاف چڑھا ہوا ہو۔ یہودی فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے آبائی مذہب پر پختہ ہیں ہم پر اسلام کے دلائل ومسائل کا کوئی اثر نہیں پڑتا خالق فرماتا ہے دراصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اور ان کو اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے اس لئے وہ کم ہی ایمان لائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ کمی باعتبار عدد بھی ہو سکتی ہے کہ تھوڑے سے لوگ ایمان لائیں گے اور بلحاظ صلاحیت بھی ہو سکتی ہے کہ ان میں ایمان لانے کی صلاحیت کم ہے۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ کفر کے بعد بھی وہ کافر رہنے پر مجبور نہیں ہیں بلکہ ان میں ایمان لانے کی صلاحیت اب بھی موجود ہے اگرچہ کم ہے اور یہی بات ان کے فاعل مختار ہونے کے لئے کافی ہے۔

وَ کَانُوْا مِنْ...الآیۃ

یہاں خُدا وند عالم یہود کی کج روی اور ہٹ دھرمی کا تذکرہ فرما رہا ہے کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے جب کبھی ان کی مشرکین عرب (جو جناب موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے بھی قائل نہ تھے) اور ان کے بالمقابل یہ اہل کتاب گویا اہل ایمان کی حیثیت رکھتے تھے۔ سے جنگ ہوتی تھی تو یہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے اپنی فتح ونصرت کی دعائیں اور تمنائیں کرتے تھے چنانچہ ایک قول کے مطابق ہنگام جنگ میں بنی قریظ اور بنی نضیر کہتے تھے ''اللّٰھم انا نستنصرك بحق النبی الامی الا نصرتنا علیھم ''(مجمع البیان'روح المعانی'القرطبی)

اور دوسرے قول کے مطابق جب کوئی ان سے لڑائی جھگڑا کرتا تھا تو یہ اس سے کہتے تھے کہ ایک (آخری) نبی کا زمانہ قریب ہے جب وہ تشریف لائے گا تو تمہارے برخلاف ہماری نصرت کرے گا (مجمع البیان)

مگر جب وہی نبی آخر الزمان آ گیا تو کفار مدینہ (اوس وخزرج) تو ایمان لائے مگر یہود نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی اور تعصب وعناد اور ذاتی مفاد کے تحت انکار کر دیا اور کفر پر ایکا کر لیا۔ اور جب معاذ بن جبل بشر بن ابو البراء اور داؤد بن سلمہ وغیرہ نے ان کی اس روش ورفتار پر تنقید کرتے ہوئے ان سے اسلام لانے کا مطالبہ کیا تو بنی نضیر کے سلام بن مشکم نامی شخص نے بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی کا مظاہرہ کرتے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ وہ نبی نہیں ہے جس کا ہم تم سے تذکرہ کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (مجمع البیان' درمنثور) فلعنة الله علی الکافرین۔ پس اللہ کی لعنت ہو (ایسے) کافروں پر۔

(۹۰) فَلَمَّا جَآءَھُمْ......الآیۃ

مختلف آثار اور یہود کے اطوار سے جو کچھ واضح وآشکار ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا کفر وانکار کسی غلط فہمی کا نتیجہ نہیں تھا۔ ''یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ ''۔ (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۴٦) وہ اپنی کتابوں کی تعلیم کی وجہ سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح پہنچانتے تھے جس طرح اپنے گھر پیدا ہونے والے بیٹوں کو پہنچانتے تھے۔ بلکہ ان کا یہ ابا وانکار محض تعصب وعناد اور حسد ولداد اور ہوس دنیا پر مبنی تھا کہ یہ نبی اولاد اسحاق۔ میں سے کیوں نہیں بھیجا گیا حضرت اسماعیل۔ کے خاندان میں سے کیوں بھیجا گیا ہے اور نبوت اسرائیل کے خاندان سے باہر کیوں نکل گئی ہے۔ جس کا خداوند حکیم نے مختصر مگر جامع جواب یہ دیا ہے کہ نبوت اس کا فضل و کرم ہے اب یہ بات اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ جسے چاہے اپنے فضل وکرم سے نوازے اس پر کسی بھی قوم و

خاندان کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔

قرآن کے مصدق کتب ہونے کا مفہوم

واضح رہے کہ قرآن مجید کو جو سابقہ آسمانی کتابوں توراۃ' انجیل وغیرہ کا مصدق (تصدیق کرنے والا) کہا جاتا ہے تو اس کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ وہ ان کتابوں میں بیان کردہ واقعات کی تصدیق کرتا ہے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کے بیان کردہ واقعات میں سے ایک واقعہ اور پیشین گوئی حضرت پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت بھی ہے لہٰذا قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ اصل کتابیں منجانب اللہ نازل ہوئی ہیں اور برحق ہیں۔

آیات القرآن

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا
وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَالۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ ؕ قُلۡ فَلِمَ
تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴿۹۱﴾ وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ
مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ﴿۹۲﴾
وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ
بِقُوَّةٍ وَّاسۡمَعُوۡا ؕ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا ۚ وَاُشۡرِبُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ
الۡعِجۡلَ بِكُفۡرِهِمۡ ؕ قُلۡ بِئۡسَمَا يَاۡمُرُكُمۡ بِهٖۤ اِيۡمَانُكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ
مُّؤۡمِنِيۡنَ﴿۹۳﴾ قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَكُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ عِنۡدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنۡ
دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ﴿۹۴﴾

ترجمۃ الآیات

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو (قرآن) اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ۔ تو وہ کہتے

ہیں کہ ہم اس پر تو ایمان رکھتے ہیں جو ہم (بنی اسرائیل) پر نازل کیا گیا ہے مگر اس کے علاوہ جو کچھ (قرآن، انجیل وغیرہ ہے) اس کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور جو ان کے پاس موجود ہے (تورات) اس کی بھی تصدیق کرتا ہے (اے رسول) آپ ان سے کہیے کہ اگر تم (توراۃ پر) ایمان رکھتے تھے تو اس سے پہلے (اگلے زمانہ) میں اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو (۹۱) اور یقینا موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے معجزے لے کر آئے پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ ان کے (کوہ طور پر جانے کے) بعد گوسالہ کو (معبود) بنالیا (۹۲) اور (وہ وقت یاد کرو) کہ جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا اور تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا (اور کہا تھا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو۔ اور جو کچھ اسمیں ہے اسے غور سے) سنو تو (تمہارے اسلاف) نے زبان سے کہا ہم نے سن تو لیا اور دل میں کہا ہم عمل نہیں کریں گے اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت بیٹھ گئی تھی۔ (اے رسول) کہیے! اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان تمہیں بہت ہی برے کاموں کا حکم دیتا ہے (یہ عجب ایمان ہے) (۹۳) نیز ان سے کہیے کہ اگر خدا کے نزدیک آخرت کا گھر (جنت) دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لئے مخصوص ہے تو پھر موت کی آرزو کرو۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو (تا کہ جلدی بہشت میں داخل ہو جاؤ) (۹۴)

تشریح الالفاظ

(۱) بالبیّنٰت — یہ بینہ کی جمع ہے جس کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں

(۲) عصینا — یہ عصی و معصیۃ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مخالفت کرنا، نافرمانی کرنا اور دشمنی کرنا۔

تفسیر الآیات

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ...الآیۃ۔

شتر مرغ کی طرح یہود کی حالت بھی عجیب ہے۔ کہ جب ان سے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا

جا تا ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم کوئی کافر تو نہیں ہیں بلکہ ایمان رکھتے ہیں۔ مگر صرف اسی پر جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا ہے اس کے علاوہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے اس عذر لنگ کے خدا نے دو جواب دیئے ہیں

ایک یہ کہ جب قرآن منجانب اللہ برحق ہے۔ اور تورات کی تصدیق کرنے والا ہے تو محض حسد وتعصب کی بنا پر اس کے انکار کرنے کا نام کفر نہیں ہے۔ تو اور کیا ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر تم اس پر ایمان رکھتے ہو جو تم پر نازل ہوا تھا تو خدا فرماتا ہے کہ اگر تمہارا اس پر ایمان تھا تو پھر ان انبیاء کو قتل کیوں کیا۔ جو بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آیات بینات لے کر آئے تھے۔ ان کے کوہ طور پر جانے کے بعد تم نے گوسالہ کو خدا مان کر اس کی پرستش کیوں کی تھی؟ جب خدا نے کوہ طور کو تم پر بلند کر کے تم سے تورات کو مضبوطی سے تھامنے کا عہد و پیمان لیا تھا تو تم نے کیوں کہا تھا کہ ہم نے سنا اور (دل سے کہا) ہم نے عمل نہیں کرنا ہے۔ اور تمہارے دلوں میں گوسالے کی محبت بیٹھ گئی ہے یہی تمہارا اپنی وحی پر ایمان ہے؟ اگر تمہارا یہی ایمان ہے جو تمہیں اس قسم کی قبیح و شنیع برائیوں کا حکم دیتا ہے تو پھر یہ ایمان بڑا ہی عجیب وغریب ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ایمان ہے تو پھر بے ایمانی کیا ہے اور اگر یہ اسلام ہے تو پھر کفر کیا ہے؟ الغرض یہ بے ایمانی اور کفر ہے اسلام وایمان نہیں ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ......الآیة

یہود کے کفر وانکار کا ایک ظاہری سبب یہ بھی تھا کہ وہ بلا شرکت غیرے اپنے کو جنت کا اجارہ دار جانتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جنت میں وہی جائیگا جو یہودی ہوگا ’’وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا‘‘ بہشت میں وہی داخل ہوگا۔ جو یہودی ہوگا (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۱۱) لہٰذا ان کی نجات تو ایک یقینی امر ہے۔ لہٰذا کسی اور دین کو اختیار کرنے کا کیا فائدہ؟ تو اس آیت میں خداوند عالم نے ان کے اس خیال کا محال ہونا ثابت کر کے اسے ھباءً منثورا کر دیا فرماتا ہے۔ کہ اگر تم اپنے اس دعوی میں سچے ہو۔ تو پھر موت کی تمنا و آرزو کرو۔ تا کہ تمہاری دنیا کے تمام دکھوں، دردوں اور اس کی تمام زحمتوں وکلفتوں سے گلوخلاصی ہو جائے۔ اور جنت کی ابدی وسرمدی لازوال اور بے مثال نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکو! مگر خدائے علیم وحکیم حتمی ویقینی پیشگوئی فرما رہا ہے کہ یہ لوگ ہرگز موت کی خواہش نہیں کریں گے ان گناہوں کی وجہ سے جو اپنے ہاتھوں سے آگے بھیج چکے ہیں۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ وہ قرآن کے اس اعلان کے بعد بھی موت کی آرزو نہ کر سکے اور قرآن کو نہ

جھٹلا سکے۔ایک روایت میں وارد ہے کہ اگر وہ موت کی تمنا کرتے تو ایک یہودی بھی زندہ نہ رہتا (مجمع البیان)

خداوند عالم ان لوگوں کو مزید ذلیل و رسوا کرنے کیلئے فرماتا ہے کہ یہ لوگ موت کی کس طرح آرزو کریں گے یہ تو اپنی سیاہ کاریوں اور تباہ کاریوں کی وجہ سے سب لوگوں سے یہاں تک کہ مشرکین اور منکرین آخرت سے بھی بڑھ کر زندگانی دنیا کے حریص ہیں۔ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے ہزار سال تک زندہ رہنے دیا جائے۔اس سے یہ بات روز روشن سے بھی زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ اپنے اس دعوی میں بالکل جھوٹے ہیں اور اس میں صداقت وسچائی کا کوئی نام ونشان بھی نہیں ہے۔''وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ''۔جو کچھ یہ کر رہے ہیں خدا اسے دیکھ رہا ہے (سورہ بقرہ آیت۔۹۶)۔

درس عبرت

ہاں اے اہل عالم اگر کسی ہستی کو اس معیار پر پورا اترتا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو نبیؐ و علیؑ کی سیرت و کردار اور اسلامی غزوات میں ان کی روش و رفتار ملاحظہ کرو۔وہ تمہیں موت سے نہ صرف مانوس بلکہ اس سے کھیلتے ہوئے بلکہ یہ فرماتے ہوئے نظر آئیں گے۔

''واللہ لا بن ابی طالب الآنس بالموت من الطفل بثدی امه''

بخدا ابوطالب کا فرزند (علیؑ) موت کے ساتھ اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا کوئی طفل شیر خوار اپنی ماں کے سینہ سے مانوس ہوتا ہے (نہج البلاغہ)

اور یہی وہ علیعلیہ السلام ہیں جنہوں نے موت کو سامنے دیکھ کر یہ تاریخی نعرہ لگایا تھا کہ:

''فزت برب الکعبة''رب کعبہ کی قسم! میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

آیات القرآن

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾
وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ
اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ
يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ

نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ۝٩٧ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ
وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۝٩٨ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ
اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۝٩٩ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا
نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝١٠٠

ترجمۃ الآیات

اور (سن لو) کہ یہ لوگ ان (اعمال بد) کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں کبھی بھی موت کی آرزو نہیں کریں گے اور خدائے تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے (۹۵) اور (اے نبی!) تم ان کو سب لوگوں سے حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی بڑھکر زندگی کا حریص پاؤ گے ان میں ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسے ایک ہزار سال کی عمر ملے حالانکہ اس قدر عمر کا مل جانا بھی اسے خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکتا اور یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے (۹۶) (اے رسولؐ) کہہ دیجئے! کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہے (ہوا کرے) اس نے تو وہ (قرآن) خدا کے حکم سے آپ کے دل میں اتارا ہے، جو اپنے سے پہلے (نازل شدہ) کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اہل ایمان کے لئے ہدایت اور کامیابی کی بشارت ہے (۹۷) جو کوئی اللہ، اس کے فرشتوں اس کے رسولوں اور (خاص کر) جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو بے شک اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے (۹۸) (اے رسولؐ) بالیقین ہم نے تمہاری طرف واضح آیتیں نازل کی ہیں اور ان کا انکار نہیں کرتے مگر وہی جو فاسق (نافرمان) ہیں (۹۹) اور کیا (ہمیشہ ایسا نہیں ہوا کہ) جب بھی انہوں (یہود) نے کوئی عہد کیا تو انہی کے ایک گروہ نے اسے پس پشت ڈال دیا (توڑ دیا) بلکہ ان میں سے اکثر بے ایمان ہیں۔ (۱۰۰)

تشریح الالفاظ

(۱)بمزجزحہٖ یہ زحزح یزحزح سے ہے جس کے معنی دور کرنے اور ہٹانے کے ہیں

(۲)ان یُعمّر یہ تعمیر سے مشتق ہے جس کے معنی لمبی عمر پانے کے ہیں

تفسیر الآیات

قُلْ مَنْ کَانَ...الآیۃ۔

اس آیت کی شان نزول مفسرین اسلام نے یہ بیان کی ہے کہ ایک بار یہود کا ایک عالم ابن صوریا اور مقام فدک کا ایک گروہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آنحضرتؐ سے چند سوالات کئے جن کے آنحضرتؐ نے شافی جوابات دئے منجملہ اور سوالوں کے ایک سوال یہ تھا کہ آپ پر کونسا فرشتہ وحی لاتا ہے؟ آپ نے فرمایا جبرائیل! اس پر ابن صوریا نے کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے جو جنگ وجدال کے شاق احکام اور عذاب وعقاب لے کر نازل ہوتا ہے۔ اس لئے ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے۔ ہاں! البتہ اگر میکائیل آپ پر وحی لاتا تو ہم ضرور ایمان لاتے۔ اس پر خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی اور جبرائیل کی پوزیشن واضح فرمائی کہ جبرئیل تو صرف خدا کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ وحی تو خدا بھیجتا ہے۔ ان لوگوں کو تو جبرئیل کا ممنون احسان ہونا چاہیے تھا کہ وہ جو وحی قرآن کی صورت میں لایا ہے وہ تو تورات کی مصدق ہے اور اہل ایمان کیلئے ذریعہ ہدایت اور بشارت ہے۔ بنا بریں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جو جبرئیل ومیکائیل ملائکہ میں داخل ہیں مگر تعمیم کے بعد تخصیص کے طور پر ان کا علیحدہ نام لینا ان کی خصوصی عزت وعظمت کی وجہ سے ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ...الآیۃ۔

اس آیت مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید نہ تو بالکل ایک معمہ کی مانند ہے کہ کسی کے پلے کچھ نہ پڑے اور نہ ہی اس قدر سہل وآسان ہے کہ اس کے اسرار ورموز کو سمجھنے کیلئے کسی معلم ربانی کی بالکل ضرورت ہی نہ پڑے بلکہ حقیقت الامر ان دونوں نظریوں کے بین بین ہے۔ یعنی جہاں تک اس کے عمومی اوامر ونواہی اور دیگر ظواہر الفاظ کا تعلق ہے تو ان کو سب صاحبان علم وعقل سمجھ سکتے ہیں جو عربی زبان پر عبور رکھتے ہیں اور جہاں تک اس کے معارف اور حقائق اور اسرار ورموز کا تعلق ہے تو ان کو یا خدا جانتا ہے یا راسخون فی العلم جانتے ہیں جو عالم

علم لدنی ہیں ''وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ''۔

آیات القرآن

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ
مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا
یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَمَا
كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ
وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ
مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا
مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا
لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۛ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ
اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

ترجمۃ الآیات

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ رسول (حضرت محمدؐ) آیا جو ان کے پاس والی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے تو انہی اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب خدا (تورات) کو اس طرح پس پشت ڈال دیا کہ جیسے کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں (۱۰۱) اور (یہ لوگ) ان (بے بنیاد) چیزوں کی پیروی کرنے لگے جو شیاطین سلیمان کے عہد سلطنت میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا۔ بلکہ ان شیطانوں نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے (نیز) وہ اس چیز (جادو) کی پیروی کرنے لگے جو بابل کے

مقام پر ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر اتاری گئی۔ حالانکہ یہ دونوں فرشتے اس وقت تک کسی کو کچھ تعلیم نہیں دیتے تھے جب تک پہلے یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم محض آزمائش ہیں۔ لہٰذا (اس علم کو غلط استعمال کرکے) کافر نہ ہو جانا (بایں ہمہ) لوگ ان سے وہ کچھ سیکھتے تھے جس سے مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ حالانکہ وہ اذن خدا کے بغیر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ الغرض وہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جو ان کو ضرر پہنچاتی تھی اور کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی تھی۔ اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جو شخص (دین کے بدلے) ان چیزوں کو خریدے گا۔ اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور کس قدر برا (معاوضہ) ہے جس پر انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا۔ کاش انہیں اس کا علم ہوتا۔ (۱۰۲)

تشریح الالفاظ

(۱) نبزہ — نبذ کے معنی پھینکنے اور عہد توڑنے کے ہیں

(۲) السحر — اس کے معنی جادو اور حیلہ سازی کے ہیں اور وہ چیز جس کے حصول میں شیطانی تقرب سے مدد لی جائے

(۳) فتنة — اس کے معنی آزمائش کے ہیں اور یہ لفظ بمعنی گمراہی اور کفر بھی استعمال ہوتی ہے

تفسیر الآیات

وَلَمَّا جَآءَهُمْ ...الآية

مفسرین اسلام نے بالاتفاق یہاں رسول سے مراد پیغمبر اسلام کو اور کتاب اللہ سے قرآن مجید کو مراد لیا ہے یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ جب وہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے جن کی آمد کے تمام اہل کتاب منتظر و چشم براہ تھے ان پر ایمان لاتے خصوصاً اس وقت جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کا ہماری آسمانی کتابوں میں ذکر خیر موجود ہے۔ مگر انہوں نے محض اپنے ذاتی مفادات کی وجہ سے ایک تو وہ خمر و خنزیر اور سود کا کاروبار نہیں کر سکیں گے دوسرا اس سے ان کا دنیوی وقار و اقتدار متاثر ہوگا۔ اور کچھ قومی تعصب و حسد کی وجہ سے (کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اولاد اسحاق کی بجائے خاندان اسماعیل۔ سے کیوں آیا) ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کتاب خداوندی کو اسطرح پس پشت ڈال دیا۔ کہ گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں۔

حالانکہ "یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَهَا" (سورہ نحل آیت۔ ۸۳)۔ وہ خدا کی نعمت کو جانتے تھے مگر جان بوجھ کر انکار کر دیا۔

سزائے ایں چنیں دوناں بجز دوزخ کجا باشد؟

وَاتَّبَعُوْا مَا...الآیة۔

اس طویل آیت کے مفہوم کے سمجھنے میں مفسرین اسلام نے باہم خاصا اختلاف کیا ہے ہم بنظر اختصار ان اختلافات سے دامن بچاتے ہوئے اصل مقصد کو وارثان علم قرآن کی بیان کردہ تفسیر کی روشنی میں واضح کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سو واضح ہو کہ جب کسی قوم کے عروج و ترقی کا زور ہو جس میں وہ بلند ہمتی اور اولوالعزمی سے محنت کرتی ہے اور اقوام عالم میں ایک بلند مقام حاصل کرتی ہے۔ ختم ہو جائے اور اس کا تنزل و انحطاط شروع ہو جائے اور وہ کوئی نمایاں کام نہ کر سکے تو وہ اپنی عظمت رفتہ کو بحال رکھنے اور اپنے بلند مقام سے وابستہ رہنے کیلئے جھوٹے وسائل اور کھوٹے اسباب کا سہارا لیتی ہے۔ جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں نے بھی جن کا دور انحطاط شروع ہو چکا تھا تو انہوں نے بھی اپنے جھوٹے وقار و اقتدار کو برقرار رکھنے کیلئے جادو اور جنتر منتر وغیرہ کا سہارا لیا تھا۔

وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ......الآیة

جادو کے دو مراکز کا تذکرہ

تاریخ سے اس وقت سحر و ساحری کے دو مکتبوں کا پتہ چلتا ہے ایک وہ جو عہد سلیمان۔ کی طرف منسوب تھا جس کا تعلق فلسطین سے ہے اور دوسرا وہ ہے جس کا مرکز بابل تھا۔ جسے اب عراق کہا جاتا ہے۔ اہل کتاب ایک طرف تو حضرت سلیمان کو نبی مانتے تھے اور بحر و بر اور خشک و تر پر ان کی حکومت کا ذکر بھی کرتے تھے اور دوسری طرف ان کو جادوگر بھی کہتے تھے اور یہ کہ انہوں نے عمر کے آخری حصہ میں العیاذ باللہ توحید کو چھوڑ دیا تھا اور اپنی مشرک بیویوں کی انگیخت پر ان کے معبودان باطل کی پرستش کرنے لگے تھے۔ (بائبل) خداوند عالم نے اس آیت میں جناب سلیمان علیہ السلام کی اس سے برات ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ "وَ مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا" (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۰۲)۔ کہ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے لوگوں کو بدراہ کرنے کیلئے یہ مخفی چال چلی کہ جادو کے کچھ اصول اور قواعد کتاب میں لکھ دئے اور اس کے سرنامہ پر یہ لکھ دیا کہ یہ وہ علمی ذخیرہ ہے جو آصف بن برخیا نے سلیمانؑ بن داوٗدؑ کیلئے فراہم کیا۔ اس میں اس طرح لکھا تھا

کہ جو شخص یہ کام کرنا چاہتا ہے وہ یوں کرے جو وہ کام کرنا چاہے وہ اس طرح کرے پھر اس کتاب کو تخت سلیمان کے نیچے دفن کر دیا پھر کسی موقع پر خود اسے نکال کر لوگوں پر ظاہر کر دیا اور مشہور کر دیا کہ جناب سلیمان۔ (معاذ اللہ) جادوگر تھے اور اس کی وجہ سے جن وانس اور بحر و بر پر فرمانروائی کرتے تھے اور اسی کی وجہ سے چرند و پرند ان کے مسخر و تابع تھے یعنی ان کی یہ قدرت و تمکنت من جانب اللہ نہ تھی بلکہ اس سحر و ساحری کا نتیجہ تھی (قمی، عیاشی و صافی)۔

اور بابل کے مکتبہ سحر کی حقیقت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یوں مروی ہے فرمایا:

''جناب نوح علیہ السلام کے بعد سحر و ساحری کا بڑا زور ہو گیا تھا اور اس دور کے جادوگر اہل ایمان کو ضرر وزیاں پہنچاتے تھے۔ اس لئے خداوند عالم نے اس دور کے نبی کے پاس انسانی شکل وصورت میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتے بھیجے تاکہ ابطال سحر کا طریقہ کار بتائیں۔ چنانچہ اس نبی نے لوگوں کو اطلاع دی اور لوگوں نے ان فرشتوں سے جادوٹونے کے دفعیہ کا طریقہ کار سیکھا اور چونکہ ابطال سحر کے ساتھ ساتھ لوگوں کو جادو کرنے کا بھی طریقہ معلوم ہو جاتا تھا اس لئے حفظ ماتقدم کے طور پر فرشتے لوگوں سے کہتے تھے کہ ہم ایک آزمائش ہیں لہٰذا تم جادو کر کے کافر نہ ہو جانا'' (صافی، نورالثقلین)۔

ان حقائق کی روشنی میں اس آیت کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ (یہود) ان (بے بنیاد) چیزوں کی پیروی کرنے لگے جو (شیاطین) سلیمان کے عہد سلطنت میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ...الآیة۔

نیز وہ اس چیز (جادو) کی پیروی کرنے لگے جو بابل کے مقام پر ہاروت و ماروت نامی فرشتوں پر اتاری گئی۔ بنابریں ''وما انزل علی الملکین'' کا ''ما تتلوا الشیاطین'' پر عطف ہے یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے یہودی دو چیزوں کی پیروی کیا کرتے تھے ایک ما تتلو الشیاطین علی ملك سلیمان اور دوسری و ما انزل علی الملکین ببابل۔ اس لئے یہود میں دونوں مقام کا سحر رائج تھا۔

ایک اشتباہ کا ازالہ

کتب فریقین میں بعض ایسی غیر مستند روایات ملتی ہیں جن سے مستفاد ہوتا ہے کہ دونوں فرشتے زہرہ نامی عورت پر فریفتہ ہو گئے اور شراب پی کر اس سے بدکاری کی جس کی پاداش میں عورت مسخ ہو کر زہرہ نامی سیارہ

بن گئی اور ہاروت و ماروت دنیا کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔ چونکہ یہ روایت عقل ونقل اور قرآن وسنت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے اور عصمت ملائکہ کے منافی ہے لہٰذا نا قابلِ استدلال ہے اور نا قابل قبول ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے بڑے شدومد کے ساتھ اس کی رد کرتے ہوئے فرمایا: ”**معاذ الله من ذالك ان ملائكة الله معصومون من الكفر والقبائح بالطاف الله**“ (عیون الاخبار)

اور بڑے بڑے مفسرین اسلام نے بھی اسے مسترد کر دیا ہے۔ مجمع البیان غرائب القرآن تفسیر کبیر وغیرہ مشہور اسلامی تفاسیر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

سحر یعنی جادو کی حقیقت؟

السِّحۡرَ...الآیۃ۔

سحر و ساحری کا ذکر چل نکلا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سحر و جادو کے بارے میں کچھ حقائق قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں واضح ہو کہ سحر و جادو سے مراد ہر وہ تعویز کلام، جنتر، منتر ہے۔ جن کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے دھونی، تصویر اور جھاڑ پھونک ہے یا وہ گر ہیں اور قسمیں وغیرہ ہیں جو مسحور کے بدن یا اسکے دل و دماغ پر اثر انداز ہوں۔ یعنی اس شخص کو حاضر کرنے، بے ہوش کرنے، سلانے و جگانے، کسی کی محبت یا عداوت میں گرفتار کرنے پر ان کے اثرات مرتب ہوں۔ مخفی نہ رہے کہ ملائکہ، جنات، ہمزاد کی تسخیر اور احضار ارواح اور ان سے کام لینا بھی اسی جادو میں داخل ہے اسی طرح شیاطین سے استمداد کرنا بھی اسی میں شامل ہے اور کہانت، قیافہ، شعبدہ بازی اور مسمریزم بھی اسی کے ذیلی شعبے ہیں۔ بہرحال سحر کی حقیقت جو بھی ہو جو ایک فقیہ اور مفسر سے اس فن کے ماہر زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ آیا جادو کی تاثیر واقعی ہے یا اس میں صرف فریب نظر اور قوت خیالیہ کی کرشمہ سازی کارفرما ہوتی ہے؟ اس سلسلے میں علماء وفقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء اسے محض فریب نگاہ اور قوت متخیلہ کی کارگزاری قرار دیتے ہوئے اسے ایک بے حقیقت چیز قرار دیتے ہیں۔ اور بعض اس کی واقعی تاثیر کے قائل ہیں اور اس گروہ میں پھر اختلاف ہے کہ اس کی یہ تاثیر کس حد تک ہوتی ہے؟ بعض اس کی تاثیر کو صرف محبت وعداوت اور صحت و بیماری تک محدود سمجھتے ہیں اور بعض اس کے ذریعہ قلب ماہیت کے بھی قائل ہیں کہ اس اسے کسی انسان کو حیوان بنایا جاسکتا ہے۔

بہرحال ان تمام اقوال میں سے جو قول افراط وتفریط سے محفوظ اور جسے قرآن وسنت کی تائید بھی حاصل ہے وہ یہ ہے کہ جادو میں حکم خدا سے واقعی تاثیر ہے مگر وہ صرف صحت و مرض اور حب وبغض وغیرہ عادی حالات

تک محدود ہے۔اس سے کسی چیز کی ماہیت تبدیل نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی کسی کی زندگی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

احتجاج طبرسی میں ایک زندیق کا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ درج ہے:

زندیق سوال کرتا ہے کہ آیا جادوگر اس بات پر قادر ہے کہ انسان کو کتے یا گدھے کی شکل میں تبدیل کردے؟

امام نے فرمایا: ''وہ اس سے کہیں عاجز ہے کہ اللہ کی خلقت کو متغیر کردے اور اگر وہ ایسا کر سکے تو پھر تو وہ خدا کا شریک بن جائیگا''۔

پھر فرمایا: ''اگر جادوگر اس قدر قوت کا مالک ہے تو اپنے بڑھاپے، سر کی سفیدی، اپنی بیماری اور اپنے فقر وفاقہ کو دور کیوں نہیں کر لیتا............'' تا آخر۔

ایضاح

مخفی نہ رہے کہ جادو کا زیادہ تر اثر کمزور دل ودماغ اور کمزور ایمان واعتقاد والے لوگوں پر ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کا دل ودماغ قوی اور ایمان محکم ہوتا ہے اور خدا پر کامل توکل واعتماد ہوتا ہے اور گھروں میں قرآن، صحیفہ کاملہ اور نہج البلاغہ اور دیگر اسلامی وایمانی کتابیں ہوتی ہیں۔ان پر جادو کا کوئی اثر نہیں ہوتا انشاء اللہ تعالیٰ۔ یہیں سے مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ نبی وامام پر جادو کا اثر نہیں ہوتا۔

جادو کے فقہی احکام

جادو کرنا نہ صرف گناہان کبیرہ میں سے ہے بلکہ بنص قرآن کفر ہے حضرت امیر۔۔فرماتے ہیں:

''الساحر کالکافر و الکافر فی النار'' (نہج البلاغہ)

لہٰذا اگر کوئی مسلمان جادو کرے اور پھر اس کے اقرار یا شرعی شہادت سے ثابت بھی ہو جائے تو اس کی شرعی سزا قتل ہے۔اور اگر غیر مسلمان ایسا کرے تو اسے تعزیر لگائی جائیگی۔ نیز واضح رہے کہ سحر وساحری کے ابطال کیلئے اس کا سیکھنا سکھانا جائز ہے مگر اس کا غلط استعمال کرنا بہر حال حرام ہے۔واللہ العاصم۔

اذن اللہ کا مفہوم

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللهِ...الآیۃ۔

کہ جادوگر اذن اللہ کے بغیر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اذن اللہ سے

مراد کیا ہے؟ سو واضح ہو کہ اذن اللہ کے کئی معنی ہیں ان میں سے ایک علم اللہ ہے دوسرے تخلیۃ اللہ اور تیسرے معنی ہیں حکم اللہ یہاں پہلے دو معنی مراد لئے جاسکتے ہیں یعنی جب کوئی جادو کرتا ہے تو اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ اور وہ چاہے تو اپنی قدرت کاملہ سے اس کے اثر کو زائل کر کے بے اثر کرسکتا ہے۔ مگر جب خدا دخل نہ دے اور بندہ کو اسکے حال پر چھوڑ دے تب جادو اثر کرتا ہے۔ واللّٰہ العالم۔

آیات القرآن

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۝۱۰۳ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝۱۰۴ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۝۱۰۵ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝۱۰۶ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۝۱۰۷

ترجمۃ الآیات

اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو خدا کی بارگاہ سے انہیں جو ثواب ملتا وہ (اس سے) بہت ہوتا کاش انہیں اس کا علم ہوتا (۱۰۳) اے ایمان والو (پیغمبرؐ سے) راعنا نہ کہا کرو (بلکہ) انظرنا کہا کرو (توجہ سے ان کی بات) سنا کرو اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے (۱۰۴) جو لوگ کافر ہیں (خواہ) اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے وہ ہرگز پسند نہیں کرتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے کوئی بھلائی نازل ہو۔ حالانکہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کیلئے مخصوص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے

(۱۰۵) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لاتے ہیں۔کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر بڑی قدرت رکھتا ہے (۱۰۶) کیا تمہیں معلوم ہے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کیلئے ہے۔اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی سرپرست اور مددگار نہیں ہے۔(۱۰۷)

تشریح الالفاظ

(۱)خلاق اس کے معنی ہیں بھلائی کا بڑا حصہ (۲)ننسخ یہ نسخ سے ہے جس کے معنی ہیں منسوخ کرنا

(۳)ننسھا یہ انساء سے ہے جس کے معنی بھلا دینے کے ہیں۔

تفسیر الآیات

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ...الآیة

خداوند عالم کا یہ دستور ہے کہ وہ قرآن مجید میں اہل ایمان کے علاوہ دوسرے لوگوں سے نہ کلام کرتا ہے۔اور نہ امر ونہی کے ساتھ کسی اور سے مخاطبہ فرماتا ہے۔ بلکہ وہ جب بھی خطاب کرتا ہے تو صرف اہل ایمان سے اور کلام کرتا ہے تو فقط اہل ایمان سے۔اور یہ سلسلہ پورے قرآن میں پھیلا ہوا ہے۔البتہ یہ پہلا مقام ہے جہاں رب رحمن نے اہل ایمان سے یوں کلام کیا ہے۔اب قابل غور بات یہ ہے کہ اہل ایمان سے مراد کون لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے عمومی معنی تو یہی ہیں کہ جو لوگ خدا کی وحدانیت، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و خاتمیت اور جو کچھ وہ منجانب اللہ لائے ہیں اس پر ایمان و ایقان رکھتے ہیں جس میں خدا کی عدالت، ائمہ علیہم السلام کی امامت اور عقیدہ قیامت اور فروع میں سے نماز و روزہ وغیرہ سب احکام داخل ہیں۔امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ایمان کی یہ تعریف بیان کی ہے۔

''الایمان تصدیق بالجنان اقرار باللسان وعمل بالارکان''۔(نہج البلاغہ)

ایمان کیا ہے؟ چند عقائد کی دل سے تصدیق کرنا، زبان سے اقرار کرنا اور کچھ اعمال ہیں جنہیں بجالا کر اپنے ایمان کی پختگی کا اظہار کرنا اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

''ما انزل الله اية وفيها ''یَاۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا'' الا علی رأسها واميرها'' قرآن میں

جہاں بھی ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا '' وارد ہے وہاں اس گروہ کے سید وسردار علیعلیہ السلام ہیں۔ (تفسیر در منشور وصواعق محرقہ وغیرہ)۔

رَاعِنَا...الآیة

بہرکیف خداوند عالم نے یہاں اہل ایمان کوایک بات سے روکا ہے اور وہ ہے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''راعنا'' کہنا اور ایک بات کا حکم دیا ہے اور وہ ہے ''انظرنا'' کہنا۔ مفسرین اسلام نے لکھا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ ارشاد فرماتے اور وہ بات بعض صحابہ کرام کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ عرض کرتے ''''راعنا'' یارسول اللہ ہمارے حال کی رعایت فرمایئے یعنی مقرر ارشاد فرمایئے۔ مگر چونکہ یہ لفظ ذو معنی ہے۔ جس کے سیدھے سادھے معنی تو وہی ہیں جو مذکور ہوئے اور عبرانی زبان میں اس کے معنی دشنام کے بھی ہیں۔ ''احمق، شیخی باز اور شریر'' لہٰذا صحابہ کرام تو اس سے وہی اچھے معنی مراد لیتے تھے۔ مگر منافق اور بدطینت یہود اس کے دوسرے برے معنی مراد لیتے تھے۔ اس لئے خدائے حکیم نے اس لفظ کے استعمال کی ممانعت کرکے اس خرابی کا سدباب کردیا۔

اُنْظُرْنَا...الآیة

اور اس کی جگہ لفظ ''انظرنا'' مقرر فرمایا جس کا مفہوم ہے ہمارے حال پر توجہ فرمائیں۔ اس اہتمام سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کو تمام انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خصوصاً کس قدر پاس ادب ملحوظ ہے کہ جس کلمہ میں سوء ادب کا شائبہ بھی پایا جائے اس کے استعمال کی ہی ممانعت فرمادی ہے۔

مَا نَنْسَخْ...الآیة

چونکہ دین اسلام سابقہ شرائع کا ناسخ ہے اس لئے یہود ونصاریٰ کو سب سے بڑا اعتراض نسخ پر تھا۔ کیا پہلے احکام غلط تھے؟ کیا خدا کی رائے بدل گئی؟ کیا وہ کوئی حکم دے کر پشیمان ہوگیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ خدا اس آیت مبارکہ میں انہی تو ہمات کا جواب دے رہا ہے کہ جب حالات اور مصالح بدل جاتے ہیں تو زیادہ مناسب حال نئے احکام نافذ کردیئے جاتے ہیں۔

نسخ در احکام کی مثال طبیب کے نسخہ کی سی ہے طبیب کی تشخیص اپنی جگہ پر بدستور رہتی ہے لیکن مریض کی حالت بدلتی رہتی ہے اور پھر موسم اور آب وہوا میں بھی فرق ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں کوئی

حاذق سے حاذق طبیب بھی اپنے نسخہ کے اجزاء میں ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کرنے میں تامل نہ کرے گا (تفسیر ماجدی)۔

اَوْ نُنْسِهَا...الآیة

دوسری صورت احکام وشریعت بدلنے کی یہ ہے کہ "پہلے قانون کو دنیا والوں نے تصرف وتحریف کر کے بالکل نسیاً منسیاً کر دیا ہے اس لئے جدید شریعت اور کتاب میں اس کی تجدید کی گئی ہے۔ جو بحیثیت اصلاح خلق ویسے ہی مضمون پر مشتمل ہے جو اس نسیان شدہ حکم کا تھا اب یہ تصرف وتحریف کر کے بھلانا گو انسانوں کا فعل ہے مگر چونکہ کائنات کا ہر واقعہ قدرت الٰہی کے تحت ہے۔ شرائط واسباب کی فراہمی اور موانع کے فقدان کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے نتائج کو بھی خالق کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ نسیاً منسیاً کر دینے کی نسبت خالق کی طرف اسی اعتبار سے ہے بطور نمونہ مشتے از خروارے ہم یہاں چند آیات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

بعض ناسخ ومنسوخ آیات کا تذکرہ

(۱) اوائل اسلام میں زنا کی حد یہ تھی کہ زنا کار مرد وزن کو الگ الگ مکان میں بند کر دیا جائے اور ان کی روٹی اور پانی بند کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ شدت بھوک و پیاس سے دم توڑ جائیں۔ ارشاد قدرت ہے۔ "وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾" (نساء آیت۔ ۱۵)۔

بعد ازاں اسے منسوخ کر کے اس کی جگہ یہ حکم مقرر ہوا کہ اگر زانی اور زانیہ کنوارے ہوں تو انہیں سو کوڑے مارے جائیں اور اگر شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے۔ "اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ" (سورہ نور آیت۔ ۲)

(۲) پہلے حکم تھا کہ "اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ" (سورہ انفال آیت۔ ۶۵)۔ اگر تم میں بیس صبر کرنے والے (مجاہد) ہوں تو وہ دو سو (کافروں پر) غالب آ جائیں گے۔ یہ آیت اس سے اگلی آیت سے منسوخ ہے۔ ارشاد قدرت ہے۔ "اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ"۔ اس وقت خدا نے تمہارے لئے تخفیف کر دی ہے اور وہ جانتا ہے کہ تم میں کمزوری پائی جاتی ہے سو اگر تمہارے سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر

غالب آجائیں گے۔

(۳) حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے علیحدگی میں کوئی بات کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم دیا گیا۔ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً'' (مجادلہ آیت ۔ ۱۲) ایمان والو! جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی راز کی بات کرنا چاہو تو پہلے صدقہ دو۔ پھر اس حکم کو اس آیت سے منسوخ کر دیا گیا۔ ''ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ''۔ کیا تم راز کی بات کرنے سے پہلے صدقہ دینے سے ڈرتے ہو (مجادلہ آیت ۔ ۱۳)۔

نسخ وانساء میں فرق؟

الغرض نسخ کی دوسری قسم کا نام انساء ہے (خدائے قدیر کی طرف سے کسی آیت کا بھلا دینا) گویا نسخ میں کسی آیت کو ظاہری منظر سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور انساء واسھا میں اسے ذہنی منظر سے بھی بھلا دیا جاتا ہے۔ اگر چہ انبیاء وائمہ علیہم السلام کیلئے شیطانی سہو ونسیان روا نہیں ہے لیکن کسی خاص مصلحت کے تحت رحمانی اسہاء وانساء میں کوئی عقلی وشرعی مضائقہ نہیں ہے اور یہ بات قرآن وسنت کی نا قابل رد دلیلوں سے ثابت ہے۔ اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ نسخ کے لغوی معنی ایک چیز کو زائل کر کے دوسری چیز کو اس کی جگہ رکھنے کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں اس کا مفہوم کسی شرعی حکم کی مدت ختم ہونے اور اس کی جگہ دوسرے حکم کے مقرر کرنے کا اظہار کرنے کے ہیں۔ تو جن وجوہ کی بنا نظام شریعت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جس کا نام نسخ ہے اور یہود کا ایراء بالکل بودہ اور ان کی معاملہ نافہمی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا بداء پر جو حالات کے بدلنے سے تقدیرات خداوندی میں تبدیلی کا نام ہے۔ ان کی معاملہ نافہمی کی علامت ہے ورنہ جس طرح حالات وکوائف اور ظرف زمان ومکان کی تبدیلی سے احکام بدل جانے میں نہ جہل ہے نہ نادانی اور نہ کوئی پشیمانی بالکل اسی طرح حالات ومصالح کے ادل بدل سے تقدیرات میں تبدیلی کرنا نہ جہل ہے نہ نادانی اور نہ پشیمانی بلکہ عین تقاضائے علم وقدرت اور حکمت ہے۔ ''یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ ۖۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ﴿۳۹﴾ (سورہ رعد آیت ۔ ۳۹)'' اور اس سے جہاں خدا کی قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہاں اس کی حکمت بالغہ کا بھی اثبات ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ نظام شرع میں جو مقام نسخ کا ہے نظام تکوین میں وہی حیثیت بداء کی ہے وبس۔

قرآن میں ناسخ ومنسوخ کے وجود میں اختلاف کا بیان

علماء اسلام میں فی الجملہ اختلاف ہے کہ آیا قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ آیات موجود ہیں یا نہ؟

بعض نے سرے سے اس کے وجود کا انکار کیا ہے۔(جیسے مفتی محمد عبدہ مصری)
اور بعض سینکڑوں آیات کے ناسخ و منسوخ ہونے کے قائل ہیں اور ان کی تعداد پانچ سو بتاتے ہیں۔ (تفسیر ابن جریر)
اور بعض نے گھٹاتے گھٹاتے ان کی تعداد پانچ بتائی ہے۔مشہور و منصور قول یہی ہے کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ آیات موجود ہیں اور اس پر فریقین کی روایات متکاثرہ دلالت کرتی ہیں۔ ہاں البتہ ایسی آیات بہت زیادہ نہیں ہیں بالکل معدودے چند ہیں۔

آیات القرآن

اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ يَّتَبَدَّلِ الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيۡرٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَوۡ يَرُدُّوۡنَكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِكُمۡ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡحَـقُّ ۚ فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ تَجِدُوۡهُ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوۡا لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَـنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ تِلۡكَ اَمَانِيُّهُمۡ ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمۃ الآیات

(اے مسلمانو) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسے ہی (احمقانہ) سوال کرو۔ جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے؟ اور جس شخص نے ایمان کے عوض کفر اختیار کیا وہ راہِ راست سے بھٹک گیا (۱۰۸) (اے مسلمانو!) بہت سے اہل کتاب اپنے ذاتی حسد کی وجہ

سے چاہتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد تمہیں پھر کافر بنا دیں باوجودیکہ ان پر حق واضح ہو چکا ہے سو تم عفو و درگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ ان کے بارے میں اپنا حکم بھیجے یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۱۰۹) اور نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور جو کچھ نیکی اور بھلائی اپنے لئے (زادِ راہ کے طور پر) آگے بھیج دو گے اسے اللہ کے یہاں موجود پاؤ گے جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے (۱۱۰) اور وہ (یہود و نصاری) کہتے ہیں کہ کوئی ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا مگر وہی جو یہودی یا نصرانی ہوگا۔ یہ ان کی خیال بندیاں اور خالی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم (اپنے دعوی میں) سچے ہو تو اپنی کوئی دلیل پیش کرو (۱۱۱)

تشریح الالفاظ

(۱) **من ولی** ولی کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی سرپرست کے ہیں

(۲) **فاعفوا واصفحوا** یہ عفو و صفح سے مشتق ہیں جن کے معنی معاف کرنے اور درگزر کرنے کے ہیں۔

تفسیر الآیات

وَدَّ كَثِيرٌ...الآية

عموماً حسد میں یہ ہوتا ہے کہ حاسد کی خواہش ہوتی ہے کہ محسود کے پاس جو دینی یا دنیوی نعمت ہے وہ اس سے چھن جائے اور اسے مل جائے۔ اور حسد کی آخری سٹیج یہ ہوتی ہے کہ حاسد یہ چاہتا ہے کہ وہ نعمت اسے ملے یا نہ ملے بہرحال محسود کے پاس نہ رہے۔ جس طرح ہر دور میں فضل و کمال سے محروم، کم ظرف و کوتاہ اندیش اور پست ہمت حاسدین کی یہ حالت رہی ہے۔ اپنی انہی کمزوریوں کی وجہ سے وہ خود تو کمال حاصل کر نہیں سکتے۔ مگر باکمال اور اولوالعزم لوگوں کے علمی و عملی کارناموں کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ ان کی بلندی دیکھ کر انہیں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان لوگوں سے ان کا فضل و کمال چھن جائے اور وہ ان کی پست سطح پر آ جائیں۔ کچھ یہی کیفیت اہل کتاب کی نزول قرآن کے وقت تھی کہ وہ خود تو نعمت ایمان سے محروم تھے ہی۔ مگر چاہتے تھے کہ جو خوش قسمت ایمان لا چکے ہیں ان کو بے ایمان بنائیں۔ اور جب ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تھی تو وہ تکلیف محسوس کرتے تھے۔ **قل موتوا بغیظکم**۔

چونکہ ان لوگوں کی روش سے مسلمانوں کا غصہ کرنا اور تکلیف کا محسوس ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس لئے خدائے حکیم انہیں حکم دے رہا ہے کہ تم عفو و درگزر سے کام لو اور ان سے کوئی انتقام نہ لو۔ جب تک خدا خود کوئی انتظام نہ کرلے کیونکہ

در عفو لذتے است کہ در انتقام نیست

وَقَالُوا لَنۡ...الآیۃ۔

یہود و نصاری بلاشرکت غیرے جنت پر اپنی اجارہ داری کے قائل تھے۔ اسی لئے تو گرجا والے اپنی قوم کے گنہگاروں اور بدکاروں کو خطیر رقوم لے کر جنت کے پروانے لکھ دیا کرتے تھے اور اس طرح بالواسطہ جرائم میں اضافہ اور معاشرہ میں تباہی کا باعث بنتے تھے۔ اس موضوع پر آیت نمبر ۹۴ کی تفسیر میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔ بہرحال جب ہر دعوی دلیل کا محتاج ہوتا ہے۔ تو خداوند عالم ان سے مطالبہ کر رہا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو سچائی کی کوئی دلیل پیش کرو۔ لہٰذا اگر تم اپنے دعوی کی صداقت پر کوئی دلیل و برہان پیش نہ کر سکے تو معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا دعوی غلط ہے۔

آیات القرآن

بَلٰى ۚ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا
خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى
عَلٰى شَىۡءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ
الۡكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ۚ فَاللّٰهُ
يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنۡ اَظۡلَمُ
مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنۡ يُّذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهٗ وَسَعٰى فِىۡ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ
مَا كَانَ لَهُمۡ اَنۡ يَّدۡخُلُوۡهَاۤ اِلَّا خَآئِفِيۡنَ ؕ لَهُمۡ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ
وَّلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ۚ

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ترجمۃ الآیات

ہاں۔(کسی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے)جو شخص (حق سنکر) اپنا سر تسلیم خدا کے سامنے خم کردے اور (مقام عمل میں) نیکوکار بھی ہو تو اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر وثواب ہے اور (قیامت کے دن) ایسے لوگوں کو کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۱۱۲) یہودی کہتے ہیں کہ نصرانی کسی چیز (راہ راست) پر نہیں اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی کسی چیز (راہ راست) پر نہیں حالانکہ یہ سب (آسمانی) کتاب کے پڑھنے والے ہیں اسی طرح (بے بنیاد) باتیں ان لوگوں (کفار و مشرکین) نے بھی کی ہیں جو کچھ بھی علم نہیں رکھتے۔ پس جن باتوں میں یہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہیں قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان فیصلہ کردیگا (۱۱۳) اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے (اللہ کے بندوں کو) روکے اور ان کی ویرانی و بربادی کی کوشش کرے حالانکہ (روکنے والوں) کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسجدوں میں داخل ہوں مگر ڈرتے ڈرتے۔ ان لوگوں کیلئے دنیا میں ذلت ورسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے (۱۱۴) اور مشرق ومغرب (پورب وپچھّم) سب اللہ کے ہی ہیں سو تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی ذات موجود ہے یقیناً اللہ بڑی وسعت والا، بڑا علم والا ہے (۱۱۵)

تشریح الالفاظ

(۱) اسلم یہ اسلام سے مشتق ہے جس کے معنی مذہب اسلام قبول کرنا، فرمانبردار ہونا۔ اور جب اس اس کا صلہ الٰی ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے معاملہ کا خدا کے سپرد کرنا۔

تفسیر الآت

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ ... الآية

اہل کتاب کے دونوں گروہوں (یہود ونصاری) کے نظریہ کو رد کرنے کے بعد خداوند عالم جنت میں دا

خلہ کا قاعدہ اور ضابطہ بیان فرما رہا ہے کہ اس پر کسی خاص گروہ کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی اپنے کو اللہ کے سامنے جھکا دے اور نیک عمل بجالائے یعنی عقائد حقہ رکھنے اور اعمال صالح بجالانے میں خدا کی فرماں برداری کرے وہی نجات کا مستحق ہے۔ اس میں ذات پات یا رنگ و نسل کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ کیونکہ "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ" (سورہ حجرات آیت۔ ۱۳) ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ ...الآية

یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا مذہب کچھ نہیں ہیں اور عیسائی کہتے ہے کہ یہودی سیدھی راہ پر نہیں ہیں اور مذہب کچھ نہیں۔ حالانکہ وہ سب (آسمانی) کتاب کے پڑھنے والے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے لمحہ فکریہ

اہل کتاب کی اس روش اور خدا کی اس مذمت میں اہل عقل و انصاف کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ اگر چہ اہل کتاب آسمانی کتاب کو پڑھتے ہیں مگر ان کی کتابیں جو جدا جدا ہیں یہود کی کتاب توراۃ ہے اور نصاریٰ کی انجیل پھر ان کے نبی بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ مگر خدا پھر بھی ان کی تفرقہ بازی کی مذمت کر رہا ہے۔ تو وہ مسلمان جن کی کتاب بھی ایک ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔ اور نبی بھی ایک ہے اور وہ ہیں رحمۃ للعالمین۔ تو جب وہ ایک دوسرے پر کفر کا فتوی لگاتے ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کرنے اور اس کے خون بہانے کے جواز کا فتوی دیتے ہیں تو کیا خدا ان کی اس روش پر راضی ہوگا؟ اور آیا عقلاً و شرعاً اس رویہ کا کوئی جواز ہے؟ بلکہ حق تو یہ ہے کہ بقول فاضل شیخ جواد مغنیہ:

"لو نظرنا الی الایة و قسنا هذا بمقياسها لكنا اسوء حالا الف مرة من اليهود و النصاری"

اگر ہم اس آیت پر نگاہ کریں۔ اور پھر اسے میزان عدل پر تولیں تو ہماری حالت یہود و نصاریٰ سے ہزار درجہ بدتر نظر آئے گی۔ (تفسیر کاشف)

آیت کے آخری حصہ سے واضح ہوتا ہے کہ فرق اور مسالک کا یہ اختلاف دنیا میں طے نہیں ہو سکتا۔ اس کا حتمی اور آخری فیصلہ تو آخرت میں پیش خدا ہی ہوگا۔ تو مسلکی اختلاف پر دنیا میں لڑائی جھگڑے کا جواز کیا ہے؟ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار سے فرما سکتے ہیں کہ "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (سورہ کافرون

آیت۔۶) تو ہم ایک دوسرے سے کیوں نہیں کہہ سکتے کہ **لکم مذھبکم و لنا مذھبنا** کہ تمہارا مسلک تمہارے لئے اور ہمارا مذہب ہمارے لئے۔ الغرض

مذہب نہیں سکھا تا آپس میں بیر رکھنا

بلکہ وہ تو اخوت ومحبت اور تحمل ورواداری اور بھائی چارہ وہمدردی کا درس دیتا ہے۔ اوراس کی تمام تعلیم و تلقین کا خلاصہ یہ ہے کہ ''خود جیواور دوسروں کو جینے دو'' اور یہ حقیقت خود لفظ اسلام میں پوشیدہ ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ...الآیۃ

اگر چہ اس آیت کی ظاہری شان نزول تو خاص ہے مراد رومی اور بابلی ہیں جنہوں نے بیت المقدس کو خراب وبرباد کیا تھا یا کفار مکہ ہیں جنہوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کو ہجرت کے بعد مکہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روکا تھا۔ مگر بموجب **المورد لا یخصص الوارد**۔ اس کی زد میں ہر وہ فرقہ، گروہ اور قوم آتی ہے جو مذہبی تعصب یا فرقہ وارانہ عناد کی بنا پر کسی فرد یا جماعت کو خانہ خدا میں داخل ہونے اور اس میں اسے اپنے مسلکی طریقہ پر عبادت خدا کرنے سے منع کرے۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج ایک رب العالمین کے بندوں اور ایک رحمۃ للعالمین کے امتیوں نے جہاں اپنے ڈیرے الگ الگ بنائے ہوئے ہیں (اوراس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے) وہاں ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بھی الگ الگ بنا رکھی ہیں۔ کہ یہ سنیوں کی مسجد ہے اور وہ شیعوں کی ہے اور وہ بریلویوں کی ہے یہ اہل قرآن کی ہے یہ دیوبندیوں اور وہ اہلحدیث کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ڈیروں کی طرح یہ مسجدیں بھی ان مسلک والوں کی اپنی ذاتی ملکیت ہیں۔ خدا کی نہیں ہیں حالانکہ ارشاد قدرت ہے ''وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ'' کہ مسجدیں صرف خدا کی ہیں۔ (سورہ جن آیت۔۱۸) لہٰذا اس روش اور سوچ کے انداز کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے اور مساجد کے منتظم حضرات کا مذہبی واخلاقی فریضہ ہے کہ وہ مسجدوں کے دروازے سب اہل اسلام کے لئے کھلے رکھیں۔ اور کسی مسلک ومذہب کے مسلمان کو اپنے مسلک کے مطابق ان میں خدا کی عبادت کرنے سے منع نہ کریں اور اس حقیقت کو ذہن نشین کریں کہ

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے جو جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

ورنہ وہ ظالموں میں شمار ہوں گے اور اس کے نتیجہ میں خدا کی لعنت میں گرفتار ہوں گے۔ **ولعنۃ اللہ علی الظّٰلمین**

وَلِلّٰہِ الۡمَشۡرِقُ...الآیۃ

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ تحویل قبلہ کے بارے میں یہود ونصاری نے جواعتراض کیا تھا۔اس کے جواب میں یہ آیت اتری ہے۔بعض نے یہ لکھا ہے کہ خداوندعالم نے اس آیت میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ چونکہ خدا جسم نہیں رکھتا اس لئے وہ کسی خاص جہت وسمت میں محدود نہیں ہے اس لئے اس کیلئے مشرق ومغرب پورب وپچھم سب برابر ہیں۔ہاں البتہ اس نے جماعت مسلمین میں یکجہتی پیدا کرنے کیلئے اور منتشر افراد کوایک مر کز پرجمع کرنے کیلئے ایک جانب منہ کر کے عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔ورنہ اس کی کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے۔بہرنوع وارثان علم قرآن یعنی سرکار محمدآل محمد علیہم السلام کے مستند اخبار وآثار سے جوکچھ واضح وآشکار ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جوکچھ اس آیت مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے۔یہ اس شخص کا حکم ہے جوسمت قبلہ کے بارے میں با لکل متحیر وسرگردان ہواور اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہواور کسی وجہ سے احتیاط پرعمل بھی نہ کرسکتا ہو (الفقیہ)۔یا پھر یہ نماز نافلہ کے بارے میں ہے جوسفر میں پڑھی جائے (صافی)۔مگر جہاں تک نماز فریضہ کا تعلق ہے تو اختیاری حالت میں حتی الامکان اس کارو بقبلہ ہوکر پڑھنا واجب ہے (تمام کتب فقہیہ)

آیات القرآن

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ
كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا
يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ
اَوۡ تَاۡتِيۡنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ
تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ
بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنۡ تَرۡضٰى
عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ
هُوَ الۡهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِىۡ جَآءَكَ مِنَ

الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

ترجمۃ الآیات

اور وہ (اہل کتاب) کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی بیٹا بنالیا ہے۔ وہ (ایسی باتوں سے) پاک ہے۔ بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب کچھ اسی کا ہے سب اسی کے مطیع وفرمانبردار ہیں (۱۱۶) (وہی) آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ تو اسے بس اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جاؤ اور وہ ہو جاتا ہے۔ (۱۱۷) جاہل و ناداں کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے (براہ راست) کلام کیوں نہیں کرتا۔ یا ہمارے پاس (اس کی) کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں وہ بھی اسی طرح کی (بے پرکی) باتیں کیا کرتے تھے ان سب کے دل (اور ذہن) ملتے جلتے ہیں۔ بے شک ہم نے یقین کرنے والے لوگوں کیلئے (اپنی نشانیاں) کھول کر بیان کر دی ہیں (۱۱۸) (اے رسول) بے شک ہم نے آپ کو برحق بشیر ونذیر (خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا) بنا کر بھیجا ہے۔ اور (اس اتمام حجت کے بعد) دوزخ میں جانے والوں کے بارے میں آپ سے باز پرس نہیں کی جائیگی (۱۱۹) اے رسول یہود ونصاریٰ اس وقت تک آپ سے راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کے دین و مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں۔ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے (جو اس نے بتائی ہے) اور اگر آپ نے (اللہ کی طرف سے) علم آجانے کے بعد بھی ان لوگوں کی خواہشات وخیالات کی پیروی کی۔ تو پھر اللہ کی گرفت) سے آپ کو بچانے والا نہ کوئی سرپرست ہوگا اور نہ کوئی یار و مددگار (۱۲۰)

تشریح الالفاظ

(۱) قانطون — قنط وقنوط کے معنی مایوسی کے بھی ہیں اور فرمانبرداری کے بھی

(۲) بدیع — اس موجد کو کہا جاتا ہے جو کوئی ایسی چیز ایجا کرے جس کی پہلے مثال نہ ہو

تفسیر الآیات

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللہ...الآیۃ

یہود جناب عزیر علیہ السلام اور عیسائی جناب عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا یقین کرتے تھے اور مشرکین ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے۔ خداوند عالم نے یہاں اور بہت سے دوسرے مقامات پر ان لوگوں کی ردّ فرمائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ زمین ہو یا آسمان اور جو کچھ اس وسیع و عریض کائنات کے اندر ہے۔ خواہ کبیر ہو یا صغیر، نوری ہو یا ناری۔ یا خاکی ہر شئی اس کی مملوک ہے کوئی چیز اس کی مولود نہیں ہے وہ بیوی بچوں کے جنجال سے منزہ و مبرہ ہے۔ سبحانہ و تعالی عما یشر کون.

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ...الآیۃ

بدیع اس موجد کو کہا جاتا ہے جو کوئی ایسی چیز ایجاد کرے جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہ ہو بنا بریں اس فقرہ کا مطلب یہ ہوگا کہ خدائے قدیر نے زمین اور آسمان کو اس انوکھے طریقہ و طرز پر خلق فرمایا ہے کہ جس کی پہلے کوئی مثال یا نظیر موجود نہیں تھی۔

وَاِذَا قَضٰی...الآیۃ

جہاں تک ''کن فیکون'' کا تعلق ہے تو عوام کالانعام اور مقررین بے لگام تو یہ گمان کرتے ہیں کہ چونکہ کن کہنے کے لئے زبان اور دہان کی ضرورت ہے۔ اور پھر جب دیکھتے ہیں کہ خدا ان چیزوں سے مبرا ہے۔ تو پھر پریشان ہو جاتے ہیں کہ وہ کس طرح کہتا ہے۔ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خدا نے کچھ مخصوص ہستیاں پیدا کی ہیں جو کن کہتی ہیں۔ تو چیزیں وجود میں آتی ہیں مگر عقل و خرد سے عاری یہ لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر کسی چیز کے پیدا کرنے کیلئے کن کا کہنا ضروری ہے اور خدا کن نہیں کہہ سکتا۔ العیاذ باللہ۔

تو پھر اس نے ان مخصوص ہستیاں کو کس طرح خلق فرمایا تھا؟ اور اس وقت کس نے کن کہا تھا؟ بہر حال ایسے لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے یا ان کے معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے عرض ہے کہ ایسے لوگوں کو خدا کے متکلم ہونے کا مفہوم سمجھنا چاہیے یہاں منہ سے کلام کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ موجد کلام ہے۔ کہ وہ جس چیز میں چاہے کلام پیدا کر سکتا ہے اور یہ کہ لفظ ''کن'' کسی چیز سے خدا کے ارادہ کے تعلق کی تعبیر ہے کہ جس طرح کن کہنے میں دیر نہیں لگتی اسی طرح جب کسی کام کے کرنے سے متعلق خدا کا ارادہ ہو جائے تو اس

کی مراد کے وجود میں آنے میں کوئی دیر و درنگ نہیں ہوتی تو گویا یہ لفظ کسی چیز کے جلدی وجود میں آنے کا استعارہ ہے۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام نے اس کی وضاحت کی ہے (نہج البلاغہ) مخفی نہ رہے کہ یہ کن فیکون کی کبھی کبھار ضرورت پڑتی ہے ورنہ عموماً اس عالم اسباب میں ہر چیز اپنے علل و اسباب کے تحت کبھی دیر اور کبھی سویر اپنے مقررہ وقت پر ہی ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ذلك تقدير العزيز العليم۔

وَ قَالَ الَّذِيۡنَ...الآیۃ

خداوند عالم نے علم و دانائی سے محروم لوگوں کے وہ دو مطالبے دہرائے ہیں جو ہمیشہ سے ایسے لوگ کرتے چلے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا بلا واسطہ اور براہ راست ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا؟ دوسرے ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ یہ مطالبے ہی ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہیں وہ سمجھتے تھے کہ خدا عام لوگوں کی طرح جسمانی طور پر کلام کرتا ہے اور انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس کا کلام غیر مادی ہے اور ہر شخص اس کے کلام کے سماعت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے خاص روحانی استعداد کی ضرورت ہے اور وہ صرف مخصوص افراد کاملہ کو حاصل ہوتی ہے۔ جن کو ملائکہ مقربین یا انبیاء و مرسلین کہا جاتا ہے۔ نیز وہ تو ایک آیت (معجزہ) کا مطالبہ کر رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کی متعدد نشانیاں آچکی تھیں اور وہ آپ کی صداقت کے کئی معجزات دیکھ چکے تھے پھر ہمارے پاس کوئی نشانی آئے کی تکرار کا کیا مطلب ہے؟ ان کا یہ مطالبہ حجت بازی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اسی لئے خدا فرماتا ہے کہ ہم نے اہل یقین کے لئے اپنی نشانیاں صاف صاف بیان کر دی ہیں اور سب سے بڑا معجزہ تو آپ کی ذات ہے مگر ان کیلئے جو یقین و اذعان کرنے کیلئے تیار ہیں ورنہ لا تغنی الآیات و النذر عن قوم لا یومنون۔

وَلَنۡ تَرۡضٰی...الآیۃ

اس آیت کی شان نزول مفسرین اسلام نے یہ بیان کی ہے کہ یہود اور نصاریٰ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتے تھے کہ آپ ہم سے نرم روی اور ہمدردی کا مظاہرہ کریں تو ہم اسلام لائیں گے (مجمع البیان) خداوند عالم ان کی باطنی خباثت کو ظاہر کرتے ہوئے خبر دے رہا ہے کہ یہ فقط ان کی چالاکی اور چالبازی ہے حقیقت الامر تو یہ ہے کہ جب تک آپ ان کی ملت کی پیروی نہ کریں تب تک یہ لوگ کبھی آپ سے راضی نہیں ہوں گے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ حق کبھی باطل کی اتباع نہیں کرسکتا ورنہ زمین اور آسمان برباد ہو جائینگے "وَ لَوِ اتَّبَعَ الۡحَقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ" (سورہ مومنون آیت۔ ۷۱) نہ آپ کبھی ان کی ملت کی پیروی کریں گے اور نہ یہ لوگ کبھی آپ سے راضی ہوں گے اور اگر بالفرض کبھی آپ نے ایسا کیا تو پھر آپ

کا کوئی یاور اور مددگار نہ ہوگا۔ بنابریں اگر ان لوگوں کے اسلام لانے کی کوئی امید تھی تو خدائے علیم و حکیم نے اسے قطع کر دیا اور واضح کر دیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

آیات القرآن

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ
وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۠ ﴿۱۲۱﴾ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا
نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا
یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا
تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ
فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ
قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً
لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى
اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ
السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

ترجمۃ الآیات

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح پڑھنے کا حق ہے وہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو اس کا انکار کرتے ہیں تو یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (۱۲۱) اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا۔ اور یہ بھی کہ تمہیں دنیا و جہان والوں پر فضیلت دی (۱۲۲) اور (قیامت کے) اس دن سے ڈرو۔ جب کوئی کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا اور نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔

اور نہ ہی سفارش کسی کو کچھ فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ ہی (کسی اور طریقہ سے) ان کی امداد کی جائیگی (۱۲۳) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم کا ان کے پروردگار نے چند باتوں کے ساتھ امتحان لیا۔ اور انہوں نے پوری کر دکھائیں ارشاد ہوا۔ میں تمہیں تمام انسانوں کا امام بنا نے والا ہوں۔ انہوں نے کہا اور میری (اولاد میں سے بھی؟ ارشاد ہوا۔ میرا عہدہ (امامت) ظالموں تک نہیں پہنچے گا (۱۲۴) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے اس گھر (خانہ کعبہ کو تمام لوگوں کیلئے مرکز اور مقام امن قرار دیا۔ اور (حکم دیا کہ) مقام ابراہیم (جہاں عبادت کیلئے کھڑے ہوئے تھے) کو (اپنی) نماز کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو وصیت کی (حکم دیا) کہ تم دونوں میرے (اس) گھر کو طواف کرنے والوں اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کیلئے پاک وصاف رکھو (۱۲۵)

تشریح الالفاظ

(۱) ابتلیٰ یہ ابتلا سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں آزمانا (۲) مثابةً اس کے معنی ہیں لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ (۳) مصلّٰی اس کے معنی ہیں جائے نماز

تفسیر الآیات

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ ...الآیة

اس بات کے بارے میں مفسرین اسلام کے درمیان سخت اختلاف ہے کہ ان لوگوں سے کون لوگ مراد ہے جن کی خدا اس آیت میں تعریف کر رہا ہے؟ بعض حضرات نے کتاب سے مراد انجیل اور ان لوگوں سے مراد وہ چالیس اصحاب سفینہ نصرانی مراد لئے ہیں جو جناب جعفر طیار کے ہمراہ آئے تھے اور ایمان لائے تھے جن میں سے بتیس اہل حبشہ تھے اور آٹھ شام کے راہب تھے جن میں ایک بحیرا راہب بھی تھا بعض نے کتاب سے مراد تورات اور ان لوگوں سے وہ یہودی مراد لئے ہیں جو ایمان لائے تھے جیسے عبداللہ بن اسلام، شعبہ بن عمرو تمام بن یہودا اسد و اسید فرزندان کعب ابن یابین اور بن صوریا وغیرہ۔ اور بعض نے کتاب سے مراد قرآن مجید اور ان لوگوں سے مخلص اہل اسلام و ایمان مراد لئے ہیں (مجمع البیان تفسیر حقانی وغیرہ) واضح رہے کہ کتاب

کی اس طرح تلاوت کرنا جس طرح کرنے کا حق ہے سے مراد یہ ہے کہ اسے ٹھہر ٹھہر کر اور مخارج کو ادا کر کے پڑھا جائے۔ محکم پر عمل کیا جائے اور متشابہ پر ایمان لایا جائے اور اس کے اوامر پر عمل درآمد کیا جائے۔ اور نواہی سے دامن کو بچایا جائے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس کا یہ مفہوم مروی ہے کہ تلاوت کرتے وقت جہاں جنت کا ذکر آئے وہاں خدا سے اس کا سوال کیا جائے۔ اور جہاں جہنم کا ذکر آئے وہاں اس سے خدا سے پناہ مانگی جائے (نور الثقلین)

وَاتَّقُوۡا...الآیة

ان دو آیتوں کی تفسیر آیت ۴۷۔۴۸ کے ذیل میں گزر چکی ہے ان آیات کی تکرار تاکید اور نصیحت کے لیے ہے یا پھر مسلسل تازیانہ عبرت لگانے کے لئے ہے۔

وَاِذِ ابۡتَلٰۤی...الآیة۔

اس آیت مبارکہ سے اسلامی دنیا کے خلافت و امامت جیسے اہم اور قدیم الایام سے معرکتہ الارا ء اسلامی مسئلہ میں شیعی نقطہ نگاہ کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں کئی قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں مثلاً

(۱) ایک اختلاف یہ ہے کہ آیا امام کا تقرر خدا کرتا ہے یا بندے منتخب کرتے ہیں۔ شیعہ موقف یہ ہے کہ جس طرح نبی خدا بناتا ہے اسی طرح اس کا وصی بھی خدا منتخب فرماتا ہے یہاں خدا کے اس اعلان کہ ''اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۲۴) (میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں) سے بعبارۃ النص ثابت ہوتا ہے کہ امام بنانا خدا کا کام ہے نیز جناب ابراہیم علیہ السلام کے اپنی ذرّیت کے لئے اس عہدہ جلیلہ کی دعا داستدعا کرنا بھی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جناب خلیل خدا کا نظریہ یہی تھا کہ امام خدا بناتا ہے۔

(۲) دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امامت کا کوئی معیار ہے یا نہ؟

شیعہ موقف یہ ہے کہ ہر کس و ناکس قہر و غلبہ وغیرہ سے امامت کے جلیل القدر منصب پر فائز نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اس کا ایک معیار ہے اور وہ وہی معیار نبوت ہے۔ یعنی وہی شخص امام ہو سکتا ہے جو صفات و کمالات نبویہ کا حامل ہو جن میں علم و عمل ایمان و تقویٰ اور شجاعت و شہامت کے علاوہ ایک نمایاں صفت عصمت بھی ہے یعنی نبی کی طرح امام کیلئے بھی معصوم عن الخطاء ہونا ضروری ہے۔ اس آیت سے یہاں بھی شیعہ موقف کی تائید ہوتی ہے جناب خلیل علیہ السلام و من ذرّیتی کہہ کر اس عہدہ کے اپنے ذرّیت میں برقرار رکھنے کی خدا سے استدعا کرتے ہیں جواب میں خدا فرماتا ہے ''قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ'' میرا یہ عہدہ امامت تیری ذ

رّیت میں سے ظالموں کو نہیں پہنچے گا (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۲۴) اس سے واضح ہوتا ہے کہ ظالم کبھی امام نہیں ہوسکتا اب قابل غور بات یہ ہے کہ ظلم کا دائرہ کس قدر وسیع ہے؟ ارشاد قدرت ہے ''وَ مَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ'' (سورہ بقرہ آیت۔۲۲۹) جو شخص اللہ کی مقررہ کردہ حدوں سے کسی حد کو توڑے وہ ظالم ہے)۔ظاہر ہے کہ ان حدود میں احکام خمسہ (واجب حرام مستحب مکروہ اور مباح) داخل ہیں لہٰذا یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ امام کیلئے معصوم ہونا ضروری ہے۔اس بنا پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ

''ابطلت هذه الآية امامة كل ظالم الى يوم القيامة'' اس آیت نے قیامت تک ہر ظالم کی امامت کو باطل کر دیا ہے (اصول کافی)

فاضل نیشاپوری لکھتے ہیں:

''فی الآية دليل انه كان معصوما عن جميع الذنوب''

اب رہی یہ بات کہ کون اس معیار پر پورا اترتا ہے اور کون نہیں اترتا؟ اس کے معلوم کرنے کا طریقہ ابتلا وامتحان ہے۔کیونکہ عند الامتحان يكرم الرجل او يهان۔ چنانچہ اسی مقصد کی خاطر یہاں خدائے حکیم نے جناب ابراہیم علیہ السلام کا چند باتوں سے امتحان لیا۔اور جب وہ اس امتحان میں کامیاب وکامران ہوئے تو پھر ان کی امامت کا اعلان فرمایا وہ باتیں کیا تھیں؟ قرآن مجید میں ان کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔البتہ جو کچھ مختلف اخبار وآثار اور مفسرین کے اقوال وآراء سے واضح وآشکار ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ باتیں یہ تھیں۔

(۱)۔راہ خدا میں بیٹے کا ذبح کرنا (۲) آتش نمرودی میں جھونکا جانا

(۳) اپنی قوم وقبیلہ سے علیحدگی اختیار کرنا (۴) امر ونہی کا فریضہ ادا کرنا

(۵) جناب سارہ کی بدخلقی پر صبر کرنا (۶) معرفت پروردگار میں اطمینان کی منزل پر فائز ہونا

(۷) دشمنان دین کا پامردی سے مقابلہ کرنا (۸) مناسک حج ادا کرنا

(۹) وطن سے ہجرت کرنا۔

(۱۰) حنیفیت پر عمل کرنا جن میں سے پانچ کا تعلق سر سے ہے اور پانچ کا تعلق بدن سے۔چنانچہ پہلی پانچ چیزیں یہ ہے۔۱۔مونچھیں کٹوانا۔۲۔ڈاڑھی رکھوانا۔۳۔سر کے بال کٹوانا۔۴۔خلال کرنا۔۵۔اور مسواک کرنا۔۶۔اور دوسری پانچ چیزیں یہ ہیں۔۱۔بدن کے بالوں بالخصوص موئے زہار کا صاف کرنا۔۲۔ختنہ کر

نا۔۳۔ناخن لینا۔۴۔غسل جنابت کرنا۔۵۔اور پانی سے طہارت کرنا یہی وہ حنیفیت ہے جو جناب خلیل علیہ السلام لائے اور جو قیامت تک برقرار رہے گی اور کبھی منسوخ نہیں ہوگی۔**وا تبع ملة ابراهیم حنیفا۔**

ایک سوال اوراس کا جواب

سوال کیا جاتا ہے کہ جب خدا علام الغیوب ہے تو پھر یہ امتحان وآزمائش کیوں؟اس کا جواب یہ ہے کہ امتحان ہمیشہ اس لئے نہیں لیا جاتا کہ امتحان لینے والے کو علم ہو بلکہ کبھی لوگوں پر اس شخص کا استحقاق اوراہلیت ظاہر کرنے کیلئے بھی لیا جاتا ہے۔کہ جو عہدہ اس شخص کو دیا جاتا ہے وہ اس کا مستحق ہے خدا کا امتحان اسی دوسری غرض کیلئے ہوتا ہے۔

امام کا مقام

نبی ورسول اورامام کے لغوی معنی پر غور کیا جائے تو امامت کی منزل زیادہ بلند نظر آئے گی۔نبی خبر دینے والا رسول پیغام پہنچانے ولا اورامام یعنی پیشوا پہلی دونوں چیزوں میں وہ ہمہ گیری، مستقل حیثیت اوردوسروں کے لحاظ سے خود مفہوم لفظ میں وہ رفعت نہیں جو امام میں ہے اوراسی لئے جب کہ عقلی طور پر نبی ورسول بھی معصوم ہوتے ہیں امام کیلئے خود اس لفظ سے اورزیادہ قوت کے ساتھ عصمت کے ضروری ہونے کا پتہ چلتا ہے۔(فصل الخطاب)

مخفی نہ رہے کہ اس لفظ امام کا اطلاق کبھی نبی ورسول پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہوا ہے ''وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا'' (سورہ انبیاء آیت۔۷۳)اورکبھی وصی نبی پر ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے بارہ آئمہ طاہرین علیہم السلام امام ہیں مگر نبی ورسول نہیں ہیں۔**فلا تغفل۔**

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ...الآية

اس آیت مبارکہ میں خالق اکبر نے خانہ کعبہ کی عظمت بتاتے ہوئے اس کی بعض خصوصیات کا تذکرہ فرمایا ہے

(1)۔مثلاً یہ کہ خدا نے اسے مثابة للناس بنایاھے مثابه ثاب یثوب سے ظرف مکان ہے جس کے معنی لوٹنے اور پلٹنے کی جگہ کے ہیں۔یہ وہ مقدس مقام اورمرجع الخلائق ہے جس کی طرف بار بار لوگ لوٹ کر آتے ہیں۔اسکی زیارت کرتے ہیں اس کا طواف کرتے ہیں اوروہاں نماز پڑھتے ہیں مگر پھر بھی سیر نہیں ہوتے اس لئے پھر شوق زیارت انہیں کشاں کشاں وہاں لاتا ہے۔

(2)۔ یہ جائے امن ہے وہاں انسان تو انسان حیوان اور نباتات بھی امن میں ہیں چنانچہ حرم کے حدود کے اندر جس طرح جانوروں کا شکار کرنا حرام ہے وہاں کی گھاس کا اکھیڑنا بھی جائز نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ البیت سے مراد حرم ہے جیسا کہ ''هَدۡيًاۢ بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ'' (سورہ مائدہ آیت ۔۹۵) میں ''الکعبۃ'' سے مراد حرم ہے۔

(3)۔ وہاں مقام ابراہیم ہے جہاں جناب خلیل خدا نے نماز پڑھی تھی اور آج بھی دو رکعت نماز طواف وہیں پڑھنے کا حکم ہے اور وہیں وہ پتھر بھی نصب ہے جس پر کھڑے ہو کر جناب خلیل علیہ السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا اور اس پر آپ کے قدم مبارک کا نشان بھی ہے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''تین پتھر جنت سے نازل ہوئے۔ (۱) حجر اسود (۲) مقام ابراہیم (۳) بنی اسرائیل کا پتھر'' (تفسیر عیاشی)۔

(۴) جناب خلیل خدا و اسماعیل علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اس گھر کو ہر قسم کی ظاہری و باطنی نجاست و کثافت سے پاک رکھیں طواف کرنے والوں اعتکاف کرنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کیلئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی غرض و غایت یہ چیزیں ہیں۔

وَعَهِدۡنَاۤ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ ...... الآیۃ

حضرت خلیل خدا ملک شام میں رہتے تھے اور حکم خداوندی کے تحت اپنی بیوی ہاجرا اور اپنے لخت جگر اسماعیل علیہ السلام کو اس لق و دق صحراء اور چٹیل میدان میں چھوڑ گئے۔ جہاں بعد میں خانہ کعبہ کی عمارت کھڑی کی گئی اور شہر آباد ہوا اور پھر وقتاً فوقتاً وہاں تشریف لاتے رہے اور جب جناب اسماعیلعلیہ السلام جوان ہو گئے تو اس وقت جناب خلیل کو حکم ہوا کہ وہ خانہ کعبہ کی عمارت تعمیر کریں چنانچہ انہوں نے اپنے لخت جگر اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ ملا کر خانہ کعبہ کی عمارت کھڑی کی یہاں جناب خلیل خدا کی جن مقدس دعاؤں کا خداوند عالم نے تذکرہ فرمایا ہے ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو آپ نے اس وقت مانگی تھیں جب اپنی صابرہ و شاکرہ اور فرمانبردار بیوی ہاجرا اور اپنے بڑھاپے کے سہارا لخت جگر اور نور نظر اسماعیل علیہ السلام کو بے آب و گیاہ لق و دق صحرا میں چھوڑ کر واپس شام تشریف لیجا رہے تھے۔ اور کچھ وہ ہیں جو خانہ خدا کی تعمیر سے فارغ ہو کر مانگی تھیں۔ ان دعاؤں کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے پہلے یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے کہ یہاں خدائے حکیم نے تعمیر خانہ کعبہ کے سلسلہ میں جو لفظ استعمال کئے ہیں کہ ''وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ'' اس وقت کو یاد کرو کہ جب جناب ابراہیمعلیہ السلام اور جناب اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی بنیادوں کو اونچا کر رہے

تھے۔(سورہ بقرہ آیت۔۱۲۷)اس سے ظاہراور واضح ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں البتہ عمارت (طوفان نوح۔وغیرہ کی وجہ سے) گر گئی تھی جسے از سرنو تعمیر کیا گیا ہے اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ''اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا'' کہ اس عالم آب وگل میں سب سے پہلا گھر جولوگوں کے فائدے کیلئے تعمیر کیا گیا۔ وہ وہی ہے جو سرزمین مکہ میں ہے جس کا نام خانہ کعبہ ہے(سورہ بقرہ آیت۔۹۶)..........اس کی مزید وضاحت اسی آیت مبارکہ کی تفسیر میں کی جائے گی۔انشاءاللہ)۔

آیات القرآن

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ
الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ
فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾
وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ
مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

ترجمۃ الآیات

اوراس کے رہنے والوں میں سے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں انہیں ہر قسم کے پھلوں سے روزی عطا فرما۔ارشاد ہوا۔اور جو کفر اختیار کرے گا اس کو بھی چند روزہ (زندگی میں) فائدہ اٹھانے دونگا۔اور پھر اسے کشاں کشاں دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤنگا۔ اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔(۱۲۶)اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر

(خانہ کعبہ) کی بنیادیں بلند کر رہے تھے۔ (اور اس کے ساتھ ساتھ یہ دعا کرتے جاتے تھے) اے ہمارے پروردگار ہم سے (یہ عمل) قبول فرما............ بے شک تو بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔(۱۲۷) اے ہمارے پروردگار ! ہمیں اپنا (حقیقی) مسلمان (فرمانبردار بندہ) بنائے رکھ۔ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت مسلمہ (فرمانبردار امت) قرار دے۔ اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتا۔ اور ہماری توبہ قبول فرما بے شک تو بڑا توبہ قبول کرنیوالا بڑا مہربان ہے (۱۲۸) اے ہمارے پروردگار ان (امت مسلمہ) میں انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر بھیج جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے یقینا تو بڑا زبردست اور بڑی حکمت والا ہے (۱۲۹)

تشریح الالفاظ

(۱) والعاکفین یہ عکف وعکوف سے مشتق ہے جس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں

(۲) من القواعد یہ قاعدہ کی جمع ہے جس کے معنی اصل اور بنیاد کے ہیں ویسے اصطلاح میں قاعدہ اس ضابطہ کو کہتے ہیں جو تمام اپنے جزئیات پر منطبق ہوتا ہے۔

تفسیر الآیات

جناب خلیل کی وہ دعائیں جو بیوی بچہ کو چٹیل میدان میں چھوڑتے وقت کیں

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ ......الآیة

جب جناب خلیل خدا اپنی بیوی اور بچہ کو کچھ کھجوریں اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر واپس شام جانے لگے تو جناب ہاجرا نے دادوفریاد کی کہ آپ ہمیں اس بے آب و گیاہ چٹیل میدان میں تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں جہاں نہ کوئی مونس و غمگسار ہے اور نہ کوئی یار و مددگار۔ اور نہ کوئی خورد و نوش کا انتظام؟ تو جواب میں جناب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا مجھے خداوند عالم کا یہی حکم ہے۔ اس پر جناب ھاجرا نے کہا پھر آپ بے شک جائیں جس نے آپ کو یہ حکم دیا ہے وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ بہرحال اس حال میں اپنے بیوی بچہ کو چھوڑ کر واپس جاتے

وقت آپ نے اپنے خالق و مالک سے چند دعائیں مانگی تھیں۔

(۱) ''وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

''اے میرے پروردگار اس مکہ کو امن والا شہر بنا اور اس میں رہنے والوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما۔ (سورہ بقرہ آیت۔۱۲۶)

(۲) ''وَّ اجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ''

اور مجھے اور میرے فرزندوں کو بتوں کی پرستش سے بچا۔(ابراھیم ۳۵)

(۳) ''رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ وَ ارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَشۡكُرُوۡنَ''

اے ہمارے پروردگار! میں اپنی اولاد کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک ایسے میدان میں آباد کر رہا ہوں جو کھیتی باڑی کے قابل نہیں ہے اے ہمارے پروردگار! تا کہ وہ نماز قائم کریں پس کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اوران کو پھلوں کی روزی دے تا کہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔ (ابراہیم آیت۔۳۷) بعدازاں جناب ابراہیم علیہ السلام تو شام روانہ ہوگئے اور جب ان کی چھوڑی ہوئی کھجوریں اور پانی ختم ہوگیا اور ماں بیٹا شدت پیاس سے بے چین ہوئے تو جناب ہاجرا پانی کی تلاش میں نکلیں اور کوہ صفا و مروہ کے درمیان دوڑیں اوران پہاڑوں پر چڑھیں تا کہ اپنے بیٹے کو دیکھیں ادھر جناب اسماعیل علیہ السلام نے ایڑیاں رگڑیں اور خداوند عالم نے چشمہ زمزم جاری فرمایا۔ اور پھر سب سے پہلے وہاں قبیلہ جرھم آ کر آباد ہوا جس میں جناب اسماعیل نے بڑے ہو کر شادی کی اور پھر یکے بعد دیگرے مختلف قبائل وہاں آ کر آباد ہوئے یہ واقعات مشہور ہیں اور خواص اور عوام سب کو معلوم ہیں چنانچہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی یہ سب دعائیں بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئیں آج وہاں شہر بھی آباد ہے وہ جائے امن بھی ہے دنیا جہاں کے وہاں تر و تازہ پھل بھی ملتے ہیں چنانچہ خود خداوند عالم نے اس دعا کی قبولیت کا تذکرہ سورہ قصص کی آیت ۵۷ میں بایں الفاظ فرمایا ہے کہ ''یُّجۡبٰۤی اِلَیۡهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیۡءٍ'' جس کی طرف ہر شے کے پھل لائے جاتے ہیں لطف یہ ہے کہ جناب خلیل نے یہ دعا نہیں فرمائی تھی کہ مکہ کی سرزمین گل و گلزار بن جائے اور کاشت کے قابل ہو جائے بلکہ یہ دعا کی تھی۔ کہ پھل فروٹ جہاں بھی پیدا ہوں۔ مگر یہاں بہر حال لائے جائیں اور پہنچ جائیں اس دعا کی قبولیت کا ''اثر عیاں راچہ بیان'' کا مصداق ہے کہ دنیا بھر کے نہ صرف ثمرات بلکہ کل مصنوعات وہاں بآسانی دستیاب ہیں۔ جناب ابراہیم علیہ

السلام کی وہ دعائیں جو تعمیر خانہ کعبہ کے بعد مانگی گئیں:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا......الآیة

جناب خلیل علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کی وہ دعائیں جو انہوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہو کر اجرت وصول کرنے کے وقت بارگاہ خداوندی سے بڑے عجز و نیاز کے ساتھ مانگی تھیں وہ یہ ہیں

(۱) رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اے ہمارے پروردگار ہماری یہ خدمت ضرور قبول فرما بے شک تو سمیع و علیم ہے۔

وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ......الآیة

(۲) ہمیں اپنا حقیقی مسلمان (فرمانبردار بندہ) بنائے رکھ۔

وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً......الآیة

(۳) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت مسلمہ (فرمانبردار جماعت) قرار دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندے صرف اپنی دنیا سنوارنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ انہیں اپنی اولاد کے ساتھ اتنی محبت ہوتی ہے کہ ان کی عاقبت سدھارنے کی بھی پوری کد و کاوش کرتے ہیں۔

وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا...الآیة۔

(۴) ہمیں ہمارے اعمال حج اور مقامات حج سکھا۔ مناسک منسک کی جمع ہے جو اگرچہ لغوی طور پر ہر عبادت کی شامل ہے مگر اصطلاحی طور پر اعمال حج کو مناسک کہا جاتا ہے چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے خذو اعنی مناسککم (مجھ سے اپنی حج کے مناسک لے لو)۔

(۵) وَ تُبْ عَلَيْنَا۔ اور ہماری توبہ قبول فرما یعنی ہمارے حال پر خصوصی توجہ فرما اور اپنی رأفت ورحمت سے ہماری طرف رجوع فرما۔

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا......الآیة

(۶) اے ہمارے پروردگار اس امت مسلمہ میں خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر بھیج جو تیری آیتوں کو پڑھ کر سنائے، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ اور ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے۔ ان دعاؤں میں سے یہی اہم دعا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد خلیل علیہ السلام اور اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے ہمیشہ ایک ایسی امت مسلمہ موجود رہنی چاہیے جس کا اسلام فطری اور حقیقی ہو اور پھر اسی خاص امت مسلمہ میں سے ایک عظیم الشان

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مبعوث ہونا چاہیے۔

وہ امت مسلمہ کون ہے؟:

اب غور طلب بات یہ ہے کہ وہ امت مسلمہ کون ہے؟ جو اولاد خلیل علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام میں سے ہے؟ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس سے مراد بنی ہاشم ہیں۔(البرہان۔مجمع البیان)۔ظاہر ہے کہ اس امت مسلمہ سے وہ لوگ مراد نہیں ہو سکتے ہیں جن کی طرف آپؐ مبعوث کئے گئے۔ اور نہ ہی وہ لوگ مراد ہو سکتے ہیں جو آپ پر ایمان لائے۔ بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن میں سے آپ مبعوث ہوئے اور واضح ہے کہ وہ بنی ہاشم ہی ہیں تو ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان پیغمبر سے سرکار ختمی مرتبت ہی مراد ہیں جو جناب اسماعیل علیہ السلام کی ذریت سے پہلے اور آخری رسول اعظم ہیں۔

پیغمبر اسلام کے آباء واجداد حقیقی مسلمان تھے

مذہب شیعہ خیر البریہ کا یہ نظریہ ہے کہ انبیاء وائمہ کے آباء وامہات جناب آدم علیہ السلام تک موحد ومسلمان ہوتے ہیں اس تمام قرآنی واقعہ اور جناب خلیل علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام دعا و استدعا سے نیز بہت سے دوسرے دلائل سے یہ حقیقت واضح وآشکار ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعلی علیہ السلام کے آباء واجداد فطرتی، حقیقی اور نبوی اسلام کے ساتھ مسلمان تھے اور اگر اس امت مسلمہ کے اسلام اور بالخصوص اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین شریفین کے اسلام کا انکار کیا جائے تو اس سے جہاں قرآن کا انکار لازم آتا ہے وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا بھی انکار لازم آتا ہے۔وذلک ھو الکفر المبین۔ انہی حقائق کی بنا پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

انا دعوۃ ابی ابراھیم و بشارۃ عیسیٰ علیھم السلام

میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔(مجمع البیان) چنانچہ اس دعا کی قبولیت کا تذکرہ کئی مقامات پر قرآن مجید میں کیا گیا ہے: كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ (بقرہ آیت۔۱۵۱)

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (آل عمران

آیت۔۔۱۶۴)

الحمد لله الذی جعلنا من امة محمد صلی الله علیه و آله و سلم و لم یجعلنا من سائر الامم۔

آیات القرآن

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

ترجمۃ الآیات

اورکون ہے جو ابراہیم کی ملت (و مذہب) سے روگردانی کرے سوا اس کے جو اپنے کو احمق بنائے اور ہم نے انہیں دنیا میں منتخب کیا اور آخرت میں بھی ان کا شمار نیکو کاروں میں ہوگا۔ (۱۳۰) (یہ انتخاب اس وقت ہوا) جب ان کے پروردگار نے ان سے فرمایا ''مسلم'' ہوجا (سرتسلیم جھکا کر فرمانبردار ہوجا)۔ تو انہوں نے کہا میں نے تمام جہانوں کے رب کے سامنے سر جھکا دیا (۱۳۱)۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اسی (ملت پر قائم رہنے) کی وصیت کی اور یعقوب علیہ السلام نے بھی۔ اے میرے فرزندو! بے شک اللہ نے تمہارے لئے ایک خاص دین (اسلام) منتخب کیا ہے سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم (حقیقی) مسلمان ہو (۱۳۲) (اے یہود) کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ

السلام کی موت کا وقت آیا؟ اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا (پوچھا) کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا ہم آپ کے اور آپ کے آباء (واجداد) ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے واحد و یکتا معبود کی عبادت کریں گے اور ہم اسی کے مسلمان (فرمانبردار) ہیں۔ (۱۳۳)

تشریح الالفاظ

(۱) من یرغب یہ رغبت سے مشتق ہے جس کے معنی خواہش کرنا اور چاہنا ہیں مگر جب اس کا صلہ عن ہو تو پھر اس کے معنی روگردانی کرنے اور منہ پھیرنے کے ہوتے ہیں

(۲) ووصّٰی یہ توصیہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وصیت کرنا کسی کام کا عہد لینا اور کسی کام کا اشارہ کرنا۔

تفسیر الآیات

وَمَنْ یَّرْغَبُ......الآیة

ملت ابراہیمی کا دوسرا نام اسلام ہے جو دین فطرت ہے جس کے اصول اور فروع عبادات و معاملات اور تمدنیات و اخلاقیات وغیرہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں جس کا کوئی سلیم الفطرت انسان انکار نہیں کرسکتا تو پھر ظاہر ہے کہ اس دین فطرت سے روگردانی وہی شخص کرے گا۔ جس کی انسانی فطرت مسخ ہوگئی ہوگی۔ اور وہ بے وقوف اور احمق ہوگا۔ اسی لئے خدا فرماتا ہے:

''وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ''

کہ جو شخص دین اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اس کا دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور اسے آخرت میں نقصان اٹھانا پڑے گا (سورہ آلِ عمران آیت۔ ۸۵)۔

وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهِیْمُ......الآیة

اسی حقیقی اور فطری اسلام کا تقاضا رب العالمین نے جناب خلیل علیہ السلام سے کیا تھا۔ اور اسی کا اقرار و اظہار آنجناب نے اپنے رب جلیل سے کیا تھا اور اسی کی وصیت جناب خلیلعلیہ السلام اور ان کے پوتے جناب

یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو کی تھی کہ اے میرے فرزندو! اللہ نے تمہارے لئے یہ مخصوص دین اسلام منتخب کیا ہے لہٰذا تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم حقیقی مسلمان ہو چنانچہ آپ کے بعد اب یہ شرف امت محمدیہ کو حاصل ہے کہ اس کا نام امت مسلمہ رکھا گیا ارشاد قدرت ہے:

''مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ لا ه مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا'' یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی ملت ہے (اس پر قائم رہو) اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے اس سے پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی۔ (سورہ حج آیت۔۷۸)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی رائے، اپنی خواہش اور اپنی پسند کو نظر انداز کر کے خدا کے سامنے سر جھکانے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کا نام ہے جو عمل وکردار سے ثابت ہوتا ہے نہ کہ گفتار سے مگر آج ہم مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ

وضع میں ہم ہیں نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اسی بنا پر قرآن واضح کرتا ہے:

''وَ رَبِّكَ لا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا'' تیرے پروردگار کی قسم یہ لوگ اس وقت تک ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام نزاعات میں آپؐ کو اپنا حاکم تسلیم نہ کریں اور پھر آپؐ جو فیصلہ کر دیں اس سے دل میں بھی کبھی کوئی کوفت محسوس نہ کریں بلکہ اس طرح تسلیم کریں جس طرح تسلیم کرنے کا حق ہے۔ (سورہ نساء آیت۔۶۵)

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ...الآية

کیا تم لوگ اس وقت موجود تھے جب جناب یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا اور انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ ''قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا'' انہوں نے کہا کہ ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے آباء (باپ دادا) ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاق کے خدا کی جو معبود واحد ہے اور ہم اسی کے حقیقی مسلمان (فرمانبردار) ہیں۔ (سورہ بقرہ آیت۔۱۳۳)

جناب یعقوب علیہ السلام جن کا لقب اسرائیل ہے اور اسی وجہ سے یہود و نصاریٰ بنی اسرائیل کہلاتے ہیں۔ یہ جناب اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے۔ بنا بریں جناب ابراہیم علیہ السلام

،اسحاقعلیہ السلام تو اولاد یعقوبعلیہ السلام کے آباء و اجداد ہیں مگر جناب اسماعیلعلیہ السلام جو کہ جناب یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے ان کو آبا کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چچا کو بھی باپ کہا جا سکتا ہے۔تو اگر جناب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آزر کو باپ کہہ دیا تو اس سے کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی جبکہ مورخین کا اتفاق ہے کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد ماجد کا نام تارخ تھا جو مؤحد تھے (تفسیر رازی وتفسیر مظہری وغیرہ)۔

آیات القرآن

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

ترجمۃ الآیات

یہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم کماؤ گے اور وہ جو کچھ کرتے تھے اس کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ نہیں ہوگی (۱۳۴) اور وہ (یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی تاکہ ہدایت پا جاؤ۔ (اے رسول) کہہ دیجئے کہ (نہیں) بلکہ ہم ابراہیم کی ملت پر ہیں جو نرے کھرے موحد تھے اور

مشرکوں میں سے نہیں تھے (۱۳۵) (مسلما نو) کہو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر۔ اور اس (قرآن) پر جو ہماری طرف نازل ہوا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ اسماعیل اسحاق، یعقوب اور اسباطؑ پر اتارا گیا اور ہم ان (سب کے برحق ہونے میں اور ان پر ایمان لانے) میں کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اس (اللہ) کے مسلمان (فرمانبردار) ہیں۔ (۱۳۶) تو اگر یہ لوگ (اہل کتاب) اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو ہدایت پا گئے اور اگر روگردانی کریں تو وہ بڑی مخالفت اور ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں سو ان کے مقابلہ میں اللہ تمہارے لئے کافی ہے اور وہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔ (۱۳۷)

تشریح الالفاظ

(۱) قد خلت — یہ خلو اور خلاء سے مشتق ہے جس کے ایک معنی خالی ہونے کے ہیں اور دوسرے معنی گزر جانے کے ہیں

(۲) حنیفًا — حنیف کے معنی ہیں سیدھا، اسلامی احکام پر عمل پیرا ملتِ ابراہیمی پر قائم اور موحد

تفسیر الآیات

تِلْكَ اُمَّةٌ...الآیۃ

یہود و نصاری کو اولاد ابراہیم ہونے پر بڑا فخر تھا اور وہ اپنے آباء واجداد سے رشتے جوڑ کر مطمئن ہو جاتے تھے اور اسی اضافی وصف کو اپنے لئے سرمایہ نجات تصور کرتے تھے۔ خداوند عالم نے اس آیت کریمہ میں واضح فرمایا ہے کہ باپ دادا کے نیک اعمال اولاد کے لئے ذریعہ نجات نہیں ہیں جس طرح کہ ان کے برے اعمال اولاد کیلئے ذریعہ عذاب نہیں ہیں۔ جب تک آدمی کا اپنا ذاتی عقیدہ و عمل درست نہ ہو صرف عظیم المرتبت آباؤ اجداد کی طرف انتساب کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ''اسی سے مسلمانوں کو بھی سبق لینے کی ضرورت ہے جو صرف بزرگان دین کی طرف انتساب کو ذریعہ نجات خیال کرتے ہیں اور ان کے اتباع اور عملی پیروی کی اہمیت کا احساس نہیں کرتے کیونکہ اصول بہرحال اصول ہے وہ من و تو کی تفریق کی گنجائش نہیں رکھتا وہ اگر یہود کیلئے تھا تو مسلمانوں کیلئے بھی اسے ماننا لازم ہے'' (فصل الخطاب)

اور اس میں بڑا سبق آج کل پیرزادوں اور رسمی مشائخ زادوں اور بہت سے بدعتی فرقوں کیلئے موجود

ہے جو بلاسعی محض بزرگوں کی نسبت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہوتے ہیں اور اسی کو جنت میں جانے کے لئے کافی وافی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی جڑ ہی اسلام نے کاٹ دی ہے۔(تفسیر ماجدی)۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا......الآیۃ

یہود جناب موسیٰ علیہ السلام کو مانتے تھے مگر جناب عیسیٰ علیہ السلام کے منکر تھے اور عیسائی جناب عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے تھے مگر ہمارے رسول کے منکر تھے پھر یہ دونوں جناب اسحاق۔ کی عظمت کے تو قائل تھے مگر جناب اسماعیل علیہ السلام کو یکسر نظر انداز کر دیتے تھے۔ اور اس طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر انبیاء میں تفریق کے جرم کا ارتکاب کرتے تھے۔ ان کے بالمقابل خداوند عالم اہل اسلام کو یہ تعلیم دے رہا ہے۔ کہ تم کہو کہ ہم خدا پر اس کی تمام کتابوں پر اور اسکے تمام نبیوں پر ایمان لائے ہیں اور ہم کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم خدا کے فرمانبردار بندے ہیں۔ یہاں بڑے اختصار کے ساتھ دو باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔ ایک یہ کہ اسباط سے مراد وہ انبیاء ہیں جو اولاد یعقوب میں سے ہوئے ہیں جیسے جناب داؤد' سلیمان اور زکریا ویحییٰ وامثالھم۔

دوسرے اس عدم تفریق سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کی تعظیم وتکریم کرنے اور ان پر ایمان لانے میں تفریق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کریں اس عدم تفریق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے باہمی مرتبہ ومقام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات تو بنص قرآن ''تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ''(سورہ بقرہ آیت۔۲۵۳) سے ثابت ہے لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ آدم کا مقام اور ہے اور نوح کی منزل اور۔ خلیل خدا کا مرتبہ اور ہے اور ذبیح اللہ کا درجہ اور۔ موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام کی آن اور ہے اور ہمارے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اور۔

آنچہ خو باں ہمہ دار ند تو تنہا داری

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ......الآیۃ

ایمان کا دعویٰ تو یہود ونصاریٰ سب کرتے تھے مگر خداوند عالم نے اصلی اور حقیقی ایمان کا نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کبار اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ایمان کو قرار دیا ہے کہ جس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط۔ نہ کسی بندہ کو خدا یا فرزند خدا کہا گیا ہے اور نہ خدا کو مخلوق کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ جسکے عقائد میں اعتدال ہے اعمال میں اعتدال ہے عبادات میں اعتدال ہے۔ معاملات میں اعتدال ہے اخلاقیات میں اعتدال ہے' تمدنیات میں اعتدال معاشیات میں اعتدال ہے اور سیاسیات میں اعتدال۔ اس میں کسی نبی کو ابن اللہ کہا گیا

ہے اور نہ کسی فرشتہ کو بنت اللہ کہا گیا ہے اس میں نہ غلو ہے نہ تقصیر۔ سو اگر وہ ایسا ایمان لائیں گے تو ہدایت پا جائینگے اور اگر اس سے روگردانی کریں گے تو وہ بڑی ہٹ دھرمی میں پڑ گئے۔ آیت کے آخر میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر وہ مخالفت و مخاصمت پر کمربستہ رہیں گے تو وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے کیونکہ اللہ ان کے مقابلہ میں تمہاری کفایت وحمایت کرے گا وھو نعم المولی و نعم النصیر۔

آیات القرآن

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

ترجمۃ الآیات

ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کیا ہے اور اللہ کے رنگ (دین اسلام) سے بہتر کس کا رنگ ہے اور ہم اسی کے عبادت گذار ہیں۔ (۱۳۸) (اے رسول) کہہ دیجئیے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے اور ہم تو اخلاص کے ساتھ اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ (۱۳۹) کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اسماعیل اسحاقؑ یعقوب اور اسباط یہودی تھے؟ آپ کہیئے کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی کوئی گواہی ہو جسے وہ چھپائے اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں

ہے۔(۱۴۰) یہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم کماؤ گے اور جو کچھ وہ کرتے تھے اس کے بارے میں تم سے پوچھ کچھ نہیں کی جائے گی۔(۱۴۱)

تشریح الالفاظ

(۱)صبغۃ اللہ صبغہ کے معنی ہیں رنگ، ملت، دین اور بپتسمہ کا رنگ

(۲)ممن کتم کتم اور کتمان سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کو پوشیدہ کرنے اور چھپانے کے ہیں

تفسیر الآیات

صِبْغَةَ اللهِ... الآیۃ

یہود کے ہاں رواج تھا کہ جب کوئی آدمی ان کا دین اختیار کرتا تو اسے رنگدار پانی سے غسل دیتے تھے۔ پھر عیسائیوں نے بھی یہی رسم اختیار کی۔ اور ان کے ہاں جب کوئی بچہ متولد ہوتا تھا تو اسے زرد رنگ کے پانی سے غسل دیتے تھے جسے اصطباغ تعمید یا بپتسمہ کہا جاتا تھا۔ اس طرح وہ خیال کرتے تھے کہ اب اس پر دین کا رنگ چڑھ گیا اور یہ شخص اب مذہب میں پکا ہو گیا۔ بعض تاریخی شواہد کے مطابق جب تک کوئی بچہ اس منزل سے گزر نہ جاتا تھا اس وقت تک اسے عیسائی تصور نہیں کیا جاتا تھا اور اسے عیسائیوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے بالمقابل خداوند عالم مسلمانوں کو یہ تعلیم دے رہا ہے کہ تم کہو کہ ہم نے اللہ کے رنگ یعنی اسلام کو اختیار کر لیا ہے۔ اور ہم اس کے پکے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ہمیں کسی مصنوعی اور ایسے کچّے رنگ کی ضرورت نہیں ہے جو پانی سے دھل جائے یا دھوپ سے اڑ جائے اور بھلا اللہ کے رنگ یعنی دین فطرت سے کس کا رنگ بہتر ہے؟ جو ظاہری نجاست اور باطنی کثافت سے طہارت اور پاکی کا ضامن ہے اور جو اس رنگ میں رنگا جائے اس پر کوئی اور رنگ نہیں چڑھ سکتا جس طرح بلاتشبیہہ ہر رنگ پر دوسرا رنگ چڑھ سکتا ہے مگر سیاہ رنگ پر کوئی رنگ نہیں چڑھ سکتا بالکل اسی طرح ہر دین و مذہب پر دوسرے دین و مذہب کا رنگ چڑھ سکتا ہے مگر دین اسلام پر کسی اور دین و مذہب کا رنگ نہیں چڑھ سکتا اس لئے ہم صرف اللہ کے عبادت گزار ہیں یعنی کسی اور کی عبادت نہیں کر سکتے کیونکہ

ما سو اللہ را مسلمان بندہ نیست

پیش فرعو نے سرش افگندہ نیست

مخفی نہ رہے کہ اس میں یہ راز بھی مضمر ہے کہ جس طرح رنگ نظر آتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے چہرہ ومہرہ پر اور اس کے جسم و جان پر بھی اسلام کے علائم و آثار نظر آتے ہیں **سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود**۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔ صبغۃ اللّٰہ سے مراد دین اسلام ہے۔ (صافی)

قُلۡ اَتُحَآجُّوۡنَنَا......الآیۃ

کیا تم (اللہ کے بارے میں بھی ہم سے تکرار کرتے ہو۔ یہود نے خدا کو بھی اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا کہ وہ صرف ہمارا رب ہے اور ہم اس کے چہیتے ہیں اس کے بالمقابل مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ خدا کسی خاص قوم وقبیلہ یا کسی خاص اہل زمان و مکان کا خدا نہیں ہے بلکہ وہ ہمارا اور تمہارا سب کا خدا ہے کیونکہ وہ رب العالمین ہے۔ بعینہ وہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اور ''الخلق عیال اللّٰہ'' تمام مخلوق اس کی عیال ہے۔ اس سے اسلام کے ہمہ گیر پیغام کا درس ملتا ہے اور عالمی تنظیم کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارا رب ہے تو رب العالمین، ہمارا نبی ہے تو رحمۃ للعالمین اور ہمارا ولی ووصی ہے۔

تو ''**ھدی للعالمین**'' آیت کے آخری جزء سے محاسبہ نفس اور دوسروں پر تنقید کرنے کی بجائے اپنی ذات کی اصلاح کرنے کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ دوسروں کی عیب جوئی کرنے اور ان کی برائیوں پر نگاہ کر کے ان کی گلہ گوئی کرنے کی بجائے اپنے عیوب اور اپنی برائیوں پر نظر کرے اور پھر ان کی اصلاح کرے۔ حدیث میں وارد ہے کہ: ''خوش نصیب ہے وہ شخص جو اپنے عیبوں کی تلاش اور ان کی اصلاح میں اس طرح مصروف رہے کہ اسے دوسروں پر نکتہ چینی کا وقت ہی نہ ملے''۔ جب ایسا کرے گا تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

وَمَنۡ اَظۡلَمُ......الآیۃ

اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو کسی گواہی کو جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے چھپائے۔ وہ دین کے بارے میں ہو یا دنیا کے بارے میں پیغمبر اسلام کی علامات کے بارے میں ہو۔ یا اسلام کی صداقت کے

بارے میں؟ بہر حال گواہی پوشیدہ کرنا اور اسے چھپانا ظلم اور گناہ کبیرہ ہے ارشاد قدرت ہے:
''وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ'' گواہی نہ چھپاؤ اور جو اسے چھپائے گا اس کا دل گنہگار سمجھا جائے گا۔(سورہ بقرہ آیت۔ ۲۸۳) اور اس کا اظہار کرنا اور ادا کرنا واجب ہے۔ خداوندعالم نے اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ ''هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ'' (سورہ معارج آیت۔ ۳۳)

کہ اہل ایمان اپنی شہادتوں پر قائم اور ثابت قدم رہتے ہیں۔ انہیں کوئی طمع ولالچ یا کسی قسم کا کوئی خوف وہراس شہادت کے ادا کرنے سے روک نہیں سکتا اور انہیں کتمان شہادت پر آمادہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی

تِلْكَ اُمَّةٌ......الآیة

یہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی۔ یہ آیت اور اسکی تفسیر ابھی اوپر بذیل آیت نمبر ۱۳۴ گذر چکی ہے اس میں ایک بار پھر اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ نجات اخروی کیلئے بزرگان دین کی طرف صرف نسبی یا سببی انتساب کافی نہیں ہے بلکہ عقائد و اعمال میں اتحاد اور ہم آہنگی و یک رنگی کی اشد ضرورت ہے نیز اس آیت مبارکہ سے مستفاد ہوتا ہے کہ جب تک کوئی خاص عقلائی غرض وغایت داعی نہ ہو تب تک خواہ مخواہ گزشتگان کا ذکر چھیڑنا اور ان کے حالات و واقعات میں ٹانگ اڑانا اور ان کی وجہ سے نہ صرف باہم نزاع کرنا بلکہ جنگ وجدال اور قتل وقتال کرنا کوئی مستحسن اقدام یا کوئی قابل ستائش کام نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی بزرگ کے تذکرہ سے اور اس کی یا دمنانے سے اس کے اچھے کاموں وکارناموں میں اس کی تقلید و تاسی مطلوب ہو یا کسی برے شخص کا تذکرہ کر کے اس کی برائی اور اس کے بُرے کاموں سے اور اس کے فتنہ وشر سے خلق خدا کو ڈرانا اور اس سے بچانا مقصود ہو تو یہ اور بات ہے انما الاعمال بالنیات مگر یہاں بڑے حزم واحتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ۔ے

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

آیات القرآن

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا

عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى
النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ
الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى
عَقِبَيْهِ ۗ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى
تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ
وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۗ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ترجمۃ الآیات

عنقریب بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو کس چیز نے رُوگردان کر دیا۔ اس قبلہ (بیت المقدس) سے، جس پر وہ پہلے تھے (اے پیغمبر) کہ دیجئے اللہ ہی کے لیے ہے مشرق اور مغرب بھی۔ وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے (اس پر لگا دیتا ہے) (۱۴۲) (مسلمانو! جس طرح ہم نے تم کو صحیح قبلہ بتا دیا ہے) اسی طرح ہم نے تم کو ایک درمیانی (میانہ رو) امت بنایا ہے تاکہ تم عام لوگوں پر گواہ ہو اور پیغمبر تم پر گواہ ہوں اور تم پہلے جس قبلہ پر تھے، ہم نے اسے صرف اسی لیے قبلہ بنایا تھا کہ ہم جان لیں کہ رسول کی پیروی کون کرتا ہے، اور کون پچھلے پاؤں پلٹ جاتا ہے اگرچہ یہ (تحویل قبلہ) ان لوگوں کے سوا، جنہیں اللہ نے خاص ہدایت دی ہے اور سب پر بہت گراں تھی۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت اور بڑا رحم کرنے والا

ہے۔(۱۴۳)(اے رسول!تحویل قبلہ کی خاطر) تیرا بار بار آسمان کی طرف منہ کرنا ہم دیکھ رہے ہیں تو ضرور اب ہم تمہیں موڑ دیں گے اس قبلہ کی طرف جو تمہیں پسند ہے بس اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف موڑ دیجئے اور (اے اہل ایمان) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے منہ (نماز پڑھتے وقت) اسی طرف کیا کرو۔ جن لوگوں کو (آسمانی) کتاب (تورات وغیرہ) دی گئی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ (تحویل قبلہ کا فیصلہ) ان کے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہ حق ہے اور جو کچھ (یہ لوگ) کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔(۱۴۴)

تشریح الالفاظ

(۱) ماولّٰھم ولّٰی کا صلہ جب عن ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں اعراض کرنا یعنی منہ پھیرنا

(۲) علی عقبیہ عَقب اور عَقِب کے معنی ہیں ایڑی، بیٹا اور پوتا۔ اس کی جمع اعقاب ہے

(۳) تقلب وجھك تقلب کے معنی ہیں رُخ تبدیل کرنا اور مڑ جانا

تفسیر الآیات

تحویل قبلہ کا بیان

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ......الآیۃ

کتب تاریخ، تفسیر اور حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں اور ہجرت کے بعد باختلاف روایات واقوال سات ماہ، سولہ ماہ یا انیس ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جو کہ روز اول سے یہود کا قبلہ تھا اور وہ مسلمانوں پر برابر طعن وتشنیع کرتے رہتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی قبلہ نہیں ہے البتہ فریقین کی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں تھے تو بیت المقدس کی طرف اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ خانہ کعبہ کی طرف بھی رخ ہو جاتا تھا۔ مگر مدینہ پہنچ کر ایسا ممکن نہ رہا کیونکہ سمتیں الگ الگ ہو گئی تھیں۔

قرآن مجید کی آیات اور تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل یقیناً یہ چاہتا تھا کہ کعبہ ان کا قبلہ ہو۔ مگر جب تک صراحتاً وحی نازل نہیں ہوئی اس وقت تک کعبہ کو قبلہ نہیں بنایا۔ بلکہ

برابر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے ظاہر ہے کہ جب عمل حکم الٰہی پر ہے تو بہ حیثیت بشر کوئی خواہش کرنا شان نبوت یا مقام عصمت کی منافی نہیں ہے۔

الغرض! ہجرت نبوی کے بعد جب اسلام قدرے مستحکم ہو گیا تو بنا بر مشہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز ظہر پڑھا رہے تھے۔(اور بروایتے نماز صبح) کہ دو رکعت کے بعد عین حالت نماز میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا کہ باقی دو رکعتیں کعبہ کی طرف رخ کر کے مکمل کی جائیں چنانچہ جس مسجد میں یہ واقعہ پیش آیا اسے مسجد ذو القبلتین کہا جاتا ہے۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ احکام میں تبدیلی پشیمانی کی وجہ سے آتی ہے ان کے لئے چہ مہ گوئیوں کا دروازہ کھل گیا کہ پہلے دن سے ہی کعبہ کو قبلہ کیوں نہ بنایا گیا؟ پہلے یہود کے قبلہ کی طرف منہ کر کے کیوں نماز پڑھی گئی............؟ مگر اہل دانش وبینش جانتے ہیں کہ یہ تغیر وتبدل خواہ تشریع سے متعلق ہو جسے نسخ کہا جاتا ہے یا تقدیر وتکوین سے متعلق ہو جسے بداء کہا جاتا ہے یہ پشیمانی کی وجہ سے واقع نہیں ہوتا۔ بلکہ حالات وواقعات کے بدلنے اور حکمت ومصلحت کے بدل جانے کے سبب سے ہوتا ہے جو عین مقتضائے حکمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے حکیم نے اس پر اعتراض کرنے والوں کی سفیہ اور احمق قرار دیا ہے۔

تحویل قبلہ کی غرض وغایت

بہر حال خداوند عالم نے اس تبدیلی قبلہ کی غرض وغایت لوگوں کے ایمان کا امتحان لینا قرار دی ہے کہ کون رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتا ہے اور کون اپنے پچھلے پاؤں پلٹتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ مشرق و مغرب جو دو بڑی سمتیں ہیں، وہ بھی بلکہ تمام جہات اللہ ہی کی ہیں اور کسی میں کوئی ذاتی تقدس اور خصوصیت نہیں ہے بلکہ اصل اور بنیاد تو اللہ کا حکم ہے وبس۔۔۔اور یہ بھی واضح ہے کہ کسی خاص جگہ کو قبلہ مقرر کرنا مرکزیت قائم کرنے کے لیے ہے، ورنہ خدا تو جسم وجسمانیت سے منزہ ومبرا ہے (وھوالمروی عن آئمۃ اھل البیت علیھم السلام ہے (مجمع البیان) مخفی رہے کہ یہ حکم ۲ھ میں نازل ہوا۔

امت وسط کی وضاحت:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً......الآیة

امت وسط کا مطلب ہے بہترین امت۔ کیونکہ یہ حقیقت کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ ہر چیز کا درمیانی حصہ ہی اس کا اعلیٰ حصہ ہوتا ہے مثلاً انسان کی زندگی کا درمیانی حصہ، جو کہ عہد شباب کہلاتا ہے۔ زندگی کا

بہترین حصہ ہے۔ دن کا درمیانی حصہ دوپہر ہے جس میں روشنی اپنے نقط ارتقاء پر ہوتی ہے اسی طرح اخلاق میں میانہ روی ہی قابل ستائش ہوتی ہے اور افراط وتفریط دونوں پہلو مذموم ہوتے ہیں۔ جیسے بخل اور اسراف کے درمیانی حالت کا نام سخاوت ہے بزدلی اور طیش کی درمیانی حالت کا نام شجاعت ہے وعلی ھذا القیاس۔

اسی بنا پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ خیر الامور اوساطھا۔ خداوند عالم نے امت محمدیہ کو اس عظیم الشان خطاب سے نوازا ہے کیونکہ ان کے اخلاق، احکام، سیاست اور تہذیب وتمدن غرض کہ پورے نظام شریعت میں نہ افراط ہے نہ تفریط بلکہ پورا اعتدال وتوازن پایا جاتا ہے۔ ہماری متعدد احادیث میں وارد ہے کہ امت وسط سے عام افراد امت مراد نہیں ہیں بلکہ کچھ مخصوص ہستیاں مراد ہیں بھلا جن لوگوں کی دنیا میں ایک صاع کھجور پر گواہی قبول نہیں ہوتی وہ آخرت میں لوگوں کے اعمال کے کس طرح گواہ بن سکتے ہیں بنابرایں اس کے حقیقی مصداق ائمہ اہل بیت علیہم السلام ہیں۔ ''نحن الامۃ الوسطی ونحن شھداء اللہ علی خلقہٖ وحجتہ فی ارضہ'' امت وسط ہم ہیں خدا کی مخلوق پر گواہ ہم ہیں اور زمین خدا میں حجت خدا ہم ہیں۔ (الکافی، بصائر درجات، تفسیر برھان، تفسیر صافی، نور الثقلین وسابع بحار الانوار وغیرہ) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا: ''الینا یرجع الغالی وبنا یلحق المقصر'' غالی ہماری طرف پلٹ کر رجوع کرتے ہیں اور مقصر ترقی کر کے ہم سے ملحق ہوتے ہیں۔ (مجمع البیان)

ایک غلط استدلال کا ابطال

یہاں اس بات کی وضاحت بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے کہ بموجب کلمۃ حق یراد بھا الباطل۔ بعض وہ بدعقیدہ لوگ جو خدا کی طرح آئمہ اہل بیت علیہم السلام کو بھی ہر وقت اور ہر جگہ حاضر وناظر جانتے ہیں وہ اپنے اس خلاف عقل ونقل بدعقیدہ کی تائید میں بڑے شدومد کیساتھ یہ آیت مبارکہ پیش کیا کرتے ہیں کہ گواہ وہ ہوتا ہے جو کسی واقعہ کا چشم دید گواہ ہو۔ اس کا جواب واضح ہے کہ گواہ کیلئے اصل واقعہ کے وقت موجود ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اصل واقعہ کے متعلق اس کا علم ویقین ضروری ہے خواہ جس ذریعہ سے ہو۔ لغت عرب میں شاہد وشہید میں کوئی فرق نہیں ہے، ہر دو الفاظ کا مصدر شہود اور حاصل مصدر شہادت ہے اور شہادت کے معنی کتب لغات القرآن والحدیث میں خبر قاطع کے لکھے ہیں ملاحظہ ہو (لسان العرب، قاموس، المنجد وغیرہ)

شرح صحیفہ کاملہ موسوم بہ ریاض السالکین صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے:

''کل من عرف حال شخص فلہ ان یشھد علیہ فان الشھادۃ خبر قاطع'' یعنی جو شخص کسی کے حالات سے آگاہ ہو اس کے متعلق گواہی دے سکتا ہے کیونکہ شہادت قطعی خبر کا نام ہے

اور چونکہ متعدد روایات میں وارد رہے کہ کراماً کاتبین جو کچھ بندوں کی ڈائری لکھتے ہیں اسے بارگاہ خدا میں پیش کرنے سے پہلے نبی وامام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ہمارے اچھے یا برے اعمال پر مطلع ہوتے ہیں اسی علم ویقین کی بنا پر وہ ہمارے متعلق گواہی دے سکتے ہیں تو گویا شہید بمعنی مطلع ہے کیونکہ شہادت کی لفظ علم واطلاع کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ......الآية

بعض حضرات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جو مسلمان تحویل قبلہ کے وقت سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور انتقال کر گئے ان کی نمازوں کا کیا بنے گا؟ تو خداوند عالم نے ان کی تسلی کی خاطر فرمایا کہ جب وہ خدا کے حکم کے مطابق پڑھی گئیں تو ان کے ضائع ہونے کا کیا اندیشہ؟ خدا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو اکارت کرے مخفی نہ رہے کہ خداوند متعال نے اس آیت میں نماز کو ایمان قرار دیا ہے جو کہ نماز کی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ......الآية

کچھ یہودیوں کے طعن وتشنیع کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ کعبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدامجد حضرت خلیل علیہ السلام کا بنایا ہوا تھا اور ان کا قبلہ بھی نیز عربوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا موثر ذریعہ بھی یا دیگر وجوہ جو نگاہ نبوت میں تھیں۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دلی تمنا تھی کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے اس لیے چشم امید بار بار در رحمت کی طرف اٹھتی تھی۔ بقول از ہری ''اللہ کو اپنے محبوب کی یہ ادا اتنی پیاری اور اس کی خوشنودی اتنی مطلوب تھی کہ اس آیت میں اعلان فرما دیا کہ اے محبوب! جو قبلہ تمہیں پسند ہے وہی ہمیں پسند ہے اور تیری خوشی کے لئے ہم کعبہ کو قبلہ مقرر فرماتے ہیں۔'' (ضیاء القرآن)

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ......الآية

مسجد حرام سے عموماً وہ وسیع احاطہ مراد ہوتا ہے جس میں خانہ کعبہ ہے یہ احاطہ کوئی دوسو پچاس قدم لمبا اور دوسو قدم چوڑا ہے اور خانہ کعبہ اس کے وسط میں واقع ہے جو اٹھارہ قدم لمبا اور چودہ قدم چوڑا ہے اس کے شمال مشرقی کونہ پر حجر اسود ہے ہاں! کبھی مسجد حرام کا اطلاق کل حرم پر بھی کر دیا جاتا ہے۔ جس کے اندر تمام مکہ معظّمہ اور منیٰ وعرفات وغیرہ واقع ہیں اور جس کے اندر جنگ کرنا' ہتھیار اٹھانا' شکار کھیلنا' بلکہ گھاس وغیرہ تک کا کاٹنا ممنوع ہے یہاں مسجد حرام کو قبلہ قرار دیا گیا ہے تو یا تو اس سے مراد کعبہ ہی ہے جیسا کہ اکثر فقہاء کا قول ہے کہ اصل

قبلہ تمام مسلمانوں کا کعبہ ہی ہے اور یا یہ کہ مسجد حرام کو بہ معنی حرم لے کر ان لوگوں کے لحاظ سے قبلہ قرار دیا گیا ہے، جو مکہ معظّمہ سے باہر ہیں جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ کعبہ قبلہ ہے ان کے لئے جو مسجد کے اندر ہوں اور حرم قبلہ ہے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے۔ (تفسیر فصل الخطاب، بحوالہ الاء الرحمن بلاغی و مجمع البیان طبرسی)

آیات القرآن

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۣ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

ترجمۃ الآیات

اور اگر آپ اہل کتاب کے سامنے سارے معجزے (دنیا جہان کے سارے دلائل) پیش کر دیں تب بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ ہی آپ ان کے قبلہ کی پیروی کریں گے اور وہ خود بھی ایک دوسرے کے قبلہ کو نہ مانتے ہیں اور نہ پیروی کرتے ہیں اور اس علم کے بعد جو (منجانب اللہ) تمہارے پاس آچکا ہے اگر ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرو گے تو تمہارا شمار ظالموں (حد سے تجاوز کرنے والوں میں ہو جائے گا۔ (۱۴۵) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات وغیرہ) دی ہے وہ اس (رسولؐ) کو اس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ (مگر اسکے باوجود) ان کا ایک گر

وہ جان بوجھ کر حق کو چھپا رہا ہے۔ (۱۴۶) (اے رسولؐ! تحویل قبلہ وغیرہ) برحق ہے اور تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے لہٰذا ہرگز شک وشبہ کرنے والوں یا جھگڑا کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔ (۱۴۷) اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ (نماز کے لئے) منہ کرتا ہے (اے مسلمانو! تم اس نزاع کو چھوڑ دو) پس تم بڑھ چڑھ کر نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔ تم جہاں بھی ہوگے اللہ تم سب کو (جزا وسزا کے لیے ایک جگہ) لے آئے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۴۸)

تشریح الالفاظ

(۱) اھوآرھم یہ ھویٰ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں خواہش نفس

(۲) من الممترین یہ امتراء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں شک کرنا اور جھگڑنا

(۳) وجھةٌ اس کے معنی ہیں جانب، گوشہ اور جس کی طرف توجہ ہو۔

تفسیر الآیات

وَلَئِنۡ اَتَیۡتَ...الآیۃ

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہایت آرزو تھی کہ مخالفین کو وادی ضلالت سے نکال کر جادہ حق پر چلائیں۔ خواہ معجزات دکھانے پڑیں یا دلائل دینے پڑیں۔ مگر خداوند عالم نے ان آیات میں واضح کیا ہے کہ اگر مخالف کی مخالفت کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہو تو اس کے دور ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن اگر یہ مخالفت محض تعصب، ہٹ دھرمی اور ذاتی عناد کی وجہ سے ہو تو پھر مفاہمت کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اور یہاں صورت حال کچھ اسی قسم کی ہے کہ وہ لوگ حق کو حق جانتے ہوئے بھی اُسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ارشاد قدرت ہے ''وَ لَنۡ تَرۡضٰی عَنۡكَ الۡیَهُوۡدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۲۰)۔ ''یہود ونصاریٰ اس وقت تک آپ سے خوش نہ ہوں گے جب تک آپ ان کا دین قبول نہ کر لیں۔'' جب وہ ذاتی بغض وعناد کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے اور آپ حق کو چھوڑ نہیں سکتے تو پھر مفاہمت کیسی اور اتحاد کیسا؟ آیات ومعجزات دکھانے کا اثر کیا؟ کیونکہ یہ چیزیں اُسے فائدہ دیتی ہیں جو کسی سبب کی وجہ سے انکار کرے اور بھلا ان کی آپ سے کب مفاھمت ہوگی جبکہ ان کا آپس میں بھی اتحاد نہیں ہے بلکہ اس قدر باہمی ضد و کد

ہے کہ وہ ایک دوسرے کا قبلہ ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ یہود صخرہ بیت المقدس کو اپنا قبلہ قرار دیتے ہیں۔ اور نصاریٰ بیت المقدس کے اس مکان شرقی کو جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نفخ روح واقع ہوئی تھی۔ (مجمع البیان۔ فتح البیان۔ المیز ان وغیرھا)

اور آیت کے آخر میں جو تہدید و وعید مذکور ہے اس میں خطاب گو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے مگر بموجب ''ایاك اعنی و اسمعی یا جارة ''اس سے مراد امت ہے کیونکہ عصمت کبریٰ کے مالک سے اس قسم کے گناہ کا صادر ہونا ممکن نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ... الآية

تورات وانجیل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق جن بشارات' علامات اور نشانات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں ایک علامت یہ بھی تھی کہ آخری نبی دوالقبلتین (دو قبلہ والا) ہوگا بنا بریں یہ تحویل قبلہ آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنی اولاد کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے۔ کہ جس طرح اپنی اولاد کو پہچاننے میں کوئی دقت اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی اشتباہ۔ بالکل اس طرح وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلا کسی شبہ واشتباہ کے یقینی طور پر جانتے' پہچانتے تھے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حالات میں ان کا انکار محض عناد وہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا۔

سزائے ایں چنیں دونان بجز دوزخ کجا باشد؟

ہاں بعض اخبار وآثار سے واضح وآشکار ہوتا ہے کہ ان احبار ورھبان میں سے کچھ لوگ ایمان لائے تھے۔ جیسے کعب الاحبار، عبد الله بن سلام وغیر هما۔ جو مشرف باسلام ہوئے۔ جب عبداللہ سے اس آیت مبارکہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا۔ میں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو فوراً پہچان لیا اور میری یہ پہچان اولاد کی پہچان سے اتم و اکمل ہے کیونکہ مجھے آسمانی بشارات وعلامات کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت میں کوئی شک نہیں۔ مگر اپنے بیٹے کے بارے میں ہوسکتا ہے کہ شاید اس کی ماں نے خیانت کی ہو۔ (تفسیر کاشف وغیرہ)

بعض اہل تفسیر نے ''یعر فو نه ''میں ''ہ'' کی ضمیر کا مرجع مقام قبلہ کو ٹھہرایا ہے جو کہ تعمیر خلیل ہے مطلب یہ ہے کہ علماء یہود ونصاریٰ اس حقیقت کو اس طرح جانتے پہچانتے تھے جس طرح کوئی آدمی اپنی اولاد کو جانتا پہچانتا ہے کہ کعبہ جناب ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ ہے جو کہ قدیم ہے۔ بخلاف بیت المقدس کے جو اس سے تیرہ سو سال بعد جناب سلیمان کا تعمیر کردہ ہے۔ والاشهر والاظهر الاول۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ......الآية

اس آیۂ مبارکہ میں گو خطاب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے مگر اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں جیسے آیت مبارکہ "لَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا"۔(ماں باپ کو اف تک نہ کہو اور نہ ہی ان کو جھڑکی دو۔سورہ بنی اسرائیل آیت۔۲۳) کہ یہاں بھی بظاہر خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے مگر مراد دوسرے لوگ ہیں (الاء الرحمن بلاغی۔مجمع البیان وغیرھما) یا جیسے آیت "يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ" اے نبی! جب عورتوں کو طلاق دو۔۔۔کہ بظاہر خطاب آنجناب کو ہے مگر مراد اور لوگ ہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ...الآية۔

"وجهه" کا مطلب ہے وہ چیز جدھر توجہ کی جائے ظاہر ہے کہ

ہر قوم را است راہے دینے و قبلہ گاہے

جیسا کہ ارشاد قدرت ہے "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا "(سورہ مائدہ آیت۔۴۸)۔یعنی ہم نے سب کے لئے (علیحدہ علیحدہ) شریعت اور راستہ مقرر کیا ہے۔جو اس کا شعار ہے مگر یہ چیز کسی بزرگی کا معیار نہیں ہے جسے تم موضوع سخن بنا کر اچھال رہے ہو۔بلکہ معیار فضلیت تقویٰ اور اعمال خیر ہیں اور اس بحث کو چھوڑ و اور اعمال خیر کے بجالانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ بلکہ دنیا جہان کی قوموں پر سبقت حاصل کرو۔کیونکہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

لہٰذا تم اپنی عاقبت سنوارنے' سدھارنے کی فکر کرو۔اور جب بھی کسی نیک کام کے کرنے کا موقع مل جائے' تو اس کے کرنے میں تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بلا وجہ کسی کار خیر میں تاخیر کرنے اور اسے ٹالنے کیوجہ سے توفیق ایزدی سلب ہوجاتی ہے پھر آدمی نیکی کا وہ کام کبھی کر ہی نہیں سکتا۔اسی لیے حکم ہے کہ "سارعوا الی مغفرة"۔کہ بخشش کے کام میں جلدی کرو۔

مخفی نہ رہے کہ نماز کو وقت فضلیت میں ادا کرنا بھی اسی مسابقت فی الخیرات (نیکی کے کاموں میں سبقت) میں شامل ہے واللہ الموفق۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا......الآية

تم جہاں بھی ہوگے اللہ تم سب کو (جزاوسزا کی خاطر) ایک جگہ لے جائے گا۔عام مفسرین نے اس

سے قیامت مراد لی ہے کہ جب خالق عادل جزا وسزا کے لیے لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہیے گا تو مشرق ومغرب کے فاصلے اور مکان وزمان کی حدود وقیود رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ کیونکہ وہ قادر مطلق ہے اور یہ سب فاصلے اس کے یکساں ہیں مگر بعض اخبار وآثار کے مطابق اس آیت مبارکہ میں حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہٗ کے ظہور اور زمانہ رجعت کی طرف اشارہ ہے جب قادر مطلق مختلف اقوام عالم کو اسلام کے غلبہ اور بعض بڑے مجرمین کو اخروی عذاب سے پہلے دینوی عذاب کا مزہ چکھانے کے لیے اکٹھا کرے گا۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

"واللہ لو قام قائمنا یجمع اللہ الیہ جمیع شیعتنا من جمیع البلدان "۔ جب ہمارے قائم آل محمدؑ قیام فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ تمام شہروں سے ہمارے شیعوں کو جمع کرے گا۔ (تفسیر نور الثقلین)

ظاہر قرآن کے لحاظ سے پہلے معنی اور باطن کے لحاظ سے دوسرے معنی میں کوئی منافات نہیں ہے۔

عجل اللہ فرجہ الشریف و جعلنا من اعوانہ و انصارہ۔

آیات القرآن

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾

ترجمۃ الآیات

اور (اے پیغمبرؐ) آپ جب بھی کہیں نکلیں تو (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد حرام کی طرف رکھیں۔ بے شک یہ (تبدیلی قبلہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل و بے خبر نہیں ہے (۱۴۹) اور آپ جب بھی کہیں نکلیں تو (نماز کے وقت) اپنا منہ مسجد حرام کی طرف ہی موڑیں اور (اے مسلمانو!) تم بھی جہاں کہیں ہو (نماز کے وقت) اپنے مونہوں کو اسی (مسجد حرام) کی طرف ہی کرلیا کرو (اس حکم کی بار بار تکرار سے ایک غرض یہ ہے کہ) تاکہ لوگوں (مخالفین) کو تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ ملے۔ سوا ان لوگوں کے لیے جو ظالم ہیں۔ (کہ ان کی زبان تو کسی طرح بھی بند نہیں ہوسکتی)۔ تو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو (دوسری غرض یہ ہے) کہ تم پر میری نعمت تام و تمام ہو جائے (اور تیسری غرض یہ ہے) کہ شاید تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔ (۱۵۰) (اے مسلمانو!) یہ تحویل قبلہ تم پر ایسا احسان ہے جس طرح ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا ہے۔ جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں (بدعقیدتی، بدعملی اور بداخلاقی کی نجاست و کثافت) سے پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ (۱۵۱)

تشریح الالفاظ

(۱) **فاستبقوا الخیرات** یہ استباق سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کے آگے بڑھنے میں مقابلہ کرنا

(۲) **شطر المسجد** شطر کے کئی معنی ہیں جیسے جزء، نصف کنارہ اور طرف اور یہاں یہی اخری معنی مراد ہیں۔

تفسیر الآیات

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ......الآية

اور آپ کہیں بھی نکلیں۔ یہ تکرار اس بات کی اہمیت کے پیش نظر تاکید پر محمول ہے ہاں دونوں آیات میں فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی آیت میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب تھے اور اب اس خطاب میں امّت بھی شامل ہوگئی ہے۔ اور اُسے حکم دیا جا رہا ہے کہ سفر ہو یا حضر، صحت ہو یا مرض، دور ہو یا نزدیک بہر حال نماز کی حالت میں تمہارا رُخ کعبۃ اللہ کی طرف ہونا چاہیے۔ ورنہ اہل کتاب کو حجت والزام دینے کا موقع ہاتھ آجائے گا کہ وہ کہیں گے کہ جس آخری نبی کی ہماری کتابوں میں بشارت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ذوالقبلتین ہوگا۔ مگر یہ اور اس کی امت تو صرف ایک (بیت المقدس) کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتی ہے دوسری طرف تو پڑھتی ہی نہیں ہے لہٰذا یہ وہ نبی آخر الزمان نہیں ہے اور مشرکوں کو یہ حجت کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔ کہ وہ کہیں گے کہ یہ لوگ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں مگر ان کے قبلہ کو قبلہ بھی نہیں سمجھتے۔ اس آیۂ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فریضہ میں روبقبلہ ہونا واجب ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً......الآية

مطلب یہ ہے کہ یہ تبدیلی قبلہ بھی اسی طرح خدائے دو جہان کا تم پر احسان ہے جس طرح وہ اس سے پہلے تم پر احسان فرما چکا ہے کہ ان صفات کا حامل نبی تمہاری جانب مبعوث فرمایا ہے، جو دعائے خلیل اور تمنائے اسماعیل۔ ہے یعنی یہ وہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کی بعثت کی دُعا تعمیر کعبہ کے وقت جناب خلیل علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام نے بایں الفاظ کی تھی۔ ''رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۲۹) خداوند عالم نے ان دو بزرگواروں کی دعا کی قبولیت کا تذکرہ قرآن مجید کے متعدد مقامات پر انہی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جن میں سے ایک یہی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ان کی دعا قبول ہوئی اور وہ آخری پیغمبر ان صفات سے متصف ہو کر تشریف فرما ہو گیا ہے جو۔ ''رسولاً منهم''۔ ''رسولاً منكم'' ۔ کا مصداق ہے نہ جنوں سے ہے نہ فرشتوں سے اور نہ کائنات عالم کی کسی اور نوع سے بلکہ وہ تمام انواع عالم سے افضل و اشرف نوع یعنی نوع انسانی کا فرد کامل و اکمل ہے۔ اور ''

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کا مصداق ہے

آیات القرآن

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا
تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا
تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ
اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ
عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ترجمۃ الآیات

پس تم مجھے یاد رکھو۔ میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو۔ اور میری ناشکری نہ کرو۔
(۱۵۲) اے ایمان والو! (مصیبت کے وقت) صبر اور نماز (کے ذریعے خدا) سے مدد لیا
کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (۱۵۳) اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی
راہ میں قتل کیے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں (ان کی زندگی کی حقیقت
کا) شعور (سمجھ) نہیں ہے۔ (۱۵۴) اور ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے خوف و خطر، اور کچھ
بھوک (و پیاس) اور کچھ مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصان کے ساتھ (یعنی ان میں سے کسی
نہ کسی چیز کے ساتھ)۔ (اے رسول) خوشخبری دے دو ان صبر کرنے والوں کو۔
(۱۵۵) جب بھی ان پر کوئی مصیبت آپڑے تو وہ کہتے ہیں بے شک ہم صرف اللہ ہی کے
لیے ہیں۔ اور اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔ (۱۵۶) یہی وہ (خوش نصیب) ہیں،
جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے درود (خاص عنایتیں اور نوازشیں) ہیں اور رحمت
ومہربانی ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ (۱۵۷) بیشک صفا و مروہ نامی دو پہاڑیاں اللہ

تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جوشخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ بجالائے' اس پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اِن دونوں کے درمیان چکر لگائے اور جو شخص برضا و رغبت کچھ (مزید) نیکی کرے تو اللہ تعالیٰ (نیکی کا) قدردان ہے اور خوب جاننے والا ہے (۱۵۸)

تشریح الالفاظ

(۱) ولا تکفرون   یہ کفران سے مشتق ہے جس کے معنی ناشکری کے ہیں جیسا کہ کفر کے معنی انکار کرنے اور ایمان کے خلاف عقیدہ رکھنے کے ہیں

(۲) ولنبونّکم   یہ بلو اور بلاء سے مشتق ہے جس کے معنی آزمانے اور امتحان لینے کے ہیں

(۳) من شعائر الله   یہ شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت

تفسیر الآیات

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ......الآية

تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا بندہ کا خدا کو یاد رکھنے کا مطلب ہے۔''اسکے فرائض کو ادا کرنا''۔ اور خدا کے بندہ کو یاد رکھنے کا مطلب ہے۔''اُسے اپنی نعمتوں سے نوازنا''۔

ذکر خدا کے اقسام اور ذکر خدا کا مفہوم

الغرض ذکر کی تین قسمیں ہیں۔(۱) لسانی۔(۲) قلبی۔(۳) جوارحی۔ لسانی میں تسبیح و تقدیس' ثناو تعریف' ذکر واذکار اور درود و استغفار وغیرہ داخل ہیں جن میں سے ایک تسبیح جناب سیدہ سلام اللہ علیہا بھی ہے۔

قلبی میں خدا کی عظمت و کبریائی اور قدرت میں غور کرنا' نیز اس کی نعمتوں کو یاد کرنا داخل ہے۔

اور ''جوارحی'' میں اعضاء و جوارح کو اس کی اطاعت وعبادت میں مشغول رکھنا شامل ہے شکر کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ہر عطا کردہ نعمت کو اُس مصرف میں صرف کرنا' جس کے لیے اس نے وہ نعمت عطا کی ہے۔ اور ''کفران'' سے مراد یہ ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمتوں کو اُس مصرف میں صرف نہ کیا جائے' جس کے لیے وہ دی گئی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ......الآية۔

مشکلات اور نا ملائم حالات کا مقابلہ کرنے اور دنیا میں کامیاب وکامران ہونے کے لیے اگر چہ دینوی اسباب ووسائل کا سہارا لینا عقلاً جائز ہے اور 'توکل علی اللہ'' کے منافی نہیں ہے۔ نص قرآنی ہے۔ ''لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى'' (سورہ نجم آیت۔۳۹) لیکن اگر کبھی ایسے مشکلات اور نا مساعد حالات در پیش ہوں کہ جن کے دفعیہ کے لیے مادی طاقت نا کافی ہو تو خدائے حکیم وعلیم نے اہل اسلام کو دو ایسے ہتھیار دیئے ہیں کہ اگر ان کے ذریعے حالات کا مقابلہ کیا جائے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ہر بلا ٹل جاتی ہے ''ایک صبر ہے اور دوسری نماز''۔ صبر داخلی قوت ہے اور نماز بیرونی طاقت ہے صبر کیا ہے؟ تمام تر مشکلات ومصائب کے باوجود پائے استقامت میں جنبش واقع نہ ہو۔

مشکلے نیست کہ آسان نشود
امامردے بایدکہ ہراساں نشود

نماز کیا ہے؟ خدا سے رابطہ کی علامت اور اپنے مالک ومعبود کی بارگاہ میں اپنی بندگی وعاجزی کا ثبوت۔ ان ہر دو صفتوں کی برکت سے آدمی کے اندر خودداری ہے پیدا ہوتی ہے خودسری نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو صبر کا جوہر ذاتی رکھتے' اور نماز کے ذریعے خدا سے اپنا رابطہ قائم رکھتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا نسان تو مٹ جاتا ہے رنج

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ......الآية۔

مخفی نہ رہے کہ بعض روایات میں وارد ہے کہ صبر سے مراد روزہ ہے بنا بریں مشکلات ومصائب کی یلغار کے وقت روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے کی منت ماننے اور اس طرح اپنے قادر مطلق خالق ومالک سے رابطہ مستحکم کرنے سے کامیابی قدم چومتی ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ۔ ''الصبر مفتاح الفرج''۔ ''اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ''۔

شہداء کی حیات جاوید کا تذکرہ

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ......الآية۔

زندگی فطرتاً ہر شخص کو پسند ہے اور موت ناپسند اسی طبعی تقاضا کے مطابق جب جان کے جانے کا خطرہ ہو تو آدمی خطروں سے قدم پیچھے ہٹاتا ہے۔ مگر اسلام جن بلند مقاصد کے لیے جانی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے اس کی خاطر ''شہادت موت ہے'' کے نظریہ کا خاتمہ چاہتا ہے کیونکہ موت کے لفظ سے ذہن پر حوصلہ شکن اثر پڑتا ہے اس

لیے قرآن مجید میں اعلان کیا جاتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں چونکہ کائنات عالم کا نظام اسی بات پر قائم ہے کہ ہر پست بلند کے کام آئے۔ اور اس کا اس طرح کام آنا اس کی بلند تر بقاء کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تو پھر انسان اپنے مافوق کے کام آ کر میت (مردہ) کیوں کہلائے۔ اس صورت میں وہ شہید ہوگا اور ایک بلند تر حیات کا مالک ہوگا۔ (فصل الخطاب)

ہمیں حیاتِ شہداء کا شعور نہیں ہے

مگر ہمیں شہید کی زندگی کا شعور نہیں ہے اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے۔ اس میں مومن و کافر، صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں ہے لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے اور کچھ مخصوص درجے انبیاءؑ و صالحین کے لیے مخصوص ہیں اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے شہید کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ''مر گیا'' گو صحیح اور جائز ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ظاہری احکام میں وہ عام مردوں کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی میراث تقسیم ہوتی ہے۔ اس کی بیوی عقد ثانی کر سکتی ہے اور اس کا کفن و دفن ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اسکی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ اسے اس حیات برزخیہ میں دوسرے مردوں سے ایک گونہ امتیاز ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے۔ (معارف القرآن)

مگر ان کی اس حیات کی حقیقت کا ہمیں شعور نہیں ہے اور ہم اس کی پوری نوعیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں بھلا جب ہم عمومی حیات برزخیہ کی کیفیت کو نہیں سمجھتے تو پھر شھداء کی خصوصی زندگی کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم اس کے مکلف ہی نہیں ہیں۔ اور بقول بعض اعلام۔ ''اسے ہمیں سمجھنا بھی نہ چاہیے''۔ اس لیے کہ منزل نقص میں کمال کا صحیح تصور ناممکن ہوتا ہے بچپن میں یہ سمجھنا کہ شباب کیا ہوتا ہے؟ خواب میں یہ سمجھنا کہ بیداری کسے کہتے ہیں؟ ویسے ہی اس دور حیات مادّی میں یہ سمجھنا کہ مابعد الموت کی زندگی اور پھر وہ بھی حیات شہداء کیا ہے؟ مگر جب یہ عقلاً ممکن ہے اور قرآن اس کی خبر دے رہا ہے اور تصریح کر رہا ہے تو ایک مسلمان کے لیے اس کا ماننا بہرحال ضروری ہے بہرحال شہید زندہ ہے اور اس کی زندگی قومی زندگی کی ضمانت ہے کیونکہ۔

شہید کی جو موت ہے
وہ قوم کی حیات ہے۔
کشتگان خنجر تسلیم را
ہرزماں از غیب جا نے دیگر است

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ ......الآیۃ۔

یہ سوال اتنا اہم نہیں ہے کہ دنیا میں تکلیفیں کیوں آتی ہیں؟ مصیبتیں کیوں نازل ہوتی ہیں؟ کیونکہ دنیا دارالحزن ہے (محنتوں اور مشقتوں کا گھر ہے) جب تک آدمی قید حیات سے آزاد نہ ہو جائے تب تک وہ بندغم سے آزاد نہیں ہو سکتا کیونکہ

قید حیات و بندغم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لہٰذا جب تک آدمی دار دنیا میں ہے۔ رنج وغم اور مصیبت والم سے کم وبیش دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ بلکہ متعدد اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ ''اشد الناس بلاء الا نبیاء ثم الامثل فالا مثل''۔ کہ سب سے زیادہ بلائیں اور مصیبتیں انبیاءؑ پر اور ان کے بعد درجہ بدرجہ اہل ایمان پر نازل ہوتی ہیں۔ (البرہان۔نور الثقلین)

دنیوی مصائب وشدائد کا فلسفہ

ہاں اہم سوال یہ ہے کہ جب اللہ علیم بذات الصدور ہے تو پھر وہ بندوں کا امتحان کیوں لیتا ہے؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ امتحان ہمیشہ حقیقت حال معلوم کرنے کیلئے نہیں لیا جاتا بلکہ اس کے دو مقصد اور بھی ہوتے ہیں ایک ناقص کو اس کے نقص کا احساس دلانا اور دوسرا کامل کے کمال سے دنیا کو متعارف کرانا۔ خداوند عالم جو بندوں کا امتحان لیتا ہے اس کا مقصد انہی دو امروں میں سے کوئی ایک ہوتا ہے وبس۔ نیز اللہ تعالیٰ کے امتحان کی نوعیتیں بہت اور مختلف ہوتی ہیں مگر یہاں بطور مثال چند چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جیسے خوف وخطر، بھوک و پیاس اور مالوں، جانوں اور پھلوں کا نقصان۔

صبر کی تعریف اور اس کا مفہوم

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ......الآیۃ

خداوند عالم نے مسلمانوں کو مصائب وآلام کے بے رحم حملوں سے بچنے کے لیے ایک ڈھال دی ہے جس کا نام صبر ہے جس کی وجہ سے مصائب وشدائد کے کالے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ صبر کیا ہے؟ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ مصیبت کا احساس ہی نہ ہو۔ وہ تو ضرور ہوگا جو انسانی شعور کا نتیجہ ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ آنکھ سے آنسو نہ نکلے یہ بھی درست نہیں کیونکہ آنسو کا نکلنا تو احساس غم کا

طبعی وفطری نتیجہ ہے تو پھر صبر کیا ہے؟ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ''کف الناس عما لا ینبغی''۔ یعنی اپنے آپ کو ہر ناشائستہ قول وفعل سے باز رکھنا۔ خلاصہ یہ کہ تقدیر الٰہی پر زبان اعتراض دراز نہ کرنا' بلکہ راضی برضاء خدا رہنا اور مصیبت آنے پر کلمہ ''استرجاع'' یعنی ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ'' پڑھنا' جس کے پہلے جزء میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہر مالک کو اپنی ملکیت میں جس طرح چاہے' تصرف کرنے کا حق ہے اور دوسرے جزء میں اپنی موت اور خدا کی بارگاہ میں پلٹ کر جانے کا اعتراف ہے کہ وہ اپنے عدل کے مطابق ہمیں ہر نقصان وزیاں کا معاوضہ عطا فرمائے گا۔ اور وہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرے گا۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''جس بندہ پر کوئی مصیبت نازل ہو اور وہ کہے انا للہ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡن تو خدا اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیتا ہے اور بعد از اں جب اسے وہ مصیبت یاد آئے اور پھر انا للہ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡن پڑھے تو خداوند عالم اس کے اس دوران والے گناہ معاف کر دیتا ہے''۔ (تفسیر نور الثقلین)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباء طاہرین علیہم السلام کے سلسلہ سند سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں فرمایا:

''چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں بھی پائی جائیں وہ جنتیوں میں سے ہے۔ (۱)۔ اس کا تمسک شہادت توحید ورسالت ہو۔ (۲)۔ جب کوئی نعمت عطا ہو تو الحمد للہ کہے۔ (۳)۔ جب کوئی گناہ کرے تو ''استغفر اللہ'' کہے۔ (۴)۔ اور جب کوئی مصیبت نازل ہو تو ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھے'' (تفسیر عیاشی)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس آیت مبارکہ میں اپنے نازل کردہ مصائب وشدائد پر صبر کرنے والوں کو تین انعامات سے نوازا ہے۔

(۱)۔ خدا کی طرف سے درود وسلام۔ (۲) رحمت حق کا نزول۔

(۳) ہدایت یافتہ اور صراط مستقیم پر ہونا۔ ''ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ'' (سورہ توبہ آیت۔ ۷۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ صلواۃ (درود) صرف نبیوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کا نظریہ قرآن کے خلاف ہے قرآنی تعلیم کے مطابق مصائب وآلام پر صبر کرنے والے سب لوگ صلوٰت الٰہی (درود) کے مستحق ہوتے ہیں۔

اسی طرح ایک روایت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ۔ ''خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ

صَدَقَةً''۔(لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرو)''وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ''۔اوران پر صلوٰت بھیجو۔(دعاءخیر کرو) بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آل ابی اوفی سے زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد فرمایا۔''اللھم صلی علی آل ابی اوفیٰ''(مقام غور وفکر ہے)

اِنَّ الصَّفَا وَ الۡمَرۡوَةَ......الآية

صفا ومروہ مکہ میں دو مختصر پہاڑیاں ہیں جنہیں اللہ نے شعائر اللہ قرار دیا ہے شعائر ''شعیرہ'' کی جمع ہے جس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد دلانے والی نشانیاں۔شریعت کی اصطلاح میں عبادت کے مکان، زمان اور علامت کو شعائر اللہ کہا جاتا ہے۔مکان جیسے کعبہ، عرفات، مزدلفہ، منیٰ اور صفا ومروہ زمان جیسے ماہ رمضان، اشہر حج، عیدین اور جمعہ اور علامت جیسے قربانی کے جانور اذان اقامت اور نماز باجماعت وغیرہ وغیرہ۔ حج ہو یا عمرہ دونوں ارکان مخصوصہ کے مجموعہ کا نام میں فرق یہ ہے کہ حج مخصوص ایام میں کی جاتی ہے۔(9۔ذوالحجہ سے لے کر 12 ذوالحجہ تک) جبکہ عمرہ دوسرے عام دنوں میں ہوتا ہے باوجود یکہ حج وعمرہ میں صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنا بنابر مشہور عندالمسلمین واجب ہے مگر قرآن مجید میں اس مطلب کو بڑے نرم الفاظ کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔کہ۔''فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ''سورہ بقرہ آیت۔۱۵۸۔(کہ جو سعی کرے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے)اس کی وجہ یہ ہے کہ اسوقت صفا ومروہ پر کچھ مورتیاں رکھی ہوئی تھیں، لہٰذا بعض مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ شاید ان کی وجہ سے یہ سعی کرنا گناہ ہو۔اور چونکہ قبل از اسلام بھی مشرکین یہ سعی کیا کرتے تھے۔فرمایا: کہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔(بلکہ کار ثواب ہے اور واجب ہے)(مجمع البیان)البتہ دوسرے دلائل سے اس کا وجوب ثابت ہے بالکل اسی طرح جس طرح سفر میں۔نماز قصر کے بارے میں یوں وارد ہے۔''فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلٰوةِ''(سورہ نساء آیت۔۱۰۱)۔جبکہ یہ قصر دوسرے دلائل کی رو سے واجب ہے۔

نیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت کے مطابق:

''کوہ صفا کو اس لیے صفا کہا جاتا ہے کہ اس پر جناب آدم صفی اللہ علیہ السلام اترے تھے اور مروہ کو اسی لیے مروہ کہا جاتا ہے کہ اس پر جناب حوا علیہا السلام اتری تھیں جو کہ مراۃ (عورت) تھیں۔اور یہ اسی سے مشتق ہے''(مجمع البیان)

آیات القرآن

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا
بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ
اللّٰعِنُوْنَ ۝۱۵۹ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ
عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۱۶۰ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ
كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۶۱
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝۱۶۲
وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝۱۶۳ اِنَّ فِيْ خَلْقِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ
فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۶۴

ترجمۃ الآیات

بالتحقیق جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری نازل کردہ روشن تعلیمات و ہدایات کو جبکہ ہم تمام لوگوں کیلئے انہیں کتاب میں واضح طور پر بیان کر چکے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں (۱۵۹) مگر وہ جنہوں نے (حق پر پردہ ڈالنے سے) توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی۔ اور (حق بات کو) ظاہر کر دیا یہ وہ ہیں جن کی میں توبہ قبول کروں گا (انہیں معاف کر دونگا) اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا (مہربان) ہوں (۱۶۰) بلاشبہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور پھر اسی کفر کی حالت میں مر

گئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ (۱۶۱) وہ اس (لعنت) میں ہمیشہ ہمیشہ رہینگے نہ تو ان کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی۔ اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت دی جائے گی اور تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ بڑا مہربان بہت رحم والا ہے (۱۶۲) بے شک آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں اور رات دن کی آمد و رفت (الٹ پھیر) میں اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں اور (بارش کے) اس پانی میں جسے خدا نے آسمان (بلندی) سے برسایا اور پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کے بے جان (بے کار) ہو جانے کے بعد جاندار بنا دیا (سر سبز و شاداب بنا دیا) اور اس میں ہر قسم کے چلنے پھرنے والے (جانور) پھیلا دیئے۔ اور ہواؤں کی گردش (ہیر پھیر) میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر کر کے (تابع فرمان بنا کے) رکھے گئے ہیں (ان سب باتوں میں) خدا کے وجود اور اس کی قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل و خرد سے کام لیتے ہیں۔ (۱۶۴)

تشریح الالفاظ

(۱) **یلعنهم الله** یہ لعنت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں رحمت سے دوری اور عذاب

(۲) **ینظرون** یہ انظار سے مشتق ہے جس کے معنی مہلت دینے کے ہیں

(۳) **واختلاف اللیل** اختلاف کے جہاں مشہور معنی باہمی اختلاف رائے کے ہیں وہاں اس کے معنی آمد و رفت اور بار بار آنے جانے کے بھی ہیں اور یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

تفسیر الآیات

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ...الآية

اگر چہ اس آیت کا روئے سخن نصاریٰ کے اکابر اور یہود کے علماء کی طرف ہے جو اپنی کتاب تورات و انجیل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کردہ اوصاف و علامات کو اس لیے لوگوں سے چھپاتے تھے کہ حق و حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے بعد لوگ حلقہ بگوش اسلام نہ ہو جائیں اور اُن کی چودھراہٹ میں فرق نہ

آ جائے۔جس کی وجہ سے وہ اس تہدید و وعید کے مستوجب قرار پائے' جو اس آیت میں مذکور ہے۔

حق وحقیقت کو چھپانے کی مذمت

لیکن بہ موجب ''المورد لا خصص الوارد''۔ یہ حکم اور یہ تہدید ہر اُس جماعت' ہر اُس شخص کو شامل ہے جو کسی غرض فاسد اور دینوی مصلحت کے تحت آیات الٰہیہ' احکام ربانیہ اور معارف قرآنیہ سے لوگوں کو بے خبر رکھے اور برملا حق وحقیقت کا اظہار نہ کرے۔

(۱) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباء طاہرین علیہم السلام کے سلسلہ سند سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں فرمایا:

''اذا ظهرت البدع فی امتی فعلی العالم ان یظهر علمه و من لم یفعل فعلیه لعنة الله۔ جب میری امت میں بدعات ومنکرات ظاہر ہو جائیں تو عالم دین پر واجب ہے کہ وہ اپنے علم کا (حق وحقیقت کا) اظہار کرے اور جو ایسا نہیں کرے گا اس پر خدا کی لعنت ہو گی''۔ (اصول کافی)

(۲) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

''جس شخص سے کسی حقیقت کے بارے میں سوال کیا جائے جسے وہ جانتا ہو مگر وہ اسے (اپنی کسی ذاتی مصلحت کے تحت) چھپائے' تو بروز قیامت اس کے منہ میں آتش دوزخ کی لگام دی جائے گی''۔ (مجمع البیان)

(۳) جناب امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے آباء طاہرین علیہم السلام کے سلسلہ سند سے حضرت امیر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ سے پوچھا گیا کہ۔ انبیاء وآئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے بعد سب مخلوق سے افضل کون ہیں؟ فرمایا۔ علماء جب کہ نیک ہوں پھر پوچھا گیا کہ شیطان اور اس کے انصار واعوان کے بعد سب مخلوق سے بدترین کون ہیں؟ فرمایا۔ علماء جب کہ برے ہوں۔ جو باطل کو ظاہر کریں۔ اور حق پر پردہ ڈالیں۔ فرمایا انہی کے بارے میں خدا فرماتا ہے۔ ''اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ'' کہ ان پر خدا اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ (احتجاج طبرسی' نور الثقلین' البرہان)

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں علماء کرام کی شان بہت بلند و بالا ہے وہاں ان وارثان انبیاء علیہم السلام کی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔

فضلیت جو بڑی تھی تو مصیبت بھی بڑی ہے۔

لعنت کا صحیح مفہوم

وَ یَلۡعَنُهُمُ اللهُ......الآیۃ

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ لعنت کوئی دشنام اور گالم گلوچ ہے مگر حقیقت اس کے خلاف ہے لعنت کی لفظ رصلٰوت کی مقابل ہے کہ جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہو تو اس کے معنی رحمت کے ہوتے ہیں اور جب اس کی نسبت مخلوق کی طرف ہو تو اس کے معنی طلبِ رحمت کے ہوتے ہیں اسی طرح جب لعنت کے لفظ کی نسبت خدا کی طرف ہو تو اس کے معنی رحمت سے دُور کرنے کے ہوں گے اور جب مخلوق کی طرف منسوب ہو تو رحمت خدا سے دوری کی دعاء بد کے ہوتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ اگر لعنت کے معنی دشنام اور گالی کے ہوتے تو وہ خدا جو اپنے بندوں کو کفار و مشرکین کو بھی گالی دینے کی مناہی کرتا ہے خود جا بجا مختلف لوگوں پر لعنت نہ کرتا کہیں کافروں پر لعنت' کہیں ظالموں پر لعنت اور کہیں کاذبوں پر لعنت وغیرہ وغیرہ۔

اس بیان سے واضح وعیاں ہو گیا کہ جس طرح رحمت خدا کے مستحق کے لیے خدا سے رحمت کے نازل کرنے کی دعا کرنا عبادت ہے' اسی طرح لعنت کے مستحق کے لیے خدا سے رحمت کی دوری کی بد دعا کرنا بھی عبادت ہے بلکہ اگر بنظر غائر قرآن سنت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں دو فعل ایسے ہیں' جن میں خالق و مخلوق باہم شامل ہیں۔(۱) صلوٰۃ۔ارشاد قدرت ہے۔ ''اِنَّ اللهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا''(سورہ احزاب آیت۔۵۶)۔(۲)لعنت۔ ارشاد ربانی ہے۔''اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (سورہ بقرہ آیت۔۱۵۹)''۔

توبہ کا مفہوم

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا......الآیۃ

توبہ کے معنی رجوع کرنے یعنی پلٹنے کے ہیں۔لہٰذا اس کی نسبت بندہ کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے۔''اس کا اپنے گناہوں سے پشیمان ہو کر بارگاہ خدا میں آئندہ اس کام کے نہ کرنے بلکہ اس کی اطاعت کا عہد و پیمان لے کر حاضر ہونا''۔ظاہر ہے کہ جب کوئی بندہ ایسا کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے کردار میں تبدیلی واقع ہوگی اسی لیے خدا فرماتا ہے۔''اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا''۔لہٰذا حق پر پردہ ڈالنے والوں کی روش میں تبدیلی اسی صورت میں ہوگی کہ جب وہ اپنی اس روش سے نادم ہو کر رجوع کریں گے

'اپنی اصلاح کریں گے اور جن حقائق کو چھپایا ہے ان کا برملا اظہار کریں گے۔ جب کوئی شخص اس طرح کی توبہ و انابہ کرے گا تو بے شک خدا اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ ''لِاِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ''۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ...الآیۃ

یہاں تک بنی اسرائیل سے خطاب تھا ان کے ایرادات کے شافی جوابات دیئے گئے۔ اہل ایمان کو صبر وضبط کی تلقین کی گئی اور راہ حق میں جان دینے والوں کو حیات جاودانی کی بشارت دی گئی اور حق وحقیقت پر پردہ ڈالنے والوں پر جہاں لعنت کی گئی وہاں کفار ومشرکین کو عذاب الیم کی تہدید بھی کی گئی۔ ان سب باتوں کے بعد خالق حکیم نے ان آیات میں عقیدہ توحید کی وضاحت فرمائی ہے جو کہ اسلام کا سنگ بنیاد ہے جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''اول الدین معرفة الجبار''۔ دین اسلام کا سنگ بنیاد معرفت پروردگار ہے (توحید صدوق)

معرفت توحید بدیہی ہے یا نظری؟ اور توحید کی کچھ نشانیوں کا تذکرہ

خالق کائنات کی معرفت بدیہی ہے؟ (کہ کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے) یا نظری ہے؟ (دلیل وبرہان کی محتاج ہے) یا کچھ بدیہی ہے اور کچھ نظری؟ متکلمین اسلام میں قدرے اختلاف ہے اگرچہ آخری قول اقرب ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے رحمن ورحیم کی اس قدر اجمالی معرفت تو بالکل بدیہی ہے کہ اس عالم کا کوئی علیم وحکیم صانع اور اس وسیع وعریض کائنات کا کوئی خالق ومدبر ہے مگر اس کی پوری معرفت کہ وہ واحد ہے یا شریک رکھتا ہے' وہ جسم ومکان رکھتا ہے یا اس سے منزہ ہے' وہ نظر آتا ہے یا نہ؟ ان حقائق کی معرفت نظری اور محتاج دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ خداوند عالم اور اس کے مقرر کردہ انبیاء ومرسلین اور آئمہ طاہرین علیہم السلام نے خواب غفلت میں سوئے ہوؤں کو جگانے کی خاطر تنبیہ کی ہے اور اثر سے موثر پر استدلال کیا ہے۔ کبھی فلسفیانہ دور وتسلسل کا تذکرہ نہیں کیا۔ ''قَالَتْ رُسُلُھُمْ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ''۔ رسولوں نے کہا: آیا اس خدا کی ہستی میں بھی کوئی شک وشبہ ہوسکتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے؟ (سورہ ابراہیم آیت۔۱۰) چونکہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اثر کو دیکھ کر موثر کا حال معلوم کر لیتا ہے خالق حکیم نے اس آیت مبارکہ میں اپنی صنعت وقدرت کے دس عظیم الشان آثار کو واضح وآشکار فرما کر انسانی فطرت کو جھنجھوڑا ہے کہ جب وہ معمولی اثر کو دیکھ کر موثر کو معلوم کر لیتی ہے وہ دھواں دیکھ کر آگ کا' تحریر دیکھ کر کاتب کا' اور آواز سن کر بولنے والے کا پتہ لگا لیتی ہے تو اس قدر آثار قدرت دیکھ کر کیوں ان کے خالق اور اس کی قدرت ویکتائی کا یقین نہیں کرتی؟

آیات القرآن

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ
الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ
الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ
الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ
كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ
وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

ترجمۃ الآیات

(ان حقائق کے باوجود) کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے سوا اوروں کو اس کا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان سے اس طرح محبت کرتے ہیں۔ جس طرح خدا سے کرنی چاہیے۔ مگر جو صاحب ایمان ہیں وہ سب سے بڑھکر خدا سے محبت کرتے ہیں اور کاش یہ ظالم (اس وقت) وہ حقیقت دیکھ لیتے (سمجھ لیتے) جو عذاب دیکھتے وقت سمجھیں گے کہ ساری قوت و طاقت بس اللہ کے لئے ہی ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔ (۱۶۵) اور (وہ مرحلہ کتنا کٹھن ہوگا کہ) جب وہ (پیر) لوگ جن کی (دنیا میں) پیروی کی گئی اپنے پیروؤں (مریدوں) سے برأت اور لاتعلقی ظاہر کریں گے اور خدا کا عذاب ان سب کی آنکھوں کے سامنے ہوگا اور سب وسائل اور تعلقات بالکل قطع ہو چکے ہوں گے۔ (۱۶۶) اور پیروی کرنے والے (مرید) کہتے ہوں گے کہ کاش! ہمیں ایک بار (دنیا میں) واپسی کا موقع مل جاتا تو ہم بھی بالکل اسی طرح ان سے بیزاری اور بےتعلقی ظاہر کرتے جس طرح انہوں نے آج ہم سے بیزاری اور لاتعلقی ظاہر کی ہے اسی طرح خدا ان کے (برے) کاموں کو حسرت و یاس کی شکل

میں دکھائے گا اور وہ کبھی دوزخ سے باہر نہیں نکل سکیں گے (۱۶۷)

تشریح الالفاظ

(۱) دابّۃ — اس کی جمع دوّاب ہے جس کے معنی ہر رینگنے والا جانور اور باربرداری کا جانور

(۲) لآیات — یہ آیت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت، دلیل اور معجزہ

(۳) اذ تبرا — اس کے معنی ہیں کسی سے بیزار ہونا

تفسیر الآیات

وَمِنَ النَّاسِ... آلآیۃ

ان نشانیوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ کوئی شخص خدا کے علاوہ اس کے مزعومہ شریک کا ماننے والا نہ ہوتا مگر آہ ما اکثر العبر و ما اقل الاعتبار۔

کاخ جہاں پراست ز ذکر گز شتگان
لیکن کسے کہ گوش نہد ایں صد اکم است

لہٰذا اس کے باوجود اوروں کو ماننے والے ان کو صفات ربوبیت سے متصف سمجھنے والے' اور ان سے خدا جیسی محبت کرنے والے موجود ہیں اور وہ بہت ہیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ انسان کو مختلف چیزوں سے محبت ہوتی ہے۔ بیوی بچوں سے دوست احباب سے' نبی اور امام سے مگر ظاہر ہے کہ کامل محبت ایک ہستی سے ہی ہوسکتی ہے بقول بعض اہل دانش۔ ''ایک مخدوم کے کئی خادم تو ہو سکتے ہیں مگر ایک خادم کے کئی مخدوم نہیں ہو سکتے' کیونکہ وہ پوری خدمت ایک کے سوا دوسرے کی کر ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح محبت و اطاعت کاملہ بھی ایک ہی ہستی کی ہوسکتی ہے''۔ اسی لیے خدا فرماتا ہے۔ کہ جو اہل ایمان ہیں وہ سب سے بڑھ کر خدا سے محبت کرتے ہیں ان کی محبت وعقیدت کا مرکز ومحور خدا کی ذات ہوتی لہٰذا اگر وہ نبی کو مانتے ہیں یا اس سے محبت کرتے ہیں تو خدا کی وجہ سے کہ وہ ان کے حقیقی محبوب کا فرستادہ ہے اور وہ امام سے محبت کرتے ہیں تو وہ بھی اس لیے کہ وہ اس کے مقرر کردہ رہبر و راہنما اور اس کے فرستادہ (رسول) کا وصی ہے لہٰذا ان کی محبت وعداوت محض خدا کے لیے ہوتی ہے وہ محبت کرتے ہیں تو صرف محبوب خدا سے اور نفرت کرتے ہیں تو صرف دشمن خدا سے اسی جذبہ کو حدیثوں میں ''الحب للّٰہ والبغض فی اللّٰہ'' کا نام دیا گیا ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

قیامت کے دن جھوٹے پیرومرید ایک دوسرے پر تبرا کریں گے

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا ......الآیۃ

عام لوگوں کی یہ کمزوری ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے خودساختہ پیروں، فقیروں اور دنیا کے مال وجاہ کے طالب دھوکہ باز لوگوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں اور کھرے، کھوٹے اور آب وسراب میں فرق نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ مشکل وقت آنے پر یہ ہمارے کام آئیں گے۔ مگر اس اندھی تقلید کا انجام بہت دردناک ہوتا ہے ظاہر ہے کہ سب سے مشکل وقت وہی ہوگا جب خدا کا عذاب سامنے موجود ہوگا۔ مریدان باصفا اس سے بچنے کے لیے پیروں کا سہارا تلاش کریں گے۔ مگر پیروں کو خود اپنی پڑی ہوگی۔ اس لیے وہ مریدوں سے تبرا (بیزاری) کا اعلان کریں گے اور کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم پیری اور لیڈری کی دکان نہ چمکاتے اور مریدان سے تبرا (بیزاری) کی حسرت ظاہر کریں گے کہ اگر ان کو ایک بار دنیا میں واپس جانے کی اجازت مل جائے تو وہ بھی ان سے اسی طرح تبرا اور بیزاری ظاہر کریں گے جس طرح انہوں نے کی ہے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو ہم گمراہ نہ ہوتے۔

ان حالات کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کو امیر و راہنما ماننا ہو تو سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے اور ہزار بار سوچ سمجھ کر کسی کو ہادی مانا جائے تا کہ بروز قیامت پچھتانا نہ پڑے۔ جبکہ پچھتاوا کوئی فائدہ نہ دے گا۔ ارشاد قدرت ہے۔ ''یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ'' (سورہ بنی اسرائیل آیت۔ ۷۱)۔ یعنی قیامت کے دن ہم تمام لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ محشور کریں گے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ظالم امام و پیشوا اپنے مقتدیوں سے اور مقتدی اپنے ظالم اماموں سے بیزاری ظاہر کریں گے۔ (تفسیر قمیؒ)

اس سے معلوم ہوا کہ تبرا کوئی دشنام طرازی یا گالم گلوچ نہیں بلکہ یہ صرف کسی کی ذات سے یا اس کے اقوال وخصال سے بیزاری اختیار کرنے کا نام ہے و بس۔

آیات القرآن

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ
وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۶۹ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ
لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝۱۷۰ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ
الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا
يَعْقِلُوْنَ ۝۱۷۱

ترجمۃ الآیات

اے انسانو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ۔ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ بلاشبہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔ (۱۶۸) وہ تو تمہیں برائی و بے حیائی اور بدکاری کا حکم دیتا ہے اور (چاہتا ہے کہ) تم خدا کے خلاف ایسی باتیں منسوب کرو جن کا تمہیں علم نہیں ہے (۱۶۹) اور جب ان (کفار و مشرکین) سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ، دادا کو پایا ہے۔ اگر چہ ان کے باپ، دادا بے عقل ہوں اور راہ راست پر بھی نہ ہوں (تو پھر بھی انہی کی پیروی کریں گے؟) (۱۷۰) اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کی مثال دعوت حق دینے میں اس شخص (چرواہے) کی سی ہے جو ایسے (جانور) کو پکارنے میں اپنا گلہ پھاڑے (چیخ و پکار مچائے) جو چیخ و پکار کی آواز کے سوا کچھ سنتا ہی نہیں ہے۔ (یہ کافر) ایسے بہرے، گونگے اور اندھے ہیں کہ عقل سے کچھ کام ہی نہیں لیتے (۱۷۱)

تشریح الالفاظ

(۱)خطوات الشیطان   یہ خطوہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چلتے وقت دوقدموں کے درمیان کا فاصلہ اور مسافت

(۲)ینعق   یہ نعق ینعق سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کائیں کائیں کرنا، اور چرواہے کا اپنی بکریوں کو ڈانٹنا

تفسیر الآیات

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ...الآیة

انسان چونکہ صاحب عقل ہے اور حیوان اس نعمت سے محروم ہے' اسی وجہ سے ان دونوں میں بڑا فرق یہی ہے کہ حیوان کے حرکات وسکنات صرف ضرورت اور طبیعت کے ماتحت ہوتے ہیں مثلاً جب اسے بھوک لگے تو اسے پیٹ بھرنے سے غرض ہوتی ہے۔ جائز ہے یا ناجائز' اس سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مگر انسان ضرورت اور خواہش کے وقت نہ صرف شخصی بلکہ اجتماعی مفادات اور احکام خداوندی یعنی اس کے حلال وحرام پر نگاہ رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان بھی حیوان کی طرح ہوجائے' تو پھر اس میں اور حیوان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟

جائز وناجائز کی حدود کا خیال رکھ کر حلال لذائز کا استعمال جائز ہے

اسی لئے خداوند عالم نے انسان کو۔''یاآیہا النّاس''۔ کہہ کر خطاب کیا ہے کہ اے انسان! تیری انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ تو صرف پیٹ بھرنے اور تجوری بھرنے سے غرض نہ رکھے بلکہ جائز وناجائز کے حدود وقیوم کا بھی خیال رکھے۔ اور بے شک حلال وطیّب چیزیں استعمال کرے۔ اور ان سے نفس کو محروم کرکے اسے بلا وجہ اذیّت نہ دے۔''قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ''یعنی کہو اللہ کی زینت اور طیب وطاہر رزق کس نے حرام قرار دیا ہے؟(سورہ اعراف آیت۔ ۳۲)

الغرض چونکہ دین اسلام دین فطرت اور دین طہارت ہے اس لیے وہ حلال اور طیّب چیزوں کے استعمال کو جائز قرار دیتا ہے۔ حلال ظاہری قانونِ شرع میں جائز کو کہا جاتا ہے چاہے وہ مرغوب ہو یا نا مرغوب۔

مگر طیب اس حلال کو کہا جاتا ہے جو حلال ہونے کے علاوہ مرغوب طبع بھی ہو لہٰذا حلال کے ساتھ طیّب کی لفظ احتیاط فی الدّین اور احسان ایزدی ہے اس حکم الٰہی اور آیت کے تتمہ۔ ''وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ لذائز کو ترک کرنا' جائز زیب و زینت سے منہ موڑنا اور جسمانی اذیتیں اور مشقتیں برداشت کر کے بلا وجہ اپنے نفس کو ایذا دینا' جیسا کہ صوفیوں کے ہاں رائج ہے خالق نفس کو پسند نہیں ہے۔ اور ایسا کرنا خطوات الشیطان (شیطانی نقوشِ قدم) میں سے ہے۔

اسلام میں اسلاف کی کورانہ تقلید کرنا روا نہیں ہے

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ...الآیۃ

دین اسلام چونکہ عقل و دانش اور فطرت وطبیعت کا دین ہے۔ اسکے اصول وضوابط عقلی وفطری ہیں اس لیے وہ ہر ہر معاملہ میں عقل سے کام لینے اور تدبر و تفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور آباء واجداد اور اسلاف کی اندھی تقلید سے روکتا ہے اور ماحول ومعاشرہ کی غلط رسوم ورواج کی پابندی سے منع کرتا ہے۔ مگر باطل پرستوں کا ہمیشہ سے یہ شیوا رہا ہے کہ جب بھی کسی ہادی برحق نے ان کو حق وحقیقت کے تسلیم کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے ہمیشہ اپنے آباء واجداد کی اتباع کا بہانہ بنا کر اس دعوت حق کو ردّ کر دیا۔ ان لوگوں کا معاملہ بڑا عجیب ہے کہ دنیا کے ہر معاملہ میں تو یہ خود کو اپنے آباء واجداد سے بڑا عقل مند اور روشن دماغ خیال کرتے ہیں اور انہیں یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ۔

یہ ہیں اگلے زمانے کے لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔

مگر دین و مذہب کے معاملہ میں نہ صرف اپنی عقل وخرد' اپنے علم وفضل کو بلکہ خدا اور رسول کی تعلیمات و احکام کو بھی بالائے طاق رکھ کر اپنے آباء واجداد کی اندھی تقلید کو مقدم سمجھتے ہیں۔

خدائے دو جہاں نے قرآن میں جا بجا ان لوگوں کی اس روش ورفتار کی سخت مذمت کی ہے اور انہیں گونگا' بہرا' اندھا اور بے عقل جانور کہہ کر جہنم کا مستحق قرار دیا ہے۔ جو عقل مند ہوتے ہوئے بھی بے عقلوں اور بے ہدایت لوگوں کی پیروی کا دم بھرتے ہیں۔

ہزار لعنت برایں تقلید باد

لہٰذا اہل ایمان کا فریضہ ہے کہ وہ ہر نظریہ کو عقل ونقل کے معیار پر پرکھ کر اختیار کریں اور کسی تحقیقی بات کو محض اس لیے ردّ نہ کریں کہ وہ پرانے نظریات کے خلاف ہے۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ...الآية

اس آیت مبارکہ کے مفہوم اور معنی کے تعیّن میں مفسرّ ین میں اختلاف ہے اور اقوال کی تعداد پانچ تک پہنچ گئی ہے (مجمع البیان)۔

مگر نظر قاصر میں اس کا وہی مفہوم ترجیح رکھتا ہے جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

''تمہارا کفار کو اسلام کی طرف دعوت دینا اور بلانا ایسا ہے جس طرح ایک چرواہا مویشیوں کو بلاتا ہے، جو صرف اس کی آواز اور چیخ و پکار تو سنتے ہیں مگر اس کی بات نہیں سمجھتے۔ بالکل اسی طرح یہ لوگ بھی تمہاری آواز و پکار تو سنتے ہیں مگر اسے سمجھتے نہیں ہیں یعنی اپنے بغض و عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تمہاری بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی ضرورت سمجھتے ہیں'' (تفسیر مجمع البیان، صافی، نور الثقلین)

اور اسی مفہوم کو صاحب مجمع البیان نے اختیار کیا ہے۔ لہٰذا چونکہ یہ لوگ خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے کام نہیں لیتے یعنی وہ کان تو رکھتے ہیں مگر آواز حق کو نہیں سنتے، زبان تو رکھتے ہیں مگر حق و حقیقت کا اقرار نہیں کرتے اور آنکھ تو رکھتے ہیں مگر جمال حق کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ گویا وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ جو غور و فکر کے تمام راستے بند کر کے خداداد عقل سے کام نہیں لیتے۔ اولئك كالانعام بل هم اضل۔

آیات القرآن

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰۗىِٕكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ښ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

ترجمۃ الآیات

اے ایمان والو! جو پاک و پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم اس کی عبادت و پرستش کرتے ہو۔ (۱۷۲) اس نے (چوپایوں میں سے) صرف تمہارے اوپر مردار، خون، سور کا گوشت اور وہ (ذبیحہ) جسے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔ حرام قرار دیا ہے۔ پس جو شخص (شدت گرسنگی سے) مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ بغاوت یا سرکشی کرنے والا نہ ہو۔ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بے شک خدا بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۱۷۳) بالتحقیق جو لوگ کتاب خدا میں سے ان باتوں کو چھپاتے ہیں جو خدا نے نازل کی ہیں اور ان کے عوض تھوڑی سی قیمت وصول کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھر رہے ہیں قیامت کے دن وہ توجہ ربانی سے اس قدر محروم ہوں گے کہ خدائے تعالیٰ ان سے بات تک نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی انہیں (گناہوں کی کثافت سے) پاک کرے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۱۷۴) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے عوض گمراہی اور بخشش کے عوض عذاب کو خرید لیا۔ یہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں دوزخ پر (۱۷۵)

تشریح الالفاظ

(۱) اھل — اھلال کے معنی ہیں آواز بلند کرنا یعنی جس جانور پر ذبح کے وقت غیراللہ کا نام بلند کیا جائے وہ حرام ہے

(۲) غیر عاد — یہ عدو اور عدوان سے مشتق ہے جس کے معنی تجاوز کرنے کے ہیں اور جب اس کا صلہ علیٰ ہو تو اس کے معنی ظلم و زیادتی کرنے کے ہوتے ہیں

تفسیر الآیت

مِنۡ طَیِّبٰتِ...الآیۃ

اس آیت مبارکہ کے ابتدائی حصے پر بقدر ضرورت آیت ۱۶۸ کے ذیل میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ شکر کی

اہمیت اور اس کی حقیقت پر آیت ۱۵۲ کے ذیل میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ جبکہ عبادت کی ضرورت اور اس کی حقیقت کی وضاحت پارہ آیت ۲۱,۵ کے ذیل میں بقدر ضرورت وگنجائش کی جا چکی ہے۔ لہٰذا جو بات یہاں اہم اور نہایت ضروری ہے وہ بعض جانوروں کی حرمت اور اضطرار کے وقت ان کی حلّت کا بیان ہے۔ سو مخفی نہ رہے کہ یہ بات اپنے مقام پر (فلسفۃ الاحکام میں) ناقابل ردّ دلائل سے ثابت کی جا چکی ہے کہ خداوند حکیم کے اوامر ونواہی بے شمار حکم ومصالح اور مضرات ومفاسد کے تابع ہوتے ہیں یعنی وہ جن اچھے کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے ان میں سینکڑوں، ہزاروں دینی ودنیوی فوائد وعوائد ہوتے ہیں اور جن برے کاموں سے منع فرماتا ہے ان میں دینی ودنیوی سینکڑوں، ہزاروں مضرات ومفاسد ہوتے ہیں کیونکہ خدا حکیم مطلق ہے اور یہ مسلّم ہے کہ۔ ''**فعل الحکیم لا یخلو من الحکمة**''۔ (ان فوائد وعوائد مضرات ومفاسد کا ایک شمّہ ہم نے اپنی فقہی کتاب ''قوانین الشریعہ فی فقہ الجعفریہ'' میں بیان کر دیا ہے شائقین تفصیل کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کریں)

بعض حرام جانوروں کا بیان

اِنَّمَا حَرَّمَ...الآیة

خداوند عالم نے یہاں کلمہ حصر (انما) کے ساتھ چار چیزوں کی حرمت بیان کی ہے (۱) مردار (۲) خون (۳) سور کا گوشت (۴) وہ ذبیحہ جسے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔

اسی طرح سورہ انعام آیت ۱۴۵ میں بھی انہی چار چیزوں کی حرمت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ '' قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ ....'' پھر مضطر ومجبور آدمی کے لیے بقدر ضرورت وسدِّ رمق ان چیزوں کے کھانے کا جواز بیان کیا گیا ہے تو یہاں چند امور کی وضاحت ضروری ہے۔

اول:۔ ان چیزوں کے کھانے میں ضرر ونقصان کیا ہے؟

دوم:۔ جبکہ ان چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں جیسے شیر، چیتا، ریچھ، کتا اور بلی وغیرہ وغیرہ تو پھر انہی چار میں حرمت کی حصر کا کیا مطلب ہے؟

اور سوم یہ کہ مضطر ومجبور سے کون شخص مراد ہے؟ بڑے اختصار کے ساتھ ان امور پر ذیل میں کچھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں واضح رہے کہ حرام میں جو مضرت ومفسدہ ہوتا ہے وہ عام ہے کہ خواہ اس کے بدمزہ اور ردّی اور مضر صحت ہونے کی وجہ سے ہو کہ جسے طبیعت قبول نہ کرے جیسے مردار

اورخون یا اس انسانی اخلاق وعادات پر بُرا اثر پڑے جیسے سوار اور دیگر درندوں کا گوشت کہ جب یہ گوشت غذا بن کر جزء بدن بنتا ہے تو اپنا اثر دکھاتا ہے۔ لہٰذا ان کے کھانے سے بے غیرتی' بے حیائی اور سخت دلی پیدا ہوتی ہے۔ یا اس سے حواس سلیمہ بالخصوص عقل پر برا اثر پڑتا ہے اور اس میں فتور واقع ہوتا ہے جیسے شراب اور دیگر منشیات۔ اور جہاں تک امر دوّم یعنی صرف ان چار چیزوں میں محرمات کا منحصر کرنا؟ تو اگرچہ مفسّرین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں مگر اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ یہ حصر اضافی ہے۔ اطلاقی اور حقیقی نہیں ہے کہ خدا نے یہاں وہ سب چیزیں گنوادی ہوں جو شریعت اسلامیہ میں حرام ہیں۔ بلکہ جن چیزوں کو کفار نے ''دل بخواہ'' کے طور پر حرام قرار دے رکھا تھا جیسے بحیرہ' سائبہ وغیرہ.......... یہ حصر ان کے بالمقابل ہے کہ جن چیزوں کو تم نے ازخود حرام کر رکھا ہے وہ حرام نہیں ہیں۔ البتہ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں۔ (یعنی محرمات کی مکمل فہرست میں سے چند بڑی بڑی حرام چیزیں یہ ہیں) اور جہاں تک امر سوم کا تعلق ہے تو بموجب۔ ''لیس شیٔ ممّا حرّمہ اللہ الّا وقد احلّہ لمن اضطر الیہ''۔ یعنی خدا نے جو چیز بھی حرام قرار دی ہے اسے ضرورت کے وقت حلال قرار دیا ہے۔

اسی ضابطہ کی بنا پر خدائے رحیم ان چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے۔ جو مضطر اور مجبور و ناچار ہو جائے یعنی بھوک کی شدّت سے جاں بلب ہو جائے اور کھانے کے لیے کوئی حلال چیز دستیاب نہ ہو۔ یا کوئی ظالم وجابر اسے ان چیزوں کے کھانے پر اس طرح مجبور کرے کہ بصورت دیگر جان سے مار دینے کی دھمکی دے۔ تو دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کا کھانا حلال ہے۔ جو بنا بر مشہور یہ ہیں۔

ایک یہ کہ وہ شخص ''باغی'' نہ ہو یعنی اس کے کھانے کا خواہش مند نہ ہو بلکہ مجبوراً کھائے۔

دوسرے یہ کہ ''عاد'' نہ ہو یعنی ضرورت سے زیادہ نہ کھائے بلکہ صرف اتنا کھائے کہ جس سے جان بچ جائے۔ مگر بعض روایات جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہیں۔ ان سے باغی اور عادی کا اور مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ باغی وہ ہے جو امام برحق پر خروج کرے اور عادی وہ ہے جو چوری اور راہزنی کرتا ہو۔ بنابریں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بوقت اضطرار حرام کھانے کے جواز کی سہولت ایسے لوگوں کے لیے نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر کوئی شخص امام برحق پر بغاوت کی نیت سے گھر سے نکلے یا چوری اور راہزنی کی غرض سے باہر نکلے اور پھر اس کو اس صورت حال کا سامنا ہو جائے تو اگر ایسا شخص بھوک سے مر بھی جائے تو بھی اس کے لیے اکل میتہ (مردار وغیرہ کا کھانا) جائز نہ ہوگا۔ (مجمع البیان' البرہان' بحارالانوار' معانی الاخبار کذا فی تفسیر الجلالین امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔ تفسیر حقانی)

غیر اللہ کے نام جانور نامزد کرنے کا حکم؟

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ...الآیۃ

یعنی وہ جانور جسے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا جائے وہ تو بالا تفاق حرام ہے اور ''ما اھل به لغیر الله'' کا کامل مصداق ہے' لیکن اگر کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے نام سے نامزد کر دیا جائے جیسے شیخ سدو کا بکرا اور سید کبیر کی گائے یا جس طرح عام لوگ مختلف مزاروں کے نام نامزد کرتے ہیں۔ یا جس طرح ہندو کالی بھوانی کے نام سانڈ چھوڑتے ہیں یا دور جاہلیت میں عرب بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے..........تو اگر ایسے جانور کو خدا کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے تو آیا حلال ہوگا یا حرام؟ اس میں قدرے اختلاف ہے مگر محققین کا رجحان حرمت کی طرف ہے کہ جب یہ جانور غیر اللہ کے نام نامزد ہو گئے تو پھر ان میں شرک والی خباثت سرایت کر گئی اور یہ کثافت اس کے رگ و ریشے میں دوڑ گئی تو جس طرح سور اور کتے کو خدا کا نام لے کر ذبح کرنا مفید نہیں' وہ حرام ہی رہیں گے اسی طرح ایسے جانور کو خدا کا نام لے کر ذبح کرنا بھی کوئی فائدہ نہیں دیتا (تفسیر حقانی)۔

شرک کو بیخ و بن سے اکھیڑنے کیلئے یہ قول اشبہہ ہے اور احوط بھی۔ ہاں اگر کوئی مسلمان خدا کے نام پر ذبح کرے اور اسی کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کرے۔ البتہ اس کار خیر کا ثواب کسی بزرگ ہستی کی روح مقدس کو ہدیہ کرے تو یہ اور بات ہے جس کا جواز لا کلام ہے۔ **واللہ العالم**۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡتُمُوۡنَ...الآیۃ

اگرچہ اس آیت کا ظاہری روئے سخن بعض احبار یہود کی طرف ہے (جس طرح آیت ۱۵۹ کا ظاہری روئے سخن اکابر نصاریٰ اور احبار یہود کی طرف تھا) مگر تنقیح مناط کے طور پر یہ تہدید ہر اس گروہ اور ہر اس فرد کو شامل ہے جو احبار یہود کی طرح ''تھوڑے درہم'' لے کر احکام خداوندی کو چھپائے یا ان میں تغیر و تبدل کرے۔ یا ان میں کسی قسم کی کوئی ترمیم و تنسیخ کرے۔

علماء سوء کے کردار پر تنقید

بدقسمتی سے ہر دور میں یہ کام علماء سوء کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں ''جب غلط عقائد و نظریات' اور چند غلط رسم و رواج مذہب بن جائیں تو علماء (سوء) کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں اللہ کا حکم جانتے ہوئے بھی اس کے اعلان سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ عوام سے کٹ جائیں گے جن کے درمیان مقبولیت حاصل کر کے وہ ''بڑے'' بنے ہوئے ہیں۔ گمراہ عوام سے مصالحت اگرچہ دنیا میں انہیں

عزت اور دولت دے دیتی ہے۔مگر اللہ کی نظر میں ایسے لوگ بدترین مجرم ہیں۔حق کو مصلحت کی خاطر چھپانا' ان لغزشوں میں سے نہیں ہے جن سے اللہ آخرت میں درگزر فرمائے گا بلکہ یہ وہ جرائم ہیں جو آدمی کو اللہ کی نظر عنایت سے محروم کردیتے ہیں۔ان میں بھی زیادہ برے وہ لوگ ہیں جن کے سامنے حق پیش کیا جائے اور وہ اعتراف کرنے کی بجائے اس میں بے معنی بحثیں نکالنے لگیں۔ایسے لوگوں کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہیں اور بالآخر وہ حق سے اتنا دور ہوجاتے ہیں کہ کبھی اس کی طرف نہیں لوٹتے۔''(تذکیر القرآن)

علماء حق کے کردار کی تعریف

یہی وجہ ہے کہ احتجاج طبرسی میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے علماء کی فضلیت میں جو ایک طویل حدیث مروی ہے اس کے آخر میں امام فرماتے ہیں کہ'' ذالك بعض فقهاء الشيعه لا كلهم ''۔ان صفات کے حامل صرف بعض فقہاء شیعہ ہیں۔سب نہیں۔جو بعض علماء گردوپیش کے ناملائم و نامساعد حالات سے آنکھیں بند کرکے اپنا فرض منصبی اور وظیفہ شرعی ادا کررہے ہیں اور قوم کے جہال وضلال کی نہ صرف ناراضگی مول لے رہے ہیں بلکہ ان کی گالیاں کھا کر بھی شکر خالق ادا فرمارہے ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

'' جو علماء سوء یہود کے علماء واحبار جیسا کردار ادا کریں گے ان کا انجام بھی انہیں جیسا ہوگا ''(احتجاج طبرسی)

کوئی کوتاہ اندیش یہ خیال نہ کرے کہ یہاں تو تھوڑے دام لے کر یہ کام کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے' لہٰذا اگر کوئی زیادہ دام لے کر ایسا کرے تو وہ مورد الزام نہیں ہوگا۔۔۔کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آیات الٰہی کو چھپا کے اور احکام خداوندی میں تغیر و تبدل کرکے جو بڑی سے بڑی قیمت بھی حاصل کی جائے وہ دینی مفاد اور اخروی ثواب کے مقابلہ میں (جو ہاتھ سے چلا گیا ہے) تھوڑی ہی ہے۔اور دین فروشی کے عوض جو دنیا آتی ہے وہ آگ ہے جو یہ لوگ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں۔بِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

آیات القرآن

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ
لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۱۷۶ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓٮِٕكَةِ
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآٮِٕلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ
فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓٮِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ
وَاُولٰٓٮِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۱۷۷

ترجمۃ الآیات

یہ (سب کچھ) اس لئے ہے کہ خدا نے حق اور سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تھی مگر وہ لوگ جنہوں نے اس میں اختلاف کیا (طرح طرح کی باتیں کیں) بے شک وہ بڑی تفرقہ اندازی اور فتنہ پروری میں پڑ گئے ہیں (اور ضد میں بہت دور جا چکے ہیں) (۱۷۶) نیکی صرف یہی تو نہیں ہے کہ تم (نماز میں) اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو۔ بلکہ (حقیقی) نیکی تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر، روز آخرت پر، فرشتوں پر، (اللہ کی) کتابوں پر اور سب پیغمبروں پر ایمان لائے۔ اور اس (خدا) کی محبت میں اپنا مال (باوجود مال کی محبت کے) رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور (غلاموں، کنیزوں اور مقروضوں کی) گردنیں چھڑانے میں صرف کرے، نماز قائم کرے زکوٰۃ ادا کرے۔ (دراصل) نیک لوگ تو وہ ہوتے ہیں کہ جب کوئی عہد کرلیں تو اپنا عہد و پیمان پورا کرتے ہیں اور تنگ دستی ہو یا بیماری اور تکلیف ہو یا ہنگام جنگ ہو وہ بہر حال ثابت قدم رہتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو (سچے) ہیں اور یہی متقی و پرہیز گار ہیں۔ (۱۷۷)

تشریح الالفاظ

(۱) الباساء　　اس کے معنی ہیں شدت، محتاجگی اور بھوک

(۲) الضرّاء　　اس کے معنی ہیں سختی، قحط اور تنگ حالی

تفسیر الآیات

ظاہری اعمال اور اصل مقاصد کا تذکرہ

لَيْسَ الْبِرَّ...الآية

ہر دین و مذہب میں کچھ ظاہری اعمال و عبادات ہوتے ہیں اور کچھ حقیقی مقاصد اور یہ ظاہری اعمال ان حقیقی مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کی بجا آوری نہایت ضروری ہوتی ہے۔ جب تک کوئی قوم صحیح دین کا دامن تھامے رہتی ہے وہ ان ظاہری اور حقیقی مقاصد ہر دو کو پیش نظر رکھتی ہے اور دونوں کو اہمیت دیتی ہے۔ مگر جب دین کا ولولہ سرد پڑ جائے تو پھر صرف ظاہری اعمال پر زیادہ توجہ دیتی ہے اور اصل مقاصد آنکھوں سے اوجھل ہونے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح ان ظاہری اعمال سے اصل مقاصد تک پہنچنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہری اعمال بے جان رسوم ہو کر رہ جاتے ہیں اور غلط اندیش قوم اپنی رسوم کی بجا آوری کو سب سے بڑی نیکی سمجھنے لگتی ہے۔۔۔ اور حقیقی مقاصد سے غافل و ساہل ہو جاتی ہے۔ مثلاً اقامہ صلوٰۃ کا اصلی مقصد بدی اور بے حیائی سے روکنا ہے اور روزہ کا حقیقی مقصد روزہ دار کے اندر تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا اگر نماز آدمی کو برائی اور بے حیائی سے نہیں روکتی اور روزہ انسان کے اندر جو ہر تقویٰ پیدا نہیں کرتا تو یہ ایک ایسا جسد ہے، جس میں روح نہیں ہے۔ یا ایک ایسا پھول ہے جس میں خوشبو نہیں ہے۔ لھذا ''لیس البرّ'' کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مقررہ سمت کی طرف رخ کرنا نیکی ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ نیکی صرف اسی میں منحصر نہیں ہے کہ سارا زور اسی پر صرف کیا جائے کہ منہ ادھر کرنا ہے یا ادھر؟ گویا کہ لوگوں نے سارا دین اسی میں منحصر کر دیا ہے۔ گویا شریعت کا کوئی اور حکم ہے ہی نہیں۔

زندہ قومیں اصل مقاصد پر زیادہ توجہ دیتی ہیں

بے شک یہ نیکی ہے مگر اس کے علاوہ بھی کچھ نیکی و اطاعت کے کام ہیں جو حقیقی مقاصد ہیں اور وہ زیادہ

توجہ کے مستحق ہیں............وہ اصلی مقاصد کیا ہیں؟ آگے وہ بڑی وضاحت اور خاص ترتیب سے بیان فرمائے جارہے ہیں۔ گویا اسلام کی ساری تعلیم ان چار عنوانوں کے تحت درج کی جاسکتی ہے۔ ۱۔عقائد ۲۔عبادات ۳۔معاملات ۴۔اور اخلاق۔

چنانچہ ''من امن سے لے کر'' النبیین'' تک اسلامی عقائد کا بیان ہے'' اتی المال '' سے'' وفی الرّقاب'' تک معاملات کا تذکرہ ہے'' وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ'' میں اسلامی عبادات کے دو اہم ارکان بیان کیے گئے ہیں اور'' والموفون یعھدھم '' سے'' وحین الباس '' تک ضابط اخلاق کی پابندی کا تذکرہ ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم ایک ایسا مکمل اور بے مثل دستور حیات رکھنے والی اس قوم کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرماوے(ضیاء القرآن)

مخفی نہ رہے کہ یہاں رشتہ داروں اور یتیموں ومسکینوں پر جس مال کے خرچ کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے' وہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کا ذکر تو اس کے بعد صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

'' علی حبه'' کی ضمیر کے مرجع میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا مرجع اللہ کو قرار دیا ہے۔ جو'' من امن نا اللہ'' میں مذکور ہے۔ گو بعید ہے۔ اس بنا پر ترجمہ یہ ہوگا یعنی وہ خدا کی محبت میں یعنی خوشنودی خدا کی خاطر مال خرچ کرتے ہیں۔ اس میں ان کی کوئی نفسانی غرض از قسم نام ونمود شامل نہیں ہوتی۔۔ اور بعض نے اس کا مرجع مال کو قرار دیا ہے۔ جو کہ قریب ہے اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ'' باوجود مال کی محبت کے اسے صرف کرتے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسے ارشاد قدرت ہے۔''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ''(سورہ اٰلِ عمران آیت۔ ۹۲) یعنی تم اس وقت تک نیکی کو حاصل نہیں کرسکتے جب تک تم اپنا محبوب مال (راہ خدا میں) خرچ نہ کرو۔

چونکہ یہاں کسی معصوم علیہ السلام کا ارشاد نہیں مل سکا لہٰذا کسی قول کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ واللہ العالم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔'' من عمل بھذہ الا یۃ فقد استکمل الایمان ''۔ یعنی جو شخص اس آیہ مبارکہ پر عمل کرے وہ کامل الایمان ہے(تفسیر صافی) واولئك ھم المتقون۔

اسلامی قصاص اور دور جاہلیت والے قصاص میں موازنہ؟

اسلام سے پہلے بھی عربوں میں قصاص رائج تھا۔ مگر اس میں کئی قسم کی خرابیاں تھیں مثلاً اس میں قاتل و مقتول کی حیثیت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اور ذات میں اونچ' نیچ کی تفریق روا رکھی جاتی تھی کہ اونچی ذات اور قوت و مال والے اپنے غلام کے عوض دوسرے نیچ قبیلہ کے آزاد کو' عورت کے بدلے مرد کو قتل کرتے تھے۔

دوسری خرابی یہ تھی کہ جاہل قوموں میں رواج تھا کہ جب کوئی ان کی قوم کے کسی آدمی کو قتل کر ڈالتا تھا تو وہ جوش میں آ کر صرف قاتل پر ہی بس نہیں کرتے تھے بلکہ قاتل کی قوم کا جو شخص مل جاتا اسے قتل کر دیتے تھے۔ تیسری خرابی یہ تھی کہ بڑے آدمی کے عوض صرف قاتل کو قتل کرنا اپنی شان کے خلاف جانتے تھے بلکہ اس کے عوض دوسری قوم کے دس، بیس آدمی قتل کرتے تھے وعلی ھذا القیاس۔ مگر اسلام نے اس ذہنیت کو ختم کرنے کے لیے قصاص کے سلسلہ میں عدم مساوات کو غلط قرار دے دیا۔ اور واضح کیا کہ گنہگار کی بجائے کسی بے گناہ کو قتل کرنا روا نہیں ہے۔ بلکہ اصل قاتل کو ہی قتل کرنا چاہیے۔ خواہ وہ آزاد ہو یا غلام مرد ہو یا عورت۔ یعنی قصاص میں آزادی وغلامی اور مرد وعورت میں مساوات ضروری ہے۔ پھر

مقتول کے وارثوں کو قصاص لینے یا خون بہا لینے، مکمل معاف کرنے یا جزوی معافی دینے کا اختیار دیا گیا ہے پھر جزوی معافی کے احکام بھی بیان کیے کہ اگر مقتول کا وارث قصاص سے دست بردار ہو گیا ہے۔ تو وہ دیت کا مطالبہ کرنے میں سخت گیری نہ کرے اور جسے معاف کیا گیا ہے (قاتل) وہ بھی خون بہا ادا کرنے میں لیت ولعل نہ کرے اور بلا وجہ تاخیر نہ کرے۔ یہ قانون قصاص میں خوشگوار تبدیلی ہے۔

مخفی نہ رہے کہ یہ قصاص صرف قتل عمد میں ہوتا ہے قتل خطاء اور قتل شبیہ بعمد میں نہیں ہوتا بلکہ ان ہر دو قسم میں صرف دیت واجب ہوتی ہے............ نیز یہ بھی واضح رہے کہ مقتول کے وارثوں کے لئے قانون کو ہاتھ میں لینا جائز نہیں ہے کہ خود قاتل کو مار ڈالیں۔ بلکہ باجماع امت شرعی عدالت کی طرف رجوع کر کے حاکم شرع یا اس کے نائب کے ہاتھ سے سزا دلوائیں گے کیونکہ وہی اس کے تمام احکام وجزئیات سے آگاہ ہے اور کوئی شخص اجراء کا مجاز نہیں ہے۔ قصاص کے دیگر تفصیلات فقہی کتابوں میں مذکور ہیں ان کی طرف رجوع کیا جائے۔

آیات القرآن

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ
فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ
فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ

عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

ترجمۃ الآیات

اے ایمان والو! ان کے بارے میں جو (ناحق قتل کر دیئے گئے ہوں) تم پر قصاص (خون کا بدلہ خون) لکھ دیا گیا ہے یعنی آزاد کے بدلے آزاد' غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ ہاں جس (قاتل) کے لیے اس کے (ایمانی) بھائی (مقتول کے ولی) کی جانب سے کچھ (قصاص) معاف کر دیا جائے تو اس (معاف کرنے والے) کو (چاہیے کہ) نیکی کا اتباع کرے (خون بہا کا مطالبہ کرنے میں سختی نہ کرے) (اور جسے معاف کیا گیا ہے اسے بھی چاہیے کہ) خوش اسلوبی کیساتھ (خون بہا) ادا کرے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت و رحمت (اور آسانی و مہربانی) ہے۔ پس اس کے بعد بھی جو زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے (۱۷۸) اے صاحبان عقل! تمہارے لئے قصاص یعنی جان کے بدلے جان والے قانون میں زندگی ہے تا کہ تم (خون ریزی سے) بچتے رہو (۱۷۹) تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو۔ بشرطیکہ وہ کچھ مال چھوڑے جا رہا ہو تو مناسب وصیت کر جائے اپنے ماں' باپ اور زیادہ قریبی رشتہ داروں کے لیے۔ یہ پرہیزگاروں کے ذمہ حق ہے (لازم ہے) (۱۸۰) جو شخص اس (وصیت) کو سننے کے بعد اس میں ردوبدل کرے تو اس کا گناہ انہی لوگوں پر ہوگا جو ردّ و بدل کریں گے۔ بے شک خدا خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔ (۱۸۱) اب جو شخص کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی (وارث) کی حق تلفی یا گناہ کا خوف محسوس کرے اور

ان (ورثہ) کے درمیان اصلاح (سمجھوتہ) کرادے، تو اس پر (اس ردّ و بدل کرنے کا) کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے (۱۸۲)

تشریح الالفاظ

(۱) القصاص اس کے معنی ہیں جرم کا بدلہ اور انتقام

(۲) کتب علیکم کتب کا صلہ جب علٰی ہو تو اس کے معنی وجوب اور لزوم کے ہوتے ہیں

تفسیر الآیات

فَمَنْ عُفِیَ...الآیۃ۔

اس کا تعلق قصاص معاف کر کے خون بہا لینے پر راضی ہونے والے سے بھی ہے اور قاتل سے بھی (جسے قصور معاف کیا گیا ہے) یعنی اگر معاف کرنے والے نے معافی کے بعد جذبہ انتقام کے تحت قاتل کو قتل کر دیا تو یہ دردناک عذاب کا مستحق ہوگا اور اگر قاتل نے اس عہد و پیمان کو پورا نہ کیا جس کی بنا پر اسے معافی دی گئی تھی تو وہ بھی اسی سزا کا مستوجب ہوگا۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ قانون قصاص جسم و جان کی طرح انسانی اعضاء و جوارح میں بھی جاری ہے یعنی اگر کوئی کسی کو جان سے نہ مارے بلکہ صرف زخم لگائے تو اس کے بدلے میں اسے بھی زخم لگایا جائے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ...الآیۃ

ان الفاظ میں خدائے حکیم نے قصاص کا فلسفہ بیان فرمایا ہے کہ اس میں لوگوں کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ بیشک قصاص میں قاتل کی جان ضرور جاتی ہے مگر اس سخت قانون کی وجہ سے بہت سی جانیں بچ جاتی ہیں اور یہ نہ رکنے والا سلسلہ یکدم رک جاتا ہے۔ کیونکہ جب ہر شخص کو یہ معلوم ہوگا کہ اگر اس نے کسی کو قتل کیا تو اس کے عوض اس کی گردن بھی اڑا دی جائے گی تو اس خوف و بیم کی وجہ سے اوروں کی زندگی بچ جائے گی۔ اور اگر قاتل کو سزا نہ دی گئی تو اس کا حوصلہ اور بڑھے گا اور کل کلاں اور لوگوں کو بھی قتل کرے گا بلکہ مجرمانہ ذہنیت والے دوسرے لوگوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوگی۔ وہ بھی قتل و غارت کا بازار گرم کر دیں گے لیکن اگر قاتل اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا تو وہ دوسروں کے لئے بھی نشانِ عبرت بن جائے گا۔ اور وہ اس کا عبرت ناک انجام دیکھ کر اپنے مذموم ارادوں سے

باز آجائیں گے اور اس طرح بے شمار معصوم جانیں قتل وغارت ہونے سے بچ جائیں گی۔ اور" **ولکم فی القصاص حیوٰۃ** " کی عملی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ شریعت کی سزائیں تین قسم کی ہیں (۱) حدود (۲) دیّات (۳) قصاص۔ یہاں قصاص اور اس کے بعض احکام کا تذکرہ کیا گیا ہے مناسب مقام پر باقی ہر دو قسموں کا بھی تذکرہ کیا جائے گا۔ انشاءاللہ۔

اسلام میں وصیت کرنے کی اہمیت

کُتِبَ عَلَيۡكُمۡ ...الآیۃ

کتب علیکم کا لفظ **کتب علیکم القصاص** اور **کتب علیکم الصّیام** کی مانند ہے اور اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ وصیت کرنا بھی واجب ہے مگر باتفاق تمام اہل اسلام مالی وصیت کرنا سنت موکدہ ہے واجب نہیں ہے۔ (مجمع البیان)۔ لہٰذا علماء وفقہاء نے ظاہری الفاظ سے ہٹ کر فتوی دیا ہے تو" داخلی وخارجی قرائن" کی بنا پر ہی دیا ہوگا۔ بہرحال اسلام نے موت کے آثار ظاہر ہونے سے قبل ہوش وحواس کی قائمی کی صورت میں وصیت کرنے پر بڑا زور دیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں تک فرمایا ہے:

"جو شخص وصیت کے بغیر مرجائے اس کی موت جہالت کی موت ہے"۔

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص مرتے وقت اچھی وصیت نہ کرے۔ یہ اس کی عقل ومروت میں نقص کی دلیل ہے"۔

اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"مسلمان کو چاہیے کہ جب رات کے وقت سوئے تو اس کا وصیت نامہ اس کے تکیہ کے نیچے ہو" (مجمع البیان)۔

اس سے بڑے بڑے فتنوں کا سدباب ہو جاتا ہے جو وصیت نہ کرنے کی وجہ سے بعض اوقات وارثوں میں رونما ہوتے ہیں اور بعض اوقات کشت وخون تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے اسلام نے مرنے والے کو وصیت کرنے کا اختیار دیا ہے کہ اپنے مال کے ایک تہائی حصہ تک جس کو چاہے، دے سکتا ہے۔ لہٰذا دادا اپنے یتیم پوتوں کے لئے۔ شوہر اپنی بیوہ کیلئے۔ سکنی اور زرعی جائیداد میں سے وصیت کرسکتا ہے تاکہ یتیم پوتے اپنے دادا کی جائیداد سے اور بیوہ اپنے شوہر کی جائیداد سے حصہ لے سکے اور گزربسر اوقات اور رہائش کیلئے مرنے

والے کے وارثوں کے رحم وکرم پر نہ رہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباء طاہرین کے سلسلہ سند سے حضرت امیر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں فرمایا:

''جو شخص اپنی موت کے وقت اپنے ان رشتہ داروں کیلئے جن کو وراثت نہیں ملتی' کوئی وصیت نہ کر جائے اس نے اپنا خاتمہ خدا کی نافرمانی پر کیا'' (مجمع البیان' تفسیر عیاشی و نور الثقلین)۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ آیت میراث ہے مگر عند التحقیق یہ خیال صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ایسا تب ہوتا ہے کہ جب دو آیتوں پر عمل کرنا ناممکن ہو۔ مگر یہاں تو ایسا نہیں ہے کیونکہ وصیت اور وراثت میں کوئی منافات نہیں ہے جن کا وراثت میں حصہ معین ہے جیسے والدین ان کے حق میں بھی وصیت کی جا سکتی ہے اور اس پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔

نیز اگر وصیت منسوخ ہو گئی ہوتی تو اس کا جواز اور وجود بھی ختم ہو جاتا حالانکہ اس کا نہ صرف جواز بلکہ اس کا سنت موکدہ ہونا اتفاقی ہے۔ کما لا یخفی۔

الغرض اس آیت سے شیعی موقف کی تائید ہوتی ہے کہ وارث کے حق میں وصیت کرنا صحیح ہے اور برادران اسلامی کا مسلک اس مسئلہ میں درست نہیں ہے۔ کیونکہ ''لا وصیۃ لوارث'' والی حدیث ثابت نہیں ہے۔ نیز غریبوں' مسکینوں' یتیموں اور بیواؤں کے لئے بھی کچھ وصیت کرنی چاہیے۔ اسی طرح اپنے مال میں سے کچھ حصہ صدقہ جاریہ جیسے مساجد و مدارس کے بنانے و چلانے اور علوم دینیہ کی نشر و اشاعت فرمانے اور اس قسم کے رفاہی کاموں کی انجام دہی کیلئے مخصوص کرنا چاہیے اور اگر صاحب جائیداد ان امور خیّریہ کیلئے کچھ جائیداد وقف کر جائے تو اور بھی بہتر ہے (قوانین الشریعہ)۔

چونکہ اس سے سابقہ آیت میں وصیت میں ردّ و بدل کرنے کی مذمت کی گئی ہے تو یہ اس سے استثناء ہے یعنی جب وصیت حکم شریعت کے مطابق ہو تو اس میں ردّ و بدل کرنا حرام ہے لیکن اگر وہ خلاف شرع ہو کہ اس میں بعض ورثہ کی حق تلفی کی گئی ہو یعنی بعض کے حق میں ہو اور بعض کو محروم کر دیا گیا ہو یا کسی گناہ کے کام کی وصیت کی گئی ہو جیسے شراب خریدنے' یا مندر بنوانے کی۔ تو وصی کے لئے اس میں مناسب تبدیلی کرنا جائز ہے............ الغرض حق کو باطل سے تبدیل کرنا ناجائز اور باطل کو حق سے تبدیل کرنا جائز ہے تا کہ وصیت کرنے والے کے نامہ اعمال میں گناہ نہ لکھا جائے اور وارثوں کے درمیان صلح و صفائی ہو جائے اور خون ریزی تک نوبت نہ آئے۔ (تفسیر قمیؒ)

آیات القرآن

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ
مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ
فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ
تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ
فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ
شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ
الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

ترجمۃ الآیت

اے ایمان والو! روزہ اس طرح تم پر لکھ دیا گیا ہے (فرض کر دیا گیا ہے) جس طرح تم سے پہلے والوں پر لکھ دیا گیا تھا...... تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ (۱۸۳) یہ گنتی کے چند دن ہیں (اس کے باوجود) اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو جائے یا سفر میں ہو۔ تو اتنے ہی دن اور دنوں میں پورے کرے۔ اور جو اپنی پوری طاقت صرف کر کے بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں تو وہ فی روزہ ایک مسکین کی خوارک فدیہ ادا کریں۔ اور جو اپنی مرضی سے کچھ (زیادہ) بھلائی کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر تم (فدیہ دینے کی بجائے) روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم علم و واقفیت رکھتے ہو۔ (۱۸۴) ماہ رمضان وہ (مقدس) مہینہ ہے جس میں قرآن

نازل کیا گیا جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں راہنمائی اور حق و باطل میں امتیاز کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جو اس (مہینہ) میں (وطن میں) حاضر ہو (یا جو اسے پائے) تو وہ روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے ہی روزے کسی اور وقت میں (رکھے)۔ اللہ تمہاری آسانی و آسائش چاہتا ہے تمہاری تنگی و سختی نہیں چاہتا اور یہ بھی (چاہتا ہے) کہ تم (روزوں کی) تعداد مکمل کرو۔ اور اس (احسان) پر کہ اس نے تمہیں سیدھا راستہ دکھایا تم اس کی کبریائی و بڑائی کا اظہار کرو۔ تاکہ تم شکرگزار (بندے) بن جاؤ۔ (۱۸۵)

تشریح الالفاظ

(۱) جنفًا — اس کے معنی ہیں ظلم اور حق سے روگردانی۔

(۲) الفرقان — فرقان کے معنی میں وہ چیز جس سے حق و باطل میں امتیاز ہو۔

تفسیر الآیات

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ ...الآیة

صوم شریعت مقدسہ میں ایک خاص عبادت کا نام ہے۔ متعدد اخبار و آثار سے یہ حقیقت واضح و آشکار ہوتی ہے کہ نماز اور روزہ دو ایسی عبادتیں ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں ہر شریعت میں واجب رہی ہیں۔ اس آیت میں ''كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ '' کہہ کر جو تشبیہ دی گئی ہے وہ اصل وجوب صوم میں ہے اس کے حدود و قیوم اور جملہ شرائط و کوائف میں تشبیہ دینا مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں ردّ و بدل ہوتا رہا ہے۔

روزہ کا وجوب اور اس کا فلسفہ

اس خاص عبادت کے وجوب کی غرض وغایت وہی ہے جو دوسری اسلامی عبادات کے وجوب کی ہے۔ جو ''لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'' میں بیان کی گئی ہیں کہ تم متقی و پرہیزگار بن جاؤ یعنی خواہشات نفس پر کنٹرول کرو اور زندگی کے حرکات و سکنات میں نظم و ضبط پیدا کرو جو کہ تقویٰ کا نتیجہ ہے اور مہینہ بھر کی اس مشق کی غرض وغایت یہی ہے کہ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں بھی اسی طرح ورع و تقوٰی اختیار کرو۔ بہر حال روزہ نہ صرف ایک اہم اسلامی عبادت ہے بلکہ ان ضروریات اسلام میں سے ہے کہ جن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج متصور ہوتا ہے اور

جو اسے واجب سمجھ کر نہ رکھے وہ فاسق ہے اور مستحق تعزیر ہے اور اگر پھر بھی ترک کرے تو دوبارہ بھی تعزیر جاری کی جائے گی اور اگر سہ بارہ ایسا کرے تو قتل کر دیا جائے گا۔ ہاں احوط یہ ہے کہ چوتھی بار قتل کیا جائے۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰاتٍ...الآیۃ

اس آیت مبارکہ میں خدائے مہربان نے لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ روزے ہمیشہ کیلئے نہیں ہیں بلکہ گنتی کے چند دن (ایک ماہ) ہیں اور پھر ان چند دنوں میں اگر کوئی خاص عذر درپیش ہو جائے تو صاحب عذر کو رخصت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور وہ عذر دو ہیں۔ (۱) ایک بیماری ہے خواہ روزہ رکھنے سے پیدا ہو یا اس کے بڑھ جانے کا خطرہ ہو یا تندرستی کے حصول میں تاخیر کا اندیشہ ہو............دوسرا سفر ہے جو بقدر مسافت ہو (۴۳ کلومیٹر)۔ اور شرعی ہو یعنی کسی خلاف شرع کام کرنے کیلئے نہ کیا گیا ہو ان صورتوں میں روزہ کا ترک کرنا لازم ہے اور جتنے دن کے روزہ نہیں رکھے جائیں گے، عذر کے برطرف ہو جانے کے بعد اتنے دنوں کی قضاء کرنا واجب ہوگی۔ اس موضوع کی دیگر تفصیلات فقہی کتابوں میں مذکور ہیں ان کی طرف رجوع کیا جائے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ...الآیۃ

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مفسرین نے عجیب وغریب بوقلمونیاں دکھائی ہیں اور قلابازیاں کھائی ہیں ان کے نقل کرنے اور ان پر تنقید و تبصرہ کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم صرف اصلی مقصد کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو یہ ہے کہ شرع اقدس کے مزاج شناسوں پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ "**وسع**" اور "**طاقت**" دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور یہ کہ شرعی احکام وسع پر مبنی ہیں یعنی ان میں وسعت اور آسائش ہے۔ ہم پچاس نمازیں پڑھ سکتے ہیں مگر خدائے مہربان نے چوبیس گھنٹوں میں صرف پانچ نمازیں واجب کیں۔ ہم چھ ماہ کے روزے رکھ سکتے ہیں مگر رحیم و کریم خدا نے صرف ایک ماہ کے روزے فرض قرار دیئے۔ سرمایہ دار لوگ ہر سال حج کر سکتے ہیں مگر رؤوف و رحیم خدا نے زندگی میں صرف ایک بار حج واجب قرار دیا......اور جہاں صورت حال یہ ہو کہ کسی حکم کی تعمیل میں وسعت نہ ہو بلکہ پوری طاقت و قوّت صرف کرنی پڑے تو وہاں شرعی تکلیف ساقط ہو جاتی ہے جیسے بوڑھا مرد، بوڑھی عورت، حاملہ عورت، مرضعہ (دودھ پلانے والی) اور ذوالعطاش (جسے پیاس کی بیماری ہو) کہ جن کیلئے روزہ رکھنا مشقت کا باعث ہے اور سخت مشکل ہے لیکن اگر اپنی پوری طاقت و قوت صرف کریں تو روزہ رکھ سکتے ہیں............تو یہاں روزہ کا وجوب ختم ہو جاتا ہے اور فی روزہ کے حساب سے ایک مد طعام فدیہ دینا پڑتا ہے بنابریں یہ حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ یہ رعایت آج بھی بحال ہے اور قیامت تک برقرار رہے گی مگر اس رعایت کے باوجود فدیہ دینے کی نسبت روزہ رکھنا افضل ہے (تفسیر عیاشی و نور الثقلین وغیرہ)۔

ماہ رمضان کی فضیلت اور نزول قرآن کی کیفیت

شَهْرُ رَمَضَانَ...الآية

اس آیت مبارکہ میں ان ''ایاماً معدودات'' کی تفصیل ہے کہ وہ گنتی کے دن ماہ رمضان ہے۔ جس میں قرآن مجید نازل ہوا............سورہ دخان میں ہے کہ یہ ایک بابرکت رات میں نازل ہوا............سورہ قدر میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ وہ برکت والی رات لیلۃ القدر ہے جس میں قرآن نازل ہوا............ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن پورے ماہ رمضان میں نہیں بلکہ اس کی ایک رات میں نازل ہوا مگر واقعات بتاتے ہیں کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے پورے تیئیس سال کی مدت دراز میں نازل ہوا۔ چنانچہ بعض اخبار و آثار کے مطابق روایت و درایت میں اس طرح جمع و توفیق کی گئی ہے کہ لیلۃ القدر میں یک بارگی لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف نازل ہوا......اور وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے حالات و واقعات کے مطابق تیئیس سال کی مدت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ (تفسیر مجمع البیان)

یا ماہ رمضان کی لیلۃ القدر میں قرآن نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس تاریخ سے نزول قرآن کا آغاز ہوا (مجمع البیان و تفسیر کاشف)۔

قرآن کسی خاص قوم و قبیلہ اور کسی خاص ملک و ملت کیلئے نہیں بلکہ (هُدًى لِّلنَّاسِ) تمام بنی نوع انسان کیلئے ذریعہ رشد و ہدایت ہے اور وسیلہ حق و صداقت ہے اور اسی مقدس مہینہ میں وہ مقدس رات ہے جو ایک ہزار مہینہ سے افضل ہے۔ لہٰذا یہ مہینہ اس لائق ہے کہ منعم حقیقی کی سپاس گزاری میں گزارا جائے یعنی اس کے دنوں میں روزہ رکھا جائے اور رات عبادت خدا میں بسر کی جائے اور شب و روز میں قرآن مجید کی تلاوت کی جائے۔ اسی لئے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ ''لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'' (تا کہ تم خدا کے شکر گزار بندے بن جاؤ)۔

فَمَنْ شَهِدَ...الآية

چونکہ لفظ ''شھد'' دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک حاضر ہونا۔ اور دوسرا معائنہ کرنا اور اطلاع پانا (المنجد)۔ اس لئے اس آیت کے معنی میں اختلاف واقع ہوا ہے اور ہم نے دونوں معنی لکھ دیئے ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ پورے ماہ رمضان کے روزے اس شخص پر واجب ہوں گے جو پورا مہینہ وطن میں حاضر رہے گا......(کیونکہ مسافر سے روزہ کا وجوب ساقط ہے) اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ جو ماہ رمضان کو پائے (اس کا بچشم خود معائنہ کرے) یا اسے شرعی شہادت (دو عادل گواہوں کی گواہی)

سے یا شیاع سے اس ماہ کی آمد کی اطلاع مل جائے اور اسے اس سے آگاہی حاصل ہو جائے اس پر روزہ رکھنا واجب ہو جائے گا۔

آیات القرآن

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا
دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ
لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ
لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ
لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ
وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمۃ الآیات

اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (آپ کہہ دیں) میں یقینا قریب ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا و پکار کو سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ تو ان پر لازم ہے کہ وہ میری آواز پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں (یقین رکھیں) تاکہ وہ نیک راستہ پر آجائیں۔ (۱۸۶) (اے مسلمانو) روزوں کی رات تمہارے لئے اپنی عورتوں سے مباشرت کرنا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ (عورتیں) تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو خدا جانتا ہے کہ تم اپنی ذات کے ساتھ خیانت کرتے رہے ہو تو اس

نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف کر دیا۔ پس اب تم ان سے (روزوں کی راتوں میں) مباشرت کرو۔ اور جو کچھ (اولاد) خدا نے تمہارے مقدر میں لکھ دی ہے اسے طلب کرو۔ اور (رات کو) کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کا سفید ڈورا (رات کی) سیاہ ڈوری سے الگ ہو کر ظاہر ہو جائے پھر رات تک روزہ کو پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف (قیام) کئے ہوئے ہو تو (رات کو بھی) بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ اس طرح خدا اپنی آیتوں (احکام) کو لوگوں کیلئے بیان کرتا ہے تا کہ وہ پرہیز گار بن جائیں (۱۸۷)

تشریح الالفاظ

(۱) یرشدون　　یہ رشد سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ہدایت اور راہ حق پر برقراری

(۲) الرّفث　　اس کے معنی ہیں فحش کام و کلام اور یہاں مراد مباشرت ہے

تفسیر الآیات

وَإِذَا سَأَلَكَ...الآية

اس آیت مبارکہ کی شان نزول کے بارے میں دو روایتیں وارد ہیں ایک یہ ہے کہ ایک شخص نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ آیا خدا قریب ہے تا کہ اس سے مناجات کریں (راز و نیاز کی باتیں کریں) یا بعید ہے تا کہ اسے پکاریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی...... دوسری یہ کہ ایک گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ ہم کس طرح خدا سے دعا و پکار کریں؟۔ اس پر خداوند عالم نے یہ آیت نازل کی کہ میں یقیناً قریب ہوں لہٰذا جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا و پکار کو سنتا بھی ہوں اور جواب بھی دیتا ہوں (مجمع البیان)

صاحب تفسیر کاشف نے یہاں بڑے پتے کی بات کی ہے کہ "صح اولم یصح یتناسب بالموضوع" روایت صحیح ہو یا غیر صحیح البتہ موضوع سے مناسبت ضرور رکھتی ہے۔

دعا نہ صرف عبادت ہے بلکہ عبادت کا مغز ہے

دعا نہ صرف عبادت بلکہ ''مخ العبادت ''یعنی عبادت کا مغز ہے(عدۃ الداعی)
خداوند عالم نے از روئے تکبر و بڑائی دعا سے روگردانی کرنے والوں کو جہنم کی وعید و تہدید کی ہے فرماتا ہے ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ''(سورہ مومن آیت۔۶۰)۔قرآن وسنت میں اس کی بڑی فضیلت اور تاکید وارد ہوئی ہے البتہ یہاں ایک ایراد کیا جاتا ہے کہ خدائے رحیم و کریم نے اس آیت میں بھی اور آیت مبارکہ ''ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ''میں بھی قبولیت دعا کا وعدہ کیا ہے۔مگر مشاہدہ شاہد ہے کہ ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو دعا کرتے ہیں مگر ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے کے وجوہ

اس ایراد کے کئی جوابات دیئے جاسکتے ہیں مثلاً ایک جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں جب تک ان کو مدنظر نہ رکھا جائے اس وقت تک اس چیز کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔منجملہ ان کے ایک قاعدہ یہ ہے کہ اللہ نے کچھ عہد و پیمان بندوں سے لئے ہیں (کہ اس کی عبادت و اطاعت کریں) اور کچھ عہد و پیمان خود بندوں سے کئے ہیں چنانچہ فرماتا ہے''اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ''(سورہ بقرہ آیت۔۴۰)۔تم مجھ سے کئے ہوئے وعدے پورے کرو میں تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کروں گا......پس''اذا فات الشرط فات المشروط''۔
دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بندہ اپنی لاعلمی اور کم فہمی کی بنا پر جس چیز کا خدا سے سوال کرتا ہے وہ چیز بندہ کیلئے مضر ہوتی ہے اس لئے باوجود اس کی الحاح وزاری کے خدا اس کی خیرخواہی کیلئے وہ چیز اسے عطا نہیں کرتا ارشاد قدرت ہے''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶ (سورہ بقرہ آیت۔۲۱۶)''۔کیونکہ وہ بہتر جانتا ہے کہ بندہ کیلئے مفید کیا ہے اور مضر کیا ہے؟
تیسرا جواب یہ ہے کہ بندہ دعا تو کرتا ہے مگر استجابت دعا کے شرائط کا خیال نہیں کرتا لہٰذا وہ موثر نہیں ہوتی۔اس سلسلہ کے بڑے بڑے شرائط دو ہیں۔۱۔صدق المقال ۲۔اکل حلال۔جب ان شرائط کا خیال نہ رکھا جائے تو دعا قبول نہیں ہوتی۔

قرآن تو قرآن دعاؤں میں بھی ہے تاثیر
جو ہر جو نہیں کھلتا یہ تو عامل کی ہے تقصیر

اور چوتھا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات اس لئے بھی دعا جلد قبول نہیں ہوتی کہ خدا کو بندہ کی آواز اچھی لگتی ہے اس لئے وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ بندہ دعا و پکار کرتا رہے اور خدا سنتا رہے۔ الی غیر ذالك من الاجوبه

نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دعا و ذکر خدا خفیہ اور آہستہ کرنا چاہیے کیونکہ دعا و ذکر میں آواز بلند کرنا شرعاً پسندیدہ فعل نہیں ہے۔

ماہ رمضان کی راتوں میں بیویوں سے مباشرت کرنا جائز ہے

اُحِلَّ لَکُمْ ...الآیة

اکثر مفسرین بیان کرتے ہیں کہ اوائل اسلام میں دن کی طرح رات کے وقت بھی ماہ رمضان میں عورتوں سے مباشرت حرام تھی۔ اور ایک بار سو جانے کے بعد کھانا بھی حرام ہو جاتا تھا مگر بعض مسلمان اس حکم پر عمل نہ کر سکے اور چوری چھپے اپنی بیویوں سے صحبت کر کے اس حکم کی مخالفت کی۔ (مجمع البیان عن الصادق علیہ السلام)

جن میں بعض اکابر صحابہ کے نام بھی نظر آتے ہیں (تفسیر کبیر)

اور بعض مفسرین نے یوں لکھا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دنوں میں روزہ دار کو افطار کے بعد جب تک نماز عشاء نہ پڑھ لے اور سو نہ جائے کھانا پینا اور جماع کرنا جائز تھا اور جب نماز عشاء پڑھ لیتا یا روزہ افطار کر کے ایک بار سو جاتا تو پھر اس کیلئے یہ چیزیں ممنوع ہو جاتی تھیں جس طرح کہ اب صبح صادق کے بعد ممنوع ہوتی ہیں (تفسیر حقانی)۔

بہرحال جب بعض مسلمان اس حکم پر عمل نہ کر سکے اور اس کی خلاف ورزی کی تو خدائے مہربان نے تخفیف کر دی اور حکم کو منسوخ کر دیا اور کھانے پینے کی طرح رات کو مباشرت کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ اور جن لوگوں نے خیانت کر کے اس حکم کی خلاف ورزی کی تھی' ان کی توبہ قبول کر کے' ان کو معافی کی بشارت بھی دے دی۔ اور ان کو ہدایت کی کہ یہ مباشرت صرف لذت نفس کیلئے نہیں ہونی چاہیے (گو وہ بھی جائز ہے) اور اس مباشرت و مقاربت سے اصل مقصد بقاء نسل اور طلب اولاد ہونا چاہئے جو نظام بشری کی بقاء کیلئے ضروری ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم بطور امتحان تھا جس کا نتیجہ ناکامی کی شکل میں سامنے آنے کے بعد اسے ختم کر دیا گیا۔

مرد و عورت میں چولی دامن کا تعلق ہے

هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ ...الآیة

نیز خدائے حکیم نے یہ بھی واضح فرمایا ہے کہ مرد وعورت میں وہ گہرا تعلق ہے کہ گویا عورتیں چولی اور مرد گویا ان کے دامن ہیں اور دونوں ایک دوسرے کیلئے بمنزلہ لباس و پوشاک کے ہیں۔ اس لئے فطرتاً ایک کو دوسرے کے بغیر چین اور سکون نہیں آتا کیونکہ لباس بمعنی سکون ہے جیسا کہ اس آیت۔ ''وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا'' (سورہ نبا آیت۔ ۱۰) میں لباس بمعنی سکون و آرام استعمال ہوا ہے کہ ہم نے رات کو سکون و آرام کیلئے بنایا ہے۔

روزہ کا وقت

وَ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا...الآیۃ

اس آیت مبارکہ میں روزہ کی ابتداء اور انتہا کا وقت بتایا گیا ہے جو صبح صادق سے لے کر رات تک ہے۔ چونکہ صبح کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) صبح کاذب اور (۲) صبح صادق

تو یہاں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ دن کا آغاز صبح صادق سے ہوتا ہے اور انتہا رات پر۔ جو بظاہر تو سورج کے ڈوبنے ہی سے شروع ہو جاتی ہے مگر صحیح معنوں میں سورج کے ڈوبنے کی علامت یہ ہے کہ مشرقی سرخی زائل ہو جائے اور جب تک یہ افق پر موجود رہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہنوز سورج افق پر موجود ہے اور یہ اس کا پرتو ہے............ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ افطاری میں اس قدر تاخیر کی جائے کہ آسمان پر ستاروں کا جال بچھ جائے جیسا کہ بعض خشک مقدس قسم کے لوگ کرتے ہیں کیونکہ بعض اخبار میں اس کی مذمت وارد ہوئی ہے (مجمع البیان)۔

اعتکاف کا بیان

وَاَنْتُمْ عَاکِفُوْنَ...الآیۃ

منجملہ ان امور کے جو شریعت مقدسہ میں مستحب مؤکد ہیں ایک اعتکاف بھی ہے۔ جس کا مطلب بقصد عبادت شب و روز مسجد میں قیام کرنا ہے۔ تاکہ دنیا و مافیہا سے الگ تھلگ ہو کر مکمل یکسوئی، پورے اطمینان قلب و سکون نفس اور حضور دماغ کے ساتھ اپنے مالک و خالق کی عبادت کی جائے۔ جو کم از کم تین دن کیلئے ہوتا ہے اور اس سے کم مدت کیلئے صحیح نہیں ہے اور اس میں شب و روز مسجد میں بسر کرنے پڑتے ہیں اور کسی شرعی غرض اور عادی ضرورت کے بغیر باہر نکلنا جائز نہیں ہوتا اور قضائے حاجت کے بعد واپس لوٹنا واجب ہوتا ہے۔ نیز اس میں روزہ

رکھنا بنیادی شرط ہے اور اس میں رات کے وقت بھی بیوی سے مباشرت کرنا حرام ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض فقہاء کا قول ہے کہ صرف اس مسجد میں اعتکاف جائز ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام علیہ السلام نے نماز پڑھی ہو جیسے مسجد الحرام، مسجد نبوی، مسجد کوفہ اور مسجد بصرہ مگر اشہر واظہر یہ ہے کہ کسی بھی شہر کی جامع مسجد میں جائز ہے۔ اس موضوع کی دیگر تفصیلات فقہی کتابوں میں دیکھی جائیں۔

آیات القرآن

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

ترجمۃ آلالت

اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال غلط طریقہ سے نہ کھاؤ۔ اور نہ ہی (رشوت کے طور پر) وہ (مال) اس غرض سے حکام تک پہنچاؤ تا کہ گناہ کے طور پر لوگوں کا کچھ مال تم بھی خورد برد کر جاؤ۔ درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔ (۱۸۸) (اے رسول) لوگ آپ سے نئے چاندوں کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ وہ گھٹتے بڑھتے کیوں ہیں؟) کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں کے (دنیوی معاملات) کی تاریخیں اور حج کیلئے اوقات مقرر کرنے کا ذریعہ ہیں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ تم گھروں میں پچھواڑے کی طرف سے (پھاند کر) آؤ۔ بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ (آدمی غلط کاری سے) پرہیز گاری اختیار کرے۔ اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور خدا سے ڈرو (اس کے قہر وغضب سے بچو) تا کہ تم فلاح پاؤ (۱۸۹)

تشریح الالفاظ

(۱)بالباطل　　اس سے ناجائز اور ناحق طریقہ سے مال کھانا مراد ہے

(۲)تدلوابها　　یہ ادلاء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کنویں میں ڈول لٹکانا اور کسی کے پاس مال لے جانا

(۳)عن الاهله　　یہ ھلال کی جمع ہے جس کے معنی نئے چاند کے ہیں

(۴)مواقیت　　یہ میقات کی جمع ہے جس کے معنی میں وقت اور وہ وعدہ جس کیلئے وقت مقرر کیا جائے اور وہ جگہ جہاں اجتماع کیلئے وقت مقرر کیا جائے

تفسیر الآیات

شرعی جواز کے بغیر ایک دوسرے کے مال میں تصرف کرنا حرام ہے

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ...الآیۃ۔

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے یہ شرعی قانون بیان کیا ہے کہ شرعی جواز کے بغیر ایک دوسرے کے مال میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے ورنہ وہ ''اکل المال بالباطل'' شمار ہوگا جس میں چوری' ڈاکہ' ظلم وجور' غصب' مکروفریب لہوولعب' جھوٹی قسم' سود' قمار' رشوت خوری اور شعبدہ بازی وغیرہ سے حاصل کردہ مال داخل ہے۔حدیث میں وارد ہے کہ ''لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفسه''یعنی کسی مسلمان کا مال اس کی قلبی رضامندی کے بغیر کسی کیلئے جائز نہیں ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ جب تک کسی ایسے آئین وقانون کے تحت معاملہ نہ کیا جائے جسے شریعت نے معتبر قرار دیا ہے اس وقت تک وہ معاملہ شرعاً صحیح نہ ہوگا اور نہ ہی اس کے تحت مال لینا' دینا مباح ہوگا لہٰذا حکام جور کو رشوت دینا اور اس طرح کسی کا مال ناجائز طریقہ پر دوسروں کو کھلانا اور خود بھی خرد برد کر کے کھانا حرام ہے۔ بالخصوص جب کہ آدمی ان مسائل سے آگاہ بھی ہو تو اس صورت میں حرمت اور بھی مغلظ ہو جاتی ہے۔اور گناہ کی سنگینی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ خداوند عالم جانتا تھا کہ اس امت میں ایسے حکام جور ہوں گے جو حق کے خلاف فیصلے کریں گے اس لئے خدائے حکیم نے اہل ایمان کو ایسے حکام کے پاس اپنے

مقدمات لے جانے کی ممانعت فرمائی ہے(الکافی‘الصافی)

اوراس آیت سے اور دوسری بہت سی روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ حکام جور کی عدالت میں مقدمہ لے جانا حرام ہے اور اگر وہ اس کے حق میں فیصلہ کریں یہاں تک کہ اگر وہ حق بجانب بھی ہو تب بھی اس سے حاصل شدہ مال حرام ہے(الکافی‘الصافی)

لہٰذا اس دور میں اپنے تنازعات علماء اعلام کی خدمت میں اور اگر وہ میسر نہ ہوں تو اہل ایمان کی خدمت میں پیش کر کے ان کا حل نکالنا اور دادرسی کرانا لازم ہے۔

چاند کے گھٹنے بڑھنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ...الآية۔

یہ سوال کرنے والوں کا مقصد چاند کے گھٹنے بڑھنے کے طبیعی علل واسباب معلوم کرنا تھا کہ چاند یکم تاریخ کو قوس کی مانند بالکل باریک ہوتا ہے پھر بڑھتے بڑھتے بدرجہ کامل ہو جاتا ہے بعد ازاں پھر گھٹتے گھٹتے پہلی تاریخ کی مانند ہو جاتا ہے اس کا سبب کیا ہے؟

چونکہ اس سوال کا اصلی جواب ان کی ذہنی سطح اور علمی استعداد سے بہت بلند تھا اور اگر خدا بتا دیتا تو بھی ان کی سمجھ میں نہ آتا اس لئے خدائے علیم وحکیم نے اسے نظر انداز کر کے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت بیان فرمادی۔اوراس کے فوائد کا تذکرہ کرنا کافی سمجھا کہ اس سے اوقات حج معلوم کرنے کے علاوہ لوگوں کی دوسری دینی ودنیوی ضروریات کے اوقات معلوم ہوتے ہیں جیسے بیوہ کی عدت‘ ماہ رمضان کے روزے‘عید فطر اور قرضوں کی ادائیگی وغیرہ وغیرہ۔

شریعت میں شمسی سال مقرر کرنا جائز نہیں ہے

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رجحان کہ روزہ وغیرہ شمسی حساب سے مقرر کیا جائے قرآنی نص کے خلاف ہے۔(فصل الخطاب)

اس مطلب کو سورہ یونس میں یوں بیان کیا گیا ہے ’’قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ‘‘ اور خدا نے اس (چاند) کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو(سورہ یونس آیت۔۵)۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا...الآية

بعض اخبار وآثار سے واضح اور آشکار ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کا یہ دستور تھا کہ وہ احرام کی حالت میں اپنے گھروں کے اندر دروازہ سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پچھواڑے سے نقب لگا کر یا سیڑھی لگا کر داخل ہوتے تھے اور اسی راستے سے باہر نکلتے تھے اور اس عمل کو بڑی نیکی سمجھتے تھے اس آیت میں خداوند عالم نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا ہے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہونے کی ہدایت وراہنمائی فرمائی ہے (مجمع البیان عن الباقر علیہ السلام)۔

اس سے بعض علماء وفقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ اگر تمہیں کوئی دینی سوال کرنا ہو تو جو اس کا مرکز ہے وہاں سے آؤ ادھر ادھر بھٹکتے نہ پھرو۔ غلط راستے اختیار نہ کرو اور ہر کام کو اس راہ سے انجام دو جس طریقہ سے اللہ نے حکم دیا ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متواتر حدیث ''انا مدینة العلم وعلی بابها فمن اراد العلم فلیات الباب''، یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی علیہ السلام اس کا دروازہ ہے اور جو علم حاصل کرنا چاہے اسے دروازہ پر آنا چاہیے۔ اسی ارشاد خداوندی کی طرف ناظر ہے۔ دوسرے آئمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی اسی معنی سے ''ابواب اللہ'' کا لفظ وارد ہوا ہے (فصل الخطاب بحوالہ الاء الرحمن ومجمع البیان)

آیات القرآن

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹۳﴾

ترجمۃ الآیات

اورتم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جوتم سے لڑیں۔اورزیادتی نہ کرو۔کیونکہ یقیناً اللہ زیادتی کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا(۱۹۰)اوران(خواہ مخواہ لڑنے والے کفارومشرکین)کو جہاں کہیں پاؤ۔قتل کردو۔اورانہیں نکال دو جہاں(مکہ)سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔اور فتنہ پروری،قتل سے بھی بڑھ کر(بری)ہے۔اورمسجدالحرام میں'ان سے اس وقت تک نہ لڑو۔ جب تک وہ اس میں تم سے نہ لڑیں۔اوراگروہ(اس میں)تم سے لڑیں توتم بھی انہیں قتل کرو یہی کافروں کی سزا ہے(۱۹۱)پھراگروہ لوگ باز آجائیں تو یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔(۱۹۲)اوران سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک تمام فتنہ وفساد ختم نہ ہو جائے اوردین(واطاعت)صرف اللہ کے لئے نہ رہ جائے ہاں اگروہ جنگ سے باز آجائیں توپھرظلم وزیادتی کرنے والوں کے سوا کسی پرزیادتی نہیں کی جاسکتی(۱۹۳)

تشریح الالفاظ

(۱)**ولا تعتدوا** یہ اعتداء سے مشتق ہےجس کے معنی ہیں ظلم اورزیادتی اورحد سے تجاوز کرنا

(۲)**ثقفتموھم** یہ ثقف سے مشتق ہےجس کے معنی میں فتح مند ہونا اورجا پکڑنا

تفسیر الآیات

جہاد کے اقسام اوران کے احکام

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ...الآیۃ۔

ان آیات مبارکہ میں ہجرت کے بعد جہاد کی اقسام اوران کے احکام بیان کئے جارہے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے جہاد ممنوع تھا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے دین اسلام امن وآشتی،صلح وصفائی'محبت وپیاراوراخوت وہمدردی کا دین ہے اوراس کے تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ''جیو اور جینے دو''یہ لڑائی بھڑائی'جنگ وجدال'قتل وقتال'بغض وعناد اورفتنہ وفساد کا دین نہیں ہے بلکہ وہ فتنہ وفساد پھیلانے کو بد

ترین گناہ و برائی جانتا ہے اس کا ارشاد ہے۔''اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ''(سورہ بقرہ آیت۔۱۹۱)''وَ الْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْل''(سورہ بقرہ آیت۔۲۱۷)مگر اس کے باوجود تین مقامات پر ہتھیار اٹھانے اور لڑنے مرنے کی اجازت دیتا ہے۔

(۱)۔جان' ایمان اور مال و منال وعزت وآبرو کے تحفظ و دفاع کیلئے جب کہ دشمن حملہ آور ہو جس کا تذکرہ اس آیت اور دوسری بعض آیات میں کیا گیا ہے جیسے''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا''(سورہ حج......۳۹)۔وان اللہ علی نصر ھم لقدیر۔

(۲)۔باغیوں کی سرکوبی کیلئے اور آتش فتنہ پردازی کو فرو کرنے کیلئے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔''وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا ج فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰاھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللہ''(سورہ حجرات آیت۔۹)۔یعنی باغی گروہ سے اس وقت تک جنگ وجدال کرو جب تک وہ امر خدا (صلح یا اطاعت) کی طرف رجوع نہ کرے۔

(۳)۔کفر و شرک کو بیخ و بن سے اکھیڑنے کیلئے............ چنانچہ ارشاد قدرت ہے''قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ بِاللہ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللہُ وَرَسُوْلُہٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّ ھُمْ صَاغِرُوْنَ''ان لوگوں سے لڑو جو خدا اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی خدا ورسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام جانتے ہیں اور نہ ہی دین حق سے وابستہ ہیں (اور یہ سلسلہ جاری رکھو یہاں تک کہ) وہ دین حق قبول کریں یا پھر ذلیل ہو کر جزیہ ادا کریں (توبہ آیت۔۲۹)

بھلا جب عالم استعمار و استکبار اپنے شیطانی تسلط او اقتدار کو برقرار رکھنے (یا قائم کرنے) کیلئے لڑتا ہے بے دریغ لوگوں کا خون ناحق بہاتا ہے اور شہروں کو ویران اور آبادیوں کو ویران وسنسان کرتا ہے تو اسلام محض حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی کیلئے کیوں عملی اقدام نہیں کر سکتا؟ مگر جہاد کی اس قسم کا جواز نبی یا اس کے وصی کی خصوصی اجازت کے ساتھ مشروط ہے۔تاکہ دین کے نام پر انارکی اور لاقانونیت عام نہ ہو جائے لیکن دفاعی جہاد میں یہ شرط نہیں ہے بلکہ جب بھی دشمن حملہ آور ہو یا حملہ آور ہونے کا پروگرام بنا رہا ہو تو اسی وقت دین وایمان جان ومال اور عزت وآبرو کی حظاظت کی خاطر دفاعی جہاد نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے۔اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حین حیات میں جس قدر جنگیں لڑی گئی ہیں وہ سب کی سب دفاعی تھیں۔یعنی ہر جنگ کا آغاز دشمنان اسلام (کفار ومشرکین) نے کیا۔اور دفاع پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں نے کیا تھا۔

اسلامی جہاد کے خصوصیات

پھر اسلامی جہاد کی اصلیت کو سمجھنے کیلئے تین چیزوں کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے

۱۔کس مقصد کیلئے؟ ۲۔کس کے ساتھ ۳۔کن شرائط کے ساتھ؟

ان آیتوں میں ان امور کی وضاحت کر دی گئی ہے یعنی مقصد جہاد کے متعلق فرمایا ''فی سبیل اللہ'' حق کی سربلندی کیلئے............لوٹ مار' تجارتی و صنعتی رقابت وطنی یا نسلی عداوت یا اس قسم کے سفلی مقاصد کیلئے نہیں۔ اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ ''لا تعتدوا'' کہ اگر آتش انتقام بھڑک رہی ہوا اور جذبات بے قابو ہوں تب بھی زیادتی نہ کرنا۔لہٰذا عورتوں' بچوں' بوڑھوں' اپاہجوں' اور مزدوروں وراہبوں پر ہاتھ نہ اٹھانا (جب کہ یہ جنگ میں شریک نہ ہوں) اور ان کے پھل دار درخت نہ کاٹے جائیں اور شیر دار جانور ذبح نہ کئے جائیں کیونکہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

جو لوگ اسلام کے نظریہ جہاد پر اعتراض کرتے ہیں وہی انصاف سے بتائیں کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم گزری ہے یا اس مہذب و متمدن دنیا میں کوئی ایسی قوم موجود ہے جس کے جنگی قانون میں عدل و انصاف کا یوں لحاظ رکھا گیا ہو آج تو جب جنگ شروع ہوتی ہے تو پرامن شہریوں اور آبادبستیوں کو ایٹم بموں سے اڑا دیا جاتا ہے عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور بیماروں غرض کہ کسی سے درگزر نہیں کیا جاتا۔درس گاہوں' عبادت گاہوں اور ہسپتالوں کا احترام بھی پس پشت ڈال دیا جاتا ہے (ضیاء القرآن)

اسلام جارحیت کی اجازت نہیں دیتا

بفضلہ تعالیٰ اس آیت اور اس بیان سے تشدد اور عدم تشدد کے بارے میں اسلام کا جو نظریہ ہے وہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام جارحانہ جنگ کا حامی نہیں ہے اس لئے قید لگا دی گئی ہے کہ جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔۔۔تم ان سے جنگ کرو۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ابتدء جنگ دوسروں کی طرف سے ہے اور دفاع مسلمانوں کی جانب سے۔ہاں اس ابتداء کے ہو جانے کے بعد وہ مطلقاً عدم تشدد کا بھی قائل نہیں کیونکہ اس صورت میں جارح کی جان و مال کا احترام باقی نہیں رہتا اور دشمن کسی رعایت کا حقدار نہیں رہتا (لہٰذا انہیں جہاں پاؤ قتل کردو۔) اور اگر تم مکہ پر قبضہ کر کے انہیں وہاں سے نکال بھی دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا تو یہ تمہاری زیادتی متصور نہ ہو گی۔مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبضہ پانے کے بعد بھی اجازت ربانی سے فائدہ نہیں اٹھایا اور جائز انتقام بھی نہیں لیا۔بلکہ فتح مکہ میں سب کو عام معافی دے دی (فصل الخطاب)

فتنہ پردازی قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے

وَالۡفِتۡنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ...الآیۃ۔

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ کسی مسلمان نے غلطی سے اشہرحرم میں (یعنی ان چار مہینوں میں سے کسی مہینہ میں......جن میں قتال حرام ہے) کسی کافر کو قتل کر دیا جس پر انہوں نے تمام مسلمانوں کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا۔ اور ایک شخص کے انفرادی فعل کی وجہ سے پوری جماعت مسلمین کے خلاف شورش برپا کر دی۔ قرآن نے ان کی اس حرکت کا جواب دیا ہے کہ بے شک اس مسلمان نے بھی غلط کام کیا مگر تمہاری یہ فتنہ سامانی ایک آدمی کے قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے (مجمع البیان)۔ اور ایک روایت میں فتنہ کی تفسیر کفر و شرک سے کی گئی ہے (تفسیر صافی)۔

اسلامی جہاد کا فلسفہ

وَقٰتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ...الآیۃ۔

اس آیہ مبارکہ میں اسلامی جہاد کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ فتنہ وفساد کو بیخ و بن سے اکھیڑنے، دین اسلام کو ادیان عالم پر غالب کرنے اور اطاعت وعبادت کو صرف خدا کیلئے مخصوص کرنے کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی اور دنیوی غرض و غایت نہیں ہے۔ لہٰذا اگر محض دنیا کے جاہ وجلال اور اس کے مال و منال کے حصول کی خاطر جنگ کی جائے یا ذاتی مفادات کیلئے لوگوں سے لڑا جائے جو مفسد ملاؤں کا محبوب مشغلہ ہے تو یہ فساد ہوگا، جہاد نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ

دین ملاں فی سبیل اللہ فساد

اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک دنیا میں کفر والحاد رہے گا جب سب لوگ ایمان لے آئیں گے تو اس کا وجوب بھی ساقط ہو جائے گا۔

آیات القرآن

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا
بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾
وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ
الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ
مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ
نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۟ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ
الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا
رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

ترجمۃ الآیات

حرمت والے مہینہ کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے اور حرمتوں میں بھی قصاص (ادلا بدلا) ہے لہٰذا جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کے ساتھ اسی طرح زیادتی کرو جس طرح اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور خدا (کی نافرمانی سے) ڈرو۔ اور سمجھ لو کہ اللہ یقینا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے (۱۹۴) اور خدا کی راہ میں (مال و جان) خرچ کرو اور (اپنے آپ) کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو اور اچھا کام کرو۔ یقینا اللہ اچھے کام کرنے والوں سے محبت کرتا ہے (۱۹۵) اور خدا کی (خوشنودی) کے واسطے حج و عمرہ کو تمام کرو۔ اور اگر کسی مجبوری میں گھر جاؤ تو پھر جو قربانی میسر ہو وہی کرو مگر اپنے سر اس وقت تک نہ منڈواؤ جب تک قربانی اپنے ٹھکانہ تک نہ پہنچ جائے (جہاں اسے ذبح یا نحر کرنا ہے) اور جب تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور سر منڈوالے تو اس کا فدیہ (بدلہ) روزہ، خیرات یا قربانی ہے۔ پھر جب تمہیں امن و اطمینان حاصل ہو جائے تو جو شخص (حج تمتع کا) عمرہ کر کے حج کے موقع تک لذائذ سے فائدہ اٹھائے۔ تو وہ لازمی طور پر ممکنہ قربانی کرے اور جسے قربانی نہ مل سکے تو

وہ تین روزے توحج کے دوران رکھے اور سات اس وقت جب واپس جاؤ۔ یہ ہو جائیں گے مکمل دس (روزے) یہ (حج تمتع) اس کے لئے ہے جس کے اہل وعیال مسجد الحرام کے باشندہ نہ ہوں۔ (حدود حرم کے اندر نہ رہتے ہوں) اور اللہ (کی نافرمانی) سے ڈرو اور سمجھ لو کہ خدا سخت سزا دینے والا ہے (۱۹۶)

تشریح الالفاظ

(۱) والحرمٰت یہ حرمۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ہر وہ حق اللہ جس کی رعایت لازم ہو۔ اور جس کی بے حرمتی حرام ہو

(۲) الی التھلکه یہ ھلک یہلک کا مصدر ہے جس کے معنی ہلاکت اور خفا ہونے کے ہیں۔

(۳) احصر تم یہ احصار سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں روک دینا۔

(۴) نسك اس کے معنی ہیں ذبیحہ اور وہ نذر جو خدا کیلئے پیش کی جائے

تفسیر الآیات

اشہر حرم اور ان کے احکام

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ...الآية۔

چار مہینے ایسے ہیں کہ جن میں قتال و جدال حرام ہے اور اسلام سے پہلے عام عرب بھی غالباً سنت خلیل کے زیر اثر ان مہینوں میں جدال و قتال کو حرام جانتے تھے اور وہ یہ ہیں ۱۔ رجب المرجب ۲۔ ذوالقعدہ ۳۔ ذوالحجہ ۴۔ محرم الحرام ابتدائے اسلام میں ۷ ہجری تک یہی حکم تھا مگر جب ۶ ہجری میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذوالقعدہ کے مہینہ میں عمرہ کے ارادے سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے لیکن مشرکین سد راہ ہوئے اور آمادہ جنگ ہوئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مہینہ کی حرمت کی وجہ سے جنگ لڑنا مناسب نہ سمجھی اور اس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ ہوئی۔ یہ کفار مکہ کی طرف سے شہر حرام کے خلاف پہلا اقدام تھا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاہدہ کے مطابق دوسرے سال اسی محترم مہینہ میں عمرہ کیلئے تشریف لائے اور معاہدہ کے مطابق مشرکین کو تین دن کیلئے مکہ سے باہر جانا پڑا جس کی وجہ سے ان کو بڑی کوفت ہوئی جس کے متعلق قرآن اس آیت

میں جواب دے رہا ہے کہ اگر گذشتہ سال تم نے اس مہینہ کی حرمت کا لحاظ کیا ہوتا تو اس سال تمہیں بھی اس کو فت کا سامنا کرنا پڑتا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہیوں کو تشویش تھی کہ اگر کفار نے معاہدہ کی پابندی نہ کی اور جنگ کی نوبت آ گئی تو پھر کیا کیا جائے گا اس مہینہ میں تو جنگ حرام ہے تو اس سے پہلی آیت میں اس کا جواب دے دیا گیا کہ حرم مکہ ہو یا اشہر حرم بے شک مسلمانوں پر ان کا احترام واجب ہے لیکن جب کفار و مشرکین خود حدود حرم کے اندر اور اشہر حرم میں جنگ کرنے لگیں تو پھر مسلمانوں کیلئے بھی دفاعی جنگ کرنا جائز ہے۔''الشھر الحرام بالشھر الحرام ''الغرض کفار مکہ کے اس اقدام سے کئی حرمتیں پامال ہوئی تھیں۔ظرف زمان کا تقدس ظرف مکان کا تقدس' ارادۂ عمرہ کا تقدس......اس لئے ارشاد ہوا۔''والحرمات قصاص،'یعنی سب حرمتوں کا ادلا بدلا ہے۔

یہ ایک ضابطہ ہے جس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کا لحاظ انسان کیلئے کسی بھی لحاظ سے ضروری ہے۔ یہاں بھی پہل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ہاں البتہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لیا جا سکتا ہے اور اسے اس کی زیادتی کا مزا چکھایا جا سکتا ہے۔

وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ...الآیۃ

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے اہل اسلام کو جہاد اور راہ خدا میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے جس سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی کئی مالی حقوق مسلمانوں پر فرض ہیں جن میں سے ایک مصرف جہاد کا اہتمام کرنا بھی ہے۔جس کی کوئی مقدار معین نہیں ہے۔بس بقدر ضرورت اس کا اہتمام کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے (معارف القرآن)۔ ویسے زکوٰۃ کے مصارف ہشت گانہ میں سے ایک مصرف فی سبیل اللہ بھی ہے یعنی ہر وہ کام جس میں مال خرچ کرنے سے خدا کی خوشنودی کے حصول کا یقین ہو۔

اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا حرام ہے

وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ...الآیۃ

اس آیہ مبارکہ کے بارے میں مفسرین اسلام میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ منا ہی صرف جان کے بارے میں ہے یا مال کے بارے میں بھی ہے؟۔حسب ظاہر تو یہ حکم جان سے متعلق معلوم ہوتا ہے اس لئے خودکشی کے حرام ہونے پر اسی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ چونکہ جان خدائے مہربان کی دی ہوئی ہے بنا بریں ظاہر ہے کہ مالک و معطی کی مرضی کے بغیر اس میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے لہٰذا اگر تو یہ جان راہِ خدا (جہاد وغیرہ)

میں قربان کی جائے تو یہ شہادت نہ صرف جائز ہے بلکہ بہت بڑی سعادت ہے لیکن اگر یہ قیمتی جان ذاتی رنجش مٹانے، آتش انتظام کو بجھانے یا خودکشی کر کے خواہ جس طرح ہو، زہر کھانے سے ہو، قمہ زنی سے ہو، سینہ میں چھرا گھونپنے سے ہو، خوشی میں ہو یا کسی کے غم میں ہو............ضائع کی جائے تو یہ ہلاکت ہے جو بالاتفاق حرام ہے اور کسی طرح بھی جائز نہیں ہے مگر ایک حدیث میں جو کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ اس کی تفسیر مالی فضول خرچی سے بھی کی گئی ہے کہ بے شک اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اس میں بخل سے کام لے کر اپنی اخروی ہلاکت کا باعث نہ بنو............علامہ طبرسی فرماتے ہیں کہ اولی یہ ہے کہ اس آیت کو عام مفہوم پر محمول کیا جائے جس میں یہ سب معانی داخل ہو جائیں (مجمع البیان و فصل الخطاب)۔

احسان کی وضاحت

وَاَحۡسِنُوۡا...الآیۃ

اس آیت مبارکہ میں اچھا کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی ترغیب دلائی گئی ہے یہ احسان اور اچھائی دو طرح کی ہے ایک عبادت میں اور دوسری معاملہ و معاشرت میں۔۔۔عبادت میں احسان یہ ہے کہ آدمی اس طرح خضوع و خشوع کے ساتھ خدا کی عبادت کرے کہ گویا اسے سامنے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ عقیدہ تو رکھے کہ اگر یہ اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو اسے ضرور دیکھ رہا ہے۔ اور لوگوں سے معاملہ و معاشرت میں احسان یہ ہے کہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کیلئے پسند کرے اور جو اپنے لئے پسند نہیں کرتا اسے دوسروں کیلئے بھی پسند نہ کرے۔ وھو غایۃ الاحسان۔

حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

اجعل نفسك میزانا بینك و بین الناس فاحب لاخیك ماتحت لنفسك و اكره لاخیك ما تكره لنفسك۔ (نہج البلاغہ)

اپنی ذات کو اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ترازو بناؤ۔ پس جو اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی اپنے (دینی) بھائی کے لئے پسند کرو۔ اور جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ اپنے بھائی کے لئے بھی پسند نہ کرو۔

حج کے اقسام اور حج و عمرۂ تمتع کے ارکان کا اجمالی بیان

اس آیت مبارکہ میں اور اس کے بعد والی چند آیتوں میں یعنی آیت نمبر ۱۹۶ سے لیکر آیت نمبر ۲۰۳ تک مسلسل آٹھ آیات میں حج و عمرہ کے کچھ قوانین و آئین، کچھ احکام و اقسام اور کچھ جزئیات و تفصیلات بیان کی

گئی ہیں۔حج وعمرہ کی پوری تفصیل تو فقہی کتابوں میں مذکور ہے۔یہاں ان امور پر فی الجملہ تبصرہ کیا جاتا ہے حج نہ صرف اسلام کے اہم ارکان وواجبات میں سے ہے بلکہ ان ضروریات اسلام میں سے ہے جن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج متصور ہوتا ہے اور واجب جانتے ہوئے عمداً نہ کرنے والا فاسق وفاجر شمار ہوتا ہے۔نیز قرآن وسنت میں اس فریضہ کی ادائیگی پر بہت ثواب کا وعدہ اور نہ کرنے پر سخت عذاب کی وعید ارشاد ہوئی ہے اور حج کا تصور اسلام سے پہلے بھی موجود تھا مگر اس میں بہت سے منکرات تھے جن کی اسلام نے تطہیر کر دی ہے اور اس کو صاف و شفاف بنا دیا ہے۔حج کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔حج تمتع ۲۔حج قرآن ۳۔حج افراد

بنابر مشہور ومنصور جو لوگ مکہ کے چاروں طرف اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ مسافت پر رہتے ہیں ان کا فریضہ حج تمتع ہے۔جو تمام اقسام حج سے ارفع واعلیٰ ہے اور جو لوگ اڑتالیس میل کے اندر رہتے ہیں ان کا فریضہ حج قران یا حج افراد ہے۔

حج تمتع کے اعمال کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ یہ حج دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے ا۔عمرۂ تمتع ۲۔حج تمتع پھر ان ہر دو کے اعمال کا جامع خلاصہ یہ ہے کہ عمرۂ تمتع پانچ اعمال پر مشتمل ہے۔

۱۔میقات سے احرام باندھنا ۲۔طواف کرنا

۳۔دو رکعت نماز طواف پڑھنا ۴۔صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنا

۵۔اور تقصیر کرنا

اور حج تمتع تیرہ اعمال پر مشتمل ہے

۱۔مکہ سے احرام باندھنا ۲۔وقوف عرفات

۳۔وقوف مشعر الحرام ۴۔منیٰ میں جمرہ عقبہ کو کنکریاں مارنا

۵۔قربانی کرنا ۶۔حلق یا تقصیر کرنا

۷۔طواف حج کرنا ۸۔دو رکعت نماز طواف پڑھنا

۹۔صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنا ۱۰۔طواف نساء کرنا

۱۱۔دو رکعت نماز طواف پڑھنا ۱۲۔۱۱،۱۲ ذوالحجہ کو رات منیٰ میں گزارنا

۱۳۔گیارہ بارہ ذوالحجہ کے دنوں میں تینوں جمروں کو کنکریاں مارنا۔

لہٰذا جب خدا کی خوشنودی کے حاصل کرنے کیلئے حج وعمرہ کرنے کا ارادہ کیا جائے تو اسے پورا کرنا چا

ہئے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کسی بیماری کی وجہ سے محصور اور کبھی دشمن کی وجہ سے مصدود ہوجاتا ہے لہٰذا ''فان احصرتم ''میں ان کے احکام بتائے گئے ہیں''و ان تحلقوا ''میں احرام کھولنے کے احکام بتائے گئے ہیں۔احرام کے خاتمہ پر سر منڈوایا جاتا ہے لیکن اگر کسی بیماری یا سر میں کسی تکلیف کی وجہ سے احرام کی حالت میں سر منڈوانا پڑ جائے تو''مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَرِيضا '' میں اس کے احکام بتائے گئے ہیں کہ وہ تین کاموں میں سے ایک کام کرے۔

۱۔وہ تین دن روزہ رکھے ۲۔یا صدقہ دے کم از کم چھ مسکینوں کو

۳۔یا (بکری وغیرہ کی) قربانی کرے۔

منیٰ میں حاجی کی قربانی کا بیان

فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ...الآیۃ

یہ اس شخص کا حکم ہے جو نہ بیماری کی وجہ سے محصور و مجبور ہوا اور نہ ہی دشمن کی وجہ سے مصدود و محدود۔ بلکہ پورے اطمینان و آرام سے حج تمتع بجالا رہا ہے تو اس کے لیے بھی ممکنہ قربانی کرنا ضروری ہے اور اگر کچھ بھی میسر نہ آئے تو پھر حاجی اس کے عوض دس روزے رکھے گا۔تین روزے حج کے دوران یعنی سات' آٹھ اور نو ذوالحجہ کو اور سات اس وقت جب حجاج اپنے گھروں کو لوٹیں گے۔(لہٰذا یہ شخص اگر وہاں بھی رہ جائے تو روزہ رکھنے کیلئے اسے لوگوں کی اپنے گھروں تک واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا)

آیات القرآن

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا
فُسُوۡقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ
وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى ۚ وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيۡسَ
عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ
عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَـرَامِ ۖ وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا
هَدٰٮكُمۡ ۚ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۱۹۸﴾

ترجمۃ الآیات

حج کے چند خاص جانے پہچانے مقررہ مہینے ہیں۔تو جو شخص ان (مہینوں) میں (اپنے اوپر) حج کی پابندی احرام باندھ کر فرض کر لے تو پھر حج کے دوران نہ (بیوی سے) مباشرت کرے۔نہ (خدا کی) نافرمانی کرے اور نہ (کسی سے) لڑائی جھگڑا کرے اور تم جو کچھ نیکی کا کام کرو گے تو خدا اسے جانتا ہے اور (آخرت کے سفر کیلئے) زادراہ مہیا کرو (اور سمجھ لو) کہ بہترین زادراہ تقویٰ (پرہیزگار) ہے اور اے عقل مندو! مجھ سے (میری نافرمانی) سے ڈرو (۱۹۷) اس میں تمہارے لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم حج کے دوران اپنے پروردگار سے فضل (رزق) کے طلب گار رہو۔ ہاں تو جب عرفات سے روانہ ہو تو مشعر الحرام (مزدلفہ) کے پاس (اس کی حدود) میں اللہ کو یاد کرو اور یاد بھی اس طرح کرو جس طرح اس نے ہدایت کی ہے اگرچہ اس سے پہلے تم گمراہوں میں سے تھے (۱۹۸)

تشریح الالفاظ

(۱) ولا فسوق	یہ اور فسق دونوں مصدر ہیں جن کے معنی ہیں بدکار ہونا اور رہ حق سے ہٹ جانا
(۲) جدال	یہ مجادلہ کی طرح جادل کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں جھگڑا
(۳) وتزودوا	یہ تزود سے مشتق ہے جس کا مادہ زاد ہے جس کے معنی زادِراہ اور توشہ کے ہیں

تفسیر الآیات

اشہر حج میں تقدیم وتاخیر جائز نہیں ہے

اَلْحَجُّ اَشْهُر ...الآیۃ

حج کے چند خاص جانے پہچانے مہینے ہیں جو کہ شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن ہیں جن میں کسی قسم کا تغیر تبدل اور کسی قسم کی تقدیم وتاخیر جائز نہیں ہے گو عمرہ مفردہ سال بھر ادا کیا جا سکتا ہے مگر عمرہ تمتع اور حج ان مخصوص مہینوں کے علاوہ جائز نہیں ہے۔ (جیسا کہ یہی مضمون حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے......مجمع البیان)

فَلَا رَفَثَ...الآیۃ

رفث وفسوق وغیرہ کی وضاحت

یہ قرآنی بلاغت ہے کہ ''''الفاظ نفی استعمال کر کے مراد نہی لی گئی ہے یعنی کہنا یہ تھا کہ ''**لا ترفثوا ولا تجادلوا**'' یعنی رفث وفسوق اور جدال نہ کرو۔ مگر نہی کی جگہ نفی کے الفاظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا کہ حج میں ان کاموں کے تصور کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لفظوں میں گوعموم پایا جاتا ہے مگر حقیقی مفسرین قرآن محمد و آل محمد علیہم السلام کی احادیث میں رفث کی مجامعت سے فسوق کی جھوٹ سے اور سب وشتم سے جدال کی جھوٹی قسمیں کھانے سے تفسیر کی گئی ہے۔ (البرہان، صافی، عیاشی)

وَتَزَوَّدُوْا...الآیۃ

عرب کے اکثر لوگوں خصوصاً اہل یمن کا دستور تھا کہ وہ زادسفر کے بغیر بے سروسامانی کے ساتھ حج کے لئے گھروں سے نکل پڑتے تھے اور توشہ سفر ہمراہ لے جانے کو توکل کے منافی سمجھتے تھے اور سفر کے دوران لوگوں سے مانگ تانگ کر گزارہ کرتے تھے۔ اس لئے خود بھی تکلیف اٹھاتے اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو اس غیر فطری طریقہ کار سے منع فرماتے ہوئے توشہ سفر ہمراہ لے کر سفر کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ اگر کسی کی خدمت نہ کر سکیں تو کم از کم دوسروں پر بوجھ تو نہ بنیں۔ (مجمع البیان)

بہترین زادسفر تقویٰ ہے

یہ حقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے سفر کی مسافت کے مطابق زادسفر کا اہتمام کرتا ہے جس قدر سفر طویل ہوتا ہے اتنا ہی زادراہ زیادہ ہوتا ہے لہٰذا عقل مجبور کرتی ہے کہ موت کے بعد والے اس طویل وعریض سفر کے لئے زادسفر کا انتظام لازم ہے۔ جس کی ابتداء تو ہے مگر انتہا نہیں ہے۔ توشہ سفر کیا مہیا کیا جائے؟ ارشاد ہوتا ہے: ''فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۹۷) یعنی اس سفر آخرت کے لئے بہترین زادسفر تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔ اس طرح اسلام نے بتایا کہ اسباب کا نام توکل نہیں ہے بلکہ خدا کے عطا کردہ وسائل واسباب کو بروئے کار لا کر نتیجہ خدا کے سپرد کرنے کا نام توکل ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ...الآیۃ

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں حج کا رواج تو تھا مگر وہ ان کے لیے گویا قومی رسم یا تجارتی میلہ تھا کفار

عرب نے حج کو تجارت کی منڈی اور نمائش گاہ بنایا ہوا تھا' تجارت کے خاص بازار لگتے تھے' مال و دولت کی نمائش ہوتی تھی' فخر و مباہات ہوتا تھا وغیر وغیرہ۔ حالانکہ حج ہو یا عمرہ یا کوئی اور عبادت ان کی اصل قیمت و اہمیت اسی وقت ہے کہ لوجہ اللہ ادا کی جائیں۔ اسلام نے ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کر دیا تو مسلمانوں نے سمجھا کہ شاید ایام حج میں تجارت کرنا یا محنت مزدوری کرنا بھی رسوم جاہلیت میں داخل ہو۔ اور شاید ایسے آدمی کا حج صحیح نہ ہو اور کچھ تو کہنے لگے کہ تاجروں' مزدوروں اور ساربانوں کا کوئی حج نہیں ہے اس خیال کے ابطال میں خداوند عالم نے یہ آیت نازل کی کہ حج سے پہلے یا حج سے فراغت کے بعد اگر حاجی بیع و شراء کرے یا محنت و مزدوری کرے جس سے اسے کچھ نفع حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ تفسیر مروی ہے (تفسیر عیاشی)۔

اس طرح قرآن نے عربوں کی بیہودہ رسموں کی دو لفظوں میں اصلاح کر دی ہے کہ یہ اللہ کا فضل ہے اس کے حاصل کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ مقصد اولین خدا کی عبادت ہو' مال و دولت کمانا اور سرمایہ سمیٹنا مقصد اولین نہ ہو بہر حال ''اصل چیز اللہ کا تقویٰ ہے پس اگر کسی کے اندر یہ گوہر گراں مایہ موجود ہے تو معاشی ضرورت کے تحت کچھ کاروبار کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے ہاں البتہ حج کے دوران جو فضاء جاری تھی وہ رہنی چاہیے وہ اللہ کا خوف' اللہ کی یاد' اللہ کی نعمتوں کا شکر اور اللہ کے لئے خود حوالگی کا جذبہ............ اور اس اثنا میں کسی حاجی سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہونا چاہیے جو ان کیفیات کے خلاف ہو' (تذکیر القرآن)۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ......الآیۃ۔

اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے یعنی جس طرح اس نے اپنی عبادت کا طریقہ بذریعہ انبیاء و اوصیاء سکھایا ہے اس کی تفسیر میں صاحب معارف القرآن لکھتے ہیں کہ ''ارشاد قرآنی و اذکروہ کما ھدا کم '' سے ایک اور اصولی مسئلہ نکل آیا کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں ان کے موافق کرنا ہی عبادت ہے ان کے خلاف کرنا جائز نہیں اور اس میں کمی بیشی یا مقدم اور موخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں نفلی عبادات وصدقہ و خیرات وغیرہ میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف سے کچھ خصوصیات اور اضافے کر لیتے ہیں اور ان کی پابند کو ضروری سمجھ لیتے ہیں حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطاء کار سمجھتے ہیں اس آیت نے ان کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اہل جاہلیت کی سی عبادت ہے کہ اپنی رائے اور قیاس سے

عبادت کی صورتیں گھڑرکھی تھیں اور چند رسموں کا نام عبادت رکھ لیا تھا''(معارف القرآن)۔

من پسند طریقہ سے عبادت جائز نہیں ہے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے سے مروی ہے کہ جب شیطان جناب آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے انکار کی وجہ سے ملعون ومردود قرار پایا تو اس نے بارگاہ رب العزت میں ایک درخواست پیش کی تھی ''رب اعفنی عن سجدة آدم و اعبدك عبادة لم يعبد كما احد قط''۔

یعنی اے میرے پروردگار امجھے اس سجدہ کی معافی دے ہاں میں اس کے عوض تیری اس قدر عبادت کروں گا جس قدر کسی نے نہ کی ہوگی۔لیکن خداوند عالم نے یہ فرما کر اس کی یہ درخواست مسترد کردی کہ ''ارید ان اعبد كما اساء لا كما تشاء''یعنی میں چاہتاہوں کہ میری عبادت اس طرح کی جائے جس طرح میں چاہتاہوں نہ اس طرح جس طرح تو چاہتا ہے۔(تفسیر صافی)

یہ بات ان لوگوں کیلئے لمحہ فکر یہ ہے جو دینی معاملات میں بالخصوص عبادات میں اور بالاخص نماز جیسی عظیم عبادت میں اور اس کے متعلقات میں یعنی تشہد وغیرہ میں اپنے من پسند اضافے کر کے جہاں ایک طرف عبادات کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں وہاں دوسری طرف اپنی عاقبت کا ستیاناس کر رہے ہیں۔

آیات القرآن

ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَذِكۡرِكُمۡ
اٰبَآءَكُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِكۡرًا ‌ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا
وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى
الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓـئِكَ
لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا ‌ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِىۡٓ
اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ‌ؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ‌ۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

ترجمۃ الآیات

پھر جہاں سے اور لوگ چل کھڑے ہوں تم بھی چل کھڑے ہو اور خدا سے مغفرت و بخشش طلب کرو یقینا خدا بڑا بخشنے والا' بڑا مہربان ہے (۱۹۹) جب تم اپنے مناسک حج (اور اسکے اعمال وارکان) کو بجالا چکو۔تو پھر اس طرح اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ داداؤں کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر خدا کو یاد کرو اب لوگوں میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگا! ہمیں (جو کچھ دینا ہے) اسی دنیا ہی میں دے دے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے (۲۰۰) اور کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر اور ہمیں دوزخ کی سزا سے بچا (۲۰۱) یہ وہ لوگ ہیں جو کچھ انہوں نے کمایا ہے اس سے (دنیا و آخرت میں) ان کا حصہ ملے گا اور اللہ بہت جلد حساب بیباق کرنے والا ہے (۲۰۲) اور گنتی کے چند دنوں میں خدا کو یاد کرو پس جو جلدی کرے گا اور (منیٰ سے) دو ہی دن میں چلا جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔اور جو دیر کرے (تیسرے دن تک ٹھہرا رہے) اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے مگر یہ (رعایت) اس کے لیے ہے جو بچتا رہا اور اللہ (کی فرمانی سے) ڈرو اور یقین رکھو کہ تم اسی کے حضور اکٹھے کئے جاؤ گے۔(پلٹ کر جاؤ گے) (۲۰۳)

تشریح الالفاظ

(۱) افیضوا — یہ افاضہ سے مشتق ہے افاض القوم کا مطلب ہے متفرق اور منتشر ہو جانا۔

(۲) خلاق — اس کے معنی ہیں بھلائی کا بڑا حصہ

(۳) نصیب — اس کی جمع انصب اور نصب ہے جس کے معنی حصہ کے ہیں

تفسیر الآیات

عبادت اسی طرح کرنی چاہیے جس طرح خدا اور ہادیانِ برحق ہمیں تعلیم دیں

ثُمَّ اَفِیْضُوْا ......الآیۃ

اکابر قریش یہ کہہ کر کہ ''نحن اهل حرم الله''یعنی ہم خدا کے حرم والے اور اس کے مجاور ہیں اس لیئے ہم عام لوگوں کے ساتھ حرم سے باہر عرفات میں نہیں جائیں گے لہذا یہ لوگ صرف مزدلفہ میں وقوف کر کے وہیں سے لوٹ جاتے تھے اس لئے خداوند عالم نے ان کے تکبر کو ختم کرنے کیلئے حکم دیا کہ تم بھی عرفات میں وقوف کرو اور پھر وہاں سے مزدلفہ کی طرف چل کھڑے ہو جہاں سے عام لوگ چل کھڑے ہوتے ہیں۔ (مجمع البیان) اور ایک طویل روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ''الناس'' (جہاں سے لوگ) لوٹتے ہیں سے مراد حضرت خلیل علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام ہیں (تفسیر عیاشی)

کیونکہ وہ عرفات میں وقوف کر کے مزدلفہ تشریف لے جاتے تھے اور اس کے بعد سنت ابراہیمؑ پر عمل کرنے والے بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ بنابریں یہ آیت ترتیب نزول کے لحاظ سے سابقہ آیت سے مقدم ہے اور اس سے عرفات سے مشعر الحرام کی جانب واپسی مراد ہے نہ کہ مشعر الحرام سے منیٰ کی طرف واپسی۔ واللہ العالم۔

بہر حال وقوف عرفات حج تمتع کے تیرہ اعمال میں سے دوسرا عمل ہے نویں ذوالحجہ کو زوال آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک مقام عرفات میں وقوف کیا جاتا ہے اور ظہرین کی نماز اکھٹی پڑھی جاتی ہے اور اس طرح سارا وقت دعا و پکار اور توبہ استغفار میں صرف کیا جاتا ہے اور غروب آفتاب کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر شب باشی مشعر الحرام میں کی جاتی ہے اور نماز مغربین وہاں اکٹھی پڑھی جاتی ہے۔

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ......الآیۃ

مفسرین اسلام نے لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب جب عرفات، مزدلفہ، طواف اور قربانی سے فارغ ہو جاتے تھے تو منیٰ میں کئی دن قیام کرتے تھے اور وہاں ان کی خصوصی مجالس و محافل منعقد ہوتی تھیں جن میں مشاعرے ہوتے تھے اور بڑے طمطراق سے اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور جھوٹے سچے کارناموں کا نظم و نثر میں بڑے شد و مد سے تذکرہ کیا جاتا تھا اور اس پر فخر و مباہات کرتے تھے۔ مگر یہ محافل و مجالس ذکر خدا سے بالکل

خالی ہوا کرتی تھیں۔ بھلا یہ مقدس مقام اور یہ مقدس ایام............مگر وہ ایسے بے ہودہ کاموں میں ضائع کئے جائیں............؟

خداوند حکیم نے اس رسم جاہلیت کو مٹانے کیلئے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب مناسک حج سے فارغ ہو چکیں تو اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرنے اور ان کے جھوٹے سچے مفاخر بیان کرنے (کہ پدرم سلطان بود) کی بجائے اپنے خالق و مالک کو یاد کریں اور اس کا ذکر خیر کریں۔ کیونکہ یہ ایام اور یہ مقام خدا کی یاد اور اس کی عبادت کیلئے مخصوص ہیں۔

دعاؤں میں خدا سے کیا طلب کرنا چاہیے؟

فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ......الآية

اس آیہ مبارکہ میں دعا کرنے والے مختلف لوگوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جو اس مقدس مکان پر آتے اور دعا کرتے تھے یا کرتے ہیں۔ وہ دو قسم کے لوگ ہیں کچھ وہ ہیں جو بے شک ذکر خدا کرتے ہیں اور دعاؤں کا شغل بھی رکھتے ہیں مگر ان کی تمام دعائیں دنیوی مرکز کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ دنیا کی راحت' دنیا کی عزت' دنیا کی دولت وغیرہ۔

الغرض ان کی تمام دعائیں دنیاوی حاجات کیلئے ہوتی ہیں ان کا آخرت اور اس کے اصلاح اور اُخروی فوز وفلاح کی طرف ہرگز کوئی دھیان نہیں ہوتا............خدا فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اس میں ان لوگوں کیلئے تازیانہ عبرت موجود ہے۔ جو آج بھی جب مقدس مقامات میں یا مقدس اوقات میں دعا کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں تو عموماً دنیوی اغراض و مقاصد کیلئے ہی کرتے' کراتے ہیں اور کچھ وہ نیک بخت لوگ بھی ہیں کہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو خدا سے جہاں دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں وہاں آخرت کی بھلائی بھی چاہتے ہیں اور آتش دوزخ سے پناہ بھی مانگتے ہیں اور یوں کہتے ہیں "رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّ فِي الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔

اب رہی اس بات کی تحقیق کہ دنیاوی حسنہ سے کیا مراد ہے اور اخروی حسنہ سے کیا؟ تو ایک حدیث میں وارد ہے جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ

"دنیاوی حسنہ سے مراد وسعت رزق' عزت اور حسن اخلاق ہے اور اخروی حسنہ سے خدا کی خوشنودی اور جنت کی جاگیر مراد ہے"۔ (تفسیر صافی' برہان)

اور دوسری حدیث بھی جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہی مروی ہے فرمایا:

''دنیوی حسنہ سے خدا کی خوشنودی' وسعت رزق اور اچھی صحبت مراد ہے اور اخروی حسنہ سے جنت الفردوس مراد ہے''۔(تفسیر عیاشی و برہان)

یہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو دنیا کے علاوہ آخرت میں بھی اپنی کمائی سے بہرہ مند ہوں گے اور یہی وہ نیک بخت افراد ہیں کہ جن کے ایک ہاتھ میں دولت دنیا کا دامن ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں دولت دین کا دامن ہوتا ہے حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔کہ''وقد یجمعهما الله لا قوام من شیعتنا''یعنی کبھی کبھار خداوند عالم ہمارے بعض شیعوں کیلئے دونوں دولتوں کو جمع کر دیتا ہے۔(نہج البلاغہ) اللّٰهم اجعلنا منهم۔

وَاذْكُرُوا اللهَ...الآية

متعدد احادیث میں وارد ہے کہ ان گنے چنے دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں یعنی ماہ ذوالحجہ کی ۱۱'۱۲ اور ۱۳ تاریخ۔(بحار' وسائل' برہان) اور ایک روایت میں ان ایام میں ذکر خدا سے مراد وہ تکبیر لی گئی ہے کہ جو ان دنوں میں ہر نماز کے بعد پڑھی جاتی ہے جو یہ ہے''الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله والله اکبر الله اکبر ولله الحمد الله اکبر علی ما هدانا و الحمد لله علی ما اولانا ورزقنا من بهیمة الانعام''(کافی وصافی)۔

واضح رہے کہ ان تکبیروں کا پڑھنا مستحب ہے واجب نہیں ہے اور یہ صرف دو دن (۱۱'۱۲) کو بھی پڑھی جاسکتی ہیں اور تینوں دن بھی۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ...الآية

ان ایام معدودات میں دو دن یعنی گیارہویں اور بارہویں تاریخوں میں مقام منیٰ کا قیام بہر حال واجب ہے لیکن اس کے بعد حاجی کو اختیار ہے کہ بارہویں کو قبل از غروب وہاں سے روانہ ہو جائے یا تیرھویں کی شب کو وہیں قیام کرے اور تیرھیویں تاریخ کو رمی جمرات کے بعد وہاں سے روانہ ہو یہ مطلب ہے اس آیت کا''فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ''آخر میں جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ اس کیلئے ہے جو بچتا رہا ہو یہ اس حکم فقہی کا بیان ہے کہ یہ اختیار جو دونوں صورتوں میں ہے یہ اس شخص کیلئے ہے جس نے احرام کی پابندیوں کو پورے طور پر نبھایا ہو جس میں خاص اہم چیزیں عورت اور شکار ہیں لیکن اگر حالت احرام میں مقاربت کی ہو یا شکار کر لیا ہو تو پھر تیرہویں شب کا قیام واجب ہے(تفسیر فصل الخطاب بحوالہ مجمع البیان والاء الرحمن

بلاغی) دراصل حج اسی شخص کا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا اور اس کے حلال وحرام کی پابندی کرنے والا ہے" وانما یتقبل اللہ من المتقین"۔

آیات القرآن

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا
فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ
فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ
وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪
وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

ترجمۃ الآیات

اور بعض لوگ (منافقین) ایسے بھی ہیں کہ جن کی (چکنی چپڑی) باتیں تمہیں زندگانی دنیا میں بہت اچھی لگتی ہے اور وہ اپنی دلی حالت پر خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ (تمہارے) بد ترین دشمن ہیں۔ (۲۰۴) اور جب آپ کے پاس سے منہ پھیرتے ہیں (یا برسر اقتدار آتے ہیں) تو زمین میں فساد برپا کرنے کیلئے دوڑتے پھرتے ہیں اور کھیتی اور نسل کو برباد کرتے ہیں جبکہ خدا فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا (۲۰۵) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے حکم عدولی) سے ڈرو تو انکی (ظاہری) عزت اور غرور نفس ان کو گناہ پر ابھارتا اور اصرار کراتا ہے ایسے (بد بخت) لوگوں کیلئے دوزخ کافی ہے اور بہت برا ٹھکانہ ہے) (۲۰۶) اور انسانوں میں سے کچھ ایسے (انسان) بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں (خطرے میں ڈال دیتے ہیں) اور اللہ (ایسے جاں نثار) بندوں پر بڑا شفیق ومہربان ہے

(۲۰۷) اے ایمان والو! تم سب کے سب امن وسلامتی (والے دین) میں مکمل طور پر داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (۲۰۸)

تشریح الالفاظ

(۱) تحشرون — یہ حشر سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں

(۲) المھاد — اس کے معنی ہیں بستر اور پست زمین

(۳) السِلْم — اس کے معنی میں صلح کرنے والا ٔ سلامتی اور اسلام

تفسیر الآیات

بعض منافقین کی روش ورفتار کا تذکرہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ...الآیۃ

قبل ازیں دعا مانگنے کے سلسلہ میں کفار ومومنین کا اجمالی تذکرہ ہو چکا اب منافقین کا تذکرہ کیا جا رہا ہے (اور آخر میں مخلصین کا ذکر خیر بھی ہے) اگر چہ اس آیت کی شان نزول میں اکثر مفسرین نے یہاں اخنس بن شریق ثقفی جیسے منافق کا نام خاص طور پر لیا ہے جو فصیح وبلیغ مگر بڑا منافق شخص تھا چنانچہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتا تو دعوائے اسلام کرتا اور اپنے اخلاص پر قسمیں کھاتا۔ مگر جب بزم رسالت سے اٹھ کر باہر جاتا تو شرارتیں کرتا اور فساد پھیلاتا تھا چنانچہ ایک دن آپ کے پاس سے گیا تو باہر جا کر غریب دہکانوں کی کھیتی جلا دی اور ان کے مویشی ہلاک کر دیئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چھوٹے بڑے سب منافقوں کی یہی کیفیت تھی کہ جب سامنے آتے تو بڑی میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی باتیں کرتے "ان یقولوا تسمع لقولھم"۔ یعنی جب وہ بات کرتے ہیں تو سننے کو جی چاہتا ہے اسلام کے بڑے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اس پر قسمیں کھاتے ہیں مگر خدا فرماتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے سب سے بڑے اور بدترین دشمن یہی ہیں۔ یہ عموماً گفتار کے غازی ہوتے ہیں کردار کے نہیں ہوتے ہیں۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى......الآیۃ

تولّی کے دو معنی ہیں۔

۱۔منہ پھیرنا۔بنابریں یہ ’’ولی‘‘ سے مشتق ہوگا۔

۲۔والی وحاکم بننا اس بنا پر یہ ولایت سے مشتق ہوگا۔

اس لئے ہم نے ترجمہ میں دونوں معنوں کا لحاظ رکھا ہے پہلے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ جب سامنے آتے ہیں تو اسلام وخلوص کی ڈینگیں مارتے ہیں اور جب اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو شرارتیں کرتے ہیں‘ کھیتی اور نسل کو برباد کرتے ہیں۔اور فتنہ وفساد پھیلاتے ہیں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے مفہوم یہ ہوگا کہ غربت میں اسلام وایمان اور ہمدردی خلائق کے بلند بانگ دعویٰ کرتے ہیں مگر جب اقتدار مل جائے تو فتنہ وفساد‘لوٹ کھوسٹ اور ظلم وجور کا بازار گرم کردیتے ہیں علامہ طبرسی اور قاضی بیضاوی نے دونوں معنی مراد لیے ہیں اور دونوں کے آیت کے اندر قرائن وشواہد بھی موجود ہیں اگرچہ ارجح پہلے معنی ہیں مگر صاحب المنار نے دوسرے معنی کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ اس حالت میں ان میں کبر ونخوت اور فتنہ وفساد پھیلانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے مگر حقیقت الامر یہ ہے کہ کبر ونخوت ہو یا تخریب کاری اس کے لئے اقتدار ضروری نہیں ہے اور ایک روایت کے مطابق جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے حرث سے دین اور نسل سے انسان مراد لئے گئے ہیں۔(مجمع البیان)

اور بعض روایات میں اس کی تفسیر دشمنان آل محمدؑ کے ساتھ کی گئی ہے (تفسیر عیاشی) اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اگر ایسے منافقین سے کوئی داعی حق یہ کہہ دے کہ اللہ سے ڈرو اور ایسی حرکتوں سے باز آجاؤ تو وہ غصہ سے لال پیلے ہوجاتے ہیں اور پھر اسے ذاتی انا اور شخصی عزت کا مسئلہ بنالیتے ہیں اور خوف خدا سے بالا ہوکر پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر ان ناشائستہ حرکتوں کی تکرار اور ان پر اصرار کرتے ہیں۔اس لئے قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے جہنم ہی کافی ہے دنیا میں ان کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔’’وبئس المصير‘‘

اس میں یہ درس عبرت مضمر ہے کہ جو شخص اس دور میں بھی ناحق بات پر اڑا رہے گا اور حق کے سامنے سر جھکانے میں عار محسوس کرے گا اور داعیان حق کی تبلیغ سے متاثر ہونے کی بجائے الٹا ان کو ضرر وزیاں پہنچانے اور ان کی جان لینے کے درپے ہوجائے گا اس کا انجام بھی ان منافقین جیسا ہی ہوگا کیونکہ ’’من رضی بفعل قوم فهو منهم‘‘یعنی جو شخص کسی قوم کے افعال پر راضی ہوتا ہے وہ اسی قوم میں سے شمار ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ......الآية

منافقوں اور مشرک لوگوں کی اخلاقی پستی کا ذکر کرنے کے بعد اب ان بندگان خاص کا ذکر کیا جارہا ہے جو اپنا تن‘من‘دھن اپنے مولائے کریم کی رضا جوئی کے لئے قربان کرنے پر آمادہ اور مستعد بیٹھے ہیں (ضیاء القرآن) کثیر التعداد شیعہ اور سنی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت امیر المومنین علی ابن ابیطالب

علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی یعنی شب ہجرت میں جب کہ آپ ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر آرام کی نیند سوئے تھے (فصل الخطاب)۔

ایک تفسیر بالرائے کا تذکرہ

یہ آیہ مبارکہ ان آیات میں سے ایک ہے کہ جن کے ساتھ بعض غیر ذمہ دار مقررین فضائل علی علیہ السلام کے بیان کرنے کی دھن میں وہ سلوک کرتے ہیں جو قصاب بکرے کے ساتھ بھی نہیں کرتے وہ اس استعارے اور مجاز کو نہیں سمجھتے جو یہاں کارفرما ہے بلکہ اپنی ناسمجھی کی بنا پر یہاں باقاعدہ بیع و شراء کراتے ہیں بائع (بیچنے والا) مولا علی علیہ السلام کو بناتے ہیں اور مشتری (خریدار) خدا کو ٹھہراتے ہیں مثمن (جو چیز بیچی جارہی ہے) حضرت علی علیہ السلام کی جان کو قرار دیتے ہیں اور ثمن (قیمت جو ادا کی گئی) خدا کی مرضیاں بتاتے ہیں پس مولا علی علیہ السلام نے اپنی جان خدا کے ہاتھ فروخت کی اور خدا نے اپنی مرضیاں (رضائیں) دے کر اسے خرید لیا اور پھر اس سب خرید و فروخت سے نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ

رضائیں خدا کی تولے لیں علیؑ نے
اللہ کے پلے میں رکھا ہی کیا ہے ؟

لا حول و لا قوۃ الا باللہ... یہ یہودیت ہے' تفویض ہے اوشرک جلی ہے اور تفسیر بالرائے ہے یہ شیعیت نہیں ہے لفظ ''شریٰ ''اضداد میں سے ہے جو بیچنے اور خرید نے ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ''ابتغاء ''باب افتعال کا مصدر ہے جو یہاں مفعول لہ واقع ہوا ہے اور مرضات مرضی کی جمع نہیں ہے جیسا کہ یہ احمق سمجھتے ہیں بلکہ رضی یرضی کا مصدر میمی بمعنیٰ ''رضا '' ہے بنا بریں درحقیقت یہاں نہ کوئی بیع ہوئی ہے اور نہ شراء بلکہ اس استعارہ کے پیرایہ میں حضرت امیر علیہ السلام کے اخلاص عمل کی مدح وثناء کی جارہی ہے کہ آپ علیہ السلام اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سو گئے تو محض اپنے پروردگار کی رضا جوئی کی خاطر۔اس لئے اسے بیچنے کی لفظ سے تعبیر کر دیا گیا............یعنی اللہ تعالیٰ حضرت امیر علیہ السلام کے خلوص نیت اور اخلاص عمل کی مدح وثنا کر رہا ہے کہ اس عظیم قربانی سے ان کا مقصد نام ونمود نہیں تھا اور نہ ہی اپنی شجاعت و بہادری کا اظہار مطلوب تھا بلکہ انہوں نے یہ سب کاروائی محض خدا کی رضا جوئی کی خاطر کی تھی اور یہ جذبہ ''سورہ دھر'' کی آیت ۸ میں جلوہ نما نظر آتا ہے۔''وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسۡکِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا وَّ اَسِیۡرًا ''یعنی وہ خدا کی محبت میں مسکینوں' یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں اور جب لوگ شکر یہ ادا کرنا چاہتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں جیسا کہ سورہ دھر کی آیت ۹ میں ارشاد ہوتا ہے''اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡہِ اللّٰہِ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّ لَا

شُکُوْرًا ''۔یعنی ہم تمہیں خوشنودی خدا کی خاطر کھانا کھلا رہے ہیں نہ تم سے کوئی جزاء چاہتے ہیں اور نہ کوئی شکر یہ............اسی بنا پر رومی نے کہا ہے:

'' از علیؑ آموز اخلاص عمل''

اتنی سی بات تھی جسے افسا نہ کردیا

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا......الآیة

''سلم ''''اسلام ''اور''تسلیم ''تینوں ایک ہی چیز ہیں اور''کافة ''کلمہ تاکید ہے جس کے معنی جمیع کے ہیں۔ جو یہاں حال واقع ہوا ہے اور اس کا ذوالحال۔''ادخلوا '' کی ضمیر مستتر بھی ہوسکتی ہے اور سلم بمعنی اسلام بھی جس میں داخل ہونے کا حکم دیا جارہا ہے اور جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد دین اسلام ہے جو صلح وسلامتی کا دین ہے پہلے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ تم سب کے سب اسلام میں داخل ہوجاؤ اور دوسرے اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء وجوارح اور قلب و دماغ سب کو اس طرح دائرہ اسلام کے اندر داخل ہونا چاہیے کہ تمہارا ظاہری' باطنی کوئی حصہ اس سے باہر نہ رہے اور تم مکمل طور پر پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو اور بعض کو رد کر دو اور بعض میں پس وپیش کرو چونکہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو قرآن وسنت میں مفصل بیان ہوا ہے اس کے اپنے عقائد واصول ہیں اس کے اپنے اعمال وعبادات ہیں اپنے معاملات ہیں اپنے سیاسیات ہیں اپنے معاشیات واخلاقیات اور اپنا نظام دیوانی وفوجداری ہے............اس کے فوائد اور برکات سے انسان اسی وقت مستفید ہوسکتا ہے کہ جب اسے پورے کا پورا اپنائے اور اس کے تمام اصول وفروع اور اوامر ونواہی پر عمل پیرا ہا۔آدھا تیتر اور آدھا بٹیر نہ بنے کہ نماز روزہ میں مسلمان نظر آئے اور حجامت و لباس میں انگریز' حج وزیارت میں مسلمان اور وراثت میں ہنود' زکوٰۃ وخمس میں مسلمان اور رسم ورواج میں یہود تا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود۔

اسلام میں دوغلی روش جائز نہیں ہے

اسلام میں اس دوغلی روش ورفتار کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اسلام سے ہٹ کر جو کام ہوگا وہ ''خطوات الشیطان ''پر عمل پیرائی ہوگی۔جس سے اجتناب کرنا واجب ہے۔

تنبیہ

اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے۔ معاملات اور معاشرت کے احکام کو گویا دین کا جزء ہی نہیں سمجھتے۔ اصطلاحی دین داروں میں یہ غفلت عام ہے حقوق، معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بے گانہ ہیں ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی یقین نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے معلوم کرنے یا سیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ ان پر عمل کرنے کا۔ (معارف القرآن)۔

نیز مخفی نہ رہے کہ بہت سی حدیثوں میں ''سلم'' کی باطنی تفسیر ولایت محمد وآل محمد علیہم السلام سے کی گئی ہے اور ''خطوات الشیطان'' کی تاویل ان کے دشمنوں کے نقش قدم پر چلنے سے کی گئی ہے (تفسیر عیاشی، نور الثقلین) نیز واضح رہے کہ جب آیت میں خطاب اہل ایمان کو ہے تو یہ آیت ایسی متصور ہوگی جیسے ''یا ایھا الذین آمنوا آمنوا'' کہ اے زبانی ایمان کا دعویٰ کرنے والو! اپنے عمل و کردار سے اپنے ایمان کا عملی ثبوت پیش کرو کما لا یخفی۔

آیات القرآن

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ سَلْ بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا
فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

ترجمۃ الآیات

اور اگر روشن دلیلوں (واضح احکام) کے آجانے کے بعد بھی تم ڈگمگا گئے تو خوب جان لو کہ اللہ بڑا زبردست (سب پر غالب) اور بڑی حکمت والا ہے (۲۰۹) کیا یہ لوگ اس بات کا انتظار کررہے ہیں کہ خود اللہ اور فرشتے سفید بادلوں کے سایہ میں ان کے پاس آئیں اور ہر بات کا فیصلہ ہوجائے آخر سب امور کی بازگشت تو خدا ہی کی طرف ہے۔ (۲۱۰) (اے رسول) بنو اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے ان کو انبیاء کے ذریعے کس قدر کھلی ہوئی نشانیاں عنایت کئیں اور جو (جو شخص وقوم) خدا کی نعمت کو اس کے پاس آجانے کے بعد بدل ڈالے (اسے برائی میں صرف کرے) تو خدا سخت عذاب والا ہے۔ (۲۱۱) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے زندگانی دنیا بڑی آراستہ کردی گئی ہے اور وہ ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی وہ قیامت کے دن ان لوگوں (کافروں) سے بہت بلند مقام پر ہوں گے اور خدا جسے چاہتا ہے بے حساب روزی عطا کرتا ہے۔ (۲۱۲)

تشریح الالفاظ

(۱) زللتم یہ زلّ' زلول سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پھسلنا اور گرنا۔ اور جب اس کا صلہ عن ہو جیسے زلّ عن الحق تو اس کے معنی پھرنے کے ہوتے ہیں

(۲) ظُلَل یہ ظُلَہ کی جمع ہے جس کے معنی تنگ سائبان اور ہر وہ چیز جس کے ذریعہ سے سردی یا گرمی سے پناہ لی جائے اور ہر سایہ دار

(۳) یسخرون یہ سخر سے ہے جس کا مصدر سَخرَ، سَخَر ہے جس کے معنی ٹھٹھا اور مذاق کرنے کے ہین

تفسیر الآیات

هَلْ یَنْظُرُوْنَ...الآیة

اس کا مطلب یہ ہے کہ زبانی کلامی تبلیغ ہو چکی' عمل و کردار سے اظہار ہو چکا' بینات و معجزات دکھائے

جا چکے لیکن اگر اس پر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو کیا اب اس بات کا انتظار ہے کہ خدا بنفس نفیس اپنے فرشتوں کے ساتھ سفید بادلوں کے سائے میں تشریف لائے...... جو کہ غیر ممکن ہے بنا بریں ان کا ایمان لانا بھی ناممکن ٹھہرا...... اس آیت میں آنے جانے کی نسبت خدائے تعالیٰ ۔ کی طرف دی جا رہی ہے جو جسم کی صفتیں ہیں اور خداوند عالم جسم وجسمانیات سے منزہ ومبرا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سفید بادلوں کے سایہ میں آنے کا مطلب

بنا بریں یہ آیت متشابہات میں داخل ہے ''وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗۤ اِلَّا اللهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ''(سورہ آل عمران آیت ۔ ۷) یعنی جن کی تاویل خدا جانتا ہے یا پھر راسخون فی العلم ۔ جو سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام ہیں اور انہوں نے اس آیت کی یہ تاویل کی ہے کہ یہاں آیت میں مضاف محذوف ہے یعنی اصل عبارت یوں ہے ''ان یاتیھم امر اللہ او عذاب اللہ '' یعنی کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس خدا کا عذاب آئے (اور ان کو نیست و نابود کر دے) اور کلام عرب میں مضاف کا محذوف ہونا عام مستعمل ہے (مجمع البیان)۔

بنا بریں اس آیت کا مطلب وہی ہو گا جو اس آیت کا ہے ''هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ''(سورہ انعام...... ۱۵۸) یعنی کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس عذاب کے فرشتے آئیں یا تمہارے پروردگار کا عذاب آئے۔

سَلْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ...الآیۃ

بنو اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے ان کو کس قدر کھلی ہوئی نشانیاں عنایت کیں اور انبیاء کے ذریعے کس قدر معجزات پیش کیے مگر نتیجہ کیا نکلا............؟ بعض (قلیل) لوگ ایمان لائے بعض (زیادہ تر) نے کفر اختیار کیا بعض نے اقرار کیا بعض نے انکار کیا اور بعض نے اللہ کی نعمتوں کو تبدیل کر دیا۔ (عیاشی، صافی، برہان)۔ سچ ہے کہ

جنہیں ہو ڈوبنا وہ ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

بعض سادہ لوح یا دوسروں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانے والے آج بھی کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی واضح بیانات نصب خلافت کے متعلق ہو گئے ہوتے تو بھلا اس دور کے جمہور مسلمین اس سے منحرف کیوں کر ہو سکتے تھے۔ جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ دیکھو۔ اور ان کی تاریخ سے واقف کاروں سے پوچھو کہ ان کے سامنے کتنے کھلے ہوئے آثار قدرت اور دلائل حقانیت جیسے ید بیضاء کا ظاہر ہونا،

عصاء کا اژدھا بننا' دریا کا شگافتہ ہونا' بادل کا سایہ فگن ہونا اور من وسلوٰی کا نازل ہونا وغیرہ (مجمع البیان) آئے لیکن پھر بھی انہوں نے اثر نہ لیا تو اگر اس امت میں بھی ایسا ہی ہو تو تعجب کی کونسی بات ہے۔'' (فصل الخطاب)۔

بہر حال مسلمانوں کو یہ بتلایا جا رہا ہے کہ تمہیں جو دین حق کی نعمت کا شکر ادا کرنے اور ہدایت کرنے کی امانت سونپی جا رہی ہے اگر تم نے اس کی قدر نہ کی اور اس کا غلط استعمال کیا تو جس طرح پہلی قوموں سے دنیاوی عزت اور دینی امانت واپس لے لی گئی تھی اور وہ ذلیل و رسوا ہو گئے تھے تو تمہارا انجام بھی ان سے مختلف نہ ہوگا کیونکہ

سخت ہیں قدرت کی تعزیریں

دنیوی نعمتوں کی فراوانی محبوب خدا اور تہی دامنی دشمن خدا ہونے کی دلیل نہیں ہے

زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوا......الآیۃ

خداوند عالم یہاں دنیا اور اس کی نعمتوں' دنیا اور اس کے جاہ وجلال' دنیا اور اس کے مال ومنال کی بے ثباتی اور بے وقعتی اہل ایمان کے سامنے پیش کر رہا ہے کہ ان پر کافر لوگ ہی فریفتہ اور مغرور ہوتے ہیں اور اہل ایمان کی غربت اور بے کسی کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ خدائے حکیم نے ان کی آزمائش کیلئے ان کو بے حد سامان آسائش و آرائش سے نوازا ہے یہ اس کی حکمت ہے کہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگی معیشت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

بنا داں ہم چناں روزی رساند
کہ دانا اندر اں حیرت بماند

اس میں ایمان وکفر کا کوئی دخل نہیں ہے ہاں ہمیشہ سے احمقوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ دنیوی نعمتوں کی فراوانی کو محبوب خدا ہونے کی دلیل اور تہی دامنی کو دشمن خدا ہونے کی علامت سمجھتے ہیں جو محض غلط ہے۔'' الدنیا جنۃ للکافر و سجن للمومن '' یعنی دنیا کافر کیلئے بمنزلہ جنت کے ہے اور مومن کیلئے بمنزلہ قید خانہ کے ہے (حدیث نبویؐ) قیامت کے دن پتا چلے گا کہ یہ فقیر و مسکین لوگ جن کا دنیا میں مذاق اڑایا گیا خدا کے نزدیک کس قدر عزت وعظمت کے مستحق ہیں۔

خاکسا ران جہان رابحقا رت منگر

توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مومن مرد وعورت کو اس کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے اوّلین وآخرین کے مجمع میں ذلیل ورسوا کرے گا (معارف القرآن بحوالہ قرطبی)۔

ارشاد قدرت ہے: ''فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ''(سورہ مطففین آیت ۔۳۴)۔ یعنی آج کے دن اہل ایمان کافروں کی حالت زار پر ہنستے ہوں گے۔''وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ''(سورہ آل عمران آیت ۱۴۰)۔

آیات القرآن

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۱۳ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝۲۱۴

ترجمۃ الآیات

(پہلے) سب انسان ایک ہی دین (فطرت) پر تھے (پھر جب ان میں باہمی اختلافات پیدا ہوئے) تو خدا نے انبیاء بھیجے۔ (جو نیکوکاروں کو) خوشخبری دینے والے اور (بدکاروں) کو ڈر

انے والے تھے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی (جس میں قانون تھا) تاکہ لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ کرے اور یہ اختلاف انہی لوگوں نے کیا جن کو وہ (کتاب) دی گئی تھی اور وہ بھی تب کہ جب کھلی ہوئی دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں محض بغاوت اور زیادتی کی بنا پر۔ تو خدا نے اپنے حکم سے ایمان والوں کو ان اختلافی باتوں میں راہ حق کی طرف راہنمائی فرمائی۔ اور خدا جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔(۲۱۳) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمہارے سامنے تم سے پہلے گزرے ہوئے (اہل ایمان) کی سی صورتیں (اور شکلیں) آئی ہی نہیں جنہیں فقر و فاقہ اور سختیوں نے گھیر لیا تھا اور انہیں (تکلیف و مصائب کے) اس قدر جھٹکے دیئے گئے کہ خود رسول اور ان پر ایمان لانے والے کہہ اٹھے کہ آخر اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی مدد یقیناً نزدیک ہی ہے(۲۱۴)

تشریح الالفاظ

(۱)فبعث اللہ بعث جو کہ بَعْث اور تباعت سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں بھیجنا

(۲)حسبتم یہ حسب سے ہے جس کا مصدر حسبان اور محسبہ ہے اس کے معنی گمان اور خیال کرنے کے ہیں

تفسیر الآیات

آغاز میں سب لوگ ''ملت واحدہ'' پر تھے تو پھر اختلاف کیسا؟

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً......الآیۃ

اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں مفسرین اسلام کے اقوال و آراء میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے آیا پہلے اتفاق تھا اور اختلاف انبیاء کے آنے کے بعد پیدا ہوا؟ یا پہلے اختلاف تھا اور انبیاء اس اختلاف کے رفع کے لئے آئے اور پھر جب دین ایک تھا تو وہ دین فطرت (اسلام) تھا یا کفر؟ اور پھر یہ اتحاد کب تک برقرار رہا؟ اور اختلاف کب شروع ہوا؟ وغیرہ وغیرہ۔

ہم اختصار کے پیش نظر ان اختلافات کے تفصیلی تذکرہ اور اس پر نقد وتبصرہ سے دامن بچاتے ہوئے صرف وہ بات پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں جو قرآن وسنت اور محقق مفسرین کے بیان کے مطابق صحیح وحق ہے اور وہ یہ ہے کہ آغاز تخلیق میں سب لوگ دین فطرت پر قائم تھے۔''**کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام**''۔اس طرح کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ محترمہ حضرت حوا کے دار دنیا میں تشریف لائے اور پھر جب ان کی اولاد ہوتی رہی تو وہ ان کو دین حق کی تعلیم وتلقین کرتے رہے اور وہ اسی تعلیم پر عمل پیرا بھی رہے............

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کی آمد سے کچھ عرصہ پہلے تک برابر جاری رہا(مجمع البیان)

جب نسل انسانی بڑھی تو اختلاف طبیعت' اختلاف نظر' اختلاف فہم وفراست اور سب سے بڑھ کر اختلاف اغراض کی وجہ سے باہمی اختلاف شروع ہوا اور لوگ مختلف گروہوں میں بٹ گئے اور رفتہ رفتہ عقائد ونظریات اور اعمال وعبادات کے اختلاف تک نوبت پہنچ گئی اور اس کا زیادہ تر سبب یہی باہمی ضدا ضدی اور حب مال تھا............اب کون حق پر اور کون باطل پر؟ یہ امتیاز کرنا دشوار تھا۔اسی حق وباطل کے امتیاز کی خاطر خدا نے انبیاء علیہم السلام بھیجے اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں تا کہ ان کتابوں کے ذریعے حق وباطل کا فیصلہ کریں اور لوگوں کو راہ راست کی ہدایت کریں البتہ انبیاءؑ کی تشریف آوری کے بعد لوگ مستقل طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔جو خوش قسمت لوگ ان میں سے ایمان لائے اور ان کی تعلیمات وہدایات کو قبول کیا وہ مومن کہلائے اور جن بدبختوں نے ان کو جھٹلایا اور ان کی ربانی تعلیمات وہدایات کو قبول نہ کیا وہ کافر کہلائے ارشاد حق تعالیٰ ہے۔''**فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ**''بنابرایں امت سے مراد یہاں پر ملت ودین ہے جو کہ دین فطرت ہے ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ پہلے وحدت تھی پھر اختلاف رونما ہوا اور بعد ازاں انبیاء تشریف لائے اور یہی اس آیہ مبارکہ کا مفاد ہے جو سورہ یونس میں ہے۔''**وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا**'' (سورہ یونس آیت۔۱۹) یعنی پہلے سب لوگ ایک ہی امت تھے(ایک ہی دین پر تھے) پھر آپس میں اختلاف کیا پس خدا نے انبیاء کو مبشر ومنذر بنا کر بھیجا اور ان پر کتاب نازل کی تا کہ وہ اختلافی امور کا فیصلہ فرمائیں۔(تفسیر قمیؒ)

خدا نے انبیاء کو اختلاف رفع کرنے کے لئے بھیجا

اس تمام گفتگو کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلے سب انسان دین حق پر تھے پھر اختلاف طبع اور اختلاف اغر

اض و مفادت سے ان کا باہمی اختلاف شروع ہوا جو اختلاف عقائد و نظریات تک پہنچا تو خدائے حکیم نے اس التباس و اختلاف کو دور کرنے اور از سر نو لوگوں کو اسی ملت واحدہ پر قائم کرنے کیلئے انبیاء و مرسلین بھیجے اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں۔

دین کے علمبرداروں کی حالت زار

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ جو کتاب اختلاف کے رفع کرنے اور اتحاد کے پیدا کرنے کیلئے اتاری گئی تھی اس کے جاننے' ماننے والوں نے اسی کے ذریعے لوگوں کو مختلف مسلکوں' فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا اور یہ سب کچھ باہمی بغض و عناد' حسد اور ذاتی مفاد کی وجہ سے ہوا۔ سچ ہے کہ

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در زار لالہ روئید و در شور بوم و خس

امتحان میں پاس ہوئے بغیر کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا ...الآیة

ہر دور میں ایسے لوگوں کی کثرت رہی ہے جو جنت الفردوس میں داخل ہونے کو خالہ جی کے گھر میں داخل ہونا سمجھتے رہے ہیں اور چند مذہبی رسموں کی ادائیگی کو کلید بہشت سمجھتے رہے ہیں۔ اس لئے خدائے حکیم نے قرآن کریم میں جا بجا ان لوگوں کو ان خام خیالیوں پر روکا ٹوکا ہے۔ اور واضح فرمایا ہے کہ جب تک تمہیں مصائب و آلام کی کٹھالی میں نہیں ڈالا جائے گا۔ اور جب تک تم محنت و مشقت سے کام نہیں لو گے تب تک جنت میں نہیں جا سکو گے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''الجنة حفت بالمکارہ والنار حفت بالشھوات''یعنی جنت مشکلات و مصائب میں گھری ہوئی ہے اور دوزخ خواہشات و شہوات میں گھری ہوئی ہے۔ (نور الثقلین)

اسی لئے فرمایا کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام اور ان کے مومنین کے حالات پر غور کرو کہ ان کے مخالفین نے ان کو کس طرح انواع و اقسام کی اذیتیں پہنچائیں اور خدا نے کس طرح فقر و فاقہ۔ اور سختی اور تنگی سے ان کا امتحان لیا۔ اسی طرح تمہارا بھی امتحان لیا جائے گا اور جب پاس ہو جاؤ گے تو جنت میں داخلہ نصیب ہوگا۔

حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: ''تمہیں اس طرح امتحان کی کٹھالی میں ڈالا جائے گا جس طرح چھلنی میں پانی ڈالا جاتا ہے (اور چند قطروں کے سوا باقی سب نیچے بہہ جاتا ہے)'' (نہج البلاغہ)۔

یہ ابتلاء و آز مائش اس لئے ہوتی ہے کہ ''لِيَمِيْزَ اللهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ''(انفال آیت۔۳۷) تا کہ خبیث علیحدہ ہو جائیں جو جہنم کا ایندھن ہیں اور طیب الگ ہو جائیں جو جنت کے مستحق ہیں ''وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ''(سورہ شعراء آیت۔۹۰)۔ایک اور جگہ اسی مطلب کو خدائے حکیم نے یوں بیان فرمایا ہے۔''اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ''(آل عمران آیت۔۱۴۲)یعنی کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی یہ ثابت ہی نہیں ہوا کہ تم میں سے سچے جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے کون ہیں۔سابقہ امتوں کے اہل ایمان پر اس قدر مصائب و آلام اور سختیوں کی یلغار ہوتی تھی کہ اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے گھبرا کر کہہ اٹھتے تھے کہ ''خدائی امداد کب آئے گی'' ظاہر ہے کہ یہ خدائی امداد کب آئے گی؟ ان کی تمنا اور آرزو کا اظہار رہے اعتراض نہیں ہے اور خدا انہیں تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرماتا تھا ''اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللهِ قَرِيْبٌ''(سورہ بقرہ آیت۔۲۱۴)یعنی آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی مدد و نصرت یقینا قریب ہے۔

آیات القرآن

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ

دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

ترجمۃ الآیات

(اے مسلمانو!) تم پر جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے جب کہ وہ تمہیں ناگوار ہے اور یہ ممکن ہے کہ جس چیز کو تم ناپسند کرتے ہو وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس چیز کو تم پسند کرتے ہو وہ تمہارے لئے بری ہو (اچھی نہ ہو) اصل بات یہ ہے کہ اللہ بہتر جانتا ہے تم نہیں جانتے (۲۱۶) (مشرک) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں کہہ دیجیئے! اس میں جنگ کرنا بڑا جرم ہے (مگر) خدا کی راہ سے روکنا' اور اس کا انکار کرنا اور مسجد (کی حرمت) کا انکار کرنا (اور لوگوں کو اس سے روکنا) اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا خدا کے نزدیک اس (جنگ) سے بھی بڑا جرم ہے اور فتنہ گری قتل سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے اور وہ لوگ برابر تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے ہی پلٹا دیں۔ (مگر یاد رکھو) کہ تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر کر کفر کی حالت میں مرے گا۔ تو یہ وہ بدنصیب لوگ ہیں۔ جن کے اعمال دنیا و آخرت میں رائیگاں ہو جائیں گے یہی لوگ دوزخی ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے (۲۱۷)

تشریح الالفاظ

(۱) القتال — یہ قاتل سے مقاتلہ کی طرح مصدر ہے جس کے معنی لڑنے اور دشمنی کرنے کے ہیں

(۲) کرہ — کراہت کی طرح کَرِہَ کا مصدر ہے جس کے معنی ناپسند کرنے کے ہیں اسی سے کارہ اور مکروہ مشتق ہے

(۳) شرلکم — شَر جو کہ خیر کی ضد ہے اس کے معنی برائی، کینہ اور جنگ کے ہیں جس کی جمع

شروع ہے

تفسیر الآیات

صدقہ اوراس کا مصرف

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا ......الآية۔

پورے قرآن مجید میں قریباً سترہ مقام پر سوال و جواب کے انداز میں خاص احکام مذکور ہیں۔قاعدہ یہ ہے کہ جواب ہمیشہ سوال کے مطابق ہوتا ہے اگر سوال آسمان سے متعلق ہوتو جواب ریسمان کے بارے میں نہیں دیا جاتا؟ یہاں سوال یہ تھا کہ راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ مگر جواب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ کس کس پر خرچ کریں ایسا کیوں؟اس ایراد کا ایک جواب تو مفسرین نے یہ دیا ہے کہ خداوندعالم نے مصرف کی وضاحت کرکے ان لوگوں کو تنبیہ کی ہے کہ یہ بات اہم نہیں ہے کہ کیا خرچ کریں بلکہ دراصل اہم بات یہ ہے کہ کس پر خرچ کریں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں دونوں چیزیں شامل تھیں کہ کیا خرچ کریں؟ اور کس پر خرچ کریں؟ چنانچہ عمر بن جموع کی روایت میں مذکور ہے کہ اس نے بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عرض کیا'ماذا اتصدق و علی من اتصدق؟''یعنی کیا صدقہ کروں اور کس پر کروں ؟(مجمع البیان وتفسیر مظہری)

قرآن نے سوال کے دوسرے جزء کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے جواب میں مصرف کی بڑی وضاحت و صراحت کی ہے کہ ماں باپ (جن میں دادا' دادی بھی داخل ہیں) رشتہ دار' ماموں' چچا' پھوپھی وغیرہ' یتیم' مسکین اور مسافر پر خرچ کیا جائے۔انفاق کا آغاز گھر والوں سے کیا گیا ہے اوران میں جو مرتبہ کے لحاظ سے سب پر مقدم ہیں یعنی ماں باپ وہ پہلے ذکر کئے گئے ہیں اور پہلے جزء کا اجمالی جواب دینے پر اکتفاء فرمائی ہے''وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ''(سورہ بقرہ آیت۔۲۱۵)یعنی تم جو بھی بھلائی کروگے اللہ اسے خوب جانتا ہے اور یہ کہہ کر اسے مبہم چھوڑ دیا گیا کہ''مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ ''(سورہ بقرہ آیت۔۲۱۵)یعنی جو مال تم خرچ کرو وہی ٹھیک ہے کوئی خاص پابندی نہیں ہے جواب میں والدین کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال زکوٰۃ سے متعلق نہیں ہے کیونکہ اس کا نصاب بھی مقرر ہے' مصرف بھی معین ہے اور مقدار بھی معلوم ہوتی ہے اوراس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اولاد کی زکوٰۃ ماں باپ پر نہیں لگ سکتی اور نہ ہی ماں باپ کی زکوٰۃ اولاد پر لگ سکتی ہے کیونکہ وہ

واجب النفقہ افراد میں شامل ہیں جن کوزکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اگرچہ دوسرے ان لوگوں پر لگ سکتی ہے جن کا آیت میں تذکرہ کیا گیا ہے اور مستحبی صدقہ وخیرات میں تو اس کے مستحق میں اسلام بھی شرط نہیں ہے بلکہ ہر غریب ونادار کو دیا جاسکتا ہے اور مذکورہ بالا افراد کو جو کچھ بطور ہدیہ وتحفہ دیا جائے اگر اس میں قصد قربت کیا جائے تو یہ بات موجب اجروثواب بھی ہے۔

دشمنان اسلام کے غلط پروپیگنڈہ کا جواب

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ...الآية

دشمنان اسلام نے اسلامی جہاد کو بڑے بھیانک رنگ میں پیش کیا ہے کہ مسلمان جنگ وجدال اور لوٹ مار کے طبعاً شائق تھے۔تلواریں سونت کر لوگوں کو قتل کرنا اور بستیوں کو ویران کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور زبردستی لوگوں کو اپنے دین اسلام میں داخل کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔قرآن مجید کے یہ الفاظ کہ۔''کتب علیکم القتال و هو كره لكم۔''یعنی تم پر قتال فرض کیا گیا ہے مگر وہ تمہیں ناپسند ہے کسی کی جان کا اتلاف طبعاً آدمی کے لئے شاق ہوتا ہے اور اگر مسلمان طبعاً خون خوار ہوتے اور لوٹ مار کے رسیا ہوتے اور جنگ وجدال پسند کرتے ہوتے تو انہیں جدال وقتال ناپسند کیوں ہوتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا بلکہ اپنی صداقت وسچائی وسرکار محمد وآل محمد علیہم السلام کے اخلاق واطوار کے بل بوتے پر پھیلا ہے نیز اس آیت مبارکہ میں اصل حقائق تک انسانی عقل وخرد کی نارسائی اور انسانی سوچ واپروچ کے ناقص ونا تمام ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کہ بالکل مبنی برحقیقت ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اچھائی اور برائی ایک واقعیت ہے جو مختلف اشیاء میں مضمر ہے اور احکام خداوندی اسی اچھائی یا برائی کے تابع ہوتے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ انسانی عقل وخرد کی ان مصالح ومفاسد تک رسائی نہ ہو۔اور اسی وجہ سے وہ بعض اوقات ان احکام الہیہ پر زبان اعتراض بھی دراز کر بیٹھتا ہے۔

وَاللهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ...الآية

اللہ بہتر جانتا ہے تم نہیں جانتے۔بعض اوقات بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی بھی ایک وجہ انسان کی یہی فطری کمزوری ہوتی ہے کہ وہ ایک چیز کو اپنے لئے بہتر خیال کرتے ہوئے خدا سے سوال کرتا ہے آہ وزاری کرتا ہے مگر خدا اپنے ازلی وابدی علم کی بنا پر جانتا ہے کہ وہ چیز اس کے لئے مضر ہے لہٰذا وہ اسے نہیں دیتا انسان وخدا کی مثال بلاتشبیہ چھوٹے بچے اور والدین والی ہے بچہ اپنی نادانی کی بنا پر چمکدار انگارے کو گوہر سمجھ کر ادھر ہاتھ بڑھاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے روتا ہے چیختا چلاتا ہے مگر ماں باپ یہ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔

لیکن اس کو انگارے کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ گوہر نہیں آگ کا انگارہ ہے' بچہ اگر اسے ہاتھ لگائے گا تو اس کا ہاتھ جل جائے گا اور اگر منہ میں ڈالے گا تو زبان جل جائے گی" وَاللهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ "۔

مگر یہ بات واضح ہے کہ احکام خداوندی کے سامنے ذاتی پسند و ناپسند کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس کے ہر ہر حکم اور ہر ہر فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا واجب ہے وہ بہتر جانتا ہے کہ مفید کیا ہے اور مضر کیا ہے؟ وہ بہتر جانتا ہے کہ کسی کیلئے بیٹا بہتر ہے یا بیٹی بہتر ہے؟ مال و دولت مفید ہے یا فقر و فاقہ مفید ہے؟ صحت اچھی ہے یا بیماری اچھی ہے؟ وَاللهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ...الآية

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام سے پہلے جاہلیت کے دور میں لوگ چار مہینوں کے اندر جدال و قتال حرام جانتے تھے اور وہ چار مہینے یہ تھے۔ رجب ذی قعدہ' ذی الحجہ اور محرم الحرام۔ اور اسلام نے بھی ان مہینوں کی حرمت اور اس حکم کو بحال رکھا۔ مگر ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے پھوپھی زاد عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں ایک مختصر سا دستہ تشکیل دے کر اسے کفار کی نقل و حرکت معلوم کرنے کیلئے بھیجا مشرکوں کے ایک قافلہ سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی جس کی وجہ سے کفار کا ایک آدمی قتل ہو گیا۔ ان کے تین آدمیوں کو ساز و سامان سمیت گرفتار کر لیا گیا جس روز یہ واقعہ رونما ہوا مسلمان اسے ۳۰ جمادی الثانیہ سمجھ رہے تھے جبکہ درحقیقت اس دن رجب کی پہلی تاریخ تھی (مجمع البیان و روح المعانی)

کفار و مشرکین اور منافقین کو مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا ایک حربہ ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اسے خوب اچھالا اور بات کا بتنگڑ بنا کر اس کی بڑی تشہیر کی اس آیت میں خدائے جلیل نے کفار و مشرکین کے اس پروپیگنڈا کا جواب دیا ہے کہ رجب حرمت والا مہینہ ہے اس میں جنگ و جدال حرام ہے اور بڑا گناہ ہے مگر تم لوگ بھی اپنی ناشائستہ حرکتوں پر غور کرو۔

۱۔ اللہ کی راہ سے (اسلام سے) تم لوگوں کو روک رہے ہو۔

۲۔ اس کا انکار کرتے ہو۔

۳۔ مسجد الحرام کی حرمت کا انکار تم کر رہے ہو۔

۴۔مسجد حرام سے اس کے اہل یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان کو جلاوطن کررہے ہو۔
۵۔اسلام قبول کرنے والوں کو مختلف قسم کی اذیتیں تم دیتے ہو۔
۶۔اورسب سے بڑھ کر فتنہ وشورش کا طوفان تم نے کھڑا کررکھا ہے۔ یہ فتنہ وفساد خدا کے نزدیک قتل سے بھی بڑا قبیح اور سنگین جرم ہے۔

مرتد کی تعریف اور اس کی سزا؟

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ ...الآية

اصول اسلام اور ضروریات اسلام کا اقرار کرنے کے بعد ان کے انکار کرنے والے کو شرعی اصطلاح میں مرتد کہا جاتا ہے پھر مرتد کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔مرتد فطری۔ ۲۔مرتد ملی۔

مرتد فطری سے مراد یہ ہے کہ جس کا نطفہ اس حالت میں منعقد ہو کہ اس کے ماں باپ یا ان میں سے ایک مسلمان ہو اور وہ بلوغ کے بعد اسلام کو خیر باد کہہ کر کوئی اور دین اختیار کرے اور مرتد ملی سے مراد یہ ہے کہ جس کا نطفہ دونوں کافر ماں باپ کے ملاپ سے منعقد ہو اور بعد ازاں بلوغ خود اسلام لائے اور بعد ازاں اس سے برگشتہ ہو جائے۔

ان میں مرتد فطری کا معاملہ زیادہ سنگین ہے۔ وہ مرتد ہوتے ہی شرعاً واجب القتل ہو جاتا ہے اور اگر وہ توبہ بھی کرنا چاہے تو ظاہری شریعت کے نقطہ نگاہ سے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی (اگرچہ عند التحقیق بینہ و بین اللہ قبول ہو جاتی ہے) لہٰذا اس کا مال وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس کی زوجہ عدت وفات گزار کر آزاد ہو جاتی ہے یعنی اگر وہ کسی طرح قتل ہونے سے بچ بھی جائے تاہم شرعاً اسے مردہ تصور کیا جاتا ہے مگر مرتد ملی کا معاملہ اس سے نرم ہے اسے تین دن تک توبہ کرنے کی مہلت دی جاتی ہے۔ پس اگر توبہ کرلے تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ اس کے ساتھ بھی مذکورہ بالا کاروائی کی جاتی ہے اور اگر مرتد عورت ہو تو (خواہ فطری ہو یا ملی) تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے توبہ کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ پس اگر توبہ کرلے تو بہت اچھا ورنہ اسے حبس دوام میں رکھا جائے گا اور مرتد کے دنیا وآخرت میں تمام اعمال حبط ہو جاتے ہیں اور پھر وہ ابدالآباد تک جہنم میں رہتا ہے۔ و ذالك هو الخسران المبين۔

مرتد کی سخت سزا کا فلسفہ

مخفی نہ رہے کہ مرتد کیلئے یہ کڑی سزائیں اس لئے مقرر کی گئی ہیں کہ فتنہ ارتداد کا ہمیشہ کیلئے سد باب ہو

جائے اور دین اسلام کا اختیار کرنا اور اسے چھوڑنا بازیچہ اطفال نہ بن جائے اور ارتداد کی وبا پھوٹنے نہ پائے واللہ العاصم (قوانین الشریعہ)۔

احباط وتکفیر اور موازنہ کا تذکرہ

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ...الآیۃ۔

علم کلام کی اصطلاح میں احباط کا مفہوم یہ ہے کہ بعد والے گناہ کی وجہ سے پہلی نیکی ضائع وا کارت ہو جائے اور تکفیر سے مراد یہ ہے کہ بعد والی نیکی سے پہلے والی دور ہو جائے اور موازنہ کا مقصد یہ ہے کہ نیکیوں اور برائیوں کا موازنہ ومقابلہ کیا جائے پس جو چیز (نیکی یا بدی) غالب آجائے اس سے دوسری چیز نابود ہوجائے اور اگر دونوں مساوی ہوں تو دونوں کا لعدم قرار پائیں۔ معتزلہ حضرات ان امور کے قائل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جیسے کفر وشرک جن سے سابقہ حسنات ضائع ہوجاتے ہیں۔ ارشاد قدرت ہے۔ ''اولئك الذين كفر وا بايا تنا ولقائه فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيامه وز نا''۔ اسی طرح بعض طاعات سے سابقہ سیئات محو ہو جاتے ہیں جیسے ایمان بعد الکفر' اور توبہ بعد العصیان۔ ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الجملہ احباط وتکفیر ثابت ہے۔ مگر غور طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ کلیہ درست ہے کہ ہر گناہ کبیرہ حبط اعمال کا موجب ہوتا ہے اور ہر حسنہ تکفیر سئیات کا باعث ہوتا ہے؟ مشہور عندالامامیہ والاشاعرہ یہ ہے کہ یہ باطل ہے کیونکہ اس سے ظلم وجور اور تاثیر عرض درعرض لازم آتی ہے جو کہ محال ہے اور جہاں تک موازنہ کا تعلق ہے تو اس کا بطلان تو اظہر من الشمس ہے ''والاوسط اوسط وهو احوط''۔ (احسن الفوائد فی شرح العقائد والانوار النعمانیہ)۔

آیات القرآن

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ
وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ
فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

ترجمۃ الآیات

بے شک جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا یہ ہیں وہ لوگ جو خدا کی رحمت کے امیدوار ہیں اور خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے(۲۱۸) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجیئے۔ کہ ان میں بڑا گناہ ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (راہ خدا میں) کیا؟ خرچ کریں؟ کہہ دیجئے۔ جو کچھ (تمہاری ضروریات سے) زیادہ ہو؟ اس طرح خدا تمہارے لئے اپنی آیات وہدایات واضح کرتا ہے۔ تاکہ تم دنیا وآخرت کے بارے میں غور وفکر کرو۔(۲۱۹) اور لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہہ دیجئے! کہ ان کی ہر طرح اصلاح (احوال کرنا) بہتر ہے اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو (تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں آخر) وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ مفسد (خرابی کرنے والا) اور اصلاح کرنے والا کون ہے؟ اور اگر خدا چاہتا تو تمہیں مشکل و مشقت میں ڈال دیتا یقیناً خدا زبردست ہے اور بڑی حکمت والا ہے(۲۲۰)

تشریح الالفاظ

(۱) خبطت — یہ حَبط اور حُبوط سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عمل کا بے کار رہنا اور برباد ہونا
(۲) الخمر — اور الخمرہ کے معنی ہیں انگور کی شراب اور ہر نشہ آور چیز
(۳) اَلْمَیْسر — اس کے معنی ہیں جُوا۔ تیروں کا جُوا

تفسیر الآیات

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...الآیۃ

یہ آیت مبارکہ جناب عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ (مجمع البیان)۔

شراب اور جوا کی حرمت اور اس حرمت کے تدریجاً نازل ہونے کا بیان

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ...الآیۃ۔

واضح رہے کہ باتفاق تمام علمائے اسلام شراب نوشی حرام ہے اور گناہان کبیرہ میں سے ہے جو اسے حلال سمجھے وہ مسلمان نہیں ہے اور جو حرام سمجھ کر پیئے وہ فاسق وفاجر ہے اور اس سے مراد ہر وہ مشروب ہے جو نشہ آور ہو اور عقل کو متاثر کرے۔ قبل از اسلام دور جہالت میں شراب نوشی کا عام رواج تھا۔ ابتدائے اسلام میں دوسری عام رسومات جاہلیت کی طرح شراب نوشی بھی عام تھی ہجرت کے بعد جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہاں بھی شراب پینے اور جوا کھیلنے کا عام رواج تھا تو حکیم مطلق نے اسلامی احکام چونکہ تدریجی طور پر نازل کئے ظاہر ہے کہ اس حرمت کا اعلان بھی بتدریج ہوا۔ اور اگر یکبارگی اس کی حرمت کا اعلان ہوتا تو لوگوں کیلئے بہت شاق ہوتا۔ اوائل میں جب کچھ مسلمانوں کو شراب وجوا کے نقصانات کا کچھ احساس ہوا اور اس کی وجہ سے ان میں بے چینی پیدا ہوئی تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے میں سوال کیا تو ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ان چیزوں میں کچھ دنیاوی فوائد ہیں۔ مثلاً شراب میں سرور ہے اور جوا میں محنت کے بغیر کچھ دولت مل جاتی ہے مگر ان کے مالی، بدنی اور اخروی نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں اس لئے یہ بات لوگوں کی سمجھ میں آگئی کہ جس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو وہ کام کرنے کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے تو اب شراب پینی چھوڑ دی اور جوا کھیلنا ترک کر دیا۔ مگر کچھ لوگوں نے یہ شغل بدستور جاری رکھا۔ اس کے بعد جب سورہ نساء کی آیت ''لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى'' نازل ہوئی جس میں نماز کے اوقات کے اندر شراب نوشی کو حرام قرار دے دیا گیا تو اس آیت کے نزول کے بعد مزید کچھ لوگوں نے شراب نوشی ترک کر دی مگر کچھ لوگ پھر بھی پیتے رہے یہاں تک کہ سورہ مائدہ کی درج ذیل دو آیتیں نازل ہوئیں۔

''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ

الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۹۰ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝۹۱''۔

یعنی اے ایمان والو! شراب' جوا' بت اور جوئے کے تیر یہ سب گندی اور شیطانی باتیں ہیں ان سے اجتناب کرو تا کہ فلاح پاؤ(۹۰) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان بغض و عداوت ڈالے اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے باز رکھے کیا تم اس سے باز آجاؤ گے؟(۹۱)

ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد جن میں صریح طور پر شراب اور جوئے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لوگوں نے شراب کے برتن توڑ دیئے' شراب بہادی گئی۔ جام توڑ دیئے گئے اور جس کے لبوں تک جام شراب پہنچا ہوا تھا اس نے اسے وہیں پھینک دیا اور کہا ہم رک گئے' ہم رک گئے (اسلامی تفاسیر)

شراب ام الخبائث ہے' شیطانی فعل ہے اور تباہی و بربادی کا ذریعہ ہے شراب کے ساتھ چونکہ قمار (جوئے) کے متعلق بھی سوال کیا گیا تھا لہٰذا جواب میں دونوں کو یکساں نقصان دہ اور مضر رساں قرار دیتے ہوئے حرام قرار دیا گیا۔ اور لاٹری' ریفل ٹکٹ وغیرہ سب اس میں داخل ہیں۔

شراب کی حرمت کی شدت کا اندازہ لگانے کیلئے یہی بات کافی ہے کہ شرابی کی حد اسی (۸۰) کوڑے ہیں جبکہ غیر شادی شدہ زنا کار مرد وزن کی سزا سو کوڑے ہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب خانہ خراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت کی ہے۔

ا۔ نچوڑنے والا'	۲۔ بنانے والا'
۳۔ پینے والا'	۴۔ پلانے والا'
۵۔ لادکر لانے والا'	۶ اور جس کیلئے لادکر لائی جائے'
۷۔ بیچنے والا'	۷۔ خریدنے والا'
۹۔ ھبہ کرنے والا	۱۰۔ اس کی آمدنی کھانے والا (خصال شیخ صدوقؒ)۔

شراب اور جُوا کی بعض برائیوں کا تذکرہ

الغرض شراب ایک ایسی لعنت ہے جس سے شرابی کی اپنی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے اور اس کی آنے والی نسل بھی۔ اس سے اخلاق واطوار برباد ہوتے ہیں۔ اور معاشرہ تباہ ہوتا ہے اور اس کا براہ راست اثر بد انسان کی سب سے زیادہ قیمتی چیز یعنی عقل پر ہوتا ہے اور جوا و شطرنج بھی سماجی و معاشرتی برائیوں میں شراب سے کم نہیں

ہیں۔اس سے جہاں انسانی فکر وعمل میں ہیجان اور جرائم میں عدوان پیدا ہوتا ہے۔وہاں جائز کسب واکتساب اور محنت سے نفرت پیدا ہوتی ہے............ یہاں اس سے زیادہ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں ہے و فیہ کفایۃ لمن لہ ادنی درایۃ۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْن......الآیۃ۔

جو سوال آیت نمبر ۲۱۵ میں کیا گیا تھا وہ دو اجزاء پر مشتمل تھا۔کیا خرچ کریں اور کہاں صرف کریں؟ مگر وہاں پہلے جز کو نظرانداز کر کے اور صرف ''ما انفقتم من خیر'' کہہ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔البتہ دوسرے جز کا جواب تفصیل سے دیا گیا تھا۔تو سوال کرنے والوں نے پھر پہلے جز و کے متعلق تفصیل پوچھی کہ راہ خدا میں کیا خیرات کریں تو خدائے حکیم نے ایک لفظ سے اس کا جواب دیا ہے ''قل العفو''۔کہہ دو۔عفو خیرات کرو۔عفو کے کئی معنوں میں سے ایک معنی فاضل اور زائد کے بھی ہیں۔یعنی جو کچھ آدمی کے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے روز مرہ یا سال بھر کے اخراجات ومصارف سے بچ جائے وہ راہ خدا میں صرف کر دینا چاہیے اور دوسرے معنی میں وسط یعنی راہ خدا میں خیرات کرتے وقت افراط وتفریط نہ کرو۔نہ اس قدر کشادہ دستی سے کام لو کہ خود تنگ دست و پریشان حال ہو جاؤ اور نہ اس طرح بخل وتقتیر سے کام لو کہ کچھ بھی خیرات نہ کرو۔جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

''وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (سورہ بنی اسرائیل......۲۹)''۔

اور یہ چیز اسلام کے حکیمانہ نظام کی دلیل ہے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت کو زکوٰۃ والی آیت نے منسوخ کر دیا ہے مگر اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ زکوٰۃ شارع کی جانب سے ایک مالی فریضہ ہے مگر یہ عفو کا انفاق شارع کی طرف سے بطور حکم نہیں آیا بلکہ لوگوں کے بار بار کے سوال پر آیا ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کوئی لازمی حکم نہیں ہے بلکہ خوشنودی خدا کی خاطر خیرات ہے جو مستحبی صدقہ کے زمرہ میں آتی ہے واللہ العالم۔

یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى......الآیۃ

کچھ لوگوں نے یتیموں کے مال کو خرد برد کرنے کیلئے کئی طریقے اپنا رکھے تھے مثلاً اسی نیت سے ان کے ساتھ مل کر شراکتی کاروبار کرتے تھے بعض یتیم مگر مالدار بچیوں سے اسی ارادہ کے تحت اپنے ساتھ یا اپنے

بچوں کے ساتھ شادی رچاتے تھے۔ ہاں البتہ کچھ لوگ نیک نیتی کے ساتھ ان کو شریک کار بناتے تھے اور کھانے پینے کا انتظام اپنے ساتھ کرتے تھے اور پوری دیانت داری کے ساتھ ان کا نفع ان تک پہنچاتے تھے۔ تو جب خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی کہ:

''اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا'' یعنی جو لوگ یتیموں کا ناحق مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں............(سورہ نساء آیت۔۱۰)

اور یہ آیت بھی اتری:

''وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ'' کہ سوائے احسن وعمدہ طریقہ کے یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ (سورہ مائدہ آیت۔۱۵۲)

اور خدا نے سختی سے یتیموں کے مال میں بد دیانتی کرنے سے منع فرمایا ہے اور جو لوگ نیک نیتی اور یتیموں کی بہتری کیلئے اپنے ساتھ شریک کئے ہوئے تھے وہ بھی پریشان ہو گئے اور جہاں اور لوگ اختلاط و اشتراک کرنے سے باز آ گئے وہاں یہ نیک نیت بھی سوچنے لگے کہ اس خطرہ سے بچنے کیلئے بہتر ہے کہ یتیموں کے ساتھ کوئی ربط وضبط ہی نہ رکھا جائے اور اسطرح یتیموں کا نقصان ہونے لگا اور معیشت تباہ ہونے لگی تو کچھ مسلمانوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں سوال کیا اور اس افراط وتفریط سے بچنے اور اعتدال کو قائم رکھنے کیلئے یہ آیت نازل ہوئی کہ یتیم تمہارے دینی بھائی ہیں۔ لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں فائدہ پہنچانے کیلئے ان کا روپیہ مشترکہ کاروبار میں لگاؤ اور انہیں نفع پہنچاؤ لہٰذا ان کے ساتھ حسن سلوک سے باز نہ آؤ۔ ہاں تمہیں ان کا روپیہ ہضم کرنے اور اسے خرد برد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ''انما الاعمال بالنیات'' خدا بہتر جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون۔ ''وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ'' (سورہ بقرہ آیت۔۲۲۰)۔ یعنی اگر خدا چاہتا تو تمہیں مشکل اور مشقت میں ڈال سکتا تھا کہ ادھر تو کہتا کہ یتیم کے مال کو ہاتھ تک نہ لگاؤ۔ اور اپنے مال کے ساتھ اس کی آمیزش نہ کرو اور ادھر یہ بھی حکم دیتا کہ یتیموں کی کفالت کرو اور ان کے مال کی حفاظت کرو تو اس کی تعمیل تمہارے لئے مشکل ہو جاتی اور تم زحمت ومشقت میں پڑ جاتے ہیں لہٰذا خدا جہاں عزیز وغالب ہے وہاں حکمت والا بھی ہے اس لئے اس نے تمہارے لئے سہولت پسندی سے کام لیا ہے اور تمہیں زحمت میں نہیں ڈالا۔

آیات القرآن

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

ترجمۃ الآیات

(اے مسلمانو!) خبردار مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو۔ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ (کیونکہ) ایک مومنہ کنیز مشرکہ (آزاد عورت) سے اچھی ہے اگرچہ (حسن و جمال میں) تمہیں کتنی ہی بھلی معلوم ہو۔ اور مشرک مردوں کے نکاح میں اس وقت تک نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ بے شک مسلمان غلام مشرک (آزاد شوہر) سے بہت اچھا ہے اگرچہ وہ (مشرک) تمہیں کتنا ہی بھلا معلوم ہو۔ یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور خدا اپنے حکم سے (تمہیں) جنت اور مغفرت (بخشش) کی طرف بلاتا ہے اور اپنے احکام کو لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں (اثر لیں) (۲۲۱)

تشریح الالفاظ

(۱) **قل العَفْو** اس کے معنی میں عمدہ چیز، فضل و معروف اور جب العفو من المال کہا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے خرچہ سے زیادہ وہ مال جس کا دینا دشوار نہ ہو۔ ویسے عفا یعفو عفوا کے معنی معاف کرنے اور سزا نہ دینے کے ہوتے ہیں

(۲) **وان تخالطوهم** یہ خلاط اور مخالطة سے مشتق ہے جس کے معنی آمیزش کرنے اور میل ملاپ

کرنے کے ساتھ رہنے کے ہیں۔

تفسیر الآیات

اہل اسلام اور کفار کے باہمی عقد و ازدواج کی حرمت کا بیان

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ...الآیۃ

اوائل اسلام میں مسلمان کفار و مشرکین سے رشتہ لیتے تھے اور ان کو دیتے بھی تھے مگر بعد میں ان آیات شریفہ کے ذریعے اس قسم کے عقد و ازدواج کو یعنی کفار و مشرکین سے رشتہ لینے دینے کو حرام قرار دے دیا گیا۔ لہٰذا اب مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے اور کافر عورتوں کا نکاح مسلمان مردوں سے ہرگز جائز نہیں ہے............ ہاں البتہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی عورتوں سے عقد و ازدواج کرنے میں فی الجملہ اختلاف ہے برادران اسلامی کے ائمہ اربعہ اس کے جواز پر متفق ہیں جب کہ ہمارے فقہاء میں قدرے اختلاف ہے اکثر عدم جواز کے قائل ہیں جب کہ بعض اس کے جواز کے قائل ہیں سورہ مائدہ کی آیت نمبر پانچ میں اہل کتاب کی عورتوں سے ازدواجی تعلقات کا تذکرہ ہے۔

''وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ''۔ یعنی حلال ہیں تمہارے لئے پاک دامن مومن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے

مگر اس آیت میں یہ فقرہ موجود ہے۔

''اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ'' یعنی یہ حلت اس وقت ہے جب تم ان عورتوں کی اجرتیں ان کو دے دو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نکاح موقت یعنی عقد متعہ سے متعلق ہے جو بوقت ضرورت عارضی طور پر ہوتا ہے اور اس میں یہ وسعت دی گئی ہے کہ جب کوئی مسلمان عورت نہ مل سکے تو اہل کتاب کی عورتوں سے متعہ کر لیا جائے مگر عقد دائمی بہرحال جائز نہیں ہے۔ جسے ایک اور آیت میں مزید صراحت کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے۔ ''وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ'' (سورہ ممتحنہ آیت۔۱۰) یعنی کافر عورتوں کے دامن کو مس نہ کرو اور اس ممانعت و حرمت کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کفار آتش دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ان سے میل محبت رکھنے اور ان سے یگانگت اختیار کرنے کا فطری نتیجہ ان کی طرف رجحان و میلان کی شکل میں سامنے

آتا ہے اور اس میلان ورجحان کا لازمی نتیجہ آتش دوزخ ہے ارشاد قدرت ہے کہ:
''وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ'' یعنی ظالموں کی طرف میلان نہ کرو ورنہ تمہیں جہنم کی آگ چھوئے گی۔ (سورہ ھود آیت۔ ۱۱۳)
ظاہر ہے کہ مرد وزن دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں مگر چونکہ مرد طاقتور ہے اور عورت کمزور اس لئے مرد اثر انداز ہونے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا اس امکانی خطرہ سے بچنے کیلئے اس عقد وازدواج کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔

آیات القرآن

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِىْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

ترجمۃ الآیات

اور لوگ آپ سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے! کہ وہ گندگی ہے' لہٰذا تم ایام حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ پھر جب وہ طہارت کر لیں تو جدھر سے خدا نے حکم دیا ہے ان کے

پاس جاؤ۔ بے شک اللہ دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور طہارت کرنے والوں کو (۲۲۲) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں (اس لئے) اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنے لئے (خدا کی بارگاہ میں) پیشگی (اعمال) بھیج دو۔ اور اللہ اور ایمان والوں کو خوشخبری (مبارکباد) دے دو (۲۲۳) اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ تاکہ تم نیکوکار، پرہیزگار بن سکو اور لوگوں میں صلح کرا سکو اور اللہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (۲۲۴) خدا تمہاری لایعنی (غیر ارادی) قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جو قسمیں تم دل سے کرو گے (کھاؤ گے) اس کا مواخذہ کرے گا اور خدا بڑا بخشنے والا اور بڑا برداشت کرنے والا ہے (۲۲۵)

تشریح الالفاظ

(۱) حرث لکم — حرث کے معنی کھیتی کے ہیں۔
(۲) اذیً — اس کے اور اذاۃ کے معنی ہیں اذیت اور تکلیف پانا۔
(۳) عرضۃً — اس کے معنی نشانہ کے ہیں
(۴) لایمانکم — یہ یمین کی جمع ہے جس کے معنی ہیں قسم

تفسیر الآیات

حائض کے احکام

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ......الآية

یہود کا دستور تھا کہ وہ ہندوؤں کی طرح ایام حیض میں عورت سے ہر قسم کے تعلقات ختم کر لیتے تھے اور اس کے ساتھ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب بند کر دیتے۔ اس کے برعکس نصرانی ان دنوں میں کسی قسم کی کوئی پرہیز نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مباشرت بھی کرتے تھے۔ اور جہاں تک مشرکین عرب کا تعلق ہے تو ان کا رویہ بھی قریباً یہود کے رویہ سے ملتا جلتا تھا بلکہ یہ لوگ ان ایام میں عورتوں کو اپنے گھروں سے جدا کر کے علیحدہ مکان میں رکھتے تھے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی جس

میں اسلام کی روایتی اعتدال پسندی کارفرما ہے جس میں نہ یہود کی طرح افراط ہے اور نہ ہی نصاریٰ کی طرح تفریط۔ بس ان ایام میں مقاربت سے روک دیا گیا ہے اور دوسرے معاملات کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ مباشرت کی حرمت کب تک ہے قرآن نے اس کا جواب دیا ہے۔ ''حَتّٰى يَطْهُرْنَ'' جب تک حیض سے پاک نہ ہو جائیں یعنی جب حیض کا آنا بند ہو جائے گو ہنوز غسل نہ بھی کیا ہو تو اس صورت میں ان کے پاس جانے کی اجازت ہے اور حیض والی پابندی ختم ہے مگر بالصراحت مباشرت کی جہاں اجازت دی گئی۔ وہ حیض سے طہارت نہیں بلکہ تطہر سے وابستہ ہے یعنی جب حیض والی عورت غسل کر لے تو نتیجہ یہ نکلا کہ ایام حیض میں مباشرت حرام ہے اور غسل کے بعد بالکل جائز ہے۔ مگر بندش حیض کے بعد اور غسل سے پہلے مکروہ ہے جیسا کہ بعض اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے۔ (مجمع البیان' تفسیر کاشف' ضیاء القرآن و فصل الخطاب وغیرہ)

عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں............ کا صحیح مفہوم

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ......الآیۃ

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مفسرین اسلام نے بڑی موشگافیاں کی ہیں کہ عورت کے کھیتی ہونے کا مفہوم کیا ہے؟ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو۔ آؤ۔ کا صحیح مطلب کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ حقیقت یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت قرآنی کا اعجاز ہے کہ وہ ایک نازک ترین حقیقت کو کیسے احسن پیرایہ میں بیان فرماتا ہے کہ جبین حیاء پر شکن بھی نہیں پڑتی اور مقصد بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے اگر غور کیا جائے تو اسلامی ازدواج کا سارا فلسفہ سمیٹ کر ان دو لفظوں میں رکھ دیا گیا ہے شادی کا مقصد صرف لذت طلبی نہیں بلکہ حصول اولاد ہے اس لئے بیوی ایسی منتخب کرو جو نیک اور پاک باز ہو کیونکہ اگر ردی زمین میں تخم ریزی کی گئی تو اچھی کھیتی کی توقع عبث ہے............

''انی شئتم'' بمعنی کیف ہے یعنی مقاربت کرنے کی کوئی ہیئت متعین نہیں ہے بلکہ جیسے تمہیں پسند ہو کرو۔ صرف ایک شرط ملحوظ رہے کہ تخم ریزی وہاں کی جائے جو جگہ اس کیلئے مخصوص کی گی ہے۔ آیت کے ان الفاظ سے دو غلط کاریوں کا ردّ کر دیا گیا ہے یہود نے مقاربت کیلئے ایک شکل مخصوص کر رکھی تھی۔ فرمایا کسی خاص ہیئت کی پابندی کی ضرورت نہیں بلکہ جیسے تمہیں پسند ہو۔ اور بعض گندے مزاج کے لوگ عورتوں سے لواطت کیا کرتے تھے اس سے منع فرمایا کہ وہ تخم ریزی کی جگہ نہیں۔ اس سے شادی کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے اور عورت کے طبعی حقوق بھی پامال ہوتے ہیں (ضیاء القرآن)

صاحب انوار القرآن لکھتے ہیں لفظ ''انّٰی'' کہاں' کب' کہاں سے اور کیسے کے معنی میں استعمال ہوتا

ہے اور قرآن مجید میں سب کے شواہد موجود ہیں اور اس طرح وطی فی الدبر کا جواز نکلتا ہے جیسا کہ امام رازی نے عمر اور مالک سے نقل کیا ہے اور ابوبکر اندلسی نے احکام القرآن صفحہ ۳۷ پر بہت سے صحابہ اور تابعین کا حوالہ دے کر لکھا ہے لیکن کھیتی کا لفظ اشارہ ہے کہ بیج وہاں استعمال کرو جہاں پیداوار کا امکان ہو۔ ورنہ بیج ضائع ہو جائے گا اور کچھ حاصل بھی نہ ہوگا۔ ویسے وہ تمہاری زوجہ ہے تم کہاں۔ کیسے۔ اور کب کے معاملات میں بالکل آزاد ہو۔ ارشاد قدرت ہے:

''فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ'' یعنی جب عورتیں ایام سے پاک ہو کر غسل کرلیں تو جدھر سے خدا نے حکم دیا ہے ان کے پاس جاؤ''۔

ظاہر ہے کہ خدائے حکیم نے ادھر سے آنے کا ہی حکم دیا ہے جدھر سے پیداوار ہوتی ہے۔ ہاں البتہ اس کی کوئی خاص ہیئت و کیفیت متعین نہیں ہے لہٰذا تم ہر وہ ہیئت منتخب کر سکتے ہو جو تمہیں پسند ہو۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے عورت کے ساتھ وطی فی الدبر کے بارے میں دریافت کیا گیا فرمایا ''المرأة لعبة فلا توذها'' عورت کھلونا ہے اسے اذیت نہ دو۔ اور وہ کھیتی ہے جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے (تفسیر نور الثقلین)۔

اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ...الآیۃ

ہر چھوٹی بڑی بات پر خدا کے نام کی قسم کھانے کی حدیثوں میں بڑی مذمت وارد ہوئی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''لا تحلفوا باللّٰه صادقين ولا كاذبين'' یعنی خدا کے نام کی سچی یا جھوٹی قسمیں نہ کھایا کرو جیسا کہ وہ فرماتا ہے ''وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ'' (اصول کافی)۔

نیز انہی جناب سے منقول ہے کہ آپ نے اپنے صحابی سدیر سے فرمایا:

''يا سدير من حلف باللّٰه كاذباً كفر ومن حلف باللّٰه صادقاً اثم ان اللّٰه عزّ و جلّ يقول لا تجعلوا اللّٰه عرضة لايمانكم'' یعنی اے سدیر جو خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھائے وہ کافر ہے اور سچی کھائے وہ گناہگار ہے خدا فرماتا ہے خدا کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ (اصول کافی)۔

لوگوں میں یہ رواج تھا (اور اب بھی ہے) کہ وہ طیش میں آ کر اس قسم کی غلط قسمیں کھایا کرتے تھے کہ

اپنے ماں باپ سے کلام نہیں کریں گے' اپنی برادری سے قطع تعلق کرلیں گے وغیرہ وغیرہ اور پھران قسموں کی وجہ سے یہ نیکی نہ کرنے کے ارادے کو دین جانتے تھے اس طرح عبداللہ بن رواحہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے داماد بشیر بن نعمان کے ہاں نہیں جائے گا۔ اس سے کلام نہیں کرے گا اور اس کے درمیان صلح نہیں کرائے گا لہٰذا اگر کوئی شخص اس سے اس معاملہ میں بات کرتا تو وہ کہتا کہ میں نے قسم کھائی ہے اس لئے میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اس پر یہ آیت نازل ہوئی (مجمع البیان وغیرہ)۔

لہٰذا خداوند عالم نے لوگوں کو ایسی قسمیں کھانے اور انہیں نیکی نہ کرنے کی آڑ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ ایسی قسمیں اس لئے نہ کھاؤ۔ تاکہ تم نیکوکار اور پرہیزگار بن سکو۔ اور لوگوں کے درمیان صلح کرا سکو۔ اور ان قسموں کو آڑ بنا کر ان نیک کاموں سے باز نہ رہو۔

لغو قسم پر مواخذہ نہیں ہے

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ...الآية

لغو قسم اسے کہا جاتا ہے جو بلا قصد اور بلا ارادۂ قلبی محض تکیۂ کلام کے طور پر ''بلی واللہ' لا واللہ'' کہہ کر اٹھائی جائے۔ اس قسم کی قسم کا خدا مواخذہ نہیں کرتا۔ ہاں جو قسم ارادہ قلبی کے ساتھ کھائی جائے اس کا مواخذہ فرماتا ہے جیسا کہ یہاں فرماتا ہے '' وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ '' اور ایک اور مقام پر فرماتا ہے ''وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ '' (سورہ مائدہ آیت۔ ۸۹) یعنی خدا تم سے ان قسموں کا مواخذہ کرے گا جو دل سے کھاؤ گے اور ایسی قسم اگر توڑی جائے تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا 'یا ان کو کپڑے پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور اگر اس کا م کا مقدمقدور نہ ہو تو پھر تین روزے رکھے۔

آیات القرآن

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾
وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ
يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ
وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

ترجمۃ الآیات

جولوگ اپنی بیویوں سے الگ رہنے (مباشرت نہ کرنے) کی قسم کھا لیتے ہیں (ان کے لیے) چار مہینے کی مہلت ہے۔ پس اگر اس کے بعد (اپنی قسم سے) رجوع کریں تو بے شک خدا بڑا بخشنے والا' بڑا مہربان ہے (۲۲۶) اور وہ اگر طلاق دینے کا ہی عزم بالجزم کرلیں تو بے شک خدا (سب کچھ) سننے اور جاننے والا ہے (۲۲۷) اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے تو وہ اپنے آپ کو (عقد ثانی) سے روکیں۔ تین مرتبہ ایام ماہواری سے پاک ہونے تک۔ اور اگر وہ خدا اور روز جزاء پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ اسے چھپائیں۔ جو کہ خدا نے ان کے رحموں (شکموں) میں پیدا کیا ہے۔ اور اس دوران ان کے شوہر اگر تعلقات بحال کرنا چاہیں تو وہ انہیں واپس بلانے (اور اپنی زوجیت میں رکھنے کے) زیادہ حقدار ہیں اور اس دوران دستور شریعت کے مطابق عورتوں کے کچھ حقوق ہیں جس طرح کہ مردوں کے حقوق ہیں ہاں البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے۔ خدا زبردست (حاکم) اور حکمت والا ہے (۲۲۸)۔

تشریح الالفاظ

(۱) **یؤلون** یہ ایلاء سے مشتق ہے جس کے معنی قسم کھانے کے ہیں اور فقہاء کی اصطلاح میں ایک خاص قسم کی قسم کا نام ایلاء ہے اور وہ یہ ہے کہ شوہر قسم کھائے کہ وہ اپنی بیوی سے مباشرت نہیں کرے گا۔

(۲) **قروء** یہ قرء کی جمع ہے جو کہ اضداد میں سے ہے جو حیض اور اس سے پاک ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے

تفسیر الآیات

''ایلاء'' کا شرعی مفہوم اور اس کے احکام

لِلَّذِيۡنَ يُؤۡلُوۡنَ...الآیۃ

اس آیت میں ''ایلاء'' کا شرعی مفہوم بیان کیا جا رہا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ''ایلاء'' ایک قسم کی طلاق تھی۔ مگر شریعت مقدسہ نے اسے حرام قرار دیتے ہوئے اس کے لئے کچھ خاص احکام مقرر کئے ہیں جن کے دیکھنے سے یقین کامل ہوجاتا ہے کہ یہ شریعت خالق فطرت کی وضع کردہ ہے۔

''ایلاء'' کے معنی ہیں قسم کھانا۔ اور فقہاء کی اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر قسم کھائے کہ وہ اپنی بیوی سے مباشرت نہیں کرے گا اس طرح عورت زوجیت میں بھی رہتی ہے اور حقوق زوجیت سے محروم بھی ہوجاتی ہے۔ قرآن اس ظلم کا خاتمہ کرتے ہوئے شوہر کو چار ماہ کی مہلت دیتا ہے۔ بعدازاں (عورت کی استدعا پر) حاکم شرع شوہر کو دو باتوں میں سے ایک بات پر مجبور کرے گا یا تو بیوی سے مباشرت کرکے اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے یا پھر اسے طلاق دے کر ہمیشہ کیلئے فارغ کردے۔ پس اگر شوہر کسی ایک بات پر رضامند ہوجائے تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ حاکم شرع اسے قید و بند میں رکھ کر اس وقت تک برابر اس پر سختی کرے گا جب تک ان دو باتوں میں سے کسی ایک پر راضی نہ ہوجائے۔ اس موضوع کی دوسری تفصیلات فقہی کتابوں میں مذکور ہیں۔

عدّت گزارنے کا بیان

وَ الۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ...الآیۃ

اس آیت مبارکہ میں عدت طلاق کا بیان ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ تو وہ طلاق کے فوراً بعد کسی دوسرے شخص سے عقد نہیں کرسکتی۔ بلکہ اسے عدت گزرنے تک انتظار کرنا ہوگا اگرچہ ''الۡمُطَلَّقٰتُ'' کا لفظ عام ہے مگر دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ یہ حکم اس مطلقہ عورت کا ہے جو مدخولہ ہو اور یہ کہ اسے ایام ماہواری آتے ہوں یعنی یائسہ نہ ہو۔ کیونکہ غیر مدخولہ' یائسہ اور نابالغ مطلقہ کیلئے عدت نہیں ہے۔ یہ عدت کس قدر ہے؟ تین قروء۔ قروء قرء کی جمع ہے اور قرء اضداد میں سے ہے۔ جو حیض اور اس سے پاک ہونا دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کی تفصیل تین طہر ہے۔ یعنی تین بار حیض سے پاک ہو۔ جن میں پہلا طہر وہ ہے جس میں طلاق دی گئی ہے۔ اسلامی برادری کے آئمہ اربعہ میں سے امام شافعی ہمارے ہم

نواہیں (تفسیر نیشاپوری)۔ مخفی نہ رہے کہ حاملہ مطلقہ کی عدت وضع حمل ہے جو اس عدت سے کم بھی ہوسکتی ہے اور زیادہ بھی۔ چونکہ یہ طلاق رجعی ہے۔ اس لئے شوہر کو عقد جدید کے بغیر سابقہ حق زوجیت کی بنا پر رجوع کر کے تعلقات زوجیت قائم کرنے کا حق حاصل ہے اور اس میں عورت کی رضامندی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ ہاں البتہ یہ رجوع اصلاح احوال اور نباہ کی خاطر ہونا چاہیے نہ کہ صرف عورت کو پریشان کرنے کیلئے۔

عدت گزارنے کی حکمتیں

الغرض اس عدت میں بڑی حکمتیں مضمر ہیں۔ مثلاً مطلقہ اگر حاملہ ہے تو اس کا پتہ چل جائے گا۔ جو ایک تو شوہر کو رجوع پر آمادہ کرے گا۔ دوسرے بچے کا نسب مشکوک و مخلوط نہ ہوگا۔ اور اس دوران شوہر کو اپنے فیصلے پر غور و فکر کرنے کا موقع مل جائے گا اور اگر اپنے فیصلے کو واپس لینا چاہے گا تو رجوع کر سکے گا۔ نیز اس میں طلاق کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کوئی عام واقعہ نہیں بلکہ ایک عظیم حادثہ اور سانحہ ہے۔

زن و شوہر کے باہمی حقوق کا تذکرہ اور اسلام سے پہلے عورت کی حیثیت

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي...الآية

اس آیت مبارکہ میں زن و مرد کے باہمی حقوق اور ان میں توازن کا تذکرہ ہے۔ اسلام سے پہلے تمام اقوام عالم میں عورت کی حیثیت گھریلو استعمال کی چیزوں سے زیادہ نہ تھی۔ جانوروں کی طرح کھلے عام اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اپنی شادی بیاہ میں اسے کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اسے رشتہ داروں کی وراثت سے کوئی حصہ نہ ملتا تھا۔ وہ مرد کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ خود اس کی ملکیت میں کوئی چیز نہ تھی۔ اور جو چیزیں اس کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں بھی وہ شوہر کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کر سکتی تھی۔ حتی کہ آج کل جو قومیں حقوق نسوان اور اس کی آزادی کی علمبردار بنی ہوئی ہیں ان میں بعض لوگ عورت کو انسان تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے بلکہ اسے ایک ناپاک جانور جانتے تھے۔ لڑکی کا قتل کرنا بلکہ اسے زندہ درگور کرنا جائز سمجھا جاتا تھا اور بعض مذاہب میں تو شوہر کی موت کے بعد عورت کو زندہ رہنے کا حق بھی نہ تھا۔ بلکہ اسے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی کر دیا جاتا تھا۔

اسلام اور اس کے رحمۃ للعالمین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی بار عورت کو اس کا اصلی مقام دیا۔ عدل و انصاف کا قانون جاری کیا۔ انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھایا۔ وراثت میں اسے اس کا حق دلوایا۔ اور مال و جان میں اسے مختار ٹھہرایا۔ عقد و ازدواج میں اس کی رضا کو بھی شامل فرمایا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بتایا کہ عورتوں کے مردوں پر ایسے ہی حقوق ہیں جس طرح مردوں کے عورتوں پر ہیں۔ لہٰذا جس طرح عورتوں پر

فرائض ہیں جن کے مطالبہ کا حق مردوں کو ہے اسی طرح عورتوں کے حقوق بھی ہیں جن کا ادا کرنا مردوں کے فرائض میں داخل ہے۔ ہاں البتہ اسلام کا نقطہ اعتدال چونکہ مرد وعورت کی بحیثیت صنف کلی مساوات کے نظریہ کے ساتھ بھی متفق نہیں ہے جو مغربی تصورات کی بنا پر آج کل تعلیم یافتہ دماغوں پر شدت سے مسلط ہے اس لئے قرآن نے تبادلہ حقوق وفرائض کے بیان کے بعد ایک جملہ میں یہ ارشاد کیا کہ ''وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ'' ہاں مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے۔ چونکہ مرد فطری خصوصیات میں ان سے بالاتر ہیں اس لئے شارع نے جو خالق فطرت بھی ہے انہیں طبقہ خواتین کی عزت وناموس کا محافظ اور نان ونفقہ کا کفیل بنایا ہے۔ اس کا لحاظ عورتوں کو رکھنا لازم ہے جس کا اسلام کے حکیمانہ نظام تشریع اور تقسیم حقوق میں بھی لحاظ رکھا گیا ہے (معارف القرآن وفصل الخطاب)۔

آیات القرآن

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

ترجمۃ الآیات

اور طلاق (رجعی) دو ہی مرتبہ ہے اس کے بعد یا تو اچھے طریقہ سے روک لیا جائے گا یا بھلائی کے ساتھ رخصت کر دیا جائے گا۔ اور تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ انہیں (بطور زرمہر

اور ہدیہ وتحفہ) دے چکے ہواس میں سے کچھ واپس لومگر یہ کہ ان دونوں (میاں بیوی) کو اندیشہ ہو کہ وہ خدا کی قائم کردہ حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو پھر (اے مسلمانو!) تمہیں بھی یہ خوف ہو کہ وہ حدود الہیہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو (اس صورت میں) عورت کو (بطور فدیہ خلع) کچھ معاوضہ دینا چاہیے (اور دے کر اپنی جان چھڑانا چاہیے) تو اس میں دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ خدا کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو لوگ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی لوگ ظالم ہیں۔ (۲۲۹) اب اگر (تیسری بار) طلاق (بائن) دے تو اس کے بعد (یہ عورت) اس مرد کیلئے اس وقت تک حلال نہ ہوگی جب تک کسی دوسرے شخص سے شادی نہ کرے۔ اب جب کہ وہ (دوسرا شوہر) اسے طلاق دے دے اور ان دونوں سابقہ میاں بیوی کا خیال ہو کہ وہ حدود الہیہ کو برقرار رکھ سکیں گے تو ان کیلئے کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ آپس میں (دوبارہ) شادی کر لیں۔ یہ خدا کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنہیں وہ صاحبان علم کیلئے واضح طور پر بیان کرتا ہے (۲۳۰)

تفسیر الآیات

طلاق رجعی کی حدود و قیود

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ...الآیة

عربوں میں یہ رواج تھا کہ مردان گنت بار عورت کو طلاق دے سکتا تھا اور پھر رجوع کر سکتا تھا اس طرح انہوں نے عورت کو ایک کھلونا بنا رکھا تھا۔ دوسری طرف ہنود و یہود اور نصاریٰ کا یہ حال ہے کہ جو زن و مرد ایک مرتبہ نکاح کی زنجیر میں جکڑ دیئے گئے بس وہ زندگی بھر کیلئے جکڑے گئے۔ حالات جس قدر بدل جائیں مگر گلو خلاصی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ شریعت اسلامیہ میں وہ اعتدال اور میانہ روی پائی جاتی ہے کہ دنیا کا کوئی قدیم یا جدید قانون اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط۔ اسلام نے شوہر کے حق طلاق کو تین بار تک محدود کر دیا ہے ایک بار۔ دوسری بار طلاق دے کر رجوع کر سکتا ہے مگر تیسری بار طلاق دینے سے چونکہ زن و شوہر کا ہر قسم کا باہمی تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اس لئے اب رجوع نہیں کر سکتا۔

چونکہ اس سے پہلے کی آیت میں بیان ہوا ہے کہ عدت کے اندر شوہر رجوع کر سکتا ہے اس لئے

یہاں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اس قسم کی (رجعی) طلاق دو مرتبہ ہی ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد اچھے طریقہ سے رشتہ ازدواج بحال رکھا جائے گا یا پھر ایسی طلاق (بائن) دی جائے گی جس کے بعد رجوع نہیں ہو سکے گا اور بھلائی کے ساتھ عورت کو رخصت کر دیا جائے گا اگر شوہر ایک بار طلاق دے تو پھر عدت کے اندر رجوع کر لے بعد ازاں پھر طلاق دے اور عدت کے اندر رجوع کرے۔ اس کے بعد پھر طلاق دے دے تو یہ طلاق بائن ہوگی۔ اب نہ رجوع ہو سکے گا اور نہ عقد جدید جب تک کسی اور شخص سے باقاعدہ شادی نہ کرے اور وہ مباشرت کے بعد باضابطہ طور پر اسے طلاق نہ دے۔ اس شخص کو محلل کہا جاتا ہے تو اب اگر سابق میاں بیوی سمجھیں کہ اب خوش اسلوبی سے فرائض زوجیت ادا کرتے رہیں گے تو محلل والی عدت گزرنے کے بعد رشتہ ازدواج میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ایک نشست میں تین دفعہ الفاظ طلاق جاری کر دیئے جائیں تو آیا وہ ایک طلاق متصور ہوگی یا طلاق بائن سمجھی جائے گی؟ اہلسنت عموماً (بالخصوص احناف) اسے طلاق بائن سمجھتے ہیں مگر قرآن مجید کی دونوں آیتوں میں غور کرنے سے اس تصور کی گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ صحیح مسلم اور مسند احمد بن حنبل میں مروی ہے:

"ان الطلاق الثلث کانت واحدۃ علی عھد رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وابی بکر وبعض السنین من خلافۃ عمر"۔ یعنی تین طلاقیں عہد نبوی اور عہد ابی بکر اور خلافت عمر کے پہلے چند سال (تین سال) تک ایک تصور کی جاتی تھی۔ پھر جناب عمر نے کسی خاص مصلحت کے تحت اسے طلاق بائن قرار دے دیا۔

صاحب تفسیر المنار نے بیان کیا ہے کہ ابن قیم نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے کہ اس قسم کی تین طلاقیں ایک طلاق متصور ہوتی ہیں۔ نیز یہ کہا ہے کہ جناب عمر کے بعد بھی صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت برابر ایسی تین طلاقوں کو ایک ہی سمجھتی تھی۔ مگر اب تو برادران اسلامی کا یہ مذہب بن چکا ہے کہ اگر کوئی شخص تین طلاق کے الفاظ کہہ دے تو اسے فوراً بائن طلاق قرار دے کر اس کا حل قابل صد نفرین حلالہ میں تلاش کرتے ہیں۔ جس کے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"لعن اللہ المحلِل والمحلل لہ" یعنی حلالہ کرنے والے پر بھی اللہ کی پھٹکار۔ اور جس (بے غیرت) کیلئے حلالہ کیا جا رہا ہے اس پر بھی اللہ کی پھٹکار۔ (ضیاء القرآن)۔

عقلاً بھی دیکھا جائے تو یہ ایک نشست میں دی گئی تین طلاقیں ایک ہی طلاق بنتی ہیں کیونکہ ایک بار صیغہ طلاق دینے سے عورت زوجیت سے خارج ہوگئی اور زوجہ ہی نہیں رہی تو اسے دوبارہ طلاق دینے کے کیا معنی؟ جب تک عدت کے اندر رجوع یا عدت کے بعد عقد جدید نہ کیا جائے۔ دوسری یا تیسری طلاق کا موضوع ہی

نہیں ہے۔لہٰذا اس طرح اگر ایک ہزار بھی طلاق دی جائے تو وہ ایک ہی متصور ہوگی اور یہی مذہب اہل بیت علیہم السلام ہے۔ جو قرآن وسنت اور عقل سلیم کے عین مطابق ہے۔

طلاق خلع کا بیان اور اس کے احکام

فَاِنْ خِفْتُمْ ...الآیۃ

اس میں طلاق خلع کا تذکرہ کیا جارہا ہے چونکہ عورت کی نسبت مرد زیادہ مدبر اور دور اندیش اور متحمل مزاج واقع ہوا ہے اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی عاجلانہ واحمقانہ اقدام کرنے سے زیادہ عقل وخرد سے کام لیتا ہے۔ نیز ازدواجی زندگی کی زیادہ تر ذمہ داریاں بھی اسی کے کندھوں پر ہوتی ہیں۔ اس لئے

شریعت مقدسہ نے طلاق دینے کا حق مرد کے حوالہ کیا ہے اور اسے اس حق کے استعمال کرنے کا طریقہ کار بھی بتا دیا ہے کہ وہ آج تک جو چیزیں اپنی بیوی کو بطور حق مہر یا بطور تحفہ وہدیہ دے چکا ہے طلاق کے وقت وہ واپس نہیں لے سکتا البتہ ''او تسریح باحسان'' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس المناک حادثہ کے وقت عورت کی دلجوئی کی خاطر اسے اپنی گرہ سے کچھ مال ومتاع دینا چاہیے۔ ہاں البتہ اگر زوجہ اسے ناپسند کرتی ہو اور اس کی زوجیت میں نہ رہنا چاہتی ہو اور خود طلاق چاہتی ہو تو پھر اگر وہ طلاق کے عوض شوہر کو حق مہر معاف کردے یا وصول کردہ زر مہر واپس کردے یا اس کے علاوہ بھی جو کچھ شوہر سے لے چکی ہے وہ واپس کردے یا مزید براں اپنی طرف سے کچھ مال ومتاع کی پیش کش کرے تو شوہر کیلئے اس کے لینے میں شرعا کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی معاوضہ والی طلاق کو شریعت کی اصطلاح میں خلعی طلاق کہا جاتا ہے اور یہ طلاق بائن کی ایک قسم ہے۔ تفصیلی احکام فقہی کتابوں کی کتاب الطلاق میں مذکور ہیں۔

آیات القرآن

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۙ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ

وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ‌ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ
عَلِيۡمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ
يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ؕ ذٰلِكَ يُوۡعَظُ بِهٖ
مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ ذٰلِكُمۡ اَزۡكٰى لَـكُمۡ
وَاَطۡهَرُ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۲﴾

ترجمۃ الآیات

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی میعاد (عدت کے خاتمہ) کے قریب پہنچ جائیں تو یا تو انہیں اچھے طریقے سے (اپنے پاس) رکھو۔ یا اچھے طریقے سے انہیں رخصت کر دو اور انہیں ضرر و زیاں پہنچانے اور ان سے زیادتی کرنے کے لئے ان سے صلح نہ کرو اور جو ایسا کرے گا گویا اس نے اپنے ہی اوپر ظلم کیا (ایسا کر کے) اور آیات خدا کا مذاق نہ اڑاؤ اور اپنے اوپر نازل ہونے والی نعمت الٰہی، کتاب آسمانی اور علم و دانش کو یاد کرو اور انہیں اس کے ذریعہ سے جو وعظ و نصیحت کی گئی ہے اور اللہ (کی نافرمانی) سے ڈرو اور خوب جان لو کہ خدا ہر شے کا جاننے والا ہے۔ (۲۳۱) اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور جب وہ اپنی (عدت کی) مدت پوری کر لیں تو انہیں اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔ جبکہ وہ مناسب طریقے پر (شریعت کے مطابق) ایک دوسرے سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اس (حکم) کے ذریعہ سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے (اور وہی اسے قبول کرے گا) جو خدا اور جزاء پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ (ان احکام پر عمل کرنا)۔ تمہارے لئے زیادہ تزکیہ و طہارت کا باعث ہے اللہ بہتر جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ (۲۳۲)

تشریح الالفاظ

(۱) سرّحوھن یہ تسریح سے مشتق ہے جس کے معنی آزاد کرنے اور چھوڑ دینے کے ہیں

(۲)فلا تعضلوھن یہ عضل وعضلات سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عورت کو نکاح کرنے سے روکنا اور منع کرنا

تفسیر الآیات

طلاق رجعی کے بارے میں کچھ ہدایت

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ ...الآیۃ

یہاں کچھ ہدایات طلاق رجعی کے متعلق دی جارہی ہیں کہ جب تم نے بیوی کو بائن طلاق نہیں دی تو تمہیں رجوع کرنے' گھر بسانے اور نباہ کرنے کا اختیار ہے۔ بشرطیکہ سوچ سمجھ کر یہ طے کرلو کہ حقوق زوجیت ادا کرکے نباہ کرنا ہے اور خانہ آبادی کرنا ہے۔ تو پھر عدت کے اندر رجوع کرلو۔ اور اگر ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے تو پھر عدت گزرنے دو اور انہیں مناسب طریقے سے رخصت کردو۔ تاکہ وہ بھی عقد ثانی کرکے اپنا گھر آباد کرسکے اور تم بھی پسند کی شادی کرکے اپنی دنیا آباد کرسکو۔

بہرنوع جو صورت بھی اختیار کی جائے اس میں نیک نیتی مدنظر رہنی چاہیے صرف عورت کو پریشان کرنے کیلئے کہ وہ عقد ثانی نہ کرسکے یا اس طرح کرکے اسے طلاق خلع لینے پر مجبور کرنا مقصود ہو یا رسم جاہلیت کا اعادہ مطلوب ہو تو پھر رجوع نہیں کرنا چاہیے چنانچہ خداوند عالم نے صراحت کردی ہے کہ عورت کو ضرر وزیاں پہنچانے کی غرض سے رجوع نہ کرو۔ اور طلاق ورجوع کے احکام الہیہ کو مذاق نہ بناؤ۔ ورنہ تم ظالم قرار پاؤ گے اور تم سے اس کا مواخذہ کیا جائے گا اور تمہیں اس ظلم وزیادتی اور احکام کا مذاق اڑانے کی سزا بھگتنا پڑے گی' **''وھو اسرع الحاسبین''**

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ...الآیۃ

جب طلاق کے بعد عدت گذر جائے اور شوہر رجوع نہ کرے تو اب چونکہ شرعاً عورت آزاد ہے وہ مناسب جگہ پر عقد ثانی کرکے شادی کرسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ پہلا شوہر بھی ہوسکتا ہے اور کوئی دوسرا شخص بھی............ بنابریں پہلی صورت میں خطاب اس عورت کے اولیاء کو ہوگا کہ وہ اسے اس عقد وازدواج سے منع نہ کریں اور دوسری صورت میں یہ خطاب پہلے شوہر کو ہوگا کہ وہ اسے دوسری جگہ شادی کرنے سے یہ کہکر نہ روکے کہ میری سابقہ بیوی کسی اور کے تصرف میں کیوں جائے یہاں پر اس کے مخاطب عورت کے اہل خاندان اور

معاشرے کے دوسرے افراد بھی ہو سکتے ہیں جو غلط رسم و رواج کی بنا پر عورت کو عقد ثانی کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ حالانکہ قرآن وسنت میں عقد ثانی کرنے کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے اور اس کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس سیرت اس کی شاہد صادق ہے کیونکہ اس عقد ثانی سے نسل میں اضافہ ہوتا ہے اور اخلاق و اطوار میں طہارت و پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے روکنا جہالت بھی ہے اور ضلالت بھی۔ خدا کی طرف سے اہل ایمان کو یہ نصیحت ہے اور ظاہر ہے کہ نصیحت کا اثر اہل ایمان ہی لیتے ہیں۔

آیات القرآن

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

ترجمۃ الآیات

اور (طلاق کے بعد) جو شخص (اپنی اولاد کو) پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے تو مائیں اپنی اولاد کو کامل دو برس تک دودھ پلائینگی۔ اور بچہ کے باپ پر (اس دوران) ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا مناسب و معروف طریقہ پر لازم ہوگا۔ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت و آسائش سے زیادہ تکلیف نہیں دی جا سکتی۔ نہ تو ماں کو نقصان پہنچایا جائے اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ ہی باپ کو زیاں پہنچایا جائے اس کے بچہ کے سبب سے اور (اگر باپ نہ ہو تو پھر) وارث پر (دودھ پلانے اور نان ونفقہ کی) یہی ذمہ داری ہے۔ اور اگر دونوں (ماں باپ اس مدت سے

پہلے) باہمی مشورہ ورضامندی سے بچہ کا دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔اور اگر تم اپنی اولاد کو (کسی دایہ سے) دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی جرم نہیں ہے بشرطیکہ جو مناسب طریقہ سے دینا ٹھہرایا ہے (ان کے) حوالے کردو۔اور خدا (کی نافرمانی سے) ڈرو اور خوب جان لو کہ تم جو کچھ کرتے ہو۔اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے (۲۳۳)

تشریح الالفاظ

(۱)یرضعن	یہ ارضاع سے مشتق ہے جس کے معنی دودھ پلانے کے ہیں
(۲)فصالاً	فصال کے معنی دودھ چھڑانے کے ہیں
(۳)جناح	جُناح کے معنی گناہ کے ہیں۔نیز اس کے معنی کسی چیز کا حصہ کے بھی ہیں

تفسیر الآیات

بچہ کو دودھ پلانے کی مدت اور اس کے متعلقہ احکام

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ...الآية

طلاق کے بعد اگر مطلقہ کی گود میں شیر خوار بچہ ہو تو اس کی تربیت و پرورش کا عموماً مسئلہ ہوتا ہے کہ اس کا طریقہ کار کیا ہو؟ اور چونکہ پرورش کی ذمہ داری ماں باپ دونوں پر ہوتی ہے۔اس لئے ضمناً یہاں نکاح وطلاق کے مسائل کے دوران اس کا تذکرہ کردیا گیا ہے فرمایا ''مائیں اپنی اولاد کو دو سال دودھ پلاتی ہیں'' بظاہر یہ جملہ خبریہ ہے مگر امر کے معنی میں ہے یعنی ماؤں کو چاہیے کہ اپنی اولاد کو دو سال تک دودھ پلائیں۔یہاں مفسرین اسلام میں قدرے اختلاف ہے کہ یہاں ماؤں سے صرف مطلقہ مائیں مراد ہیں یا زوجائیں یا ہر دو؟ اکثر اس کے قائل ہیں کہ یہ لفظ سب کو شامل ہے و بنا بر قول اظہر مائیں کاملاً دو برس تک اپنی اولاد کو دودھ پلائیں یہ امر استحبابی ہے وجوبی نہیں ہے (مجمع البیان وغیرہ)۔

یعنی یہ ان کے استحقاق کا اظہار ہے نہ یہ کہ ان کا فرض ہے کہ ضرور پلائیں اور اس کا شاہد یہ ہے کہ انہیں شوہروں سے اجرت کے مطالبہ کا حق دیا گیا ہے۔ارشاد قدرت ہے:

''فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ............وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى'' یعنی اگر وہ تمہاری اولاد کو دودھ پلائیں تو تم ان کو اجرت دو..................اور جو تنگ دستی ہو تو کسی اور

سے دودھ پلواؤ(سورہ طلاق آیت۔٦)

اسی بنا پر مفسر نیشا پوری لکھتے ہیں کہ اگر اس پر دودھ پلانا واجب ہوتا تو پھر اجرت لینا جائز نہ ہوتی (نیشاپوری)

اسی وجہ سے مفسر حقانی نے لکھا ہے کہ ہر بچہ کو دودھ پلانا عموماً واجب نہیں بلکہ مستحب ہے (تفسیر حقانی) اور یہی بات مشہور بین الفقہاء ہے (قوانین الشریعہ)

رضاعت کی وہ مدت جس پر رضاعت والے احکام مرتب ہوتے ہیں وہ کامل دو سال یعنی چوبیس مہینے ہے۔ ورنہ حالات کے مطابق اس میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ اب دودھ پلانے والی اگر بچہ کے باپ کی زوجیت میں ہے تو پھر تو اس کا نان ونفقہ بہر حال اس کے شوہر پر ہے اور اگر طلاق یافتہ ہے تو پھر مدت رضاعت میں اس عورت کے لباس وطعام کا اپنی حیثیت کے مطابق انتظام کرنا واجب ہے۔

ماؤں کے لئے اولاد کو دودھ پلانے کے استحباب کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بہ نسبت اجنبی عورت کے دودھ پلانے کی زیادہ حقدار ہیں (تفسیر کاشف)

اور اگر ان کا باپ مرجائے تو اس کے بالغ وعاقل وارث پر دودھ پلانے والی ماں کے نان ونفقہ کا انتظام کرنا واجب ہوگا اور یہ کہ ماں اور اس کے بچے کو نان ونفقہ میں تنگی کرنا اور نقصان دینا حرام ہے (تفسیر قمی، عیاشی، برہان وضیاء القرآن)

اور یہ مکمل دو سال اس بات کے لئے ہے۔ جو یہ پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے۔ ورنہ دونوں کی رضامندی اور باہمی مشورہ سے اس میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے یعنی اس سے پہلے بھی چھڑایا جاسکتا ہے اور بعد ازاں بھی پلایا جاسکتا ہے۔ احادیث کے مطابق ۲۴ ماہ کے اکیس اور ۲۴ کے چھبیس ماہ بھی کئے جاسکتے ہیں (تفسیر عیاشی ونور الثقلین)۔

نیز اگر والدہ انکار کرے یا کوئی شرعی عذر موجود ہو تو پھر اجرت پر دایہ کا اہتمام کیا جاسکتا ہے اور اس صورت میں دستور کے مطابق اس کی اجرت کی ادائیگی بچہ کے باپ پر واجب ہوگی۔

بچہ کے معاملہ میں اس کے ماں باپ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ...الآیة

اس فقرہ کے معنی ومفہوم میں خاصا اختلاف ہے۔ ایک عام مفہوم تو وہی ہے جو ہم نے ترجمہ میں اختیار

کیا ہے کہ ''نہ تو ماں کو نقصان پہنچایا جائے اس کے بچے کی وجہ سے'' (کہ بچہ اس سے چھین لیا جائے اور کسی اور عورت کو دے دیا جائے یا دستور سے کم اسے نان ونفقہ دیا جائے) اور نہ ہی باپ کو زیاں پہنچایا جائے اس کے بچہ کی وجہ سے (کہ بچہ باپ کو نہ دکھایا جائے۔ یا عورت اس کے پاس پھینک کر چلی جائے۔ یا اس کی حیثیت سے زیادہ اس سے نان ونفقہ طلب کیا جائے)

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نہ باپ کو بچہ کے در پے آزار ہونا چاہیے اور نہ ماں کو یعنی ماں باپ کو ایک دوسرے کی ضد اور باہمی نفرت کی وجہ سے بچہ کو ضرر وزیاں نہیں پہنچانا چاہیے کہ مثلاً ماں شوہر کی ضد میں جذبات کی رو میں بہہ کر کہے کہ اپنے بچے کو جس سے چاہو دودھ پلوا لو میں نہیں پلاتی۔ یا باپ غیظ وغضب میں آ کر یہ کہے کہ میں اس (ماں) سے دودھ نہیں پلواتا۔ اگر اجرت ہی دینی ہے تو کسی اور عورت کو دے دوں گا۔ قرآن دونوں کو فہمائش کر رہا ہے کہ تم ایک دوسرے کی ضد میں بچہ کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ آخر وہ تو تم دونوں کا ہی بچہ ہے لہٰذا تمہیں اس کا مفاد مدنظر رکھنا چاہیے۔

تیسرا مفہوم جو بعض حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ بچہ کی وجہ سے ماں کو نقصان نہ پہنچایا جائے کہ چار ماہ تک شوہر اس سے اس بات پر مباشرت نہ کرے کہ اس کا بچہ دودھ پیتا ہے کہ کہیں اسے حمل نہ ہو جائے اور نہ شوہر کو نقصان پہنچایا جائے کہ وہ مباشرت کی خواہش کرے تو عورت کہے میرا بچہ دودھ پیتا ہے مجھے حمل نہ ہو جائے۔ علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں ان اقوال میں کوئی باہمی منافات نہیں ہے۔ لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ آیت کو ان سب معنوں پر محمول کیا جائے (مجمع البیان)۔

آیات القرآن

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ
اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ
سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى

يَبۡلُغَ الۡكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُ ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۲۳۵﴾

ترجمۃ الآیات

اورتم میں سے جولوگ بیویاں چھوڑ کر مر جائیں تو وہ (بیویاں) چار مہینے دس دن تک اپنے کو (عقد ثانی سے) روکیں۔ اور جب یہ مدت (عدت) پوری کر لیں تو وہ اپنے حق میں جو مناسب کام (فیصلہ) کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔اورتم جو کچھ کرتے ہو خدا اس سے خوب با خبر ہے۔ (۲۳۴) اگر تم عدت کے دوران) عورتوں کی اشارہ وکنایہ میں خواستگاری کرو (پیغام نکاح دو) یا اسے اپنے دلوں میں چھپائے رکھو تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم جلد ان کو یاد کرو گے (تو بے شک کرو) مگر ان سے کوئی خفیہ قول وقرار نہ کرو۔ سوا اس کے کہ مناسب طریقہ سے کوئی بات کرو۔ (اشارہ وکنایہ سے) اور جب تک مقررہ مدت پوری نہ ہو جائے۔ اس وقت تک عقد نکاح کا ارادہ بھی نہ کرو۔ اور خوب جان لو کہ خدا تمہارے دلوں کے اندر کی بات کو بھی جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ خدا بخشنے والا اور حلیم وبردبار ہے (۲۳۵)۔

تشریح الالفاظ

(۱) عرّضتم — یہ تعریض سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بات کو مبہم کرنا یعنی اشارہ وکنایہ سے بات کرنا

(۲) خطبة النساء — خطبہ کے معنی ہیں وہ عورت جس کی منگنی کی جائے

(۳) اکننتم — یہ اِکنان سے مشتق ہے جس کے معنی چھپانے کے ہیں

تفسیر الآیات

عدت وفات اور اس کے متعلقہ مسائل

وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ ...الآیة

اس آیت میں عدت وفات' اس اثناء میں حداد (سوگ) منانے اور عدت کے بعد عقد بیوگان اور ان کے دوسرے احکام بیان کئے جارہے ہیں۔ اسلام سے پہلے جاہلیت کے دور میں عدت وفات ایک سال ہوتی تھی۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی جس میں عدت وفات چار مہینے اور دس دن مقرر کی گئی ہے۔ تو کچھ عورتیں بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ ہم چار ماہ دس دن تک صبر نہیں کرسکتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اسلام سے پہلے ایک سال تک صبر کرسکتی تھیں اور اب چار ماہ دس دن صبر نہیں کرسکتیں جبکہ خداوند کریم نے تمہیں آٹھ ماہ معاف کردیئے ہیں۔ (عیاشی' صافی اور برہان وغیرہ)۔

یہ حکم عام ہے زوجہ خواہ دائمی ہو یا منقطعہ' مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ' حاملہ ہو یا غیر حاملہ' صغیرہ ہو یا کبیرہ' یائسہ ہو یا غیر یائسہ' مطلقہ رجعیہ ہو یا غیر مطلقہ رجعیہ آزاد ہو یا مملوکہ سب کے لئے عدت وفات ضروری ہے۔ کیونکہ آیات وروایات کا اطلاق ان سب اقسام کو شامل ہے۔ البتہ ان میں سے بعض اقسام کی مدت جدا جدا ہے مثلاً عقد دائمی والی زوجہ کی بالاتفاق اور عقد متعہ والی کی علی الاشہر والاظہر عدت۔ جبکہ آزاد ہو اور غیر حاملہ ہو چار ماہ اور دس دن ہے۔ اور مملوکہ کنیز کی عدت بنا بر مشہور و منصور آزاد عورت کی نصف عدت ہے یعنی دو ماہ اور پانچ دن (قوانین الشریعہ)۔

البتہ حاملہ بیوہ کی عدت وفات میں شیعہ اور سنی میں اختلاف ہے۔ اہلسنت کے نزدیک اس کی عدت وضع حمل ہے۔ اگرچہ شوہر کی وفات کے ایک لحظہ بعد ہو جائے۔ تو اس کے لئے عقد ثانی جائز ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا مغفور و مرحوم شوہر ہنوز دفن ہی نہ ہوا ہو۔ مگر شیعہ کے نزدیک چار ماہ اور دس دن اور وضع حمل میں جو ابعد الاجلین (زیادہ دور) ہوگی اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ یعنی اگر چار ماہ اور دس دن گزر جائیں مگر ہنوز وضع حمل نہ ہو تو وضع حمل کا انتظار کیا جائے گا اور اگر وضع حمل پہلے ہو جائے اور ہنوز چار ماہ اور دس دن نہ گزرے ہوں تو پھر ان کے پورا ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔ برادران اسلامی کی دلیل وہ آیت ہے جس میں خدا فرماتا ہے "وَ اُولَاتُ

الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُن ''(سورہ طلاق آیت۔ ۴) کہ حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔ یہ حکم عام ہے جو مطلقہ اور بیوہ دونوں کو شامل ہے۔اور شیعہ حضرات نے ان دونوں آیتوں میں جمع وتوفیق کرتے ہوئے'' ابعد الاجلین '' والانظر یہ اختیار کیا ہے۔جس میں دونوں آیتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے اور کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

عدت کے دوران بیوہ پر حداد یعنی اپنے خاوند کا سوگ منانا واجب ہے جس سے زیب وزینت کا ترک کرنا مراد ہے یعنی ہر وہ چیز جو عرف وعادت میں زیب وزینت شمار ہوتی ہو جیسے رنگین وریشمی لباس پہننا' مہندی و کاجل لگانا اور خوشبو لگانا الغرض اس قسم کے دوسرے سامان آرائش سے اجتناب کرنا واجب ہے۔ ہاں البتہ غسل کرنے' بالوں کو کنگھی کرنے اور صاف ستھرا لباس پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ نیز عورت کو اس مکان میں عدت گزارنی چاہیے جس میں شوہر کی وفات کے وقت وہ موجود تھی اور سخت ضرورت کے بغیر اس سے باہر نکلنا سخت مکروہ ہے اور اگر بامر مجبوری نکلنا پڑے تو پھر نصف شب کے بعد گھر سے نکلے اور فجر سے پہلے یا دوسرے دن اوائل شب میں واپس گھر لوٹ آئے۔ ہاں عدت کے بعد یہ سب چیزیں حتیٰ کہ عقد ثانی کرنا بھی جائز ہو جائے گا۔جس کی تفصیل ذیل میں آرہی ہے۔

عقد کے خواہشمند کو عدت کے اندر عورت سے صراحۃً کوئی قول وقرار نہیں کرنا چاہیئے

وَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ ...الآية

یہ آیات اور پچھلی آیات تو بیوگان کے اولیاء اور معاشرہ کے ان افراد سے متعلق ہیں جو غلط رسم ورواج کے تحت عقد بیوگان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ عدت کے بعد بیوگان مناسب اور شرعی طریقہ پر اپنے بارے میں عقد وازدواج کا جو فیصلہ کریں وہ آزاد ہیں انہیں ان کو روکنے ٹوکنے اور راستے میں روڑے اٹکانے کا کوئی حق نہیں ہے اور کچھ ہدایات ان افراد سے متعلق ہیں جو عدت گزرنے کے بعد بیوگان سے عقد نکاح کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو عدت کے اندر صراحتاً ان سے کوئی قول وقرار نہیں کرنا چاہیے ہاں البتہ اشارے کنایے میں اپنے مدعا کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مثلاً یوں کہیں کہ میرا ارادہ شادی کرنے کا ہے اور اگر ان اوصاف والی عورت مل جائے تو کیا کہنا۔ جبکہ یہ اوصاف اس عورت میں پائے جاتے ہوں۔ یا یوں کہے مجھے ایک نیک عورت سے نکاح کی ضرورت ہے۔ جبکہ وہ نیک ہو۔ بہر حال غم واندوہ کی ان گھڑیوں میں جشن شادی منانے کی طرح ڈالنا جس

طرح عورت کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ وہاں مرنے والے کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی ہے کہ ابھی اسے مرے چند دن ہوئے نہیں کہ تم اس کی بیوی کو شادی کے پیغام بھیج رہے ہو۔ بہرحال جیسا کہ بیان ہوا کہ اشارے کنائے میں خواستگاری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ گو بہتر یہ ہے کہ یہ بات دل میں ہی رہے اور زبان پر نہ آئے۔

نہاں کئے ماند آں رازے کزو سازند محملہا

آیات القرآن

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

ترجمۃ الآیات

اگر تم (اپنی) عورتوں کو ہاتھ لگانے (خلوت صحیحہ کرنے) اور حق مہر مقرر کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے ہاں البتہ (بطور خرچہ) انہیں کچھ مال و متاع دے دو۔ مالدار اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب و نادار اپنے مقدور کے موافق۔ مناسب متاع (خرچہ) دے۔ یہ نیکوکار لوگوں کے ذمہ ایک حق ہے۔ اور اگر تم عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو۔ لیکن تم ان کا کچھ حق مہر معین کر چکے ہو۔ تو (اس صورت میں) اس

مقررہ حق مہر کا آدھا لازم ہوگا۔ مگر یہ کہ وہ (عورتیں) خود معاف کر دیں یا وہ (ولی) معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا معاملہ ہے۔ اور اگر تم درگذر کرو (معاف کر دو) تو یہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔ اور باہمی معاملات میں احسان اور بھلائی کو نہ بھولو۔ بے شک تم جو کچھ کر رہے ہو خدا اسے خوب دیکھ رہا ہے (۲۳۷) اور تم تمام نمازوں کی پابندی کرو۔ خصوصاً نماز وسطی کی اور خدا کے سامنے قنوت پڑھتے ہوئے (ادب و نیاز سے) کھڑے ہو۔ (۲۳۸)

تشریح الالفاظ

(۱) متّعوھنّ یہ متعہ سے ہے جس کے لغوی معنی فائدہ اٹھانے کے ہیں۔ اور اصطلاح میں طلاق کے وقت اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال و متاع دے کر مطلقہ کو فارغ کرنا ہے تاکہ اس کی دلجوئی ہو جائے

(۲) المقتر یہ اقتار سے مشتق ہے جس کے معنی تنگدستی کے ہیں

(۳) الفضل اس کے معنی ہیں احسان، زیادتی اور بڑھاوتی

تفسیر الآیات

مہر و مباشرت کے اعتبار سے طلاق کے اقسام اور ان کے احکام

لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ...الآية

مہر و مباشرت کے اعتبار سے طلاق کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے دو صورتوں کا حکم ان آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ نہ حق مہر معین ہوا اور نہ ہی مباشرت واقع ہوئی ہو کہ طلاق دے دی جائے۔

۲۔ حق مہر مقرر ہو مگر ہنوز مقاربت نہ کی گئی ہو کہ طلاق واقع ہو جائے۔ اسکے متعلق پہلی قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ اگر شرعی ضرورت اور ضابطہ کے مطابق ایسی طلاق دی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ اور گناہ نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ اس میں شوہر پر حق مہر کی ادائیگی واجب نہیں ہے (کیونکہ وہ مقرر ہی نہیں ہے) مگر اس پر لازم ہے کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق متعہ اور متاع (خرچہ) کے طور پر

اور مطلقہ کی دلجوئی کیلئے کچھ دیدے۔ جس کی شرعاً کوئی خاص مقدار متعین نہیں ہے۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مالدار اپنی حیثیت کے مطابق متوسط اپنی حالت کے موافق اور غریب و نادار اپنے مقدور کے مطابق دے مثلاً پہلا شخص سونے کا ہار دے، دوسرا کنگن اور تیسرا کپڑوں کا ایک جوڑا۔

بہر حال نہ تو فضول خرچی کی جائے اور نہ ہی بالکل کنجوسی سے کام لیا جائے بلکہ ''**خیر الامور اوسطھا**'' کو مدنظر رکھا جائے اور زیادہ نہیں تو تین کپڑوں کا ایک جوڑا تو ضرور دیا جائے۔ جسے خدا نے ''**حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ**'' کہہ کر لازم قرار دیا ہے۔ اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ اس میں بالاتفاق مقررہ حق مہر کا نصف شوہر کے ذمہ واجب الادا ہے مگر یہ کہ عورت (مطلقہ) معاف کردے یا اس کا ولی (باپ دادا) معاف کردے۔ بعض مفسرین نے یہاں ''**الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ**'' سے مراد شوہر لیا ہے کہ شوہر معاف کردے۔ یعنی پورا ادا کردے۔ جبکہ صرف نصف ادا کرنا تھا۔ لفظ ''**عفو**'، کے معنی اپنے حق سے درگزر کرنے کے ہوتے ہیں۔ حق سے زیادہ دینے' کے نہیں۔ اور بعض نے اس کی یہ دور از قیاس تاویل کی ہے کہ ممکن ہے کہ اس نے شادی کے ساتھ حق مہر کی رقم ادا کردی ہو۔ اور اب چونکہ مباشرت سے پہلے اس نے طلاق دے دی ہے تو وہ نصف حق مہر واپس لینے کا حقدار ہو گیا ہے۔ مگر وہ معاف کردے اور واپس نہ لے۔ مگر وارثان قرآن یعنی سرکار محمدؐ آل محمدؐ نے اس سے عورت کا ولی شرعی مراد لیا ہے۔ اور اس قسم کی متعدد حدیثیں تفسیر عیاشی، صافی، برہان اور نور الثقلین میں مذکور ہیں۔ لہٰذا اسی تفسیر کو صحیح تسلیم کرنا پڑے گا۔

۳۔ حق مہر مقرر ہو اور خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دی جائے۔ اس صورت کا حکم یہ ہے کہ شوہر کو پورا مقررہ حق مہر ادا کرنا پڑے گا۔

۴۔ حق مہر معین نہ ہو مگر خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دی جائے تو اس صورت کا حکم یہ ہے کہ طلاق کے بعد خاوند کیلئے مہر المثل کی ادائیگی واجب ہوگی یعنی اس قدر مہر ادا کیا جائے گا جتنا کہ اس عورت کے قوم وقبیلہ کی عورتوں کا ہوتا ہے۔ ان دو صورتوں کے احکام قرآن مجید کے بعض دوسرے مقامات پر بیان کئے گئے ہیں۔

صلوٰۃ وسطیٰ سے کون سی نماز مراد ہے؟

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ... الآیۃ

نماز جو تمام اسلامی عبادات کی روح رواں اور جسد عبادت کی جان ہے۔ اس کے متعلق اس آیت مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''**حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ**'' کہ عام نمازوں پر عموماً اور نماز وسطیٰ پر خصوصاً محافظت

ومداومت کرو۔ بار بار پڑھو۔ اوقات فضیلت میں پڑھو۔ مکمل ارکان کے ساتھ پڑھو۔ اور آداب ومستحبات کے ساتھ پڑھو۔ پھر نماز ہائے پنجگانہ میں سے صلوٰۃ وسطیٰ کی اہمیت اجاگر کرنے کیلئے اس کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے۔ آیا یہ اوسط بمعنی درمیان' کی مونث وسطیٰ ہے جس کے معنی ہیں درمیانی نماز یا اوسط معنی افضل کی مونث وسطیٰ بمعنی فضلیٰ ہے جس کے معنی سب سے افضل نماز کے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے حتیٰ کہ اٹھارہ اقوال ذکر کئے گئے ہیں (تفسیر کاشف بحوالہ نیل الاوطار)۔

مگر مشہور قول دو ہیں ایک یہ اس سے مراد نماز ظہر ہے۔ یہ قول ہم شیعہ امامیہ میں زیادہ مشہور ومستند ہے۔ جسے حضرات آئمہ معصومین علیہم السلام کی صحیح ومعتبر حدیثوں کی تائید حاصل ہے اور یہ دن کی تین نمازوں (صبح، ظہر اور عصر) کے درمیان واقع ہے۔ اور چونکہ کاروبار میں مشغولیت اور موسم گرما میں گرمی کی شدت کی وجہ سے بالعموم اس نماز کی جماعت میں کم لوگ شریک ہوتے ہیں۔ یہی حال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں صحابہ کرام کا تھا کہ وہ دوسری نمازوں کی نسبت اس نماز میں کم شریک ہوتے تھے۔ صرف ایک صف ہوتی تھی یا زیادہ سے زیادہ دو صفیں (مجمع البیان)۔

اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس نماز کی پابندی کرنے کا حکم ہوا ہے۔ بعض اقوال وروایات اہلسنت سے بھی اس قول کی تائید مزید ہوتی ہے (تفسیر نیشاپوری)۔

دوسرا قول جو کہ برادران اہلسنت کے ہاں زیادہ مشہور ہے یہ ہے کہ اس سے مراد نماز عصر' ہے۔ جو دن رات کی دو دو نمازوں کے درمیان واقع ہے۔ اور اس قول کو ہمارے بعض علماء نے بھی اختیار کیا ہے (تفسیر کاشف)۔

قنوت کے مفہوم کی وضاحت

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ...الآية

قنوت کے معنی دعا، خضوع وخشوع، اطاعت وعاجزی کے ہیں۔ لہٰذا اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ خشوع وخضوع (عجز وانکساری) کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہو۔ اور چونکہ اس کے معنی دعا کے بھی ہیں اور نماز کی دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے اس دعا کا خصوصی استحبابی حکم ہے۔ اور ہمارے مسلک میں نماز کا مستحبی جزو ہے۔ اور بعض روایات اہلسنت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمازوں میں قنوت پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ (تفسیر بیضاوی از ابن عباس)

آیات القرآن

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا
عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ
وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ
اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ
مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ ۢ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٤١﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾ ۧ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ
اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾

ترجمۃ الآیات

اور اگر تم خوف (کی حالت میں ہو۔ تو پھر پیدل ہو یا سوار (جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھ لو) پھر جب تمہیں امن و اطمینان ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھا دیا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ (۲۳۹) اور جو تم میں سے اپنی بیویاں چھوڑ کر دنیا سے جا رہے ہوں تو ان کو اپنی بیویوں کے حق میں وصیت کرنا چاہیے کہ ان کو سال بھر تک نان و نفقہ (خرچہ) دیا جاتا رہے اور گھر سے بھی نہ نکالا جائے۔ ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو اور بات ہے اور اپنے بارے میں جو مناسب فیصلہ کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اور خدا زبردست اور حکمت والا ہے (۲۴۰) اور جن عورتوں کو (مہر مقرر کئے اور صحبت کئے بغیر) طلاق دی گئی ہے۔ انہیں مناسب مال و متاع (خرچہ) دینا لازم ہے۔ یہ پرہیزگاروں کے

ذمہ ایک حق ہے۔ (۲۴۱) اسی طرح خدا تمہارے لئے اپنے آیات واحکام واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو (۲۴۲) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل پڑے خدا نے ان سے کہا۔ مر جاؤ (پس وہ سب کے سب مر گئے) پھر انہیں زندہ کیا۔ بے شک خدا لوگوں پر بڑا لطف وکرم کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ (۲۴۳)

تشریح الالفاظ

(۱) فرجالاً اَوْرُکباناً رجال، راجل کی جمع ہے جس کے معنی میں پیدل چلنے والا۔ اس طرح رُکبان راکب کی جمع ہے جس کے معنی سوار کے ہیں

(۲) یذرون وذر الشیٔ کے معنی ہیں کسی چیز کو چھوڑنا

تفسیر الآیات

نماز خوف کا تذکرہ

فَاِنْ خِفْتُمْ...الآیۃ

اس سے مراد نماز خوف ہے۔ جو سفر وحضر میں دو رکعت ہو جاتی ہے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے پڑھی جا سکتی ہے خواہ نمازی پیادہ ہو اور خواہ سوار۔ حتیٰ کہ ایماواشارہ سے بھی پڑھی جا سکتی ہے جنگ کی حالت میں نماز خوف کے باجماعت ادا کرنے کی ایک مخصوص کیفیت ہے جو مناسب مقام پر بیان کی جائے گی۔ انشاء اللہ۔ ہاں جب خوف دور ہو جائے اور امن واطمینان حاصل ہو جائے تو پھر اس طرح پڑھی جائے گی جس طرح عام حالات میں پڑھی جاتی۔۔ جو خدا نے سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام کے توسط سے بتادی ہے۔ اور سکھادی ہے۔

بیوہ کے بارے میں ایک منسوخ شدہ حکم

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ...الآیۃ

اسلام سے پہلے عربوں کا دستور یہ تھا کہ وہ بیوہ کو شوہر کی وراثت سے کچھ نہیں دیتے تھے۔ ہاں البتہ

ایک سال تک نان ونفقہ اوراتنی مدت تک اسے مکان میں رہائش کا حق دیتے تھے۔اور یہ خرچہ کااستحقاق بھی اس وقت تک ہوتا تھا جب تک عورت خودبخود مکان سے باہر نہیں چلی جاتی تھی۔ورنہ اس کا یہ حق بھی ساقط ہوجاتا تھا۔ اسلام نے بھی اوائل میں اس طریقہ کارکو برقرار رکھا۔مگر بعدازاں بالاتفاق یہ آیت منسوخ ہوگئی اوراس کی ناسخ دو آیتیں ہیں ایک وہ جس میں بیوہ کی عدت چار مہینے اوراس دس دن مقرر کی گئی ہے (اسی سورہ کی آیت ۲۳۳) اور دوسری وہ آیت جس میں بیوہ کی وراثت مقرر کی گئی ہے۔''وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ج فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ''(سورہ نساء آیت۔۱۲) بنابریں بیوہ اپنے حصہ سے اپنے اوپر خرچ کرے گی۔

طلاق کی وہ قسم جہاں مطلقہ کو کچھ مال ومتاع دینا واجب ہے؟

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ...الآية

قبل ازیں آیت نمبر ۲۳۶ کی تفسیر میں وضاحت کی جاچکی ہے کہ مہر ومباشرت کے لحاظ سے طلاق کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں اوران میں سے صرف ایک صورت میں اپنی حیثیت کے مطابق خاوند پر واجب ولازم ہے کہ کچھ مال ومتاع مطلقہ کو دے اوروہ صورت یہ ہے کہ جب عورت کا حق مہر مقرر نہ ہواور پھر مقاربت سے پہلے اسے طلاق دے دی جائے۔باقی تین صورتوں میں شوہر کی صوابدید پر منحصر ہے کہ زرمہر یا مہر مثل کے علاوہ کچھ دے یا نہ دے۔بنابریں یا تو مطلقات کو اسی خاص قسم کے ساتھ مخصوص کرنا پڑے گا اوراگر اسے عموم پر باقی رکھنا ہے تو پھر اس حکم کو استحباب پر محمول کرنا پڑے گا۔کہ مطلقات کی دل شکستگی کو دور کرنے اوران کی دلجوئی کرنے کی خاطر مستحب ہے کہ انہیں کچھ روپیہ پیسہ یا کچھ مال ومتاع دے دیا جائے۔اخبار وآثار میں اس عموم کے شواہد موجود ہیں۔(تفسیر عیاشی وصافی)

موت سے ڈر کر گھروں سے نکلنے والی قوم کا تذکرہ اور پھر اس کے مرنے اور جینے کا قصہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا...الآية

جب یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں سال پہلے کا ہے تو پھر اس کے دیکھنے کا کیا مطلب؟ مفسرین کہتے ہیں کہ ایسے موقع پر الم تر کے معنی ہوتے ہیں۔الم تعلم ؟۔کیا تمہیں خبر

نہیں ہے؟ اس قسم کا تخاطب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ہر سامع کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ (مجمع البیان)۔

بہر حال اس آیت شریفہ میں ایک ایسے گروہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جو جہاد یا طاعون کی وجہ سے موت سے ڈر کر اپنے گھروں سے نکلا۔ خدا نے اسے موت کا ذائقہ چکھایا۔ اور پھر زندہ فرمایا اور دوسروں کیلئے نشان عبرت بنایا۔ یہ قوم وقبیلہ کون تھا؟ کب تھا؟ اور کہاں تھا؟ مفسرین نے بہت کوشش وکاوش کی ہے کہ اس کا تعین کریں۔ مگر قصہ کے بارے میں تصدیق و اعتماد کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اور بعض جدید مفسرین جیسے صاحب المنار نے اپنے استاد مفتی محمد عبدہ کے حوالہ سے اس قسم کے کسی واقعہ کا سرے سے انکار ہی کر دیا ہے اور اسے ایک تمثیلی مرقع عبرت قرار دیا ہے۔ اور ہمارے فاضل مفسر شیخ محمد جواد مغنیہ نے اپنی تفسیر کاشف میں اس نظریہ پر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآن میں اس طرح تاویلوں کا دروازہ کھول دیا جائے تو اس سے اس قدر مفاسد لازم آئینگے کہ جن کا سد باب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ یقینا رونما ہوا ہے۔ وعدم العلم بتفا صیله لا یدل علی العدم۔ اس کی تفصیلات کا معلوم نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے اس لئے اس نے تفصیل بیان نہیں کی۔ البتہ جو چیز مختلف اخبار وآثار سے واضح وآشکار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ جو شام کے علاقہ میں ایک شہر کے رہنے والے تھے۔ جن کی تعداد کسی طرح بھی دس ہزار سے کم نہ تھی جب وہاں طاعون کی وباء پھوٹ پڑتی تو مالدار باہر نکل جاتے اور غریب ونادار وہیں رہ جاتے اور زیادہ وہی لوگ مرتے تھے جو شہر میں باقی رہ جاتے تھے۔ اس طرح مالدار کہتے کہ اگر ہم شہر میں رہ جاتے تو زیادہ مرتے اور نادار کہتے کہ اگر ہم باہر نکل جاتے تو ہم کم مرتے۔

الغرض ایک بار انہوں نے یہ اجتماعی فیصلہ کیا کہ اگر اب کی بار یہ وبا پھوٹی تو سب لوگ باہر نکل جائیں گے۔ چنانچہ جب انہیں احساس ہوا کہ وبا پھوٹنے والی ہے تو سب لوگ موت کے ڈر سے گھروں سے باہر نکل کھڑے ہوئے اور مختلف دیار وامصار میں پھرتے پھراتے ایک شہر میں پہنچے جس کے رہنے والے اسے چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ انہوں نے اس میں رحل اقامت ڈالا اور فارغ البال ہو کر رہنے لگے کہ یکا یک حکم الٰہی صادر ہوا کہ "موتوا جمیعاً" سب کے سب مر جاؤ۔ چنانچہ اسی وقت سب جاں بحق ہو گئے۔ جب آس پاس کے لوگوں کو اس واقعہ ہائلہ کی اطلاع ہوئی تو وہ وہاں پہنچے۔ مگر ہزاروں انسانوں کے دفن کفن کا انتظام کون کرتا؟ البتہ یہ کیا کہ ان کے اردگرد حظیرہ نما ایک احاطہ بنا دیا۔ ان کی لاشیں گل سڑ گئیں صرف ہڈیاں رہ گئیں کہ

اس دنیا میں بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی وہاں سے گذرے جن کا نام حزقیل علیہ السلام تھا کہا جاتا ہے کہ انہیں کو ذوالکفل بھی کہتے ہیں۔ وہ یہ عبرتناک منظر دیکھ کر غم زدہ ہوئے اور آبدیدہ ہو گئے اور بارگاہ خداوندی میں استدعا کی کہ وہ انہیں زندہ فرما دے چنانچہ خدا نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کو زندہ کر دیا جو ایک عرصہ تک زندہ رہے اور خورد و نوش' عقد و ازدواج کرتے رہے۔ الغرض دنیوی زندگی کے تمام تمتعات سے لطف اندوز ہوتے رہے اور اپنی طبعی عمریں' گزار کر مرے۔ (اصول کافی' صافی' بحارالانوار' تفسیر عیاشی بروایت امام محمد باقر علیہ السلام و امام جعفر صادق علیہ السلام)

بروایتے ان لوگوں کو جہاد کے لئے بلایا گیا تھا اور انہوں نے یہ عذر پیش کرتے ہوئے وہاں جانے سے انکار کیا کہ اس علاقہ میں طاعون کی وباء ہے اس کے نتیجہ میں ان کے اپنے شہر میں ہی وباء پھوٹ پڑی اور جب وہاں سے بھاگے تو یہ واقعہ رونما ہو گیا۔ (تفسیر نمونہ)۔

درسِ عبرت

بہر حال اس واقعہ سے کئی درس حاصل ہوتے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ اگر چہ حفاظت خود اختیاری کے لئے تدبیر اختیار کرنا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ لیکن تقدیر بہر حال تدبیر پر غالب ہوتی ہے اور

تدبیر کے پر جلتے ہیں تقدیر کے آگے

اور بالآخر

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

طاعون وغیرہ سے بھاگنا آدمی کو موت سے بچا نہیں سکتا۔ اس کا وقت مقرر ہے جس میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی۔ نیز اس آیت اور اس واقعہ سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ موت کے ڈر سے جہاد سے راہ فرار اختیار کرنا حرام ہے اور یہ کہ یہ فرار آدمی کو موت کے منہ میں جانے سے روک نہیں سکتا۔

سیکون ماہو کائن فی وقتہ
واخوالجہالۃ متعب محزون

رجعت کا ثبوت

نیز اس واقعہ سے ہمارے شیعی عقیدہ رجعت کا ثبوت بھی مل جاتا ہے کیونکہ ان لوگوں کا ایک بار مر کر دوبارہ زندہ ہونا اور پھر مدت تک زندہ رہنا اور پھر طبعی موت مرنا اس کے ممکن الوقوع ہونے کی بڑی دلیل

ہے۔اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ جو کچھ سابقہ امتوں میں ہوا ہے وہ میری امت میں بھی ضرور ہوگا (تفسیر درمنثور کنزالعمال)۔ براایں اگر آئندہ کسی وقت اس قسم کے کسی واقعہ کا اعادہ ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

خروج امام لا محالة واقع
یقوم علی اسم اللہ بالبرکات

آیات القرآن

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ
يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ
يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا
نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ
اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ
قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا
وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ
مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ
مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا

تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى وَاٰلُ هٰرُوۡنَ تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً لَّـكُمۡ
اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُـنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ
مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ‌ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّىۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ
فَاِنَّهٗ مِنِّىۡٓ اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَةً ۢ بِيَدِهٖ‌ ۚ فَشَرِبُوۡا مِنۡهُ اِلَّا قَلِيۡلًا
مِّنۡهُمۡ‌ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۙ قَالُوۡا لَا طَاقَةَ لَنَا
الۡيَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ‌ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ
كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةً ۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ مَعَ
الصّٰبِرِيۡنَ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ قَالُوۡا رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا
صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَؕ﴿۲۵۰﴾

ترجمۃ الآیات

اور خدا کی راہ میں جنگ کرو۔ اور خوب جانتے رہو کہ خدا (سب کچھ) سننے اور جاننے والا ہے۔ (۲۴۴) ہے کوئی ایسا جو خدا کو قرض حسنہ دے تاکہ خدا اسے کئی گناہ کر کے واپس کرے۔ خدا ہی تنگی کرتا ہے اور وہی کشادگی دیتا ہے۔ اور (تم سب) اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ (۲۴۵) کیا تم نے جناب موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا کہ جب انہوں نے نبی سے کہا۔ کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم (اسکی زیر قیادت) راہ خدا میں جنگ کریں۔ اس نبی نے فرمایا کہیں ایسا نہ ہو کہ جب جنگ تم پر واجب ہو جائے۔ تو پھر تم جنگ نہ کرو۔ انہوں نے کہا کہ ہم کیونکر جنگ نہیں کریں گے؟ جبکہ ہمیں اپنے گھروں اور بال بچوں سے باہر نکال دیا گیا ہے۔ مگر جب جنگ ان پر واجب قرار دی گئی تو ان کے تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب کے سب منحرف ہو گئے (پیٹھ پھیر گئے) اور خدا ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (۲۴۶) اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ بے شک خدا نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا' اس کو ہم پر

کس طرح حکومت کرنے کا حق ہوسکتا ہے؟ اس سے تو ہم حکومت کرنے کے زیادہ حقدار ہیں اسے تو مالی وسعت ملی ہی نہیں ہے (کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے)۔ نبی نے جواب دیا کہ اللہ نے اسے اس لئے تم پر فضیلت اور ترجیح دی ہے کہ اسے علم اور جسمانی طاقت میں زیادتی عطا کی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے۔ اپنا ملک عطا کرتا ہے۔ (کیونکہ) اللہ بڑی وسعت والا اور بڑا علم والا ہے۔ (۲۴۷) اور ان کے نبی نے ان سے یہ بھی کہا کہ اس کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا۔ جس میں تمہارے پروردگار کی جانب سے سکون کا سامان ہوگا اور موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کے خاندان کے بچے کچھ تبرکات و متروکات بھی اور اسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے اس میں بے شک تمہارے لئے (خدا کی قدرت کی) بڑی نشانی ہے اگر تم ایماندار ہو۔ (۲۴۸) اب جو طالوت فوجیں لے کر چلے تو (اپنے ہمراہیوں سے) کہا کہ خدا ایک نہر کے ساتھ تمہاری آزمائش کرنے والا ہے (دیکھو) جو شخص اس سے پانی پی لے گا اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہ ہوگا اور جو اسے چکھے گا بھی نہیں اس کا مجھ سے تعلق ہوگا۔ مگر یہ کہ اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ (انجام کار وقت آنے پر) تھوڑے لوگوں کے سوا باقی سب نے اس (نہر) سے پانی پی لیا۔ بس جب وہ اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے آگے بڑھے (نہر پار کی) تو (پانی پینے والے) کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی افواج سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے (مگر جن لوگوں کو خدا کو منہ دکھانے کا یقین تھا کہنے لگے خدا کے حکم سے کئی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں اور خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (۲۴۹) (غرضیکہ) یہ لوگ جالوت اور اس کی افواج کے مقابلہ کے لئے باہر نکلے۔ تو (یوں یہ مقابلہ میں ہماری مدد و نصرت فرما (۲۵۰)

تشریح الالفاظ

(۱) یقبِضُ و یَبۡصُطُ	قبض کے معنی تنگ کرنے اور بسط کے معنی کشادہ کرنے کے ہیں
(۲) اصطفٰہ	اصطفاء کے معنی ہیں انتخاب کرنا یعنی چننا
(۳) التابوت	اس کے معنی ہیں لکڑی کا صندوق اور اس کے معنی کشتی بھی ہیں
(۴) بالجنود	یہ جند کی جمع ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں

(۵)فئة جس کی جمع فئات وفئون ہے اس کے معنی ہیں گروہ اور جماعت
(۶)برزوا یہ بروز سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میدان کی طرف نکلنا۔
(۷)فهزموهم یہ ھزم وھزیمت سے ہے جس کے معنی ہیں دشمن کو شکست دینا

تفسیر الآیات

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ الله...الآية

اس آیت مبارکہ میں قتال وجدال کا حکم دیا جارہا ہے تو گویا سابقہ قصہ اس کی تمہید کیلئے بیان کیا گیا تا کہ یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرائی جائے کہ میدان جہاد میں جانے کے اندر یقینی موت نہیں ہے اور اس سے کنی کترانے میں اس سے یقینی نجات نہیں ہے۔''یدرلکم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدہ''اگر تم اپنے آپ کو مضبوط قلعوں میں بھی بند کرلو تو بھی موت تمہیں وہاں سے بھی ڈھونڈھ نکالے گی۔تو جب موت برحق ہے اور اس کا وقت مقرر ہے اور تقدیر الٰہی ٹل نہیں سکتی تو پھر بہتر یہ ہے کہ موت راہ خدا میں آئے اس طرح گویا مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی جارہی ہے اور گویا ان سے کہا جارہا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں موت کی پروانہ کریں۔ کیونکہ راہ خدا میں شہادت عین سعادت ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ ثروت نہ دولت نہ کشور کشائی

ایسا کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے؟

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ الله قَرْضًا...الآية

چونکہ جہاد کی دو قسمیں ہیں۔ا۔جانی ۲۔مالی۔چنانچہ سابقہ آیت میں جانی جہاد کا حکم دینے اور موت کے ڈر کو دل و دماغ سے باہر نکالنے کے حکم کے بعد اب اہل ایمان کو مالی جہاد کے لئے آمادہ کیا جارہا ہے۔اور عجیب انداز میں اہل ایمان کو راہ خدا میں سرمایہ کاری کا شوق دلایا جارہا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ تم راہ خدا میں جو رقم صرف کروگے وہ یونہی ہمیشہ کے لئے تمہارے ہاتھ سے چلی جائے گی بلکہ وہ تو ایک قرض حسنہ ہے۔جو تم خدا کو دے رہے ہو اور وہ اس کا کئی گنا کر کے تمہیں واپس لوٹائے گا اور یہ مسئلہ واضح ہے کہ اگر قرض میں واپسی کے وقت زیادتی کی شرط مقرر نہ کی جائے تو ادائیگی کے وقت اصل قرض سے کچھ زیادہ ادا کرنا شرعاً پسندیدہ فعل ہے۔

اب یہ بات خدا کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ یہ کئی گنا معاوضہ دنیا میں عطا فرمائے یا مرنے کے بعد ثواب کی صورت میں مرحمت فرمائے آخر پلٹ کر تو اسی کی بارگاہ میں جانا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''جب (سورہ آل عمران کی) یہ آیت نازل ہوئی ''مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ مِّنۡهَا'' (سورہ نمل آیت۔۸۹) جو شخص کوئی نیکی کرے گا تو اس کو اس سے بہتر دیا جائے گا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کیا۔ اے پروردگار کچھ اور اضافہ فرما! تو خدائے رحیم وکریم نے یہ آیت نازل فرمائی ''مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا'' (سورہ انعام آیت۔۱۶۰) کہ جو شخص ایک نیکی بجالائے گا اسے اس کا دس گناہ معاوضہ دیا جائے گا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا پروردگار! کچھ اور اضافہ فرما۔ اس پر رب رحیم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ''مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا ۔۔۔۔'' ہے کوئی ایسا جو خدا کو قرض حسنہ دے؟ تاکہ خدا سے کئی گنا کر کے واپس کرے۔ فرمایا اللہ کے نزدیک جو کثیر ہے وہ عدو احصاء سے ماوراء ہے'' (مجمع البیان، البرہان، البحار، العیاشی)۔

جناب شموئیل نبی اور جناب طالوت وجالوت کا قصّہ

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ ...الآیة

سابقہ قصہ کی طرح اس واقعہ کی تفصیل بھی پردہ خفا میں ہے کہ یہ نبی کون تھے؟ اور یہ قوم کون تھی؟ جس کا یہ واقعہ ہے۔ قرآن کوئی قصص وحکایات کی کتاب نہیں ہے، اور نہ ہی فلسفہ اور طبیعی علوم کی کوئی کتاب ہے کہ اس میں ان چیزوں کو تلاش کیا جائے بلکہ دین وشریعت اور ہدایت واخلاق کی کتاب ہے۔ اگر کبھی کبھار اس میں امم سابقہ کے بعض قصص وحکایات کا تذکرہ آجاتا ہے تو وہ بھی پند وموعظہ اور درس عبرت حاصل کرنے کیلئے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

''لَقَدۡ كَانَ فِیۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ'' (سورہ یوسف آیت۔۱۱۱)۔

'' قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ فَسِيۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ'' (سورہ آل عمران آیت۔۱۳۷)۔

اگرچہ اس واقعہ کی کچھ تفصیلات بعض روایات کے اندر وارد ہوئی ہیں۔ لیکن اگر وہ معلوم نہ بھی ہوں تو بھی اس واقعہ کے بیان کرنے کا جو مقصد ہے تو اگر اسے اسی قدر بھی بیان کر دیا جائے جس قدر قرآن نے بیان کیا ہے تو پھر بھی اس مقصد پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ بہر حال اصل قصہ کے متعلق جو کچھ قرآنی آیات اور

مستند روایات سے ثابت ہے ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں اور پھر اس سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں ان کا اجمالی تذکرہ کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جانشین انبیاء آتے رہے اور بنی اسرائیل کے معاملات کی اصلاح کرتے رہے۔ مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حسب عادت ان کی شرارتیں بڑھتی گئیں اوران کی عصیاں کاریوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ الغرض جب انہوں نے خدا کے عہد و پیماں کو بھلا دیا تو خدا نے ان کی شامت اعمال کے نتیجہ میں جالوت جیسے جابر حاکم کو ان پر مسلط کر دیا۔ جس نے ان کے مردوں کو قتل اور عورتوں کو قید کرنا شروع کیا۔ اوران کے گھروں پر قبضہ کر کے ان کو جلاوطن کر دیا۔ تب وہ ان حالات سے گھبرا کر اس دور کے نبیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے جس کا نام بنا بر مشہور شموئیل علیہ السلام ہے اور بائبیل میں ''**سموئیل**'' لکھا ہے (مجمع البیان)۔ اور بقولے صموئیل تھا (کاشف) جو جناب داؤد کے دور میں تھے۔ اوران سے استدعا کی کہ ہمارے لئے ایک دینی حاکم مقرر کریں جس کی قیادت میں ہم جالوت اوراس کی افواج (عمالقہ) سے جنگ و جدال کریں۔ نبی نے ان کا امتحان لینے کی خاطر کہا کہ اب تو تم جہاد کی خواہش کر رہے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ واجب ہو جائے تو تم پیٹھ پھیر جاؤ جس پر انہوں نے اپنے عزم و استقامت کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ بھلا ہم کیونکر نہیں لڑیں گے۔ جبکہ ہمیں اپنے گھر سے بے گھر اور اپنے بال بچوں سے دور کر دیا گیا ہے اور ہم پر مصائب و شدائد کے پہاڑ ڈھا دیئے گئے ہیں۔

چنانچہ نبی نے ان کی یہ درخواست پروردگار کی بارگاہ میں پیش کی۔ تو خدا نے جناب طالوت کو ان کا حاکم مقرر کیا۔ جو کہ جناب بنیامین بن یعقوب علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔ اسباط نبوت میں سے نہیں تھے۔ کیونکہ وہ لاوی بن یعقوب کی اولاد میں تھی۔ اور نہ ہی اسباط سلطنت میں سے تھے کیونکہ وہ یہودا بن یعقوب کی اولاد میں تھے۔ البتہ ان کا قد لمبا تھا جس کی وجہ سے ان کو طالوت کہا جاتا تھا اور علم و فضل اور قوت و شجاعت میں سرآمد روزگار تھے۔ مگر مالدار نہ تھے بلکہ مفلوک الحال تھے۔ اس نبی نے یہ بات بنی اسرائیل کو بتائی کہ خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔ تو ان کا پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ حسب عادت اعتراض جڑ دیا کہ وہ کس طرح ہمارا بادشاہ بن سکتا ہے جو مالدار نہیں ہے (اور نہ ہی اسباط نبوت و سلطنت میں سے ہے)۔ ان سے تو زیادہ ہم بادشاہت کا حق رکھتے ہیں (جو نسب اور مال میں ان سے فائق ہیں)۔ نبی نے فرمایا کہ بے شک ایسا ہی ہے مگر خدا نے ان کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ ان کا علم و فضل اوران کی قوت و شجاعت تم سے زیادہ ہے (اور ظاہر ہے کہ

کسی حکومت میں انہی دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے)۔اس پر انہوں نے دلیل طلب کی یعنی معجزہ طلب کیا کہ واقعاً خدا نے ان کو منتخب کیا ہے نبی نے فرمایا اس کی دلیل یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ تابوت سکینہ ملائکہ اٹھا کر لائیں گے جس میں تمہاری روحانی تسکین کا سامان اور جناب موسی علیہ السلام و ہارون علیہ السلام اور ان کے گھرانے کے تبرکات و متروکات از قسم عصائے موسی علیہ السلام ان کی نعلین' نیز جناب موسیٰ علیہ السلام کے کچھ کپڑے' زرہ اور جناب ہارون علیہ السلام کا عمامہ وغیرہ تبرکات موجود ہیں اور جناب امام محمد باقر علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق یہ وہی تابوت سکینہ تھا جس میں مادر موسی علیہ السلام نے جناب موسیٰ کو رکھ کر دریا میں ڈالا تھا۔ اور یہ تابوت بنی اسرائیل میں بڑا ہی متبرک سمجھا جاتا تھا۔ میدان جنگ میں اسے لشکر کے آگے آگے رکھتے تھے اور اس کی برکت سے خدا انہیں فتح وفیروزی عطا کرتا تھا۔

مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی بے قدری کرنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے بچے گلی کوچے میں اس سے کھیلتے تھے اور اسے ٹھڈے مارتے تھے۔ تب خدا نے ان کو اس کفران نعمت کی یہ سزا دی کہ اسے آسمان پر اٹھا لیا اور بروایتے ایک جنگ میں عمالقہ اٹھا کر لے گئے۔ بہرحال نبی نے جب یہ معجزہ دکھایا اور تابوت سکینہ آ گیا۔ تو یہ سب لوگ بظاہر ایمان لائے اور جناب طالوت کی بادشاہی کو بظاہر تسلیم کر لیا۔ مگر بعد والے حالات و واقعات نے ظاہر کر دیا کہ ہمیشہ کی طرح ان میں سے بھی اکثر منافق تھے۔ اور اقل قلیل مخلص مومن تھے۔ ان کی مجموعی تعداد بروایتے ستر ہزار اور بروایتے اسی ہزار تھی۔ چنانچہ جناب طالوت اس کثیر جمعیت کو اپنے ہمراہ لے کر عمالقہ سے لڑنے کیلئے نکلے تو جناب طالوت نے ان سے کہا کہ خدا تمہاری آزمائش کرنے والا ہے۔ لق و دق صحرا ہے' گرمی کا موسم ہے اور سخت پیاس ہے۔ اس حالت میں راستہ میں ایک نہر آ رہی ہے۔ پس جو شخص اس سے سیر ہو کر پانی پیئے گا وہ مجھ سے نہیں ہوگا اور جو اس پانی کا قطرہ بھی نہیں چکھے گا۔ ماسوا ایک چلو بھر پانی کے وہ مجھ سے ہوگا۔

چنانچہ ہوا یہ کہ جب وہ لوگ اس نہر پر پہنچے تو معدودے چند افراد کے سوا جو بروایتے چار ہزار اور بروایت دیگر تین سو تیرہ افراد تھے۔ باقی سب نے پیٹ بھر کر پانی پیا۔ اور اپنا نفاق ظاہر کیا۔ یہاں دو روایتیں ہیں ایک یہ ہے کہ وہ وہیں سے الگ ہو گئے اور دوسری یہ ہے کہ جناب طالوت نے ان کو ہمراہ لے کر نہر پار کی اور آگے بڑھے۔ جب میدان کارزار میں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو اب ان لوگوں نے جنگ سے جی چراتے ہوئے کہا کہ ہم میں تو اس جم غفیر کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں ہے اور اب وہ خطرہ سامنے آ گیا ہے جو نبی نے پہلے دن ظاہر کیا تھا مگر جو خالص مخلص مومن تھے انہوں نے ہمت سے کام لیا اور کہا فتح و شکست خدا کے قبضہ قدرت میں ہے بس آدمی کی ہمت بلند اور ایمان پختہ ہونا چاہیے کئی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں۔ پھر انہوں

نے بارگاہ خدا میں عجز و نیاز کے ساتھ فتح و نصرت کی دعا کی۔ چنانچہ جنگ چھڑی اور جناب طالوت کے مخلص جانبازوں نے خوب داد شجاعت دی۔ جناب داؤد نے جو بڑے بہادر و شجاع تھے اور جناب طالوت کے لشکر میں موجود تھے۔ ایک ایسا زبردست پتھر جالوت کی پیشانی پر مارا کہ جس سے وہ فی النار ہو گیا اور اس کے لشکر کے چند سپاہی بھی واصل جہنم ہوئے جس سے ان کے چھکے چھوٹ گئے اور میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور قادر و قیوم خدا نے جناب طالوت اور آپ کے مخلص ساتھیوں کو فتح و نصرت عطا فرمائی۔ اور جناب داؤد کو جو کہ لاوی بن یعقوب کی اولاد میں سے تھے۔ خدا نے اس شجاعت و بہادری کے بدلے میں (طالوت کی وفات کے بعد) سلطنت اور حکمت (نبوت) عطا فرمائی۔ اور ان کو دین و دنیا کے بعض خاص امور کی تعلیم دی جن میں زرہ سازی، لوہے کا موم ہونا، لوگوں کے فیصلے کرنا، پرندوں اور حیوانوں کی بولیوں کا سمجھنا شامل ہے۔ اور اس طرح عمالقہ کا زور ٹوٹا اور خداوند عالم نے ان مظلوموں کی مدد و نصرت فرمائی۔

آیات القرآن

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾ تِلْكَ
الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ
بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ
بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ
مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

ترجمۃ الآیات

پس ان لوگوں نے خدا کے حکم سے ان لوگوں (دشمنوں) کو شکست دے دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور خدا نے انہیں سلطنت و حکمت عطا فرمائی۔ اور جس چیز کا چاہا علم عطا فرمایا۔ اور اگر خدا ایک گروہ کا دوسرے گروہ کے ذریعہ سے دفاع نہ کرے تو زمین تباہ و برباد ہو جائے۔ مگر خدا تمام جہانوں پر بڑا لطف و کرم کرنے والا ہے۔ (۲۵۱) یہ آیات الہیہ (قدرت خدا کی نشانیاں) ہیں جنہیں ہم سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور بے شک و شبہ آپ رسولوں میں سے ہیں۔ (۲۵۲) یہ سب پیغمبر ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے خدا نے کلام کیا اور ان میں سے بعض کے درجے بلند کئے۔ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کئی معجزے دیے۔ اور روح القدس کے ذریعہ سے ان کی تائید کی اور اگر خدا (جبراً) چاہتا تو ان (پیغمبروں) کے بعد آنے والے لوگ اپنے پاس معجزے آ جانے کے بعد آپس میں نہ لڑتے۔ لیکن انہوں نے آپس میں اختلاف کیا پھر ان میں سے کچھ ایمان لائے اور بعض نے کفر اختیار کیا۔ اور اگر خدا (جبراً) چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے۔ مگر خدا جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے (۲۵۳)

تشریح الالفاظ

(۱) ایدناہ — یہ تائید سے مشتق ہے جس کے معنی میں تائید کرنا اور قوی کرنا

(۲) ما اقتتل — اس کے معنی ہیں قوم کا باہم جنگ کرنا اور ایک دوسرے کو قتل کرنا

تفسیر الآیات

وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ... الآیۃ

اس لئے آخر میں فرماتا ہے کہ جب کسی فرعون صفت کا ظلم و ستم حد سے بڑھ جاتا ہے تو خداوند عالم اپنی قدرت کاملہ سے ان کی سرکوبی کیلئے کسی موسیٰ کو پیدا کر دیتا ہے۔ اور اگر یہ دفاع کا حکیمانہ سلسلہ نہ ہوتا تو نظام

کائنات درہم برہم ہوجاتا۔ ہر بڑی مچھلی ہر چھوٹی مچھلی کو کھاجاتی اور ہر طاقتور ہر کمزور کا خون پی جاتا اور اس طرح زمین وآسمان اور نظام کون ومکان خراب وبرباد ہوجاتا۔لیکن جب تک حکیم مطلق نے اس نظام عالم کو برقرار رکھنا ہے تو قیام امن بذریعہ طاقت کا وہ خود ہی اہتمام کرتا رہے گا۔ سچ ہے ''لکل فرعون موسیٰ''۔(مجمع البیان' کاشف وغیرہ)

اس واقعہ سے حاصل شدہ نتائج ونصائح

اس واقعہ سے درج ذیل قیمتی نتائج اور گرانقدر نصائح حاصل ہوتے ہیں جن کا جامع خلاصہ یہ ہے۔

۱۔اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکم شرع کی اجازت کے بغیر شرعی جہاد نہیں ہوسکتا۔اور اگر اس کی اجازت کے بغیر جنگ ہوئی تو وہ دنیوی جنگ ہوگی۔ جہاد نہیں ہوگا۔

۲۔قوم اپنے نبی کی خدمت میں حاکم شرع مقرر کرنے کی عرضداشت پیش کرتی ہے۔مگر نبی نہ یہ کہتے ہیں کہ تم خود کسی کو اپنا حاکم بنالو۔اور نہ ہی خود بناتے ہیں بلکہ وہ بارگاہ خدا میں لوگوں کی عرض داشت پیش کرتے ہیں اور خدا جناب طالوت کو منتخب کرتا ہے اور نبی ان کی حاکمیت کا اعلان کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکم شرع کیلئے منصوص من اللہ ہونا ضروری ہے۔لہٰذا یہ انتخاب خدا کرتا ہے' البتہ اس کا اعلان نبی سے کراتا ہے ''رَبُّكَ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخۡتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ'' تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے لوگوں کو یہ اختیار نہیں ہے۔

۳۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا جب کسی کا انتخاب کرتا ہے تو وہ اس شخص کو منتخب کرتا ہے جو افضل ہوتا ہے اور افضل ہونے کا معیار نہ مال ودولت ہے' اور نہ نسب وخاندان بلکہ معیار فضیلت علم وفضل اور قوت وطاقت ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص جو ہر علم وفضل اور قوت وشجاعت میں فائق ہوگا' خدا کی نظر انتخاب میں سرداری کا وہی مستحق ہوگا۔

۴۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت الٰہیّہ کے لئے حاکم کے انتخاب کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔اس سلسلہ میں حق جمہور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔کیونکہ اگر اس کی کوئی حیثیت ہوتی تو جب قوم نے خدا کے اس انتخاب پر اعتراض کرکے اپنی اہلیت واحقیت پیش کی تھی اور عوامی ذہنیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ طالوت کے پاس تو مال ودولت نہیں ہے وہ کس طرح ہمارے حاکم بن سکتے ہیں؟ اس سے تو ہم زیادہ حقدار ہیں۔ تو اگر حق جمہور کوئی چیز ہوتا تو خدا کا یہ فیصلہ واپس ہوجانا چاہیے تھا۔مگر خدا نے ان کا یہ اعتراض مسترد کرکے اور اپنا فیصلہ بحال رکھ کر جمہوریت کی عمارت کو مسمار کردیا اور واضح کردیا کہ حکومت الٰہیہ کے بارے میں جمہوریت کے

مسلک پر چلنا سنت الٰہی کے خلاف ہے۔''وَاللہ یُؤْتِیْ مُلْکَهٗ مَنْ یَّشَآءُ'' اصل مالک الملک تو خدا ہے۔ وہ جسے چاہے حاکم مقرر کرے اور اسے سلطنت عطا کرے کسی کو مداخلت ومخالفت کا کوئی حق نہیں ہے۔

۵۔ صرف نبی و رسول کیلئے ہی نہیں بلکہ ہر اس منصب کے اثبات کے لئے جو منجانب اللہ ہو مدعی کے واسطے معجزہ کا پیش کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ جناب طالوت کی سرداری کیلئے جو کہ نہ نبی تھے اور نہ رسول بلکہ صرف جہاد کیلئے منجانب اللہ حاکم مقرر ہوتے تھے۔ ملائکہ کے ہاتھوں تابوت سکینہ کے نزول کا معجزہ پیش ہوا۔ بنا بریں ائمہ طاہرین ۔ کے معجزات کا انکار انبیاء ومرسلین کے معجزات کے انکار کے مترادف ہے۔ اور ان کے معجزات کا انکار وہی شخص کرسکتا ہے جو منکر قرآن ہو۔

۶۔ ہر دور میں باطل والوں کی اکثریت رہی ہے اور اہل حق ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں حتی کہ ظاہری ایمان لانے والوں میں سے بھی اکثر امتحان کے وقت راہ راست سے منحرف ہوجاتے ہیں اور اقلیت ہی حق پر قائم رہی ہے۔''وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ''(سورہ سبا آیت۔ ۱۱۳)۔

۷۔ قرآن کے اس قصہ میں یہ انتباہ بھی مضمر ہے کہ اکثریت سے کبھی مرعوب نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی کبھی کثرت کو حق کی دلیل سمجھنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ اقلیت باذن اللہ اکثریت پر غالب آجائے اور حق اقلیت کے ساتھ ہو۔ اور اکثریت غلط راستہ پر گامزن نظر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ پورا قرآن اکثریت کی مذمت سے لبریز نظر آتا ہے اور اقلیت کی مدح میں رطب اللسان دکھائی دیتا ہے۔

۸۔ آخر میں تشدد و عدم تشدد کے بارے میں اسلام کے اعتدل پسندانہ نقطہ نگاہ کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے کہ اس میں جارحیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مگر اس میں دفاع کا حکیمانہ حکم موجود ہے۔ جو مخلوق خدا پر محسن حقیقی کا ایک بہت بڑا احسان ہے کیونکہ اگر دفاع نہ ہوتا تو ظالموں اور جابروں کی سرکشیاں حد سے بڑھ جاتیں اور اس طرح پورا عالم تباہ وبرباد ہوجاتا۔

۹۔ جب کسی قوم کے گناہ وعصیان حد سے بڑھ جاتے ہیں تو خدائے جبار وقہار آخرت سے پہلے انہیں سزا دینے کیلئے ظالم وجابر حکمران ان پر مسلط کر دیتا ہے اور وہ ان کو ظلم وجور کی چکیوں میں خوب پیستے ہیں۔ اور چونکہ وہ قوم کی شامت اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے قوم بددعا کرتی ہے۔ مگر خدا اسے قبول نہیں کرتا۔

۱۰۔ طیب اور خبیث اور شریف اور رذیل کا امتیاز امتحان وآزمائش کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔'' عند الامتحان یکرم الرجل اویهان'' جیسا کہ یہاں نہر والے واقعہ سے اور بہت سے واقعات سے واضح وآشکار ہوتا ہے۔ اسی لئے ہمیشہ خدا لوگوں کا امتحان لیتا ہے'' لیمیز اللہ الخبیث من الطیب''۔''

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون؟'' (تفسیر قمی، مجمع البیان، البرہان، کاشف وفصل الخطاب وغیرہ)۔

انبیاء کے فرق مراتب کا بیان

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا...الآیۃ۔

یہ پیغمبر جن کا ذکر خیر اس سے پہلی آیت (وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) میں اجمالاً کیا جا چکا ہے جن کی مجموعی تعداد بنا بر مشہور ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جن میں سے تین سو تیرہ رسول اور باقی نبی ہیں اور ان تین سو تیرہ میں سے پانچ اولوالعزم ہیں جو یہ ہیں۔

۱۔جناب نوح علیہ السلام ۲۔جناب ابراہیم علیہ السلام ۳۔جناب موسیٰ ؑ

۴۔جناب عیسیٰ علیہ السلام ۵۔اور حضرت محمد مصطفی واحمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اگرچہ یہ سب معصوم عن الخطاء ہیں اور واجب الاتباع ہیں جو کہ ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ'' کا مفاد ہے (کہ ہم اللہ کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے)۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہم مرتبہ بھی ہیں اور یکساں فضیلت رکھتے ہیں۔ بلکہ خدا نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ان کو الگ الگ مخصوص امتیازات سے نوازا ہے۔اور ان کے مرتبے اور درجے جدا جدا بنائے ہیں اور یہ فرق مراتب کی بات صرف انبیاء و مرسلین تک ہی محدود نہیں بلکہ............

خدائے حکیم نے کوئی بھی دو چیزیں ہر لحاظ سے برابر پیدا نہیں کیں

خدائے حکیم نے اپنی حکمت بالغہ سے کائنات کی ہر دو چیزوں میں منازل و مراتب کا فرق قائم رکھا ہے اور کوئی بھی دو چیزیں ہر لحاظ سے برابر پیدا نہیں کیں۔دو جنسیں برابر نہیں، دو نوعیں برابر نہیں، دو صنفیں برابر نہیں اور دو افراد برابر نہیں۔اگر بنظر انصاف اشیاء عالم پر معمولی غور و فکر کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ہر دو جنس میں فرق ہے ہر دو نوع میں فرق ہے ہر دو صنف میں فرق ہے اور ہر دو فرد میں فرق ہے۔دو پتھر برابر نہیں، دو درخت برابر نہیں'' دو حیوان برابر نہیں اور دو انسان برابر نہیں۔دو نبی برابر نہیں دو ولی برابر نہیں، دو کافر برابر نہیں، دو مسلمان برابر نہیں، دو اہل ایمان برابر نہیں، دو بے ایمان برابر نہیں، دو عقلمند برابر نہیں دو احمق برابر نہیں، دو عالم برابر نہیں، دو جاہل برابر نہیں اور دو دین دار نیکوکار برابر نہیں، دو بے دین و بدکار برابر نہیں۔

اسلام میں معیار فضیلت علم، شجاعت، ایمان اور تقویٰ ہے:

پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس قانون قدرت کے خلاف بقول بعض سب صحابہ کس طرح برابر ہو سکتے ہیں؟ یہ بات حکمت خداوندی کے خلاف ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس ترجیح و تفضیل کی وجوہات کیا ہیں اور اس کا میزان کیا ہے؟ اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے کہ اس تفضیل کے وہی چار اسباب ہیں جو قرآنی و اسلامی نقطہ نگاہ سے میزان و معیار فضیلت ہیں۔ یعنی علم، شجاعت، ایمان اور تقوی۔ لہٰذا جس شخص کا ان چار چیزوں میں جس قدر مقام بلند ہو گا اسی قدر اس کی شان بلند ہو گی۔ مگر یہاں خداوند عالم نے بعض انبیاء کے ان بعض خصوصی خصائص کا تذکرہ کیا ہے جن سے ان کی خصوصی شہرت ہے جیسے جناب ابراہیم علیہ السلام کی خلیل اللہ سے، جناب موسیٰ علیہ السلام کی کلیم اللہ سے، جناب عیسیٰ علیہ السلام کی روح اللہ سے اور حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حبیب اللہ اور خاتم المرسلین ہونے سے۔ بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ عام لوگوں سے نبی افضل، عام نبیوں سے رسول افضل اور عام رسولوں سے اولوالعزم افضل اور اولوالعزم میں سے ہمارے خاتم الانبیاء افضل و اعلیٰ اور بلند و بالا ہیں اور ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کے مصداق ہیں اور باتفاق تمام مفسرین اسلام اس آیت مبارکہ کے اس فقرہ ''رفع بعضھم درجات'' کے مصداق ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ فضیلت و مرتبت کئی لحاظ سے ہے۔

۱۔ وہ تمام جن و انس وغیرہ کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔

۲۔ ان کو وہ تمام معجزات اجتماعی طور پر عطا فرمائے گئے ہیں جو مختلف انبیاء کو فرداً فرداً عطا ہوئے تھے۔

۳۔ ان کو قرآن جیسا معجزہ خالدہ عطا کیا گیا ہے جس کا اعجاز صبح قیامت کے طلوع ہونے تک برقرار رہے گا جبکہ دوسرے انبیاء اور خود آپ کے دوسرے معجزات ختم ہو چکے ہیں۔

۴۔ آپ رحمۃ للعالمین اور نذیر اللعالمین ہیں۔

۵۔ آپ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔ ''الی غیر ذلك من الخصائص الكثيرہ''

وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ...الآیۃ

خدائے بزرگ و برتر نے یہاں خصوصی طور پر جناب عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعض معجزات اور روح القدس سے ان کی تائید و تسدید کا تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ صفوف انبیاء میں ان کے بارے میں خصوصی طور پر افراط و تفریط واقع ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ نصاریٰ نے انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا۔ اور یہود ان کو ایک شریف انسان ما

سننے پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔ یہاں البینات سے جناب عیسیٰ علیہ السلام کے بعض خصوصی معجزات مراد ہیں جیسے مردوں کا باذن اللہ زندہ کرنا، بیماروں کو شفاء دینا، مٹی سے پرندہ بنا کر اڑانا وغیرہ۔

معجزہ کا حقیقی فاعل خدا ہوتا ہے

یہ بات کسی مناسب مقام پر (سورہ آل عمران میں) قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کی جائے گی کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خدا ہوتا ہیں جو اپنی قدرت کاملہ سے معجزہ ظاہر کرتا ہے اور مجازی فاعل نبی وامام ہوتے ہیں۔ جن کی دعا واستدعا پر قادر مطلق ان کے ہاتھوں پر اسے ظاہر کرتا ہے۔

روح القدس کی حقیقت کا بیان

وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ...الآیۃ

روح القدس سے کیا مراد ہے؟ اور روح القدس کی حقیقت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین اسلام میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے اس سے جناب عیسیٰ علیہ السلام کی روح مقدس مراد لی ہے (تفسیر کاشف) اور اکثر سنی وشیعہ مفسرین نے اس سے جبرائیل امین کو مراد کیا ہے (مجمع البیان وتفسیر کبیرہ وغیرہ) مگر ہم سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام کے اخبار وآثار کا تتبع کرنے اور بقدر امکان تحقیق وتدقیق کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ روح القدس دیگر ارواح کی قسم سے بھی نہیں ہے اور وہ جبرائیل بھی نہیں۔ بلکہ وہ ایک ایسا فرشتہ ہے جو شان وشوکت میں جبرائیل ومیکائیل جیسے جلیل القدر فرشتوں سے بھی بڑھ کر عظیم الشان اور جلیل القدر ہے۔ یہ فرشتہ انبیاء ماسلف کے ہمراہ بھی تھا اور پھر ہمارے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی برابر ہمراہ رہا ہے۔ اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے ائمہ اہلبیتؑ کی طرف منتقل ہوتا رہا ہے۔ خداوند عالم اس سے برابر ان کی تائید وتسدید فرماتا رہا ہے۔ اس موضوع کی صداقت کے دلائل اور دوسری تفصیلات معلوم کرنے کے خوہشمند حضرات ہماری کتاب اصول الشریعہ فی عقائد الشیعہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

انسان اپنے افعال میں مختار ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا...الآیۃ

اس آیت اور اس سے ملتی جلتی بعض دوسری آیات کو دیکھ کر بعض کوتاہ اندیش لوگ قرآن کے حقیقی مطالب ومعانی میں غور وفکر کئے بغیر اور عقل ومعصوم علیہم السلام سے راہنمائی حاصل کئے بغیر بڑی بے باکی سے کہہ

دیا کرتے ہیں کہ لوگوں کی باہمی جنگ وجدال' مومنوں کا ایمان لانا اور کافروں کا کفر اختیار کرنا سب مشیت الٰہی کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ یہ کہتے وقت اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر قرآن مجید کی ان آیات کا یہی مطلب ومفہوم ہے تو پھر مؤمن کو اس کے ایمان کی جزا اور کافر کو اس کے کفر کی سزا دینے کا کیا جواز ہے؟ اور پھر حشر ونشر کس لئے ہے؟ اور حساب و کتاب کی کیا ضرورت ہے؟ جب سب کچھ کرتا کراتا خدا ہے تو پھر جزاء وسزا بھی خود ہی پائے گا (العیاذ باللہ)۔

قرآن بار بار واضح اعلان کرتا ہے کہ ''انا ھدینٰہ السبیل'' کہ ہمارا کام صرف بندے کو اسلام اور کفر' نیکی اور برائی کا راستہ دکھانا ہے۔ اس راستہ کا انتخاب کرنا اور اس پر چلنا آدمی کا اپنا کام ہے۔ ''مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ'' جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے (سورہ کہف آیت۔۲۹)۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن میں اختلاف نہیں ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ قرآن کہیں جبر کی تعلیم دے اور کہیں اختیار کا درس دے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا اپنی مشیت قاہرہ اور جبری طاقت کو استعمال میں لاتا۔ تو پھر سب لوگ ایمان لاتے اور کافر کا وجود بھی ختم ہو جاتا۔ نیکی عام ہو جاتی اور برائی کا نام ونشان مٹ جاتا۔ نہ باہمی اختلاف ہوتا اور نہ جنگ وجدال ہوتا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

''وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا'' اگر تمہارا پروردگار (جبراً) چاہتا تو روئے زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ (سورہ یونس آیت۔۹۹)

مگر جبر کرنا خدا کے نظام عدل وانصاف کے خلاف ہے۔ ورنہ رسولوں کا بھیجنا، کتابوں کا نازل کرنا اور قیام قیامت سب کچھ بے کار ہو جائے گا۔ اس لئے اس کی مشیت اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ لوگ فاعل مختار رہوں۔ تا کہ ایمان لانے والے نیکی کرنے پر ثواب کے حقدار قرار پائیں اور کفر اختیار کرنے والے برا کام کرنے پر عذاب کے سزاوار ٹھہریں۔

آیات القرآن

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ

اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۬ۚ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوۡمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی
السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ
یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ ۚ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ
اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوۡدُہٗ
حِفۡظُہُمَا ۚ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾

ترجمۃ الآیات

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے کچھ (راہ خدا میں) خرچ کرو۔ قبل اس کے کہ وہ دن (قیامت) آجائے کہ جس میں نہ سودے بازی ہوگی، نہ دوستی (کام آئے گی) اور نہ ہی سفارش۔ اور جو کافر ہیں وہی دراصل ظالم ہیں۔ (۲۵۴) اللہ (ہی وہ ذات) ہے۔ جس کے علاوہ کوئی الہ نہیں ہے۔ زندہ (جاوید) ہے۔ جو (ساری کائنات کا) بندوبست کرنے والا ہے۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی (پیشگی) اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں (کسی کی) سفارش کرے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے۔ اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اسے بھی جانتا ہے۔ اور وہ (بندے) اس کے علم میں سے کسی چیز (ذرا) پر بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ مگر جس قدر وہ چاہے۔ اس کی کرسی (علم واقتدار) آسمان و زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ ان دونوں (آسمان و زمین) کی نگہداشت اس پر گراں نہیں گذرتی وہ برتر ہے اور بڑی عظمت والا ہے (۲۵۵)

تشریح الالفاظ

(۱) سِنَۃ — اس کے معنی ہیں اونگھ جیسا کہ نوم کے معنی نیند کے ہیں

(۲) یشفع عندہ — شفاعت کے معنی سفارش کے ہیں

(۳)اولا یؤدہ یہ اَود سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں تھکا دینا

(۴)لاا کراہ اکراہ کے معنی ہیں کسی کو کسی کام پر مجبور کرنا۔

تفسیر الآیات

کچھ قیامت کی سختی اور سفارش کے بارے میں؟

یَاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا ...الآیة

اس دن سے بعض مفسرین نے موت کا دن مراد لیا ہے (تفسیر صافی)۔ دوسری آیات وروایات کے پیش نظر اس سے قیامت کا دن مراد ہے۔ جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی۔ اور نہ کوئی دوستی و یاری کام دے گی کیونکہ ''الاخلاء یومئذ بعضهم لبعض عدو'' اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ اور نہ ہی خدا کے اذن واجازت کے بغیر کسی کی سفارش ہوگی۔ کیونکہ نہ خدا پر کسی کا دباؤ ہے اور نہ خدا کسی کا زیر احسان۔ بلکہ جو کوئی سفارش کرے گا وہ اس کی اجازت سے کرے گا جیسا کہ عنقریب آیۃ الکرسی میں آرہا ہے کہ'' مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ '' کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے ہاں کسی کی سفارش کرے؟ اس سے واضح ہوگیا کہ جس سفارش کی یہاں نفی ہورہی ہے وہ اور ہے اور جس سفارش کا اثبات ہورہا ہے وہ اور ہے۔ پہلی قسم وہ ہے جو اس کی اجازت کے بغیر ہو۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو اس کی اجازت سے ہو۔'' ولا یشفعون الا لمن ارتضی '' سفارش کرنے والے اسی کی سفارش کریں گے جس کے دین کو خدا پسند کرے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفارش صرف ان لوگوں کی ہوگی جن کا عقیدہ صحیح ہوگا اور مقام عمل میں گناہگار ہوں گے اور بدعقیدہ لوگوں کی کوئی سفارش نہ ہوگی کیونکہ ان کا دین واعتقاد ناپسندیدہ ہے۔۔ اس موضوع کی مزید تشریح وتوضیح آیت الکرسی کے ضمن میں آرہی ہے۔ آخر میں فرمایا کافر ہی حقیقت میں ظالم ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کرکے اپنے آپ کو جنت سے محروم کیا ہے اور اگر خدا کے رحم وکرم سے محروم ہوئے ہیں تو اس کے موجب وہ خود ہیں خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا ہے۔

آیت الکرسی کی تفسیر

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ...الآیة

اس آیت مبارکہ کو آیۃ الکرسی کہا جاتا ہے جو قرآن مجید کی ایک عظیم الشان آیت ہے۔ پیغمبر اسلام صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اعظم آیۃ فی لقرآن آیۃ الکرسی'' قرآن کی سب سے بڑی عظمت والی آیت آیۃً الکرسی ہے۔(مجمع البیان)۔

احادیث میں اس کے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں۔ ہر نماز کے تعقیبات میں اس کے پڑھنے کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''من قراء آیۃ الکرسی فی دبر کل صلوۃ مکتوبۃ لم یمنعہ من دخول الجنتہ الا الموت''

جو شخص ہر نماز فریضہ کے بعد آیت الکرسی پڑھے تو اس کے جنت میں داخل ہونے سے صرف موت ہی مانع ہوتی ہے۔(مجمع البیان)

سوتے وقت اس کی تلاوت کرنا فالج کے حملہ سے حفاظت کا باعث ہے(البرہان)

اور حفاظت سفر کیلئے اس کا پانچ مرتبہ پڑھنا مجرب ہے(انوار نعمانیہ)

لفظ اللہ اس ذات کا ذاتی نام ہے جو جامع جمیع صفات ہے اور خدا کی توحید ذاتی وصفاتی پر دلالت کرتی ہے۔ذات پر اس طرح کہ اس نام کا اس کے سوا کسی اور پر اطلاق ہوتا ہی نہیں ہے اور نہ ہی جائز ہے اور صفات پر اس طرح کہ خدا کے جو دوسرے صفاتی نام میں جیسے خالق، رازق اور قادر وغیرہ وہ صرف ایک ایک صفت پر دلالت کرتے ہیں مگر یہ لفظ خدا کی تمام صفات جلال و جمال پر دلالت کرتی ہے۔وہ ایسا حیّ وقیّوم ہے کہ جس سے ہر شئی کی زندگی اور کائنات ارضی وسماوی کی بقاء اور اس کا قیام وابستہ ہے۔اسے موت کیا آئے گی اسے تو نیند بھی نہیں آتی۔اور بھلا نیند کیسے آئے گی۔جبکہ اسے اونگھ بھی نہیں آتی۔زمین ہو یا آسمان یا جو کچھ ان کے درمیان ہے۔

الغرض پوری کائنات اسی کی ملکیت ہے۔اور ان کا حقیقی مالک وہی ہے جو ان کا خالق ہے۔کون ایسا ہے؟ جو اس کی پیشگی اجازت کے بغیر اسکی بارگاہ میں سفارش کر سکے ''لَا يَمۡلِكُوۡنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا'' (سورہ مریم آیت ۔۸۷) سفارش نبی بھی کرینگے۔اور امام بھی، شہداء بھی کریں گے صد یقین بھی علمائے اعلام بھی کریں گے اور عباد اللہ الصالحین بھی۔''اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى'' (سورہ انبیاء آیت ۔۲۸) مگر اسی کی کریں گے جس کے دین و اعتقاد کو خدا پسند کرے گا۔اور پھر اجازت بھی دے گا۔وہ علیم وخبیر وحکیم ہے جو لوگوں کے آگے پیچھے۔ماضی و مستقبل اور حاضر وغائب کے سب حالات وکوائف سے واقف وآگاہ ہے ''وَهُوَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ'' (سورہ حدید آیت ۔۶) اس کا علم ومعلومات اس قدر وسیع بلکہ غیر محدود ہے کہ کوئی بھی مخلوق اس کا علمی احاطہ نہیں کر سکتی مگر اسی قدر جس قدر وہ چاہے اور خود بتلائے۔''عٰلِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ

عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا (۲۶) اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ'' (سورہ الجن) یعنی اللہ ہی عالم الغیب ہے وہ اپنے غائب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر جس رسول کو جتنا چاہتا ہے آگاہ کر دیتا ہے ''قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا'' اس کی کرسی زمین وآسمان کو گھیرے ہوئے ہے۔ (سورہ بقرہ آیت۔ ۳۲)

کرسی کے بارے میں مفسرین اسلام کے درمیان بڑا اختلاف ہے اور اس کے بارے میں مختلف اقوال وآراء پائے جاتے ہیں اگر چہ کرسی بعض احادیث میں ایک ایسے ظرف کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہے جس میں زمین وآسمان اور عرش غرضیکہ اللہ کی ساری مخلوق موجود ہے (کتاب التوحید، بحارالانوار وغیرہ)۔

مگر آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں کرسی بمعنی علم بھی استعمال ہوئی ہے۔ چنانچہ جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت ''و سع کر سیہ السّمٰوٰات و الارض'' کے بارے میں دریافت کیا گیا فرمایا۔ اس سے خدا کا علم مراد ہے۔ (کتاب التوحید، بحارالانوار)

لغت عرب کی کتابوں میں بھی کرسی کے ایک معنی علم لکھے ہیں چنانچہ قاموس ''لسان العرب اور منتھی الارب وغیرہ میں کرسی کے معنی علم ودانش لکھے ہیں۔ (کذافی تفسیر الطبری)۔

بہرحال کرسی الٰہی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ہماری دنیاوی کرسیوں کی قسم سے کوئی چیز ہے جس پر خدا جلوہ افروز ہوتا ہے، انتہائی لغو اور مضحکہ اطفال خیال ہے۔

بہرحال اصل مقصود یہاں اللہ تعالیٰ کے احاطہ علمی کا بیان ہے جیسے معصومینؑ نے فرمایا ہے۔ علامہ علی نقی اعلی اللہ مقامہ نے بالکل بجا لکھا ہے کہ ''واقعہ یہ ہے کہ درحقیقت نہ عرش کے متعلق ہم واقف ہو سکتے ہیں اور نہ کرسی کے بارے میں پورے طور پر کچھ سمجھ یا سمجھا سکتے ہیں۔ (فصل الخطاب)۔

خدا وہ قادر مطلق ہے کہ زمین وآسمان اور عرش وفرش غرضیکہ کل کائنات کی نگہداشت کرنا اور نظام کائنات کا برقرار رکھنا اور اس کا چلانا نہ اسے تھکاتا ہے اور نہ اس پر گراں گزرتا ہے چونکہ وہ برتر ہے اور بڑا عظمت والا ہے۔

دین کے معاملہ میں کوئی جبر واکراہ اور زبردستی نہیں ہے دشمنان اسلام ہمیشہ سے اسلام پر لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کا الزام لگاتے رہتے ہیں۔ مگر قرآن کی تعلیم اور پیغمبر اسلام کی سیرت اس کی رد کے لئے کافی ہیں۔ قرآن واشگاف الفاظ میں اعلان کر رہا ہے کہ ''لا اکراہ فی الدین''، یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے حقیقی جانشینوں کی سیرت مقدسہ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کافر کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا۔ اسلامی جہاد کے احکام اس کا منہ چلتا ثبوت ہیں ہاں اگر کبھی کسی حکمران نے جوع الارض

کے تحت کوئی ایسا اقدام کیا ہے جو اسلام کی اس مقدس تعلیم کے منافی ہے تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہے اور وہی جوابدہ ہے۔ اسلام اور بانی اسلام پر اس کا کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔

علاوہ بریں یہ بات بھی قابل تدبر ہے کہ آیا دین خدا کے معاملہ میں جبر و اکراہ ممکن بھی ہے؟ دین کی بنیاد اعتقاد وایمان پر ہے اور اعتقاد وایمان کا تعلق دل و دماغ سے ہے اور دل و دماغ پر جبر و اکراہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ جبر و اکراہ انسانی اعضاء و جوارح پر ہوسکتا ہے یا اس کے افعال واقوال پر مگر شریعت مقدسہ میں جبر و اکراہ والے افعال واقوال پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی اعتبار رہوتا ہے۔ ہاں حق و باطل جدا جدا ہو چکے ہیں حجت تمام ہو چکی ہے اور حق کی روشنی باطل کے اندھیرے سے نمایاں ہو چکی ہے۔ ''فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ ''(سورہ کہف آیت۔۲۹)' 'وَ مَااللّٰه يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ''(سورہ مومن آیت۔۳۱) پس جو شیطان اور شیطانی قوتوں کا انکار کرے خدا پر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور امام مہدی علیہ السلام پر ایمان لائے گا وہ دین حق اور صراط مستقیم اور قرآن اور عترت اہل بیت علیہم السلام کی اسی مضبوط رسی سے متمسک ہو جائے گا جو قیامت تک ٹوٹ نہیں سکتی اور نہ اس سے تمسک کرنے والا کبھی گمراہ ہو سکتا ہے۔ اور خدا ایسے لوگوں کو توفیق دے گا کہ پہلے تو وہ باطل کے اندھیروں کے قریب ہی نہیں جائیں گے اور اگر جائیں گے تو خدا انہیں اپنی توفیق اور لطف و کرم سے وہاں سے نکال لے گا۔ اور جو خدا کا انکار کرے گا اور شیطان اور شیطانی قوتوں پر اعتماد و بھروسہ کرے گا وہ باطل کے اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا اور ان پر ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا مگر صراط مستقیم پر چلنا اسے نصیب نہ ہوگا......اس سے کوئی کوتاہ اندیش یہ نہ سمجھے کہ خدا اہل ایمان کو ایمان پر یا شیطان اہل کفر کو کفر پر مجبور کرتا ہے۔ بلکہ خدا کا اہل ایمان کو اندھیروں سے ایمان کے اجالوں کی طرف نکالنا اور طاغوت کا اہل کفر و جور دکو ایمان کے اجالوں سے کفر کے اندھیروں کی طرف نکالنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اس کے محرکات مہیا کرتے ہیں اس کے بعد اچھے یا برے راستہ پر چلنے کی ذمہ داری بہر حال راہ رو پر ہی رہتی ہے''و هذا اوضح من ان يخفى، و الحمد لله على وضوح الحقّ و الحقيقة''۔

روایات اہل بیت علیہم السلام سے مندرجہ بالا مطلب کی حرف بحرف تائید مزید ہوتی ہے۔ بروایت ابن عباس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

''من احبّ ان يتمسك بالعروة الوثقىٰ التى لا انفصام لها فليتمسك بولاية اخى ووصى على بن ابيطالب فانه لا يهلك من احبّه و تولاه و لا ينجو من ابغضه و عاداه''

یعنی جو شخص چاہتا ہے کہ اس مضبوط رسی سے تمسک کرے جو ٹوٹنے والی نہیں ہے تو وہ میرے بھائی اور

وصی علی ابن ابیطالب سے تمسک کرے کیونکہ جوان کا محب اور دوست ہے وہ ہلاک نہیں ہوگا اور جوان کا دشمن ہے وہ نجات نہیں پائے گا (معانی الاخبار، تفسیر البرہان)۔

اور ''اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' اور ''وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ'' کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک طویل حدیث کے اندر فرماتے ہیں کہ۔ ''اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا اور رسول کے ساتھ ساتھ اس امام عادل سے محبت رکھتے ہیں جو منصوص من اللہ ہے اور ''وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ'' سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جو ظالم امام (دشمنان اہل بیتؑ) کی امامت کا اقرار کرتے ہیں (تفسیر عیاشی، نور الثقلین، البرہان)۔

مخفی نہ رہے کہ آیت الکرسی ''و هو العلی العظیم'' تک ہے اس کے بعد ''فیها خلدون'' تک علیحدہ دو آیتیں ہیں لہٰذا جہاں مطلقاً آیت الکرسی کا پڑھنا وارد ہو وہاں ''العلی العظیم'' تک پڑھنا کافی ہے۔ ہاں البتہ جہاں ''هم فیها خلدون'' تک پڑھنے کی صراحت موجود ہو جیسے نماز وحشت قبر وغیرہ میں تو وہاں اسے ''هم فیها خلدون'' تک پڑھنا چاہیے۔

آیات القرآن

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔـھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰھٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾

ترجمۃ الآیات

دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے ہدایت گمراہی سے الگ واضح ہو چکی ہے۔ اب جو شخص طاغوت (شیطان اور ہر باطل قوت) کا انکار کرے اور خدا پر ایمان لائے اس نے یقیناً مضبوط رسی تھام لی ہے۔ جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ اور خدا (سب کچھ) سننے والا اور خوب جاننے والا ہے (٢۵٦) اللہ ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لائے وہ انہیں (گمراہی کے) اندھیروں سے (ہدایت کی) روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے سرپرست طاغوت (شیطان اور باطل کی قوتیں) ہیں جو انہیں (ایمان کی) روشنی سے نکال کر (کفر کے) اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہی دوزخی لوگ ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (٢۵٧) کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا (اس کے حال پر غور نہیں کیا) جس نے جناب ابراہیم سے ان کے پروردگار کے بارے میں صرف اس بنا پر بحث و تکرار کی تھی کہ خدا نے اسے سلطنت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا تھا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔ اس (شخص) نے کہا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں (اس پر) ابراہیم نے کہا خدا سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال۔ اس پر کافر مبہوت (ہکا بکا) ہو گیا۔ خدا ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا (ان کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا) (٢۵٨)

تشریح الالفاظ

(١) بالعروۃ الوثقٰی — عروۂ وثقٰی کے معنی ہیں مضبوط رسہ۔

(٢) ولی الذین — ولیّ کے معنی سرپرست کے ہیں

(٣) الطاغوت — اس کے معنی ہیں شیطان اور باطل قوتیں اور ہر سرکش

تفسیر الآیات

جناب خلیل خدا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مناظرہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ...الآیۃ

اس سے پہلے آیۃ الکرسی میں خداوند عالم یہ حقیقت واضح فرما چکا ہے کہ وہ اہل ایمان کا سرپرست اور ان کا حامی و مددگار ہے۔ جو ان کو کفر و ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور کافروں کا سرپرست شیطان اور شیطانی قوتیں ہیں جو ان کو ایمان کی روشنی سے نکال کر کفر و ذلالت کے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ تو وہاں ایک مومن جس کا ولی خدا ہے اور ایک کافر جس کا ولی شیطان تھا کا تذکرہ فرمایا ہے وہ مومن تو بالاتفاق جناب ابراہیمؑ خلیل اللہ تھے مگر وہ کافر کون تھا؟

اگرچہ قرآن نے نام نہیں لیا۔ لیکن اسلامی تاریخوں اور تفسیروں سے ثابت ہے کہ وہ نمرود بن کنعان بن سام بن نوح تھا۔ جو بڑا جبار و قہار بادشاہ تھا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے سر پر تاج رکھا اور پہلا شخص ہے جس نے نشۂ اقتدار میں بدمست ہو کر خدائی کا دعویٰ کیا تھا (مجمع البیان، تفسیر کاشف)۔

جناب خلیل علیہ السلام اور نمرود کے درمیان یہ مکالمہ کب ہوا؟ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہ جناب خلیل علیہ السلام کا بت توڑنے اور آتش نمرودی میں ڈالے جانے سے پہلے کا واقعہ ہے (مجمع البیان)۔

الغرض نمرود نے جناب خلیل خدا سے سوال کیا کہ تمہارا پروردگار کون ہے؟

جناب خلیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو پہلے زندگی عطا کرتا ہے اور پھر مارتا ہے؟

اس پر نمرود نے کج بحثی کرتے ہوئے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ پھر اس نے ایک واجب القتل کو زندان سے بلوا کر آزاد کر دیا۔ اور کہا کہ یہ مردے کو زندہ کرنا ہے۔ اور ایک بے قصور آدمی کو پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور کہا یہ زندہ کو مارنا ہے۔

جناب ابراہیمؑ کا جواب لاجواب تھا اور وہ اس دھاندلی پر احتجاج کر سکتے تھے کہ موت و حیات کا یہ مفہوم غلط ہے۔ بلکہ حیات کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ وہ خود جماد میں جان ڈال کر اسے زندہ اور جاندار بناتا ہے اور موت کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ وہ جسم کو زخم پہنچائے بغیر، اس میں داخل ہوئے بغیر اور اسے توڑے پھوڑے بغیر جسم و روح کا رشتہ قطع کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں وارد ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مر

وہی ہے کہ: جناب خلیل خدا نے فرمایا: اگر تو مردہ کو زندہ کرسکتا ہے تو ذرا اسے زندہ کر کے دکھا دے جسے قتل کیا ہے؟ (مجمع البیان)۔

بہرحال اگر جناب خلیلؑ پہلی دلیل پر زور دیتے اور موت وحیات کے مفہوم کے گورکھ دھندے میں پڑ جاتے تو یہ دور کا راستہ ہوتا اور بات لمبی ہوتی جاتی۔ اس لئے انہوں نے ایک ایسی دوسری دلیل پیش کی جس میں نمرود کی یہ دھاندلی نہ چل سکے۔ فرمایا میرا خدا آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تو اپنی خدائی کے دعوی میں سچا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال کر لا۔ پس اس استدلال پر نمرود مبہوت ہو گیا اور ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ اور جناب خلیل خدا نے میدان مار لیا۔ مگر وہ بدبخت اپنی ہٹ دھرمی سے پھر بھی باز نہ آیا سچ ہے۔ ''لا تغنی الا یات و النذر عن قوم لا یومنون، و ان اللہ لا یھدی القوم الظالمسیں'' واضح رہے کہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق وحقیقت کے اظہار کے لئے اہل باطل سے مناظرہ اور جدال احسن کرنا جائز ہے۔

آیات القرآن

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

ترجمۃ الآیات

یا اسی طرح تم نے وہ آدمی نہیں دیکھا (اس کے حال پر غور نہیں کیا) جو ایک ایسے گاؤں سے گزرا جس کے در و دیوار کا ملبہ اس کی گری ہوئی چھتوں پر گرا پڑا تھا۔ (اپنی چھتوں پر اوندھی

گرا پڑی تھی)۔اس (آدمی) نے (یہ منظر دیکھ کر) کہا اللہ اس گاؤں (اس کے رہنے والوں) کو کیونکر اسکی موت کے بعد زندہ کرے گا؟ اس پر اللہ نے اسے سوسال تک کیلئے موت دے دی۔ پھر اسے زندہ کیا۔اور کہا (پوچھا) تم کتنی دیر اس طرح پڑے رہے ہو؟ کہا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ!۔فرمایا بلکہ تم سوسال پڑے رہے ہو۔ ذرا اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ ذرا بھی خراب نہیں ہوئی ہیں۔(دوسری طرف) ذرا اپنے گدھے کو دیکھو (کہ کس طرح گل سڑ گیا ہے؟) یہ (سب کچھ) اس لئے کیا ہے کہ تمہیں لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کی) نشانی بنائیں۔ اور گدھے کی سڑی گلی ہڈیوں کہ ہم کس طرح انہیں (جوڑ جاڑ کر) کھڑا کرتے ہیں اور پھر کس طرح ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔(اور اسے زندہ کرتے ہیں) جب اس (آدمی) پر یہ بات واضح ہوگئی۔تو (بے ساختہ) کہا میں یقین سے جانتا ہوں کہ اللہ ہر شئی پر قادر ہے۔(۲۵۹)

تشریح الالفاظ

(۱)فبهت یہ بھت سے مشتق ہے جس کے معنی ہکا بکا رہ گیا اور متحیر ہوکر خاموش ہوگیا کے ہیں۔

(۲)خاوية خوی المکان کے معنی ہیں مکان گر گیا

(۳)علی عروشها یہ عرش کی جمع ہے جس کے معنی چھت کے ہیں

(۴)لم یتسنّه باب تفعّل کے مضارع کا صیغہ ہے جس کے معنی سڑنے اور بدبو والا ہونے کے ہیں۔

(۵) کیف ننشزها یہ انشاز سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مردے کی ہڈیوں کو ترکیب دے کر زندہ کرنا

(۶)فصرهن یہ صیرے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی مانوس بنانے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوجانے کے ہیں۔

تفسیر الآیات

اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ......الآیۃ

اسی طرح تم نے وہ آدمی نہیں دیکھا؟ یہ آدمی کون تھا؟ کافر تھا یا مومن' نبی تھا یا صدیق؟ نبی تھا تو کون؟ عزیر یا ارمیا یا خضر؟ پھر وہ گاؤں کونسا تھا؟ بیت المقدس جسے بخت نصر نے تباہ و برباد کیا تھا یا ارض مقدس شام؟ اگرچہ مشہور بیت المقدس ہے مگر اس سلسلہ میں قرآن خاموش نظر آتا ہے مفسرین اسلام میں اختلاف ہے اور جہاں تک روایات اہل بیت علیہم السلام کا تعلق ہے تو بعض میں عزیر اور بعض میں ارمیا وارد ہے مگر مشہور یہ ہے کہ وہ عزیر نبی تھے۔ اور یہی حضرت امیر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اور صاحب تفسیر صافی نے جمع بین الروایات کی یہ صورت پیدا کی ہے کہ شاید یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہو۔ (تفسیر صافی)

تو گویا سابقہ قصہ (خلیل و نمرود) میں ایک کافر نے خدا کے محیؔ و ممیت ہونے کا انکار کیا تھا اور یہاں ایک مومن بلکہ اللہ کے نبی نے اس بات پر اپنی حیرانی ظاہر کی ہے............جو نہ انکار ہے اور نہ خدا کی قدرت پر تعجب کا اظہار بلکہ گاؤں کی خستہ حالی دیکھ کر صرف اپنے تحیر کا اظہار ہے اور آنکھوں سے مردہ کو زندہ ہوتے دیکھنے کی استدعا ہے اور یہ چیز کسی مومن کے ایمان اور کسی نبی کی نبوت کے منافی نہیں ہے پھر وہی واقعہ رونما ہوا جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ خداوند عالم نے اسے موت دے دی۔ اور وہ ایک سو سال تک مردہ حالت میں پڑے رہے چونکہ یہ واقعہ دن کے آغاز میں ہوا تھا اور جب سو سال کے بعد خدا نے ان کو زندہ کیا تو اس وقت دن کا آخری وقت تھا اس لئے جب خدا نے پوچھا کہ تم کتنا عرصہ اس طرح پڑے رہے ہو؟ تو کہا ایک دن پھر دیکھا کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا۔ تو کہا نصف دن یا دن کا ایک حصہ۔

قادر مطلق نے اپنی قدرت کا کرشمہ یوں دکھایا کہ جو چیزیں جلدی خراب ہونے والی تھیں یعنی خورد و نوش کی اشیاء ان کا تو ذائقہ بھی نہیں بدلا تھا اور جو چیز مضبوط اور توانا تھی یعنی گدھا اس کی ہڈیاں بھی سڑ گل گئی تھیں پھر خدائے قدیر نے اپنی قدرت کاملہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا کیا۔ بعد ازاں ان پر گوشت پوست چڑھایا۔ اور گدھا زندہ ہو گیا۔ جب واپس پہنچے تو باپ پچاس سال کا تھا اور بیٹا سو سال کا۔

ابن کوا نے حضرت امیر علیہ السلام سے سوال کیا کہ آیا دنیا میں اس بات کی کوئی مثال ملتی ہے کہ بیٹا باپ سے بڑا ہو؟

فرمایا: ہاں جب عزیر گھر سے نکلے تو ان کی عمر پچاس سال تھی اور ان کی بیوی حاملہ تھیں۔ پھر انہیں وہ و

اقعہ پیش آیا جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ خدا نے انہیں سو سال تک مردہ حالت میں رکھا۔ پھر زندہ کیا۔ لہٰذا وہ واپس اپنے گھر میں پہنچے تو ان کی عمر پچاس برس تھی اور بیٹا (عزیز) سو سال کا تھا۔ اس طرح خداوند قدیر نے ان کو اپنی قدرت کی ایک نشانی بنایا (تفسیر صافی، برہان و بحار الانوار)۔

درس عبرت

اس واقعہ میں یہ درس مضمر ہے کہ جب کوئی عقلمند کوئی ایسی چیز دیکھے جس کی حقیقت سمجھنے سے اس کی عقل قاصر ہو۔ یا کسی عالم سے کوئی ایسی بات سنے یا کسی کتاب میں کوئی ایسی بات پڑھے جس سے وہ متفق نہ ہو تو اسے اس کا جلد انکار نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اسکی تحقیق و جستجو کرنی چاہیے۔ خداوند عالم نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو ہر اس بات کا انکار کر دیتے ہیں جسے سمجھنے سے ان کی عقل قاصر ہوتی ہے بل کذبو ابما لم یحطو ابعلمہ و نعم ما قال المتنبی

وکم من عائب قولاً صحیا

وآ فتہ من الفہم السقیم

(یعنی کئی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو صحیح بات کو غلط کہہ دیتے ہیں حالانکہ وہ بات غلط نہیں ہوتی بلکہ ان کا اپنا دماغ خراب ہوتا ہے)۔

آیات القرآن

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ
قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ
اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ
سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ
اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ
سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾
اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا

مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۲۶۲

ترجمۃ الآیات

(اے رسولؐ) وہ واقعہ یاد کرو۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ اے پروردگار! مجھے دکھلا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے؟ خدا نے فرمایا۔ کیا تمہارا (اس پر) ایمان نہیں ہے؟ کہا۔ کیوں نہیں؟ (ایمان تو ہے) مگر چاہتا ہوں کہ (آنکھوں سے دیکھوں) تا کہ (دل) کو اطمینان ہو جائے (اور اسے قرار آئے) فرمایا چار پرندے لو۔ اور انہیں اپنے پاس اکٹھا کرو اور اپنے سے مانوس بناؤ۔ پھر (انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے) ہر پہاڑ پر ایک ٹکڑا رکھ دو۔ پھر انہیں آواز دو۔ تو وہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے اور خوب جان لو کہ خدا زبردست اور حکمت والا ہے (۲۶۰) جو لوگ خدا کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس ایک دانے کے مثل ہے جس نے (اپنے بوئے جانے کے بعد) سات بالیاں اگائیں اور ہر بالی میں سو دانے ہیں اور خدا جس کے لئے چاہتا ہے اور بڑھا دیتا ہے (دونا کر دیتا ہے) خدا بڑی وسعت والا اور بڑا جاننے والا ہے۔ (۲۶۱) جو لوگ راہ خدا میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ ایذا پہنچاتے ہیں ان کا اجر و ثواب ان کے پروردگار کے یہاں ہے نہ انہیں کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۲۶۲)

تشریح الالفاظ

(۱) سنبلہ	اس کی جمع سنابل ہے جس کے معنی گیہوں یا جو کی بالی کے ہیں
(۲) منّ	اس کے معنی احسان جتلانے کے ہیں

تفسیر الآیات

حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے مردہ کو زندہ کر کے دکھانے کی استدعا کیوں کی؟

واذقال ابراھیم......الآیۃ

باوجود یکہ جناب ابراہیم علیہ السلام نبی تھے حیات بعد الموت پر یقین رکھتے تھے۔ خدا کی قدرت کاملہ پر مکمل ایمان رکھتے تھے۔ پھر یہ سوال کیوں کیا؟ پروردگار مجھے آنکھوں سے دکھا کہ تو کیونکر مردے زندہ کرتا ہے؟ مفسرین اسلام نے اس سوال کے دس بارہ جواب دیئے ہیں لیکن یہاں طویل بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

ایک بار جناب ابراہیم علیہ السلام ایک مردار کے پاس سے گذرے جو سمندر کے کنارے پڑا تھا۔ جس کے بدن کا کچھ حصہ سمندر میں تھا اور کچھ خشکی میں پڑا تھا جو حصہ باہر تھا اسے خشکی کے جانور اور جو پانی میں تھا اسے سمندر کے جانور چیر پھاڑ کر کھا رہے تھے۔ یہ عجیب وغریب منظر دیکھ کر جناب ابراہیم علیہ السلام نے کہا یا اللہ! یہ تو میں جانتا ہوں کہ تو اسے درندوں، پرندوں اور سمندری جانوروں کے پیٹیوں سے نکالے گا۔ (اور زندہ کرے گا) مگر مجھے آنکھوں سے دکھا کہ تو اسے کس طرح زندہ کرے گا۔ خدا نے پوچھا کیا تیرا اس پر ایمان نہیں ہے؟۔ عرض کیا ایمان تو ہے۔ مگر چاہتا ہوں کہ قلبی اطمینان بھی حاصل ہو جائے۔ (مجمع البیان)۔

مخفی نہ رہے کہ یہ مشاہدہ کا سوال ایمان بالغیب کے منافی نہیں ہے کیونکہ استدلالی و برہانی علم میں شک وشبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے مگر عیانی ومشاہداتی علم وایمان میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چھوٹا بڑا مومن جو غیب پر ایمان رکھتا ہے وہ آنکھوں سے مشاہدہ کی خواہش رکھتا ہے۔ ہاں پوری کائنات میں ایک حضرت امیر علیہ السلام کی ہستی ایسی نظر آتی ہے جو اعلان کرتی ہے کہ لو کشف الغطاء لما از ددت یقینا۔ (واجب وممکن کے درمیان والے قدرت کے) حجاب ہٹ بھی جائیں تو میرے ایمان وطمینان میں اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ (تفسیر کاشف)۔

اس پر خدا نے فرمایا کہ چار پرندے پکڑو۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ چار پرندے یہ تھے

(۱) طاؤس (۲) مرغ (۳) کبوتر اور (۴) ہدہد۔

پھر ان کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرو اور ان کو آپس میں ملاؤ اور پھر دس پہاڑوں پر رکھو۔ مگر

ان کے سر اپنے پاس رکھو۔ پھر ان کے نام لے کر ان کو آواز دو وہ دوڑ کر باذن اللہ تمہارے پاس آ جائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ اجزاء اسم اکبر کی برکت سے اپنے اپنے سروں سے پیوست ہو گئے۔ اور جناب ابراہیم علیہ السلام ایمان کی دولت کے ساتھ ساتھ اطمینان کی دولت سے بھی مالا مال ہوئے اور فرمایا: ''اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ''۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''جب وہ پرندے باذن اللہ زندہ ہو گئے تو جناب خلیل خدا سے کہا یا بنی اللہ احییتنا احیاك اللہ۔ اے اللہ کے نبی! آپ نے ہمیں زندہ کیا ہے خدا آپ کو زندہ رکھے۔

یہ سنکر جناب خلیل علیہ السلام نے فرمایا ''بَلِ اللّٰهُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' بلکہ خدا مارتا اور جلاتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ (تفسیر البرہان)۔

اس واقعہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خدا ہوتا ہے جسے وہ نبیؐ و امامؑ کے ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے ایک اور روایت کے مطابق اس سوال و جواب کی وجہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے جناب ابراہیم علیہ السلام کو خبر دی کہ میں اپنے بندوں میں سے ایک بندہ کو اپنا خلیل بنانے والا ہوں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر وہ مجھ سے دعا کرے گا تو میں اس کی استدعا پر مردے کو زندہ کروں گا اور جناب ابراہیم علیہ السلام نے اس لئے یہ دعا و استدعا کی کہ اطمینان ہو جائے کہ واقعاً وہی خلیل خدا ہیں۔ (تفسیر برہان و ثقلین وغیرہ)۔

نیچریوں کے ایک خیال کا ابطال

بعض نیچری حضرات نے اس آیت کی یہ تاویل کی ہے کہ تم چار پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کر لو پھر ایک ایک پرندہ الگ الگ پہاڑوں پر بٹھا دو پھر انہیں اپنی طرف بلاؤ۔ وہ فوراً تمہاری طرف چلے آئینگے۔ تو جس طرح تم سے مانوس پرندے تمہارے بلانے پر تمہارے پاس آ گئے اسی طرح جب رب العالمین ان منتشر اجزاء کو قیامت کے دن بلائے گا تو یہ اجزاء اکٹھے ہو کر اس کے پاس آ جائیں گے۔ ان حضرات نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ بھلا زندہ پرندوں کا مانوس کر کے بلانا کجا اور مردہ و پراگندہ اجزاء کا اکٹھا ہونا اور ان میں روح کا پھونکا جانا کجا؟ اس طرح تو یہ نہ منتشر اجزاء جمع ہوئے اور نہ کوئی مردہ زندہ ہوا۔ پھر اس سے قیامت کے منکر کی کیونکر تسکین قلب ہو گی؟ جسے پراگندہ اجزاء کے جمع ہونے اور ان کے از سر نو زندہ ہونے کا انکار ہے''۔ (ضیاء القرآن)

قادر مطلق نے ان واقعات کے ذریعہ سے آخرت سے پہلے اسی دنیا میں حیات بعد الموت کا مشاہدہ کر

ادیا ہے۔اور بتادیا ہے کہ وما ذلك على الله بعزيز۔

نیز ان واقعات سے عقیدہ رجعت کے ممکن الوقوع ہونے پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے۔کہ جب پہلی امتوں میں ایسا ہو چکا ہے تو اگر اس امت میں بھی ایسا ہو جائے تو اس میں کیا جائے تعجب ہے؟ جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو کچھ پہلی امتوں میں ہو چکا ہے وہ بے کم وکاست اس امت میں بھی واقع ہو کے رہے گا۔(تفسیر درمنثور)۔

راہ خدا میں مال خرچ کرنے کا بے پایاں ثواب

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ......الآية

بعض بالغ النظر اہل تفسیر کے قول کے مطابق قرآنی تعلیمات تین محوروں کے ارد گرد گھومتی ہیں۔

۱۔اسلامی دعوت کی نشر واشاعت۔

۲۔جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ۔

۳۔اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب۔

چنانچہ قبل ازایں بہت سی آیات گذر چکی ہیں جن میں جہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے اور کچھ اس کے بعد بھی آئیں گی۔اور یہاں دس سے زیادہ آیات مبارکہ میں راہ خدا میں (جن میں سے ایک بہترین راستہ جہاد بھی ہے) مال ومنال خرچ کرنے، صدقہ وخیرات دینے اور مستحقین کی امداد واعانت کرنے کی فضیلت واہمیت بیان کی گئی ہے۔اور مختلف طریقوں سے راہ خدا میں مال صرف کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔مثلاً یہ کہ فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے والوں کو سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ معاوضہ دینے کی خوشخبری دی گئی ہے، لیکن صدقہ وخیرات دینے کے بعد سائل کو احسان جتلانے اور اسے اذیت پہنچانے کی ممانعت کی گئی ہے، کہیں مال خرچ کرنے والوں کو خالصاً لوجہ اللہ عطا وبخشش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کہیں پاک و پاکیزہ کمائی اور پسندیدہ مال سے راہ خدا میں صرف کرنے کا امر کیا گیا ہے۔اور ردی وحرام مال صرف کرنے کی مناہی کی گئی ہے۔(تفسیر کاشف)۔

یہاں ہماری متعلقہ آیت نمبر ۲۶۱ میں خدائے رحیم وکریم نے اپنی راہ میں مال صرف کرنے والوں کو اس دانہ سے تشبیہ دی ہے جسے زمین میں کاشت کیا جائے اور وہ سات بالیاں اگائے۔اور ہر ہر بالی میں ایک ایک سو دانہ ہو۔اس طرح ایک کے عوض سات سو ہو جائیں گے پھر فرمایا ہے اگر خدا چاہے گا تو اسے اور بھی بڑھا دے گا اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چاہے تو اس سات سو کو دوگنا یعنی چودہ سو بھی کر سکتا ہے (مجمع البیان)

اور یہ اضافہ خلوص نیت کی نوعیت اور موقع ومحل کی مناسبت سے ہوتا ہے۔سوال کیا جاتا تھا کہ آج تک کوئی ایسا دانہ نہیں دیکھا گیا۔ جوایسی سات بالیاں اگائے۔اور بعض مفسرین نے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ یہ بیان صرف معاوضہ کی کثرت سے کنایہ ہے اور بعض نے جواب میں یہ کہا کہ یہ صرف ایک مجاز ہے اور اس سے راہ خدا میں مال صرف کرنے والوں کو اتنے بڑے معاوضہ کی یقین دہانی کرا کے انہیں مال خرچ کرنے کا شوق دلانا مقصود ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اپنے اپنے دور کے مطابق زراعت کو دیکھ کر یہ جوابات دیئے ہیں کہ جب بیل سے ہل چلائے جاتے تھے اور کسی سے کام کیا جاتا تھا اور روایتی بیج بوئے جاتے تھے۔اگر وہ آج کے اس سائنسی دور میں ہوتے جس میں ہر شعبہ حیات کی طرح زراعت بھی اس قدر ترقی کر گئی ہے کہ ہل کی جگہ ٹریکٹر نے' گوبر کی جگہ کھادنے اور عام روایتی بیجوں کی جگہ اعلیٰ بیجوں نے لے لی ہے اور اب من کی جگہ ٹن پیدوار ہو رہی ہے تو وہ ہرگز نہ تعجب کرتے اور نہ یہ کمزور جواب دیتے۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت مبارکہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''جب کوئی شخص اپنے عمل کو احسن طریقہ پر بجالاتا ہے تو خدا اس کے عمل کو سات سوگنا کر دیتا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔''وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ''

لہٰذا تم ثواب کی خاطر احسن طریقہ عمل بجالاؤ۔

عرض کیا گیا وہ طریقہ کیا ہے؟

فرمایا: جب نماز پڑھو تو اس کے رکوع وسجود احسن طریقہ پر ادا کرو اور جب روزہ رکھو تو مبطلات روزہ سے اجتناب کرو۔اور جب حج کرو تو ہر اس کام سے احتراز کرو جو حج وعمرہ میں حرام ہے الغرض تمہارا ہر ہر عمل ہر ہر میل کچیل سے صاف وشفاف ہونا چاہیے''۔(عیاشی'صافی'برہان)

صدقہ وخیرات دے کر احسان جتانے سے اجر ضائع ہو جاتا ہے

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ...الآية

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم صدقہ وخیرات دینے والوں کو فہمائش کر رہا ہے کہ صدقہ دے کر احسان جتلانے' ایذا پہنچانے اور دل دکھانے سے تو بہتر یہ ہے کہ اچھی اور نرم بات کر کے سائل کو ٹال دیا جائے اور اگر وہ سوال کرنے پر اصرار کرے۔یا کچھ نہ دے جانے پر وہ کچھ تلخ کلامی کرے اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرے تو اس سے درگذر کیا جائے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مروی ہے فرمایا:

''جب تک سائل کا سوال مکمل نہ ہو جائے تب تک اسے نہ ٹوکو ہاں سوال مکمل ہونے کے بعد اسے کچھ دے کر فارغ کرو۔ یا احسن طریقہ سے اسے (خالی ہاتھ) واپس لوٹاؤ'' (تفسیر کاشف)۔

مخفی نہ رہے کہ ''ان آیات میں اس قدر ثواب کا اعلان اور اس قدر ترغیب وتحریص۔ یہ سب باتیں پتہ دیتی ہیں کہ یہ سب کچھ مستحبی صدقہ وخیرات سے متعلق ہے ورنہ جو چیز واجب ہے اس کے ترک کے متعلق تو صرف یہ اعلان ہی کافی ہوتا ہے کہ جو اسے ترک کرے گا وہ عذاب خداوندی اور غضب الٰہی میں گرفتار ہوگا اسے اس قدر اجر وثواب بیان کر کے اس کام پر آمادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی'' (فصل الخطاب)

آیات القرآن

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ
حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ
كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا
يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾
وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ
اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ
فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

ترجمۃ الآیات

(سائل کو) اچھائی سے جواب دینا اور بخش دینا، اس صدقہ وخیرات سے بہتر ہے جس کے بعد (سائل کو) ایذا پہنچائی جائے۔ اور اللہ بے نیاز اور بڑا بردبار ہے۔ (۲۶۳) اے ایمان والو! (سائل کو) احسان جتلا کر اور ایذا پہنچا کر اپنے صدقہ وخیرات کو اس شخص کی طرح اکارت وبرباد نہ کرو۔ جو محض لوگوں کو دکھانے کیلئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں

رکھتا۔اس کی (خیرات کی) مثال اس چکنی چٹان کی سی ہے جس پر کچھ خاک پڑی ہوئی ہو اوراس پر بڑے دانے والی زور کی بارش برسے اور (خاک کو بہا کر لے جائے) اور اس (چٹان) کوصاف چکنا چھوڑ جائے۔اسی طرح یہ (ریاکار) لوگ جو کچھ (صدقہ وخیرات و غیرہ) کرتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا اور خدا کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کر تا (انہیں منزل مقصود تک نہیں پہنچا تا) (۲۶۴) اور جو لوگ خدا کی خوشنودی کے لئے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ اپنے مال (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس (ہرے بھرے اور گھنے) باغ کی مثل ہے جو کسی اونچی جگہ پر ہو۔جس پر بڑی بڑی بوندوں والی زور کی بارش برسے اور وہ دوگنا پھل دے۔اور اگر اس پر بڑے قطروں والا زور کا مینہ نہ برسے تو پھر ہلکی پھلکی بارش ہی کافی ہے تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اسے خدا دیکھ رہا ہے (۲۶۵)

تشریح الالفاظ

(۱)صفوان	اس کے معنی ہیں سخت بڑا پتھر
(۲)وابل	اس کے معنی ہیں بڑے بڑے قطروں والی بارش
(۳)صلدًا	اس کے معنی ہیں سخت چکنا پتھر اور بنجر زمین
(۴)زبوۃ	اس کے معنی ٹیلہ کے ہیں
(۵)طلّ	اس کے معنی ہیں ہلکی بارش

تفسیر الآیات

خیرات کر کے احسان جتلانے اور سائل کا دل دکھانے والوں کی مثال

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا ......الآية

سابقہ آیات میں خداوند عالم بیان فرما چکا ہے کہ اس سے اجر وثواب کے حصول کی شرط یہ ہے کہ یہ کام خلوص نیت کے ساتھ خالصا لوجہ اللہ کیا جائے' شکرانہ نعمت کے طور پر کیا جائے۔نہ سائل کو احسان جتلایا جائے اور نہ ہی اسے ایذا پہنچائی جائے اور نہ ہی اسکا دل دکھایا جائے۔یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد ان مطالب کی

مزید وضاحت کی خاطر خداوند عالم نے صدقہ وخیرات کر کے احسان جتانے والوں یا کڑوے کسیلے جملے کہہ کر سائل کا دل دکھانے والوں کی مثال اس منافق ریاکار شخص سے دی ہے جو مال خرچ کرتا ہے' صدقہ وخیرات کرتا ہے' مگر خدا کی خوشنودی اور حصول ثواب کی خاطر نہیں بلکہ نام ونمود کے لئے کرتا ہے اور لوگوں کی مدح وثناء سننے کیلئے کرتا ہے اس کی یہ روش ورفتار بتاتی ہے کہ گویا وہ خدا اور یوم جزاء پر ایمان نہیں رکھتا۔ ورنہ اگر وہ خدا اور یوم جزاء کا صحیح تصور رکھتا ہوتا تو وہ اس کے مقابلہ میں کسی اور مقصد کو پیش نظر رکھ نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا اس کی مثال اس چکنے پتھر کی سی ہے جس پر کچھ خاک پڑی ہو اور پھر اس پر بڑی بڑی بوندوں والی بارش برس جائے اور اسے صاف کردے اور کچھ بھی باقی نہ بچے ایسے لوگوں کا اور دکھاوے کے ارادے سے نیکی کے کام کرنے والوں کا یہی انجام ہوگا۔ اور اپنے اعمال کا وہ ذخیرہ جس سے وہ امیدیں وابستہ کئے بیٹھے تھے وہ سب اکارت ہو جائے گا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

''حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جو شخص کسی بندہ کے ساتھ بھلائی کرے اور پھر کچھ کلام کر کے اسے ایذا پہنچائے یا احسان جتلائے تو اس نے اپنا صدقہ رائیگاں کر دیا۔ اور وہ اس ریاءکار کی مانند ہے جس کی خدا نے قرآن میں مثال پیش کی ہے''۔

ابن عباس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں فرمایا:

''جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو خداوند عالم کی جانب سے ایک منادی تمام اہل محشر کو سنا کر اعلان کرے گا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو (ریاءکاری کرکے) لوگوں کی عبادت کرتے تھے۔ وہ کھڑے ہو جائیں اور اپنے اعمال کا ثواب ان لوگوں سے حاصل کریں۔ جن کی خاطر وہ عمل کرتے تھے میں تو کبھی ایسے عمل کو قبول نہیں کرتا جس میں دنیا اور دنیا والوں کی آمیزش ہو'' (تفسیر البیان)۔

خلوص نیت کے ساتھ راہ خدا میں مال خرچ کرنے والوں کی مثال:

وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ...الآیۃ

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے ریاکاری اور دکھلاوے کا صدقہ وخیرات کرنے کی چکنی چٹان اور اس کی محنت کے رائیگاں جانے والی مثال پیش کرنے کے بعد اس کے مقابلہ میں خوشنودی خدا اور خلوص نیت کے ساتھ خیرات کرنے والوں کی مثال پیش کی ہے جن کی صدقہ وخیرات کرنے سے ایک غرض تو یہ ہوتی ہے کہ خداوند کریم ان پر راضی ہو جائے اور دوسری غرض یہ ہوتی ہے کہ راہ خدا میں اپنی پسندیدہ اور پیاری چیز خرچ

کرنے کا ان کے دل و دماغ پر ملکہ راسخہ پیدا ہو جائے اور انفاق فی سبیل اللہ کی لذت سے دل آشنا ہو جائے۔ نہ احسان کر کے احسان جتلاتے ہیں اور نہ آزار پہنچاتے ہیں بلکہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر ضمیر کی پوری قوت اور اپنی پوری جرات سے یہ کام بجالاتے ہیں مثال میں باغ کے ٹیلے پر ہونے کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ ایسا باغ زیادہ سرسبز و شاداب ہوتا ہے اور گندے پانی و سیلاب سے محفوظ ہوتا ہے۔ جو موسلا دھار بارش برسنے سے دوگنا پھل دیتا ہے اور اگر وہ نہ برسے تو ہلکی پھلکی بارش ہی اس کیلئے کافی ہوتی ہے درحقیقت بارش کی اس تمثیل میں صدقہ و خیرات کی زیادتی اور کمی کی طرف اشارہ ہے۔ کہ زیادہ مقدار میں خیرات کی جائے تو وہ بڑے قطروں والی بارش کی مانند ہے جس سے پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور اگر تھوڑی مقدار میں کی جائے تو بے شک پیداوار کم ہوگی، مگر بے کار نہیں جائے گی آخرت میں ضرور فائدہ ہوگا۔ کیونکہ خلوص و نیک نیتی کے ساتھ جو تھوڑا سا مال راہ خدا میں خرچ کیا جائے تو وہ بھی ثمرات آخرت کا موجب ہوتا ہے۔

آیات القرآن

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ
ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝٢٦٦ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ
طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا
الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝٢٦٧ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ
بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ۝٢٦٨ ۖ

ترجمۃ الآیات

تم میں سے کوئی بھی یہ بات پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں، انگوروں کا ہرا بھرا گھنا باغ ہو جس کے نیچے نہریں جاری ہوں اور اس کے لئے اس میں ہر قسم کے پھل اور میوے موجود ہوں اور اسے بڑھاپا گھیر لے جبکہ اس کی (چھوٹی چھوٹی) کمزور و ناتواں اولاد ہو اور اچانک اس (باغ) کو ایک ایسا بگولہ اپنی لپیٹ میں لے لے جس میں آگ ہو جس سے وہ باغ جل کر رہ جائے۔ اس طرح خدا تمہارے لئے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم غور و فکر کرو۔ (۲۶۶) اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے پاک و پاکیزہ چیزوں سے اور ان چیزوں سے جو ہم نے زمین سے تمہارے لئے برآمد کی ہیں (خدا کی راہ میں) خرچ کرو۔ اور اس میں سے بری اور خراب چیز کے خیرات کرنے کا ارادہ بھی نہ کرو۔ جبکہ خود تم ایسی چیز کے لینے پر (خوشی سے) آمادہ نہیں ہو۔ مگر یہ کہ مروت کی وجہ سے چشم پوشی سے کام لو۔ اور خوب جان لو کہ خدا بے نیاز ہے اور حمد و ستائش کے قابل ہے۔ (۲۶۷) شیطان تمہیں مفلسی اور تنگدستی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی و غلط کاری کا تم کو حکم (ترغیب) دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور اپنے فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے خدا بڑی وسعت والا اور بڑا جاننے والا ہے (۲۶۸)

تشریح الالفاظ

(۱) اِعصار — اس کے معنی ہیں بگولہ۔

(۲) تیمّموا — تیمّم کے معنی ہیں قصد و ارادہ کرنا

(۳) تغمضوا — اغماض کے معنی ہیں چشم پوشی کرنا

(۴) الفحشاء — اس کے معنی ہیں بہت سخت قبیح گناہ

تفسیر الآیات

خلاف شرائط مال خرچ کرنے والوں کی مثال

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ......الآية

مذکورہ بالا شرائط کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے خیر خیرات کے باطل و مردود ہونے کا بیان ایک مثال میں واضح کیا گیا ہے انسان زندگی میں اسی لئے مختلف پودے لگاتا ہے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔ لہٰذا ایک آدمی کھجور وانگور کے باغات لگائے، ان کے نیچے نہریں جاری کرے۔ تاکہ بڑھاپے کے وقت آرام و سکون سے ان کا پھل کھائیگا اور اسے فروخت کرکے اپنی ضروریات زندگی پوری کرے گا۔ بالخصوص جبکہ اس کی کمزور وناتواں صغیر اولاد بھی ہو اور وہ مطمئن ہو کہ اسے اپنی اور ان کی روزی کے لئے کوئی تردد نہیں ہوگا اور اب جبکہ اس کا بڑھاپا آجائے، اور وہ کمانے کے قابل نہ رہ جائے اور اسکے کمزور اہل وعیال بھی ہوں۔ اور اس کے وہ باغات جو خوب پھل پھول رہے تھے، اچانک ایک آتشیں بگولہ آئے اور اس کی عمر بھر کی کمائی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنادے اس حالت میں اس شخص کو کس قدر صدمہ پہنچے گا اور کس قدر سخت تکلیف و پریشانی ہوگی۔ اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ہے یہی کیفیت ریاکاری اور دکھلاوے کی خیرات کرنے یا احسان جتانے اور ایذاء پہنچانے والی کی ہے کہ اس کی یہ سخاوت دنیا میں تو چار دن خوب بہار دکھاتی رہی، نام روشن ہوا، شہرت ملی، لوگوں نے خوب تعریفیں کیں۔ مگر جب ضرورت کا وقت آیا، یعنی قیامت آئی تو یہ سارا باغ جل کر خاکستر ہوگیا۔ اور سارے اعمال ھباء منثورا ہو گئے۔

مخفی نہ رہے کہ یہ مثال جس طرح دکھلاوے کے صدقہ وخیرات پر صادق آتی ہے اسی طرح ان تمام اعمال وعبادات پر بھی صادق آتی ہے جن میں قصد قربت اور خلوص نیت نہ ہو۔ ''وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ'' (سورہ بینۃ آیت۔۵) تو اس وقت اس شخص کی حسرت وندامت اور پریشانی و پشیمانی کا کیا عالم ہوگا؟ لہٰذا اگر کوئی شخص اس صورت سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تو اسے چاہیے کہ اپنے اعمال کو ریاکاری، احسان جتلانے، ایذاء پہنچانے، کفر وشرک کرنے اور منافقت کرنے سے بچائے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

جو شخص خوشنودی خدا کی خاطر صدقہ دے اور پھر احسان جتائے یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے

بارے میں خدافرماتا ہے"ایود احدکم الایة"۔(تفسیرنورالثقلین)۔

راہ خدا میں حلال و پاکیزہ مال خرچ کرنے کا حکم اور حرام اور ردی مال خرچ کرنے کی ممانعت

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا ......الآیة

اس آیت مبارکہ کی شان نزول کے سلسلہ میں حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ لوگ سود اور دیگر ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت خیرات کرتے تھے اور کچھ لوگ صدقہ وزکوٰۃ میں ردی کھجوریں دیتے تھے۔ تو اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اپنی پاکیزہ کمائی اور زمین کے حاصل سے پاک آمدنی راہ خدا میں خرچ کرو۔(مجمع البیان) لہٰذا حرام چیز کی خیرات کرنا حرام ہے اور ایسی ردی اور ناپسندیدہ چیز جسے آدمی خود کسی سے لینا پسند نہ کرے اسے راہ خدا اور زکوۃ میں دینا ناپسندیدہ فعل ہے ارشاد قدرت ہے:

"لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ" جب تک اپنی پسندیدہ چیز کو راہ خدمیں خرچ نہیں کرو گے تب تک نیکی کو نہیں پاسکو گے۔(سورہ آلِ عمران آیت۔ ۹۲)

گویا اس پورے رکوع میں راہ خدا میں مال خرچ کرنے اور اسے مقبول بارگاہ بنانے کے شرائط بیان کئے گئے ہیں۔ جو کل چھ شرائط ہیں۔

۱۔حلال اور پاکیزہ مال کا خرچ کرنا۔ ۲۔مسنون طریقہ پر خرچ کرنا۔
۳۔صحیح مصرف میں صرف کرنا۔ ۴۔خیرات کر کے احسان نہ جتلانا
۵۔سائل کو ایذا نہ پہنچانا۔ ۶۔خلوص نیت کے ساتھ خالصتاً لوجہ اللہ خرچ کرنا ریا، نام و نمود اور نمائش کیلئے خرچ نہ کرنا۔

پس جب یہ شرطیں پائی جائیں تو پھر یقیناوہ صدقہ وخیرات بارگاہ خدا میں مقبول ہوگا۔ خواہ وہ مال کسی صنعت وحرفت سے حاصل کیا ہو یا تجارت وزراعت سے یا ہدیہ اور وراثت وغیرہ ذرائع آمدنی سے اگرچہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے صدقہ دینا وخیرات کرنا افضل ہے"وان اللہ لا یضیع اجر المحسنین"۔

شیطان کی کج رفتاری و ناہنجاری کا تذکرہ

اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ......الآیة

شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ آدمی کے دل ودماغ میں وسوسہ ڈال کر اسے نیک کام کرنے اور راہ خدا میں مال خرچ کرنے سے روکتا ہے اور آدمی کو یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ اگر راہ خدا میں مال خرچ کر دیا تو نادار ہو جاؤ گے اور خود کیا کھاؤ گے؟ اہل وعیال کو کیا کھلاؤ گے؟ اور مہمان نوازی کس طرح کرو گے؟ اور مزید برآں بخل کو کفایت شعاری وغیرہ کے عمدہ نام سے پیش کرتا ہے قرآن نے بخل کو فحشاء (بے حیائی) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا بے حیائی ہوگی کہ انسان خود تو عیش وعشرت کر رہا ہو اور اپنے غریب بھائی کی اعانت کرنے کا خیال بھی نہ کرے۔ مگر اللہ تعالیٰ کار ہائے خیر میں مال ودولت خرچ کرنے کی رغبت دلاتا ہے اور بخشش گناہ اور نعم البدل عطا کرنے کا وعدہ فرماتا ہے ارشاد قدرت ہے:

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا" ان لوگوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو تاکہ اس کی وجہ سے ان لوگوں کو گناہوں سے پاک کرو۔ (سورہ توبہ آیت ۱۰۳)

اور

"وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ" تم جو کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرو گے، خدا تمہیں اس کا بدل دے گا کیونکہ وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ (سورہ سبا آیت۔ ۳۹)

آیات القرآن

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ
وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ
مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا
الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾
لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ
خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

ترجمۃ الآیات

جسے وہ چاہتاہ حکمت ودانائی عطا فرماتا ہے اور جسے (منجاب اللہ) حکمت عطا ہوئی' بے شک اسے درحقیقت خیر کثیر (بڑی دولت) مل گئی۔ عقلمندوں کے سوا کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا۔ (۲۶۹) اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو یا منت مانتے ہو تو یقینا اللہ اسے جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ (۲۷۰) اگر تم اپنی خیرات علانیہ طور پر دو تو بھی اچھا ہے اور اگر اسے پوشیدہ رکھو اور حاجتمندوں کو دو تو وہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور تمہارے کچھ گناہوں اور برائیوں کا کفارہ ہو جائے گا (انہیں مٹا دے گا)۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۲۷۱) (اے رسول!) ان لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچانے کی آپ پر ذمہ داری نہیں ہے (تمہارا فرض صرف راستہ دکھانا ہے) اللہ جسے چاہتا ہے منزل مقصود تک پہنچاتا ہے اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو تو وہ تمہارے اپنے (فائدہ) کے لئے ہے اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو وہ اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتے ہو اور تم جو مال و دولت خیرات میں دو گے۔ وہ پورا پورا تمہیں ادا کر دیا جائے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۲۷۲)

تشریح الالفاظ

(۱) یکفّر عنکم یہ تکفیر سے ہے جس کے معنی ہیں معاف کرنا

(۲) سیّاٰتکم یہ سیّئۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں گناہ اور برّائی کے ہیں

تفسیر الآیات

خیر کثیر والی حکمت کا مفہوم؟

یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ...الآیۃ

جسے وہ چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے یہاں حکمت سے کیا مراد ہے؟

اس لفظ کا اطلاق کئی معنوں پر ہوا ہے۔

۱۔مصلحت

۲۔موعظ

۳۔علم وفہم (وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ)

۴۔نبوت (وَاٰتَیْنٰهُ الْحِکْمَۃَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ)

۵۔علم الفقه

۶۔تمام دینی علوم

۷۔خشیۃ اللہ ارشاد نبوی ہے "راس الحکمة مخافة الله" (نور الثقلین)

۸۔طاعت اللہ و معرفة الامام (ارشاد امام جعفر صادق علیہ السلام) (نور الثقلین)

۹۔معرفۃ الامام اور گناہان کبیرہ سے اجتناب کرنا (نور الثقلین)

۱۰۔عقل نظری اور عقل عملی میں کمال حاصل کرنا۔

۱۱۔معرفت قرآن یعنی اس کے محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ آیات و احکام کا علم۔

۱۲۔مکمل غور و خوض کے بعد کسی کام کو محکم طور پر عقل و خرد کے تقاضوں کے مطابق انجام دینا۔

الغرض بعض مفسرین نے اس کے قریباً تیس معانی بیان کئے ہیں اور درحقیقت ان میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے صرف تعبیر کا فرق ہے

عباراتنا شتی و حسنک واحد

لہٰذا بعید نہیں ہے کہ زیر بحث آیت میں یہ سب معانی مراد ہوں بنا بریں حکیم وہ ہے جس کا کوئی قول و فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہ ہو اور وہ جو کام بھی کرے سوچ سمجھ کر کرے، اپنے وقت پر کرے۔ اس کے کرنے میں جلد بازی نہ کرے اور خواہش نفس کے تقاضا کے مطابق نہ کرے بلکہ عقل و خرد کے تقاضا کے موافق کرے لہٰذا حکمت صرف انبیاء و اوصیاء اور فلاسفہ و علماء کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والا ہر شخص حکیم ہو سکتا ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

"و ما انعم الله علی العبد بنعمة اعظم و ارفع و اجزل و ابهی من الحکمة قال الله تعالیٰ و من یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً ای لا یعلم احد ما او دع الله فی الحکمة من الاسرار الا من استخلصه لنفسه فالحکمة هی النجاة و صفة الثبات عند اوائل الامور و الوقوف عند عواقبها" (تفسیر کاشف)

نذر کی حقیقت اوراس کے احکام

اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ...الآیۃ

خداوندعالم پھر انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرتے ہوخواہ یہ انفاق واجبی ہو یا مستحبی کثیر ہو یا قلیل خدا سب جانتا ہے لہٰذا وہ ضرور اس کی تمہیں جزادے گا۔ اورتم جونذرکرتے ہوخدا اسے بھی جانتا ہے نذر کے معنی ہیں منت جو کہ غلط بھی ہوسکتی ہے اور صحیح بھی شرعاً منت محض اللہ کے لئے کسی عمل صالح کی بجا آوری کو اپنے ذمہ لینے کا نام ہے جو صرف خدا کے نام کی ہوتی ہے صرف لفظ ''للہ علی کذا'' سے ہوتی ہے جیسے ''ان رزقنی اللہ ولدافللہ اللہ علی کذا''اگرخدا نے مجھے بیٹا دیا تو میں خدا کے لئے فلاں کام کروں گا مثلاً نماز پڑھوں گا یا اتنے روزے رکھوں گا۔ یا''ان ابرأ اللہ المریض للہ علی کذا''اگرخدا نے بیمار کوصحت دی تو میں خدا کے لئے فلاں کام کروں گا۔

احتیاط واجب یہ ہے کہ حتی الامکان یہ صیغۂ نذرعربی میں ادا کیا جائے ہاں البتہ بامر مجبوری اس کے ترجمہ پر اکتفا کی جاسکتی ہے نیز یہ بھی ضروری ہے کہ نذر کا متعلق اللہ کی اطاعت ہو جسے محض خوشنودی خدا حاصل کرنے کیلئے بجالایا جائے۔ بالاتفاق یہ نذر صرف اور صرف خدا کے ذاتی یا صفاتی نام کے ساتھ صحیح ہوتی ہے ورنہ باطل متصور ہوتی ہے اور جب منت پوری ہوجائے تو پھر وہ عمل کرنا واجب ہوجاتا ہے ورنہ نہیں۔

اس موضوع کی باقی تفصیلات فقہی کتب میں مذکور ہیں۔ اس کام کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ اگر واجبی انفاق نہ کیا گیا یا غلط کاموں میں مال صرف کیا گیا۔ یا غلط منت مانی گئی یا صحیح نذر کو پورا نہ کیا گیا تو آدمی ان ظالموں کے زمرہ میں داخل ہوجائے گا جن کا قیامت کے دن کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔

واجبی زکوٰۃ وغیرہ کا علانیہ اور مستحبی صدقات کا خفیہ دینا افضل ہے

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ......الآیۃ

جب اعمال کا دارومدار نیت پر ہے (انما الاعمال بالنیات) جب دینے والے کا مقصد صرف خوشنودی خدا کا پروانہ حاصل کرنا ہے نہ کہ نام ونمود حاصل کرنا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ علانیہ دے یا خفیہ دے؟ وارثان علم قرآن کے کلام وفرمان سے مستفاد ہوتا ہے' کہ واجبی زکوٰۃ کو علانیہ ادا کرنا افضل ہے تاکہ دوسرے لوگ بھی اس کی پیروی کریں اور اس پر ترک واجب کی تہمت بھی نہ لگے۔ مگر مستحبی وسنتی خیرات کا خفیہ اور چھپا کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ (مجمع البیان' کافی' صافی)۔

اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے کا حقیقی مفہوم؟

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰاهُمْ...الآیة

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی لوگوں کو ہدایت کرنا ہے ''وانك تهدی الی صراط مستقیم ''(یس) پھر آیت ۹۱ س کا کیا مطلب ہے کہ آپ کے ذمہ ان کی ہدایت نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہدایت کے دو معنی ہیں ایک ارائۃ الطریق یعنی زبانی کلامی سیدھا راستہ دکھانا۔ دوسرا ایصال الی المقصود یعنی کسی کے بازو سے پکڑ کر اسے منزل مقصود تک پہنچانا۔ جو ہدایت رسولؐ کے ذمہ ہے اور اس کے فرائض میں داخل ہے وہ پہلے معنی کے لحاظ سے ہے اور وہ سب لوگوں کیلئے عام ہے ''وما علیك الا البلاغ''ہاں دوسرے معنی کے اعتبار سے ہدایت کرنا خدا کا کام ہے اور وہ بھی ان کو کرتا ہے جنہیں وہ ان کے ذاتی شوق ہدایت وجستجو حقیقت کی بنا پر اس کا اہل وحقدار پاتا ہے۔ لہٰذا اہل و نااہل کا لحاظ کئے بغیر سب لوگوں کو جبری طاقت سے منزل مقصود تک پہچانا خدا کے نظام حکمت کے خلاف ہے ارشاد رب العزت ہے:

''وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا''اگر تمہارا پروردگار (زبردستی) چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ ایمان لے آتے۔(سورہ یونس آیت۔۹۹) اور

''وَلَوْ شَآءَ اللّٰه لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً'' اگر خدا (زبردستی) چاہتا تو سب کو ایک قوم بنا دیتا۔(سورہ مائدہ آیت۔۴۸)

مگر وہ اپنی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ سے اس طرح جبری طور پر چاہتا نہیں ہے کیونکہ یہ چیز اس کے نظام عدل وحکمت کے خلاف ہے۔

اس آیت کی شان نزول

خیرات کے ذکر میں آخر ہدایت کی بحث کس طرح آ گئی؟ اس کا جواب اس آیت کے شان نزول سے ملتا ہے کئی مسلمانوں کے رشتہ دار غریب ونادار تھے اور وہ ان کی اعانت کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ خیال کر کے رک جاتے تھے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں خالق کائنات فرما رہا ہے کہ تمہیں صدقہ وخیرات دیتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ مسلمان ہے یا کافر، مومن ہے یا بے ایمان؟ بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ تمہاری امداد کا محتاج ایک غریب انسان ہے بس تم اس کی امداد کرو جو دراصل تمہاری اپنی مدد

ہے کہ تمہیں اس کا پورا پورا اجر وثواب ملے گا اور ذرہ بھر تمہارا حق دبا کر تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یہ ہے وہ وسعت نظر جو اسلام اپنے نام لیواؤں میں پیدا کرنا چاہتا ہے مگر یہ خیال رہے کہ یہ سنتی و مستحبی صدقات وخیرات کا حکم ہے' اور جہاں تک واجبی زکوٰۃ وفطرہ وغیرہ کا تعلق ہے تو وہ صرف مسلمان اور اہل ایمان فقراء ومساکین کو ہی دیا جاسکتا ہے۔

آیات القرآن

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي
الْاَرْضِ ز يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ
بِسِيْمٰهُمْ ج لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا
وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ
الرِّبٰوا م وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ط وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ط وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

ترجمۃ الآیات

(یہ خیرات) خاص طور پر ان حاجتمندوں کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں اس طرح گھر گئے ہیں کہ روئے زمین پر سفر نہیں کر سکتے' ناواقف انہیں خودداری برتنے اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے مالدار سمجھتا ہے مگر تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر اور ان

کے پیچھے پڑ کر سوال نہیں کرتے اور تم جو کچھ مال و دولت (راہ خدا میں) خرچ کرو گے بے شک اللہ اسے جانتا ہے۔ (۲۷۳) جو لوگ اپنے مال رات اور دن میں خفیہ و علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں ان کا اجر و ثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۲۷۴) اور جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) نہیں کھڑے ہوں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان نے اپنے آسیب سے مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ (جس سے وہ پہچانے جائیں گے کہ وہ سود خور ہیں) یہ اس لئے ہے کہ وہ قائل ہیں کہ تجارت بھی تو سود کی مانند ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے پس جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت (فہمائش) آئی اور وہ (سود خوری سے) باز آ گیا۔ تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا ہے اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے اور جو (ممانعت کے بعد) پھر ایسا کرے تو ایسے لوگ جہنمی ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (۲۷۵)

تشریح الالفاظ

(۱) الحافا — اس کے معنی ہیں لپٹ کر اور پیچھے پڑ کر سوال کرنا

(۲) الرّبوا — اس کے معنی ہیں سود اور زیادتی

(۳) یتخبطه — یہ خبط سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مخبوط الحواس بنانا

تفسیر الآیات

واجبی زکوٰۃ اور مستحبی صدقات کے صحیح حقدار کون ہیں؟

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا ......الآیة

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم یہ فرمانا چاہتا ہے کہ اگرچہ سابقہ آیات میں بیاں کردہ حکم کے مطابق سنتی صدقہ و خیرات غیر مسلمان فقراء کو بھی دیا جا سکتا ہے مگر اس کے صحیح حقدار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں دین کی خدمت کیلئے وقف کر دی ہیں اور انہیں اپنی فکر معاش کی فرصت ہی نہیں ہے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہ آیت مبارکہ اصحاب صفہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (مجمع البیان)

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد معدلت انگیز میں تین چارسو ایسے مہاجرین تھے جن کے پاس نہ مال ومنال تھا نہ اہل وعیال۔ اور نہ ہی رہائش کے لئے کوئی مکان اور نہ آرائش کا کوئی ساز وسامان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لئے مسجد میں ایک چھپر بنوا دیا تھا' وہ وہاں بارگاہ نبوت میں حاضر رہتے' احکام نبویہ کی تعمیل کرتے' سرایا وغزوات میں شامل ہوتے' فراغت پر قرآن وحدیث یاد کرتے تھے بلکہ اس کا مقصد مطلقا سوال کرنے کی نفی ہے خداوند عالم نے اس آیت کے ذریعہ مسلمانوں کی توجہ ایسے لوگوں کی طرف مبذول کرائی ہے۔ "وَفِيٓ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ"(سورہ ذاریات آیت۔۱۹)(مالداروں کے مال میں دوقسم کے لوگوں کا حق ہے ایک سوال کرنے والوں کا اور دوسرا ان کا جو باوجود مستحق ہونے کے عزت نفس کی وجہ سے سوال نہیں کرتے)۔

مخفی نہ رہے کہ مستحقین کے جو اوصاف یہاں بیان کئے گئے ہیں یہ کسی اور زمانہ میں بھی جن فقراء میں پائے جائیں گے ان کو عام فقراء پر ترجیح ہوگی اور اب بھی جو لوگ خدمت دین میں اس طرح مشغول ہوں کہ کسب معاش کے لئے وقت نہ نکال سکیں ان کا حکم یہی ہوگا۔ دور حاضر میں یہ صفت صرف دینی مدارس کے طلبہ میں پائی جاتی ہے جو لادینیت کی فضاء سے بچ کر علم دین کی تحصیل میں شب و روز مصروف ہیں اور ان کے پاس روزی کمانے کا وقت نہیں ہے لہٰذا ان پر صدقات کا خرچ کرنا سب سے بہتر اور افضل ہے (انوار النجف)۔

رات دن' خفیہ وعلانیہ خیرات کرنیوالے سے مراد حضرت امیر علیہ السلام ہیں

اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ......الآیۃ

اس آیت وافی ھدایہ میں ان لوگوں کی فضلیت بیان کی گئی ہے اور ان سے اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے جو تمام حالات وواقعات' رات میں' دن میں خفیہ وعلانیہ راہ خدا میں اپنا مال ودولت خرچ کرتے رہتے ہیں۔ جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ خیر خیرات کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے اور نہ خفیہ وعلانیہ کی کوئی قید ہے۔ ہاں صرف خلوص نیت کے ساتھ خلق خدا کی سچی خدمت کرنے کا داعیہ اور جذبہ ہونا ضروری ہے۔ نام ونمود اور نمائش مدنظر نہیں ہونی چاہیے۔ برادران اسلامی نے جناب ابن عباس سے اور ہمارے مفسرین نے حضرت امام باقر علیہ السلام وحضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ یہ آیت مبارکہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے آپ کے پاس کل چار درہم تھے ایک رات میں صدقہ کیا۔ دوسرا دن میں تیسرا خفیہ طور پر دیا اور چوتھا علانیہ طور پر (تفسیر کبیر' نیشاپوری' کشاف وثعلبی درمنثور' مجمع البیان وبرہان)۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں ”حکمه سائر فی کل من فعل مثل فعله وله فضل السبق الی ذلك “ (مجمع البیان)

اب جو شخص ایسا کام کرے گا اسے اجر و ثواب تو ملے گا مگر سبقت کا شرف تو حضرت امیر علیہ السلام کو ہی حاصل رہے گا۔ ”ذلك فضل الله یوئیه من یشاء “۔

سود کی حرمت ان ضروریات اسلام میں سے ہے جن کا منکر خارج از اسلام متصور ہوتا ہے

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا ...الآیة

خداوند عالم نے ان انسانیت دوست لوگوں کا ذکر خیر کرنے کے بعد جو پہلو میں دل اور دل میں احساس سوز زیاں رکھتے ہیں اور کسی دکھی انسان کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں اور کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر مضطرب و پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ اضطراب اور پریشانی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس دکھی انسان اور مصیبت زدہ آدمی کا دکھ اور مصیبت دور نہیں ہو جاتی۔ اور یہ سب کچھ محض خدا کی رضا جوئی کیلئے مستحق افراد کی امداد و اعانت کرتے ہیں اور جواب میں کسی معاوضہ کی توقع نہیں رکھتے۔ اب ان لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو باوجود مالدار اور سرمایہ دار ہونے کے اس قدر تنگ دل بلکہ سنگ دل ہیں کہ اپنے کسی محبوب بھائی کو قرض بھی دیتے ہیں تو سود کا مطالبہ ساتھ کرتے ہیں۔ ان آیات میں سود کی حرمت اور اس کے دوسرے احکام شروع ہو رہے ہیں قرآن و سنت میں سود پر شدید وعید وارد ہوئی ہے اور اس کی حرمت قرآن، سنت اجماع اور عقل سے ثابت ہے بلکہ اس کی حرمت ان ضروریات اسلام میں سے ہے جن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج متصور ہوتا ہے۔ ارشاد قدرت ہے ”وَ اَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا “ خدا نے بیع و شراء کو حلال اور ربوا و سود کو حرام قرار دیا ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

’لعن رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم الربوا و اكله و موكله و بائعه و مشتريه و كاتبه و شاهديه “یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود پر، اس کے کھانے کھلانے والے پر، خرید و فروخت کرنے والے پر لکھنے والے پر اور اس کے دو گواہوں پر لعنت کی ہے۔ (مجمع البیان، من لا یحضرہ الفقیہ، تہذیب الاحکام)۔

ہشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں فرمایا:

''درهم الربوا اشد عند الله من سبعين زنية كلها بذات محرم ''
یعنی سود کا ایک درہم خدا کے نزدیک ایسے ستر زنا سے بدتر ہے جو کسی محرم کے ساتھ کیا جائے (مجمع البیان،من لا یحضرہ الفقیہ،تہذیب الاحکام)

''سود''ان برے خصائل و عادات میں سے ہے جو قبل از اسلام عربوں کی رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوتے تھے امیر لوگ غریبوں اور حاجتمندوں کو بھاری شرح سود پر رقم دیتے تھے اور جب تک روپیہ وصول نہ ہو جاتا ہر سال اصل سرمایہ کو بڑھاتے جاتے تھے۔ جسے''اضعافا مضاعفه''(دوگنا چوگنا) کہا جاتا تھا۔ سود کی حرمت بتدریج نازل ہوئی۔ سب سے پہلے اس قسم کی ممانعت کی گئی:

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ'' اے ایمان والو! یہ دوگنا چوگنا سود نہ کھاؤ۔ اللہ (کی نافرمانی) سے ڈرو تا کہ رستگاری حاصل کرو۔ (آل عمران آیت۔۱۳۰)

اور بعدازاں آٹھ ہجری میں حرمت سود کے تفصیلی احکام نازل ہوئے جو اس آیت سے شروع ہوتے ہیں''اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا......''اور کچھ عرصہ کے بعد یہ آخری سخت تہدیدی آیت نازل ہوئی ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ(۲۷۸) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ''جس میں سودخوری کو خدا اور رسولؐ سے جنگ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے اس آیت کے نزول کے بعد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو جمع کر کے اس حکم کا اعلان فرمایا اور حجۃ الوادع کے موقع پر ملک عرب کے تمام سودی معاملات کو کالعدم قرار دے دیا۔

حرمت سود کے بعض علل و اسباب

سود ایک ایسی لعنت ہے جس کے اندر بے شمار تمدنی اور معاشرتی مفاسد پائے جاتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔سود انسانی ہمدردی کے خلاف ہے۔

۲۔سود میں ایک محتاج آدمی کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ جو جوہر انسانیت کے منافی ہے۔

۳۔سود سے بلاسودی قرض دینے کی نیکی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

۴۔سود سے لوگوں کی توجہ جائز کاروبار تجارت سے ہٹ جاتی ہے اور وہ اس ناجائز کاروبار کو اپنا لیتے ہیں۔

۵۔سود سے فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہے۔جو مقدمہ بازی اور بالآخر مال وجان کے ضیاع تک جاری ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔الغرض سود اکل المال بالباطل کے زمرہ میں آتا ہے۔

سود کے اقسام اور سودی معاملہ کے شرائط: قابل غور بات یہ ہے کہ شرعاً سود کی کل کتنی قسمیں ہیں اور سودی معاملہ کے حدود وقیود کیا ہیں؟ سو واضح ہو کہ سود کی دو قسمیں ہیں۔۱۔قرضی سود۔۲۔معاملی سود۔ان دو قسموں کے احکام جدا جدا ہیں جہاں تک پہلی قسم (سود) کا تعلق ہے تو وہ ہر اس چیز میں پایا جاتا ہے جو بطور قرض دی جائے اور اس میں اضافہ کی شرط لگائی جائے جیسے آج ایک من گندم دو ماہ کے لئے ڈیڑھ من گندم کی شرط پر دی جائے۔یا آج پانچ انڈے پانچ ماہ کے لئے دس انڈوں کی شرط پر قرض دیئے جائیں وغیرہ وغیرہ۔مگر جو سود معاملی ہے اس کے کچھ شرائط ہیں اور وہ کل دو شرطیں ہیں۔پہلی شرط یہ ہے کہ اتحاد جنسی ہو یعنی عوض ومعوض کی نوع ایک ہو۔بایں طور کہ دونوں کا نوعی نام ایک ہو جیسے گندم، جوار، باجرہ، سونا اور چاندی۔اس شرط پر سب فقہاء متفق ہیں ما سوا گندم وجو کے ان کے نوعی نام الگ ہونے کے باوجود سود کے معاملہ میں ایک جنس شمار ہوتے ہیں لہٰذا ایک من گندم کے عوض دو من جو نہیں لئے جاسکتے پس جب جنس الگ الگ ہو تو پھر معاملہ میں کمی بیشی میں کوئی اشکال نہیں ہے۔دوسری شرط یہ ہے کہ عوضین مکیل یا موزوں ہوں۔یعنی ناپے یا تولے جاتے ہوں یہ شرط اشہر واظہر ہے جس پر روایات **مستفیضہ** دلالت کرتے ہیں بنابریں جن چیزوں کا معاملہ شمار کرکے کیا جاتا ہے جیسے انڈے یا روپے وغیرہ یا صرف دیکھ کر کیا جاتا ہے جیسے گائے بھینس اور بھیڑ بکری وغیرہ ان میں کاروباری سود ثابت نہ ہوگا۔لہٰذا ان کے باہمی معاملہ میں بنابر اشہر واظہر کمی بیشی جائز ہے اگرچہ احوط یہ ہے کہ ایسے معاملہ سے بھی اجتناب کیا جائے۔واللہ العالم (قوانین الشریعہ)۔

ایک ایراد کا جواب

دور جاہلیت کے لوگ کہتے تھے کہ سوداگری بھی تو سود کی مانند ہے سود کے جواز کی جو دلیل آج سے چودہ سو سال پہلے غیر متمدن لوگ پیش کرتے تھے وہی دلیل اس متمدن دور میں بھی پیش کی جاتی ہے کہ جب دوسری اجناس کے لین دین میں نفع حاصل کرنا صحیح ہے تو روپیہ بھی تو ایک جنس ہے اس کے لین دین میں اگر نفع لیا جائے تو وہ کیوں حرام ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ بیع وشراء کو اس کے فوائد کی وجہ سے خدا نے حلال قرار دیا ہے۔لہٰذا وہ جائز ہے اور سود کو اس کے نقصانات کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے۔لہٰذا وہ حرام ہے اور بقدر ضرورت اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سوداگری اور سود میں بڑا فرق ہے مثلاً

(۱) تاجر کو نقصان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے جبکہ سود خور کو ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔حتیٰ کہ وہ اس تاجر سے بھی

اپنا سود وصول کرتا ہے جسے کاروبار میں نقصان ہو جائے۔

(۲) کاروباری آدمی جنس کا ایک بار نفع حاصل کرتا ہے جبکہ سود خور ہر سال سود وصول کرتا ہے۔

(۳) تجارتی کاروبار سے ملک و معاشرہ ترقی کرتا ہے جبکہ سود خور پورے معاشرے کو ہضم کر جاتا ہے۔

(۴) تجارتی کاروبار کرنے والے کو فائدہ پہنچاتا ہے جبکہ سود خود غرضی، بے رحمی اور استحصال کر کے معاشرہ کے لئے خون چوسنے والی جونک بن جاتا ہے اور تمدن و ماحول کیلئے ناسور بن کر رہ جاتا ہے الی غیر ذلك من الفوارق۔

اس لئے ارشاد قدرت ہے جو شرع کا یہ حکم سن کر سود خوری سے باز آ جائے۔ اور باقیماندہ سود چھوڑ دے تو دور جہالت میں کھایا ہوا یا حرمت کا حکم آ جانے اور جہالت و لاعلمی سے کھایا ہوا سود مباح ہو جائے گا اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ جو اپنے فضل و کرم سے اسے معاف کر دے گا۔ مگر جو سمجھ کر سود کھائے اور کاروبار کرے تو وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے کیلئے تیار ہو جائے اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنے والا بالخصوص جب اسے حلال سمجھ کر کرے تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہے گا۔ ہاں البتہ توبہ کر لے تو اصل سرمایہ کا مستحق ہوگا۔ اور سودی رقم کو چھوڑنا پڑے گا۔

(نوٹ) آج کل ساری دنیا میں بنک کاری کا سسٹم سودی نظام پر چل رہا ہے۔ اگر اسلامی ممالک کوشش کریں تو بتوفیقہ تعالیٰ اس نظام میں ایک خوشگوار تبدیلی لا کر اسے اسلامی رنگ دے سکتے ہیں۔ اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ بنک کے کاروبار کو شرکت یا مضاربت، والے کاروبار کی شکل دے دیں تو یہ اصلاح با آسانی ہو سکتی ہے اور سودی کاروبار کی لعنت سے با آسانی چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ واللہ الموفق۔

آیات القرآن

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

ترجمۃ الآیات

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیر خیرات کو بڑھاتا ہے اور جتنے ناشکرے اور گنہگار ہیں اللہ ان کو دوست نہیں رکھتا۔(۲۷۶) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے۔ اور نماز پڑھی اور زکوٰۃ ادا کی ان کا اجر وثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے اور (قیامت کے دن) ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۲۷۷) اے ایمان والو! خدا (کی نا فرمانی) سے ڈرو۔ اور جو کچھ سود (لوگوں کے ذمے) باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو۔(۲۷۸) لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر خدا اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرنے کیلئے تیار ہو جاؤ اور اگر اب بھی تم توبہ کرلو۔ تو تمہارا اصل مال تمہارا ہوگا (جو تمہیں مل جائے گا)۔ نہ تم (زائد لے کر) کسی پر ظلم کروگے اور نہ (اصل مال خورد برد کر کے) تم پر ظلم کیا جائے گا۔(۲۷۹)

تشریح الالفاظ

(۱) یمحق اللہ — یہ محق سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مٹانا اور باطل کرنا

(۲) یُربی — یہ ارباء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بڑھانا

تفسیر الآیات

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا...الآیۃ

محق کے معنی گھٹانے اور مٹانے کے ہیں اور ''ربٰوا'' کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ کہ سود خور تو یہ سمجھتا ہے کے سود سے سرمایہ بڑھتا ہے اور خیرات سے گھٹتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اللہ تعالی سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ یہ گھٹانا اور بڑھانا دنیوی زندگی کے محدود تصور کے لحاظ

سے نہیں ہے۔ بلکہ دنیا وآخرت دونوں کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے ہے جب اخروی زندگی کی صبح ہوگی تو سود خود دیکھے گا کہ دنیا کے بنک میں تو اس کے لاکھوں روپے جمع تھے لیکن خدا کے بنک میں اس کی ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ صرف حسرت وندامت ہی اس کا سرمایہ ہے۔

برعکس اس کے خدا کی راہ میں انفاق کرنے والا جب اس زندگی میں آنکھ کھولے گا تو دیکھے گا کہ اس کے خزف ریزوں کے عوض یہاں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے جواہرات کے پہاڑ بنے ہوئے ہیں۔ قرآن دوسری جگہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ اس گھٹنے اور بڑھنے کا تعلق آخرت کی ہی زندگی سے ہے۔ مثلاً ''وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ'' (سورہ روم آیت۔ ۳۹) اور جو مال تم سود کے لئے دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال میں پل کر بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔ اور یہ جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اس کی رضا طلبی میں تو یہی لوگ خدا کے ہاں بڑھانے والے ہیں۔ احادیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے (تدبر قرآن)۔

آیات القرآن

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ

مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا
الۡاُخۡرٰى ؕ وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ؕ وَلَا تَسۡـــَٔمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ
صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰ لِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ
وَاَدۡنٰٓى اَلَّا تَرۡتَابُوۡٓا اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ
فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَا ؕ وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۖ
وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ ؕ وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌۢ بِكُمۡ ؕ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝۲۸۲

ترجمۃ الآیات

اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے فراخ دستی تک مہلت دینا ہوگی۔ اور اگر (قرضہ معاف کر کے) خیرات کرو۔ تو یہ چیز تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر تم جانتے ہو۔ (۲۸۰) اوراس دن (کی سزا اور رسوائی) سے ڈرو۔ جس دن اللہ کی طرف پلٹائے جاؤ گے اور پھر جس شخص نے جو کچھ (نیکی یا بدی) کمائی ہوگی۔ وہ (اس کا بدلہ) اسے پورا پورا دیا جائے گا۔ اور (ان کی حق تلفی کر کے) ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۲۸۱) اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت تک آپس میں قرضہ کا لین دین کرو۔ تو اسے لکھ لیا کرو۔ اور چاہیے کہ کوئی لکھنے والا عدل و انصاف کے ساتھ تمہارے باہمی قول و قرار کو لکھے۔ اور جس طرح اللہ نے لکھنے والے کو (لکھنا پڑھنا) سکھایا ہے وہ لکھنے سے انکار نہ کرے (بلکہ) اسے چاہیے کہ لکھ دے اور جس (مقروض) کے ذمہ (قرضہ کی ادائیگی) کا حق عائد ہوتا ہے اسے چاہیے کہ تحریر کا مضمون لکھوا دے اور اس (کاتب) کا چاہیے کہ اپنے پروردگار سے ڈرے اور اس میں کمی نہ کرے اور اگر وہ شخص (مقروض) جس پر حق عائد ہو رہا ہے کم عقل ہو یا کمزور و معذور ہو یا خود نہ لکھا سکتا ہو۔ تو پھر اس کا سرپرست (وکیل یا ولی) عدل و انصاف سے (تمسک کا مضمون) لکھوائے۔ اور اپنے آدمیوں میں سے دو گواہوں کی گواہی کرا لو۔ تاکہ اگر ان دو میں

سے کوئی ایک بھولے تو ان میں سے دوسرا اسے یاد دلائے اور جب گواہوں کو (گواہی کیلئے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا جس کی معیاد مقرر ہے اس کے لکھنے میں سہل انگیزی نہ کرو۔ یہ (لکھا پڑھی) اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ کاروائی ہے اور گواہی کیلئے زیادہ مضبوطی ہے اور اس طرح زیادہ امکان ہے کہ تم شک وشبہ میں نہ پڑو۔ مگر یہ کہ جب نقد انقد خرید وفروخت ہو کہ جو تم آپس میں ہاتھوں ہاتھ کرتے ہو۔ تو اس صورت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اسے نہ لکھو۔ اور جب (اس طرح) خرید وفروخت کرو تو گواہ کر لیا کرو اور (زبردستی کرکے) کاتب اور گواہ کو ضرر وزیاں نہ پہنچایا جائے اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہاری نافرمانی ہوگی۔ (گناہ ہوگا) خدا (کی نافرمانی) سے ڈرو۔ اللہ تمہیں (یہی) سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (۲۸۲)

تشریح الالفاظ

(۱) توفّی — اس کا اصل مادہ وفا ہے جس کے معنی پورا کرنے کے ہیں اور توفی کے معنی ہیں پورا پور لینا یا دینا۔

(۲) اذا تداینتم — اس کے معنی ہیں ایک دوسرے سے قرض مانگنا اور ادھار پر لین دین کرنا۔

(۳) ولیملل — یہ املاء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں املا کرانا یعنی لکھوانا

(۴) ولا یأب — یہ اباء واباءت سے مشتق ہے جس کے معنی انکار کرنے اور ناپسند کرنے کے ہیں

(۵) ولا تسئموا — یہ سأم اور سآمہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز سے اکتانا اور ملول ہونا

تفسیر الآیات

تنگدست مقروض کو مہلت دینے کا درس

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ......الآیة

اسلامی مکارم اخلاق اور انسانی ہمدردی کا یہ بہترین درس ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو اور سر دست قرضہ ادا نہیں کر سکتا۔ تو اس پر سختی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی خوش حالی وفراخ دستی تک اسے مہلت دینی چاہیے

تا کہ وہ با آسانی قرضہ ادا کر سکے ارشاد قدرت ہے اور اگر خیرات کرو اس کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ اسے قرضہ معاف کر دو۔ تو یہ زیادہ بہتر ہے اور کشائش کار کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ حکومت شرعیہ کے قائم ہونے کی صورت میں یہ بات حاکم شرع تک پہنچے اور وہ بیت المال کے مال میں سے اس کا قرضہ ادا کرے بشرطیکہ وہ قرضہ جائز مصرف میں صرف کیا گیا ہو۔ (آلاء الرحمن بلاغی)۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''جو شخص چاہتا ہے کہ خدا اسے اس دن سایہ نصیب کرے جس دن اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ تو وہ غریب مقروض کو مہلت دے یا اسے کچھ حق معاف کرے''۔ (تفسیر نور الثقلین)

کاروبار اور لین دین کے تفصیلی احکام

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ...الآية

خداوند عالم جہاں حاکم ہے وہاں حکیم بھی ہے جہاں بادشاہ ہے وہاں علیم بھی ہے اور جہاں جبار ہے وہاں رحیم بھی ہے اور اس کے سب احکام حاکمانہ لحاظ سے نہیں ہوا کرتے بلکہ حکیمانہ حیثیت سے بھی ہوتے ہیں چنانچہ قرآن مجید کی اس طویل ترین آیت مبارکہ میں معاملات و معاہدات کے جو تفصیلی احکام بیان کئے گئے ہیں (جو تعداد میں قریباً پندرہ ۱۵ ہیں) وہ زیادہ تر اسی حیثیت کے ہیں کہ جن کی خلاف ورزی کرنے سے دنیوی نقصان و زیاں کا خطرہ تو ہوتا ہے مگر گناہ کوئی نہیں ہوتا۔

وثیقہ نویسی کا حکم

وَلۡيَكۡتُبْ بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌ...الآية

یہاں پہلا حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ جب ادھار کا لین دین کیا جائے تو اسے لکھ لیا جائے۔ آج کل تو لکھنے لکھانے کا عام رواج ہے اور موجودہ دور میں تو بقول بعض علماء ''تحریر انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے۔'' مگر ہم جب چودہ سو سال پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو سب کاروبار زبانی ہوتا نظر آتا ہے لکھائی پڑھائی کرنے کا رواج نہ تھا۔ سب سے پہلے قرآن حکیم نے وثیقہ نویسی، اور دستاویز لکھنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آج بھی بعض لوگ بعض اوقات دستاویز لکھنے اور گواہ مقرر کرنے سے شرماتے ہیں مگر بعد میں جو مشکلات درپیش آتے ہیں اور بعض اوقات لڑائی جھگڑے اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ جاتی ہے جس کی وجہ سے باہمی تعلقات ہمیشہ کیلئے کشیدہ ہو جاتے ہیں اس لئے ان سے بچنے کیلئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ادھار کے معاملات میں دستاویز لکھ لی جائے

جس میں اس لین دین کی پوری تفصیلات از قسم مقدار، قسم اور ادائیگی کا وقت وغیرہ لکھ لی جائیں۔ تاکہ بھول چوک اور اباو انکار اور جھگڑا و فساد کا دروازہ بالکل بند ہو جائے۔ اسی لئے غیر معین مدت کیلئے ادھار کا لین دین جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے مذکورہ بالا مفاسد کا دروازہ کھلتا ہے اس لئے ادائیگی کی مدت اس طرح معین ہونی چاہیے کہ جس میں کوئی ابہام نہ ہو۔

ضروری ہے کہ لکھنے والا عدل و انصاف سے وثیقہ لکھے۔ فریقین میں جو شرائط طے ہوئی ہوں وہ سب بلا کم و کاست لکھے ایسا نہ ہو کہ صاحب معاملہ کچھ اور لکھوائے اور وہ کچھ اور لکھے۔ ذو معنی لفظ اور مغالط دہی سے اجتناب کرے۔ الغرض کسی کے فانی نفع کی خاطر اپنا دائمی نقصان کرے اس لئے بہتر ہے کہ کاتب غیر جانبدار ہو کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو۔ جس طرح خدا نے اسے کتابت کے علم کی نعمت سے نوازا ہے اسے چاہیے کہ شکرانہ نعمت کے طور پر دستاویز لکھدے اور نازنخرے نہ کرے گو اس پر اجرت لینا حرام نہیں ہے۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ...الآية

یعنی وثیقہ کا مضمون وہ لکھوائے جس کے ذمہ حق ہے یعنی جو قرض لے رہا ہے اور وہ خدا سے ڈرے اور حق لکھوانے میں ذرہ بھر کمی نہ کرے۔ اور اگر یہ شخص سفیہ (کم عقل) ہے، یا نابالغ بچہ یا سٹھیایا ہوا بوڑھا ہے یا گونگے پن یا کاتب کی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے لکھوانے سے معذور ہے تو پھر یہ کام اس کا ولی شرعی انجام دے گا۔ اور وہ عدل و انصاف کے ساتھ دستاویزات لکھوائے گا۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ...الآية

یہاں حکیمانہ حکم دیا جا رہا ہے کہ وثیقہ کی صرف تحریر کو کافی نہ سمجھیں بلکہ اپنی جماعت (مسلمین) میں سے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ایسے گواہ بھی بنا لیں جو تمہیں پسند ہوں۔ اپنی جماعت سے کہہ کر گواہوں میں اسلام کو معتبر قرار دیا اور۔ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ۔ (جو تمہیں پسند ہوں) فرما کر ان کی وثاقت و عدالت کی طرف اشارہ فرمایا دو عورتوں کو ایک مرد کا قائم مقام قرار دے کر اور یہ فرما کر اگر ایک بھولے تو دوسری اسے یاد دلائے، عورت کی کمی عقل کی طرف اشارہ فرمایا ہے اب اس بات کو کوئی پسند کرے یا ناپسند کرے۔ مگر جب تک قرآن و اسلام کا انکار نہ کیا جائے تب تک اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح عورت ناقص الحصہ بھی ہے (کہ وراثت میں اس کا حصہ آدھا ہے) اور ناقص العبادت بھی ہے کہ ہر ماہ چند دن کیلئے خدا کی عبادت نہیں کر سکتی۔ گواہ مقرر کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ اگر تحریر کے باوجود باہمی نزاع ہو جائے اور معاملہ عدالت میں پہنچ جائے تو گواہوں کی گواہی سے قاضی کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا ...الآية

گواہوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ جب انہیں کسی معاملہ میں گواہ بنانے کیلئے کہا جائے یا جب ادائے شہادت کیلئے انہیں عدالت میں بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ کیونکہ پہلا کام احیاءِ حق کا ذریعہ ہے اور دوسرا جھگڑا وفساد مٹانے کا وسیلہ۔ اور کتمان شہادت تو بہر حال حرام ہے۔ ارشاد قدرت ہے ''وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ'' جو گواہی کو چھپائے گا اس کا دل گنہگار سمجھا جائے گا۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيدٌ ...الآية

جہاں کاتب اور شاہد کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ لکھنے اور گواہ بننے سے انکار نہ کریں وہاں معاملہ کے فریقین کو بھی یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ اپنے فائدہ کی خاطر ان کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ بلکہ اپنے مفاد کے ساتھ ساتھ ان کے مصلحت و مفاد کا بھی خیال رکھا جائے اور اگر ان کو نقصان وزیاں پہنچایا گیا تو یہ فسق وفجور ہوگا۔ جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔

لہٰذا اگر کاتب اجرت کا مطالبہ کرے یا گواہ آمد ورفت کے کرایہ کا مطالبہ کرے تو اس کے اس جائز حق کا دبانا بھی انہیں ضرر پہنچانے کے مترادف سمجھا جائے گا۔ نیز اسے وقت بے وقت اور بلا وجہ بلانے سے بھی اجتناب کیا جائیگا۔ مگر موجودہ دور میں عدالتی غلط طریقہ کار کی وجہ سے گواہوں کے ساتھ جو غیر شریفانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کی وجہ سے آج کوئی شریف آدمی گواہ بننے اور گواہی دینے کیلئے آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ ہاں اگر ملتے ہیں تو پیشہ ور گواہ جن کی نظر میں جھوٹ اور سچ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے عدل وانصاف کا خون ناحق ہورہا ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا چار شخص ایسے ہیں جن کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ چوتھا وہ ہے جو گواہوں کے بغیر قرضہ دے دوسری روایت میں وارد ہے کہ اسے اجر نہیں ملتا۔ (تفسیر نور الثقلین)۔

یہ لکھا پڑھی ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں ہونی چاہیے تا کہ ہر قسم کے جھگڑا وفساد کا سد باب ہو جائے۔

إِلَّآ أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً ...الآية

اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں لین دین نقد بہ نقد ہو اور ایک ہاتھ سے دینا اور ایک ہاتھ سے لینا ہو۔ اگر وہاں وثیقہ نویسی نہ کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں بھی اگر کسی بڑی چیز کا معاملہ ہو جیسے زمین یا مکان وغیرہ کی خرید وفروخت تو اس کی لکھائی پڑھائی ضروری ہے۔ تا کہ بعد میں کوئی نزاع پیدا نہ ہو۔ '' آخر میں جو دو لفظ ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰه...الآية

یہ ہمارے خیال میں دونوں قسم کے احکام کے لحاظ سے ہیں ''اللہ سے ڈرو'' یہ ان احکام کے لحاظ سے جو حاکمانہ ہیں جیسے یہ کہ کاتب لکھنے میں خیانت نہ کرے۔ دوسرے لوگ کاتب اور گواہ پر دباؤ نہ ڈالیں اور ضرر رسانی کے لئے تیار نہ ہوں۔ وغیرہ۔ اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے' دوسرے احکام کے لحاظ سے ہے جو حکیمانہ ہیں''۔ (فصل الخطاب)۔

الغرض اس آیت مبارکہ میں لین دین کے بارے میں لکھائی پڑھائی کرنے گواہ مقرر کرنے وغیرہ کے جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ تمام فقہاء ومفسرین کے نزدیک استحبابی وارشادی ہیں۔ فرضی ووجوبی نہیں ہیں اور اس امر کی تائید مزید اس سے ہوتی ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ۔

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ...الآية

اگر کوئی کسی پر اعتبار کر کے وثیقہ اور گواہوں کے بغیر قرضہ دے دے تو اسے چاہیے کہ امانت کو ادا کرے۔ اس آیت میں وثیقہ نہ لکھنے اور گواہ مقرر نہ کرنے کی رخصت دی گئی ہے۔ ''وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ'' اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے پوری کائنات کی کوئی چیز اس پر چھپی ہوئی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر تم کسی طرح بھی اس کے احکام کی خلاف ورزی کروگے تو اسے فریب نہیں دے سکوگے۔

آیات القرآن

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸۳ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ؕ وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴

ترجمۃ الآیات

اور اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں کا تب نہ ملے تو رہن با قبضہ رکھ لو۔ اور اگر تم میں سے ایک کو دوسرے پر اعتبار ہو۔ تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنی امانت واپس کر دے اور اپنے پروردگار (کی مخالفت) سے ڈرے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ اور جو اسے چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ (۲۸۳) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (سب کچھ) خدا کا ہے۔ اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اس کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ۔ خدا سب کا تم سے محاسبہ کرے گا۔ اور پھر جسے چاہے گا۔ بخش دے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۸۴)۔

تشریح الالفاظ

(۱) فرھان — رھن کے معنی گروی اور گروی رکھی ہوئی چیز کے ہیں

(۲) ان تبدوا — یہ ابداء سے مشتق ہے جس کے معنی اظہار کے ہیں

تفسیر الآیات

رہن رکھنے کی ہدایت اور اس کے بعض احکام

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ...الآية

اس آیت مبارکہ میں خداوند حکیم نے رہن کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ جن کی تفصیل فقہی کتابوں میں مذکور ہے۔ شریعت اسلامیہ چونکہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اس لئے اس نے انسانی جان کی طرح اس کی عزت و ناموس اور اس کے مال و منال کو بھی بڑی اہمیت دی ہے چنانچہ بعض اخبار و آثار میں وارد ہے کہ ”حرمة مال المسلم كدمه“ مسلمان کے مال کا احترام اس کی جان کی مانند ہے۔ اسی وجہ سے شریعت مقدسہ نے یہ حکیمانہ حکم دیا ہے کہ جب کسی کو قرضہ دو یا بیع سلم کرو۔ تو اسے ضبط تحریر میں لے آؤ۔ یا دو عادل گواہ مقرر کرو۔ یا کوئی مال با قبضہ رہن رکھ لو۔ تاکہ کل کلاں تمہارا مقروض ابا و انکار نہ کر سکے اور اگر ایسا کرے تو تم گواہوں

کے ذریعہ سے اپنا حق وصول کر سکو۔

یہ رہن بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا اصل مقصد اپنے مال کو تلف ہونے سے بچانا ہے لہٰذا جو مال و متاع قرض لینے والا بطور وثیقہ قرض دینے والے کے پاس رکھتا ہے اسے شریعت کی اصطلاح میں ''رھن'' کہا جاتا ہے۔ اور رہن کے منجملہ دوسرے شرائط صحت کے اس کی بالاتفاق ایک شرط قبضہ بھی ہے کہ راہن رہن کا مرتہن کو قبضہ دے دے۔ تاکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ اگر مقروض قرضہ ادا نہیں کرے گا تو وہ اس گروی شدہ مال کو فروخت کر کے اپنا حق وصول کر لے گا۔

مخفی نہ رہے کہ یہ رہن سفر کے علاوہ حضر میں بھی بالاتفاق جائز ہے یہ جو سفر کی اور کاتب کے نہ ملنے کی قید لگائی گئی ہے۔ یہ تغلیبی ہے کہ غالباً سفر میں ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ اطمینان قلب کیلئے وثیقہ لکھنے کیلئے کوئی کاتب نہیں ملتا۔ یا گواہ نہیں ملتے تو پھر اطمینان کا ایک ذریعہ رہن ہے جبکہ حضر کی حالت میں بھی اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اسکی نظیر نماز قصر ہے ارشاد قدرت ہے:

''وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا'' اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور تمہیں کافروں کے نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہو تو نماز قصر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (سورہ نساء آیت۔۱۰۱)۔

یہاں نماز قصر کیلئے سفر اور خوف دونوں کا تذکرہ کیا گیا ہے حالانکہ ان دو چیزوں میں سے ایک بھی ہو تو وہ قصر کا موجب ہے اور اگر کسی کو کسی پر اس طرح اعتبار ہو کہ وہ رہن کی ضرورت محسوس نہ کرے تو وہ اس اعتبار پر قرضہ دے دے تو پھر اس شخص (مقروض) کا دینی، ایمانی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ اس شخص کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے اور اس کے اعتماد سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ بلکہ بلا چوں و چرا حسب الوعدہ اس کا قرضہ ادا کر دے۔

گواہی کا چھپانا گناہ کبیرہ ہے

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ...الآیة

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے کتمان شہادت کے گناہ کبیرہ ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے کہ جس شخص کو نزاعی معاملہ کی حقیقت کا علم ہو اس پر لازم ہے کہ شہادت دے کر اس نزاع کو رفع دفع کرے ورنہ اس کا دل گنہگار متصور ہو گا۔ کیونکہ زبان ہو یا کوئی اور عضو۔ گناہ کا ارادہ تو دل سے ہی کیا جاتا ہے۔ ارشاد قدرت ہے

وھم بشھا داتھم قائمون۔مومن وہ ہوتے ہیں جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں۔اور دنیا کا کوئی خوف وہراس اور دنیا کا کوئی طمع ولالچ انہیں ادائے شہادت سے منحرف نہیں کرسکتا۔

خدا ہر چیز کا محاسبہ کرے گا:

وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ...الآیة

وہ خیالات اور وسواس جو غیر اختیاری طور پر قصدو ارادہ کے بغیر انسانی دل ودماغ میں پیدا ہوتے ہیں جن کو حدیث نفس اور وسوسہ کہا جاتا ہے ان پر خدا نہ عذاب کرتا ہے اور نہ عتاب۔حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا۔میری امت سے نو چیزیں اٹھالی گئی ہیں۔

(۱)خطاء　　(۲)نسیان　　(۳)جس پر مجبور کئے جائیں

(۴)جس کا علم نہ ہو

(۵)جس کی طرف مضطر ہوں　(۶)جس کی طاقت نہ ہو　(۷)حسد

(۸)شگون بدلینا

(۹)وسوسہ فی الخلق جب تک زبان سے اظہار نہ کریں اور عمل میں نہ لائیں۔(الخصال)۔

پھر وہ کونسی چیزیں ہیں جن کا خدا محاسبہ کرے گا؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے مراد ایمان واعتقاد اور کفر وشرک والحاد کے تمام مسائل ہیں جن کو انسان اپنے عزم وارادہ سے اپنے دل ودماغ میں جگہ دیتا اور رکھتا ہے ظاہر ہے کہ ان کا محاسبہ کیا جائے گا۔اور دوسرا جواب یہ ہے کہ گنہگار دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ ہیں کہ وہ جس گناہ کے کرنے کا عزم بالجزم کر لیتے ہیں تو پھر کھلم کھلا اسے کر گذرتے ہیں اور کوئی پروا نہیں کرتے کہ لوگ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور ان پر کیا تنقید وتبصرہ کرتے ہیں۔یہ ہیں دلوں کی بات کو ظاہر کرنے والے دوسرے وہ ہیں کہ جس گناہ کے کرنے کا عزم وارادہ کرتے ہیں اسے لوگوں کی نگاہوں سے چھپ چھپا کر کرتے ہیں۔یہ ہیں دلوں کی بات کو چھپانے والے۔خدا ان سب کا محاسبہ کرے گا۔جسے چاہے گا معاف فرمائے گا چونکہ وہ مالک الملک بھی اور ہر شے پر قادر بھی ہے۔

آیات القرآن

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۗ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۗ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

ترجمة الآيات

رسولؐ ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر اتاری گئی ہیں اور مومنین بھی (سب) خدا پر اس کے ملائکہ پرؔ اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں کہ) ہم خدا کے رسولوں میں تفریق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے فرمان الٰہی سنا اور اس کی اطاعت کی! پروردگار ہمیں تیری مغفرت درکار ہے۔ اور تیری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے (۲۸۵) خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا وہ جو (نیکی) کرے گا۔ اس کا نفع اس کو ہوگا اور وہ جو (برائی) کرے گا اس کا نقصان بھی اسی کو ہو گا۔ پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہماری گرفت نہ کر۔ پروردگار! ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ پروردگار! ہم پر وہ بار نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے اور ہمیں (ہمارے قصور) معاف کر۔ اور ہمیں (ہمارے گناہ) بخشش دے۔ اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مالک و سرپرست اعلیٰ ہے کافروں کے مقابلہ میں تو ہی ہماری مدد فرما۔ (۲۸۶)

تشریح الالفاظ

(۱)اصرًا اس کے معنی عہد و پیمان کے بوجھ اور گناہ کے ہیں

(۲)ولا تحمّلنا یہ تحمیل سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اٹھوانا

(۳)واغفرلنا غفر وغفران کے معنی چھپانے اور گناہ معاف کرنے کے ہیں

تفسیر الآیات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان خدا کے تمام انبیاء پر اور اس کی نازل کردہ کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ...الآیۃ۔

یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام تک انبیاء کو مانتے ہیں بعد والوں کو نہیں مانتے نصاریٰ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک مانتے ہیں وہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں مانتے۔ مگر ہمارے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کی یہ شان ہے کہ وہ "يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" خدا کو مانتے ہیں، اس کے فرشتوں کو مانتے ہیں، اس کی تمام آسمانی کتابوں کو مانتے ہیں اور اس کے تمام نبیوں کو مانتے ہیں۔

وہ بعض کو مان کے اور بعض کو نہ مان کے تفریق کا ارتکاب نہیں کرتے۔ وہ ہر ہر حکم خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے "سمعنا واطعنا" کہتے ہیں۔ یہود کی طرح س "سمعنا واعصینا" (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) نہیں کہتے۔ اور خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔ اور خداوند رؤف ورحیم ان کی یہ شان بندگی وخود سپردگی دیکھ کر ان کو طاقت برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ہے۔ بلکہ وسعت سے کام لیتا ہے اور وسعت طاقت سے کمتر درجہ کا نام ہے اور اپنے فضل وکرم سے ان کو شریعت سہلہ سمحاء عطا فرماتا ہے جس میں بڑی سہولتیں موجود ہیں اور ان پر وہ بوجھ نہیں ڈالتا جو پہلی امتوں پر ڈالا تھا۔ مثلاً ان پر پچاس نمازیں فرض تھیں، بدن یا کپڑا نجس ہوجاتا تو اسے قینچی سے کاٹنا پڑتا تھا، زکوٰۃ میں مال کا چوتھا حصہ لازم تھا، گناہ کا اثر اسی وقت ظاہر ہوجاتا تھا۔ اور قتل کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ۔

جن چیزوں کو یہاں بطور دعا خدا سے طلب کیا گیا ہے یہ صرف مقتضائے عبودیت ہے ورنہ وہ تو خدا

پہلے ہی عطا فرما چکا ہے۔ اور مرحمت کرنے کا فیصلہ فرما چکا ہے نہ یہ کہ اب اسے دعا کر کے حاصل کرنے کی سعی و کوشش کی جا رہی ہے بعض اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ یہ سب استدعائیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج بارگاہ خداوندی میں پیش کی تھیں جو خدا نے قبول فرمائیں اور شریعت سہلہ کی صورت میں عطا فرمائیں۔

چنانچہ احتجاج طبرسی میں حضرت امیر علیہ السلام سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شب معراج جب قاب قوسین کے اجل وارفع مقام پر پہنچے اور فاوحیٰ الی ما اوحیٰ عبدہ کی صورت حال پیش آئی تو اس وحی میں سورہ بقرہ کی یہ آیت بھی تھی۔ ''لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ......الآیۃ''۔ جسے سابقہ انبیاءؑ اور ان کی امتوں پر پیش کیا گیا تھا مگر وہ اس کی سنگینی کی بنا پر اسے قبول نہ کر سکے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول کر لیا۔ اور پھر اسے اپنی امت پر پیش فرمایا۔ اور اس نے بھی قبول کر لیا۔ مگر خدا جانتا تھا کہ یہ بات ان کی طاقت برداشت سے باہر ہے۔ مگر ان کی تسلیم و رضا کو دیکھ کر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساق عرش کے قریب پہنچے تو خدا نے سمجھانے کی خاطر اس کلام کا اعادہ کرتے ہوئے مزید فرمایا: ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ......''

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اور اپنی امت کی جانب سے عرض کیا۔ ''وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ......''

ارشاد ہوا: اگر انہوں نے ایسا کیا تو میں ان کو جنت و مغفرت عطا کروں گا۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا۔ ''غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ..........''

پھر خدا نے فرمایا۔ جب آپ نے اس آیت کو اس کی شدت کے باوجود قبول کر لیا ہے اور آپ کی امت نے بھی تو پھر مجھ پر لازم ہے کہ اس سختی کو آپ سے اٹھالوں۔ لہٰذا ''لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ......''۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کیا۔ یا اللہ! اگر تو نے میرے اور میری امت کے ساتھ یہ مہربانی کی ہے تو اس میں اور اضافہ کر۔

ارشاد ہوا سوال کر۔

عرض کیا۔ ''رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا''۔ یا اللہ! ہم

پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلی امتوں پر ڈالا تھا (جن میں سے بعض کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے)۔

ارشاد ہوا: میں نے یہ سارا بوجھ آپ کی امت سے اٹھالیا۔ مزید برآں آپؐ کی امت جب کوئی نیکی کا ارادہ کرے گی تو ایک نیکی تو اسی وقت لکھ لی جائے گی اور جب کر گذرے گی تو پھر اسے دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا اور جب کسی برائی کا ارادہ کرے گی۔ مگر کرے گی نہیں تو ایک نیکی تو اس وقت لکھ لی جائے گی اور اگر کرے گی تو صرف ایک برائی لکھی جائے گی۔

عرض کیا یا اللہ! جب یہ بندہ نوازی فرمائی ہے تو اس میں بھی اضافہ فرما۔ ارشاد ہوا۔ سوال کر۔

عرض کیا۔ ''رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ''۔

ارشاد ہوا میں نے یہ سب کچھ آپؐ کو اور آپؐ کی امت کو عطا کر دیا۔

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا ''وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْ لَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا......''۔

ارشاد ہوا تیری امت میری زمین میں ایسی (روشن) ہے جیسے سیاہ رنگ کے بیل میں سفید تل۔ تیری وجہ سے یہ قادر ہوں گے (نہ مقدور)' قاہر ہوں (نہ مقہور) اور مخدوم ہوں گے (نہ خادم) اور میں تیرے دین کو مشرق و مغرب کے تمام ادیان پر اس طرح غالب کروں گا۔ کہ اسلام کے سوا کوئی دین باقی نہیں رہ جائے گا۔ (احتجاج طبرسی' تفسیر برہان وغیرہ)۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا۔ جس گھر میں سورہ بقرہ کی یہ دو آخری آیتیں (آمن الرسول سے تا آخر سورہ) پڑھی جائیں اس گھر میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔ (تفسیر عیاشی و برہان)۔

۱۷ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ بمطابق ۲۸ ستمبر ۱۹۹۹ء

بروز منگل بوقت پانچ بجے دن

بمقام سرگودھا سورہ بقرہ کی تفسیر ختم ہوئی۔ والحمدللہ

سُوۡرَةُ اٰلِ عِمۡرَان

(سورہ آل عمران مدنی ہے جس کی آیات ۲۰۰ اور رکوع ۲۰ ہیں)

(اس کے الفاظ ۳۵۴۲ ہیں اور حروف ۱۵۳۳۶ ہیں)

وجہ تسمیہ

چونکہ اس سورہ مبارکہ میں بار بار اور خصوصیت کے ساتھ عمران اور آل عمران کا ذکر آیا ہے اس لیے اس سورہ کا نام آل عمران مقرر ہوا۔

سورۂ آل عمران کی فضیلت کا بیان

۱۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔فرمایا:

''جو شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی تلاوت کرے گا تو یہ دو سورتیں قیامت کے دن بادل کے دو ٹکڑوں کی طرح اس کے سر پر سایہ فگن ہوں گی''(ثواب الاعمال)

۲۔حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

''جو شخص سورہ آل عمران کی تلاوت کرے خدا اس کے ہر ہر حرف کے عوض اسے جہنم کی گرمی سے نجات عطا فرمائے گا۔اور اگر اسے زعفران سے لکھ کر اس عورت پر باندھا جائے جسے حمل نہ ہوتا ہو تو وہ باذن اللہ حاملہ ہو جائیگی۔اور اگر اسے لکھ کر اس کھجور یا درخت پر باندھا جائے جس کا پھل یا پتے گر جاتے ہوں تو باذن اللہ گرنے سے رک جائیں گے''۔(تفسیر برہان)۔

۳۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے' فرمایا:

''اگر اس سورہ کو زعفران سے لکھ کر اس عورت پر باندھا جائے جو اولاد کی طلبگار ہو تو وہ باذن اللہ حاملہ ہو جائے گی۔اور اگر اسے کوئی غریب و نادار باندھے تو خدائے تعالیٰ اس کو کشائش کار اور رزق وسیع عطا فرمائے گا''۔(تفسیر برہان)

اس سورہ مبارکہ کے مضامین عالیہ کی اجمالی فہرست

ویسے تو دوسری قرآنی سورتوں کی طرح اس سورہ میں بھی بے شمار مضامین و مسائل کا تذکرہ موجود ہے۔ مگر جن مضامین کا خصوصیت کے ساتھ اس میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ خدا کی وحدانیت اور دوسرے معبودان باطل کا بطلان۔

۲۔ دین خدا کی صداقت اور دوسرے ادیان کا ابطال۔

۳۔ محبت الٰہی اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجوب۔

۴۔ آئمہ اہلبیتؑ کا راسخ فی العلم ہونا۔

۵۔ قرآنی آیات کا محکم و متشابہ ہونا۔

۶۔ عدالت باری کا اصول عقائد میں داخل ہونا۔

۷۔ خدا کا حقیقی مالک الملک ہونا، منعم ہونا اور عطا کی باگ ڈور کا اس کے قبضہ قدرت میں ہونا۔

۸۔ نصارائے نجران سے مباہلہ کا واقعہ۔

۹۔ حضرت علیؑ کا نفس رسول اور حسنین شریفینؑ کا فرزندان رسولؐ ہونا۔

۱۰۔ جناب مریم کی ولادت کا واقعہ۔

۱۱۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت اور ان کے دوسرے معجزات۔

۱۲۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا تذکرہ۔

۱۳۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا۔

۱۴۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے والے بدعقیدہ کی رد۔

۱۵۔ دین خلیل علیہ السلام کی تشریح۔

۱۶۔ اہل کتاب کو مشترکہ اصول توحید پر اتحاد کی دعوت۔ ۱۷۔ یہود و نصاریٰ کے کردار و رفتار کا تذکرہ۔

۱۸۔ پیغمبروں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی نصرت و تائید کرنے کا میثاق لیے جانے کا تذکرہ۔

۱۹ ۔اسلام میں ایمان و عمل پر نجات کا انحصار۔

۲۰۔ تقیہ کا حکم۔

۲۱۔ فرضیت حج اور مقام ابرہیمؑ

۲۲۔ امت مسلمہ کے خیرالامم ہونے کا ذکر۔

۲۳۔ جنگ بدر کی روئیداد۔

۲۴۔ یہود کے بارے میں پیشگوئی۔

۲۵۔ حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد فتنہ ارتداد کا تذکرہ۔

۲۶۔ غزوہ احد کی عبرت ناک تصویر کشی۔

۲۷۔ خانہ کعبہ کا امتیاز وفضلیت۔

۲۸۔ حیات شہداء اور اس کی تفصیل۔

۲۹۔ مانعین زکوٰۃ کا عذاب۔

۳۰۔ جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت۔

۳۱۔ خیرات کی ترغیب اور اس کی قبولیت کی شرط۔

۳۲۔ جناب یحییٰ علیہ السلام کا قصہ۔

۳۳۔ کتب سابقہ تورات وانجیل وغیرہ کی تصدیق۔

۳۴۔ قیامت کا تذکرہ۔

۳۵۔ موت کی حقیقت اور اسے یاد کرنے کی تاکید۔

۳۶۔ اہل ایمان کی تعریف۔

۳۷۔ سب انبیاء دین اسلام کے داعی تھے۔

۳۸۔ ہمارے پیغمبر خاتم انبیاء ومرسلین کے تصدیق کرنے والے ہیں۔

۳۹۔ عقیدہ تثلیث کا سخت محاسبہ۔

۴۰۔ باہمی اتفاق اور اخوت اسلامی کے جذبہ سے سرشار ہونے کا حکیمانہ حکم وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ اس سورہ مبارکہ کی تفسیر میں مناسب مقامات پر ان امور کی بقدر ضرورت وضاحت کی جائے گی۔ انشاءاللہ۔

شان نزول

ہمارے علامہ طبرسیؒ اور برادران اسلامی کے فاضل نیشاپوری وغیرہ تمام مفسرین نے اس سورہ کی شان

نزول نصاریٰ نجران کو قرار دیا ہے۔ جو دین اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحقیق وتمحیص کے لئے مدینہ آئے تھے۔ جس کی تفصیل آیت مباہلہ کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

نیز ان حضرات نے لکھا ہے کہ اس سورہ کی اسی (۸۰) سے زیادہ ابتدائی آیات آیت مباہلہ تک انہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ (مجمع البیان وغرائب القرآن وغیرہ)۔ اسی لیے اس سورہ کا آغاز توحید پروردگار سے ہوا ہے۔

آیات القرآن

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ الٓمّٓ ۟ۙ ۱ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الۡحَىُّ
الۡقَيُّوۡمُ ؕ ۲ نَزَّلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَاَنۡزَلَ
التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ ۙ ۳ مِنۡ قَبۡلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ اِنَّ
الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُو
انۡتِقَامٍ ۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخۡفٰى عَلَيۡهِ شَىۡءٌ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ؕ ۵
هُوَ الَّذِىۡ يُصَوِّرُكُمۡ فِى الۡاَرۡحَامِ كَيۡفَ يَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِيۡزُ
الۡحَكِيۡمُ ۶ هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ
اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ
فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ ۚ وَمَا
يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ
مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۷

ترجمة الآيات

"شروع (کرتا ہوں) اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان' نہایت رحم کرنے والا ہے)۔

الف۔لام۔میم۔(۱)اللہ ہی (کی ذات) ہے جس کے علاوہ کوئی اِلٰہ نہیں ہے زندہ (جاوید) ہے جو (ساری کائنات کا) بند وبست کرنے والا ہے۔(۲)اسی نے آپ پر حق کے ساتھ وہ کتاب اتاری ہے جو اس سے پہلے موجود (آسمانی کتابوں) کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات وانجیل نازل کی۔اور (حق وباطل کا) فیصلہ کن کلام نازل کیا۔بلا شبہ جو لوگ آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ان کے لئے بڑا سخت عذاب ہے خدا زبردست ہے (اور برائی کا) بدلہ لینے والا ہے۔(۴) بے شک خدا پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے زمین میں اور نہ آسمان میں۔(۵) وہ (خدا) وہی ہے جو ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے، تمہاری صورتیں بناتا ہے۔اسکے سوا کوئی اللہ نہیں ہے وہ زبردست اور بڑی حکمت والا ہے (۶) وہ وہی ہے جس نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جس میں کچھ آیتیں تو محکم ہیں جو کتاب کی اصل و بنیاد ہیں اور کچھ متشابہ ہیں اب جن لوگوں کے دلوں میں کجی (ٹیڑھ) ہے تو وہ فتنہ برپا کرنے اور من مانی تاویلیں کرنے کی خاطر متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں حالانکہ خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں مضبوط و پختہ کار ہیں اور کوئی ان کی تاویل (اصل معنی) کو نہیں جانتا۔ جو کہتے ہیں کہ ہم اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں یہ سب (آیتیں) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت کا اثر صرف عقل والے ہی لیتے ہیں۔(۷)

تشریح الالفاظ

(۱)القیّوم اس کے معنی ہیں وہ ذات جو خود بخود قائم ہو اور وہ ذات جس کی ابتداء نہ ہو۔

(۲)عزیز اس کے معنی ہیں شریف قوی یعنی توانا، قادر اور معزّز

(۳)محکمات یہ محکم کی جمع ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی مراد ہر اس شخص پر واضح ہو جو عربی زبان اور اس کے قواعد کو جانتا ہو اور جو اس طرح نہ ہو اسے متشابہ کہا جاتا ہے

تفسیر الآیات

الٓمّٓ......الآیۃ

اس کے متعلق سورہ بقرہ کے آغاز میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ حروف ان متشابہات میں سے ہیں اور قدرت کے وہ راز ہیں کہ جن کی حقیقت خدا اور راسخون فی العلم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ......الآیۃ

اس آیت کی تفسیر آیت الکرسی کے آغاز میں بیان کی جا چکی ہے۔ وہاں رجوع کیا جائے۔

نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ...الآیۃ

قرآن جو سابقہ آسمانی کتابوں کی بشمول تورات و انجیل کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اس تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ توحید ہو یا دیگر اصول دین وہ تمام انبیاء کی تعلیمات میں مشترک ہیں قرآن بھی وہی بتا رہا ہے یہ قرآن یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص خصوصیت نہیں ہے بلکہ قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آکر ان تمام انبیاء اور ان کی کتابوں کی تصدیق کی ہے نیز اس تصدیق کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ چونکہ ان کتابوں میں اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی شریعت کی خوشخبری دی گئی تھی۔ لہٰذا قرآن و اسلام کا آجانا ان کتابوں کی صداقت کی عملی تصدیق ہے۔ اگرچہ "مابین یدیہ" میں تورات و انجیل بھی داخل تھیں۔ مگر مقتضائے حال کے مطابق خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی اصطلاح میں جب لفظ "تورات" بولا جائے تو اس سے خدائے تعالیٰ کی وہ وحی مراد ہوتی ہے جو اس نے جناب موسیٰؑ ابن عمران علیہ السلام پر نازل کی تھی اور لفظ "انجیل" سے خدا کی وہ وحی مراد ہوتی ہے جو اس نے جناب عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر نازل کی تھی مگر قرآن کہیں اشارتاً اور کہیں صراحتاً یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے پاس جو تورات و انجیل موجود ہے۔ وہ اصلی نہیں ہے بلکہ تحریف شدہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "مِنَ الَّذِیۡنَ ھَادُوۡا یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ" (سورہ النساء آیت۔ ۴۶)۔

نیز فرماتا ہے "وَمِنَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰۤی اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَھُمۡ فَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوۡا بِہٖ"۔ (سورہ المائدہ آیت۔ ۱۴)۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے "یٰۤاَھۡلَ الۡکِتٰبِ قَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمۡ

كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ''(سورہ مائدہ آیت۔۱۵)
بایں ہمہ یہود ونصاریٰ اوران کے مبلغین عوام الناس کودھوکہ دینے کی خاطر کہا کرتے ہیں کہ قرآن ان کی کتابوں کی صداقت کا اعتراف کرتا ہے حالانکہ وہ ان کے منحرف ہونے کا اعلان کررہا ہے۔اوراب تو اس تحریف کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔کہ ان کتابوں کا ہر زبان کا ہر ایڈیشن دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔

بہر حال تورات جو کہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی شریعت کے ہیں اہل کتاب کے نزدیک پانچ اسفار کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔۱۔سفر تکوین۔۲۔سفر خروج۔۳۔سفر تثنیہ۔۴۔سفر الا ولین۔۵۔سفر عدد۔یہ پانچ اسفار قریباً انتالیس (۳۹) اسفار کا مجموعہ ہیں اوراس مجموعہ کوعہد قدیم کہا جاتا ہے۔

اورانجیل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بشارت کے ہیں اورنصاریٰ کے ہاں انجیلیں چار ہیں۔۱۔انجیل متی۔۲۔انجیل مرقص۔۳۔انجیل لوقا۔۴۔انجیل یوحنا۔اور یہ ستائیس (۲۷) اسفار کا مجموعہ ہیں اوراس مجموعہ کوعہد جدید کہا جاتا ہے۔

الغرض عہد قدیم کا تعلق جناب موسیٰ علیہ السلام سے ہے جبکہ عہد جدید کا تعلق جناب عیسیٰ علیہ السلام سے ہے (تفسیر کاشف)۔

وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ...الآیۃ

اس میں قدرے اختلاف ہے کہ الفرقان سے کیا مراد ہے؟ عقل۔زبور یا معجزہ؟

حق یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے کیونکہ قرآن کے مختلف ناموں میں سے ایک صفاتی نام فرقان بھی ہے ''تَبٰرَكَ الَّذِيۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰى عَبۡدِهٖ لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا''(سورہ فرقان آیت۔۱)۔اوراسے فرقان اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ حق و باطل میں تفرقہ کا ذریعہ ہے جس طرح ''مَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ''میں تورات وانجیل داخل تھیں۔مگران کی اہمیت کے پیش نظر بعد میں ان کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔اسی طرح ''انزل الکتاب''میں گو الفرقان بھی داخل تھا۔مگر اس کی عظمت کے پیش نظر بعد میں اس کا خاص طور پر نام لیا گیا۔

مگر آئمہ اہل بیتؑ کے اخبار وآثار سے واضح وآشکار ہوتا ہے۔کہ ''الفرقان''اسی کتاب یعنی قرآن مجید کا وہ حصہ ہے جو آیات محکمات پر مشتمل ہے (کافی۔عیاشی۔صافی وبرہان وغیرہ)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخۡفٰى عَلَيۡهِ...الآیۃ

اسی آیت مبارکہ میں ان مشرکین کی رد کی گئی ہے جو عزیر علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یعنی خدا مانتے

ہیں۔ کہ خدا تو وہ ہوتا ہے جس پر زمین و آسمان یعنی پوری کائنات کی کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو اور پھر اس کا یہ علم جہاں احاطی ہو وہاں ذاتی بھی ہو۔ مگر یہ حضرات تو صرف اس قدر جانتے ہیں جس قدر خدا انہیں بتاتا اور سکھاتا ہے تو پھر وہ خدا یا خدا کے بیٹے اور شریک کس طرح ہو سکتے ہیں جبکہ ان کا یہ علم نہ احاطی ہے اور نہ ذاتی بلکہ جو کچھ ہے وہ عطائی ہے پس لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی...الآیۃ

اس آیت سے بھی یہود و نصاریٰ اور دوسرے ان تمام مشرکین کی رد مقصود ہے جو مخلوق کو خالق، عبد کو معبود اور بندہ کو خدا کہتے ہیں۔ محض اس لیے کہ کوئی باپ کے بغیر پیدا ہوا ہے، کسی نے (باذن اللہ) کوئی مردہ زندہ کیا ہے یا (باعلام اللہ) کوئی غیبی خبر دی ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ خدا وہ ہے جو رحم مادر میں بچہ کی صورت گری کرتا ہے اور یہ صورت گری بھی کئی تاریک حجابوں کے اندر ہوتی ہے اور خالق اکبر کی تخلیق کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش کائنات سے لے کر آج تک ہر مولود کی شکل الگ ہے اور عقل الگ ہے باوجود یکہ ان سب کے اعضاء و جوارح محدود و متعین ہیں مگر سب کی نہ صرف یہ کہ شکل و صورت جدا جدا ہے۔ بلکہ ان کے نقوش اور لکیریں بھی علیحدہ علیحدہ ہیں اسی لیے انگوٹھا لگایا جاتا ہے کیونکہ اس علم کے ماہرین جانتے ہیں کہ ہر شخص کے انگوٹھے کے نقوش دوسرے شخص کے نقوش سے نہیں ملتے بلکہ جدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ چیز کسی قادر مطلق اور علیم و حکیم صانع کی ہستی کا قطعی ثبوت نہیں ہے؟

الغرض خدا وہ ہے جو شکم مادر میں بچہ کی صورت گری کرتا ہے۔ وہ خالق ہے، موجد ہے، مبدع ہے اور مصور ہے۔ جو مخلوق ہو، جو خود رحم مادر میں رہا ہو وہ کسی طرح بھی خدا نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ جو بعض مخالف عقل و نقل اور ناقابل اعتماد و اعتبار اخبار میں بعض محترم ذوات مقدسہ کی طرف ''مصور من فی الارحام'' ہونے کی نسبت دی گئی ہے وہ بالکل باطل اور بے بنیاد ہے اور ''شرك افعالی'' کے زمرے میں آتی ہے۔ واللہ العاصم۔

قرآن میں محکم آیات بھی ہیں اور متشابہ بھی

مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ...الآیۃ

چونکہ قرآنی دعوت تمام لوگوں کو شامل ہے جن میں عالم و جاہل، ذہین و کند ذہن وغیرہ سب داخل ہیں نیز معانی و مطالب بھی کچھ ایسے سلیس اور آسان ہوتے ہیں کہ درس و تدریس کے بغیر ہی سمجھ میں آجاتے ہیں اور کچھ ایسے دقیق و عمیق ہوتے ہیں جو درس تدریس و تحقیق عمیق کے بعد سمجھ میں آتے ہیں نیز کبھی کسی بات کے مبہم رکھنے

میں مصلحت بھی ہوتی ہے اس لیے ضرورت تھی کہ قرآن حکیم میں آیات محکمات بھی ہوں اور متشابہات بھی۔

محکم و متشابہ کی تعریف

اب رہی یہ بات کہ محکم کسے کہتے ہیں۔ اور متشابہ کیا ہے؟ اگر چہ ان کے مختلف مفہوم بیان کیے گئے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کی بہترین تعبیر وتشریح یہ ہے کہ محکم وہ ہے جس کی مراد ہر اس شخص پر بالکل واضح وعیاں ہو جو عربی زبان اور اس کے قواعد ہ ضوابط کو اچھی طرح جانتا ہے کیونکہ محکم کے معنی اس طرح واضح ہوتے ہیں۔ جو کسی قرینہ کے محتاج نہیں ہوتے جیسے ''قُلۡ هُوَاللّٰهُ اَحَد'' یا جیسے ''اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡر'' (سورہ بقرہ آیت ۲۰ و۔۔۔۔)۔ یا جیسے۔ ''لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ'' (سورہ شوریٰ آیت۔۱۱)۔ وغیرہ وغیرہ جیسی آیات ہیں یہی آیات ام الکتاب ہیں اور یہی تعلیمات کی اساس وبنیاد ہیں۔ اور ''متشابہ'' وہ ہے کہ جس کی مراد زبان دان اور واقف الفاظ ومعانی پر بھی مبہم اور غیر متعین ہو۔ اور متکلم کا مطلب واضح نہ ہو۔ بلکہ مشتبہ ہو۔ اور اس اشتباہ کے کئی علل واسباب ہوتے ہیں جیسے

(۱۔) لغت وعرف کے لحاظ سے اس لفظ کے کئی ایک معنی ہوتے ہیں اور معلوم نہیں ہو پا تا کہ یہاں کون سے معنی مراد ہیں جیسے لفظ ''قرء'' جو کہ حیض و طہارت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ''وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ'' (سورہ بقرہ آیت۔۲۲۸)۔

(۲۔) ایک لفظ کے کئی معنی ہیں اور جو عام طور پر مراد ہوتے ہیں عقل ان کا انکار کرتی ہے جیسے ''ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ'' (سورہ اعراف آیت۔۵۴)۔ ''عرش'' کے عمومی معنی چار پائی کے ہیں جس کا خدا کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یا جیسے ''كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ وَّ يَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ'' (سورہ رحمن آیت۔۲۶،۲۷)۔ ''وجہ'' کے عمومی معنی چہرہ کے ہیں جو یہاں مراد نہیں لئے جاسکتے

(۳۔) یا ایک لفظ عام ہے جو بظاہر تمام مکلفین کو شامل ہے مگر اس سے مراد بعض افراد ہیں جیسے ''السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقۡطَعُوۡٓا اَيۡدِيَهُمَا'' (سورہ مائدہ آیت۔۳۸) جبکہ معلوم ہے کہ اگر کوئی باپ بیٹے کا مال چرائے یا قحط کے زمانے میں چوری کرے یا ربع دینار سے کم مال کی چوری کرے یا غیر محفوظ جگہ سے چرائے تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔

(۴۔) یا وہ حکم منسوخ ہو چکا ہو مگر آدمی کو اس کا علم نہ ہو جیسے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔

(۵۔) یا جس کے اجمالی معنی تو معلوم ہوں مگر تفصیل کا علم انسانی عقل وفہم کی حد سے ماوراء ہو جیسے

''روح'''' فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ''(سورہ انبیاءآیت ۔۹۱) ۔وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر پورے قرآن کو''محکم'' کہا گیا ہے جیسے''الٓرٰ وقف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُه''(سورہ ہود آیت ۔۱) یا پورے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے جیسے''اللهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا''۔(سورہ زمر آیت ۔۲۳) تو یہ مختلف حیثیتوں سے ہے محکم اس اعتبار سے ہے کہ وہ فصاحت الفاظ و بلاغت معانی کے لحاظ سے نہایت ہی محکم کتاب ہے اور متشابہ اس اعتبار سے ہے کہ آغاز سے انتہا تک فصاحت و بلاغت احکام واتقان اور بے عیب ولا ریب ہونے میں ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ اور اعجاز کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ اور کچھ محکم اور کچھ متشابہ اس لحاظ سے ہے جس کی اوپر ابھی وضاحت کی گئی ہے۔ لہٰذا ان آیات میں کوئی تناقض واختلاف نہیں ہے بہرحال جب محکم و متشابہ کا صحیح مفہوم واضح ہو گیا تو اب خداوند عالم نے مختلف لوگوں کی روش ورفتار کا تذکرہ فرمایا ہے کہ جو سلیم الفطرت ہوتے ہیں وہ تو محکمات کی پیروی کرتے ہیں اور متشابہات کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ متشابہات کی کوئی مناسب تاویل کر کے محکمات کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کو متکلم کی مراد جانتے ہیں اور ان کی کوئی ایسی توجیہ و تاویل نہیں کرتے جو دین و مذہب کے مسلمات اور آیات محکمات کے خلاف ہو۔ اور یہی احتیاط و سلامتی کا راستہ ہے مگر جن لوگوں کے دل ٹیڑھے ہوتے ہیں اور ارادوں میں کجی اور نیتوں میں فتور ہوتا ہے وہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور پھر ان کی من مانی تاویلیں کر کے اور خواہش کے مطابق معانی نکال کر اپنے مقاصد باطلہ کی تائید کر کے لوگوں کے دلوں میں وسوسے اور شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں اور ان کو گمراہ اور بدراہ کرتے ہیں اور فتنہ وفساد کی آبیاری کرتے ہیں اور اپنی مطلب براری کرتے ہیں اس لیے قرآن وسنت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے۔

اللہ اور راسخون فی العلم کے علاوہ متشابہات کی تاویل کوئی نہیں جانتا

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ...الآية

اس میں سخت اختلاف ہے کہ لفظ''الله'' پر وقف ہے اور''والراسخون'' مبتداء اور''يقولون''اس کی خبر اور یہ جملہ مستأنفہ ہے۔ یا''الراسخون فی العلم'' پر وقف ہے اور اس کا عطف''الّا'' کے تحت میں کلمہ''الله'' پر ہے اور''يقولون'' جملہ حالیہ ہے؟۔ پہلے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف خدا ہی متشابہات کی تاویل جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا اور جو''وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ'' ہیں وہ سر تسلیم خم کر کے صرف یہ کہتے ہیں کہ سب کچھ محکم و متشابہ اللہ کی جانب سے ہے لہٰذا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور دوسرے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا۔

کہ خدا اور راسخون فی العلم کے سوا اور کوئی ان کا مطلب نہیں جانتا۔ یعنی خدا کے علاوہ ''وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ '' بھی جانتے ہیں ظاہر ہے کہ اگران کا آیات کا مفہوم خدا کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا اور نہ ہی جان سکتا ہےاورتو قابل غور بات یہ ہے کہ پھران کے نازل کرنے کا فائدہ کیا ہے؟

اب بر داران اسلامی کے اکثر مفسرین نے ''الاِّاللہ ''پر اور ہمارے اکثر مفسرین نے ''وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ ''پر وقف کیا ہے۔فاضل حقانی ان چند جید علماء میں سے ہیں جوالا اللہ پر وقف کے قائل نہیں ہیں لکھا ہے۔''اور مجاہد اور ربیع اور اکثر متکلمین اور جمہور معتزلہ کہتے ہیں کہ ''والراسخون'' کا عطف ''اللہ'' پر ہے اس تقدیر پر معنی ہوں گے کہ علماء ربانی بھی متشابہات کو جانتے ہیں کیونکہ بندوں سے کلام کیا گیا ہے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس کو کوئی بھی نہ سمجھے ورنہ اس کے نازل کرنے کا کیا فائدہ تھا والعلم عند اللہ ''(تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۳۸)۔

والراسخون فی العلم کون ہستیاں ہیں؟:

اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے اور اس میں مختلف اقوال ہیں ہماری اکثر احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔

۱۔ چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:''ذالك القرآن الصامت وانا القرآن الناطق ''۔ ۲۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا۔''نحن وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ نَحۡنُ نَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَه ''،یعنی ہم وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ ہیں اور ہم اس کی تاویل جانتے ہیں۔(کافی،عیاشی وصافی)۔

۳۔ایک دوسری حدیث میں اس کے ساتھ یہ تتمہ بھی ہے:

'فرسول اللہ افضل الرّاسخین فی العلم قد علمه اللہ عزوجل جمیع ما انزل علیه من التنزیل و التاویل و ما کان اللہ لینزل علیه شیئا لم یعلمه و اوصیائه من بعدہ یعلمون ''۔یعنی سب راسخون فی العلم سے افضل حضرت رسول خدا ہیں خدا نے ان پر جو کچھ نازل کیا ہے انہیں اس کی تنزیل وتاویل کا علم عطا فرمایا ہے اللہ ایسا نہیں ہے کہ آپ پر کچھ نازل فرمائے اور پھر انہیں اس کی تاویل نہ بتائے اور آپؐ کے بعد آپ کے اوصیاء اس تمام علم کے عالم ہیں۔(کافی،عیاشی،صافی)

۴۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''والراسخون فی العلم آل محمد'' راسخون فی العلم سے مراد ہم آل محمد علیہ السلام ہیں(تفسیر عیاشی وبرہان)۔

۵۔حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تلاوت کر کے فرمایا ''و نحن نعلمه ''یعنی ہم اس کی تاویل کو جانتے ہیں (تفسیر عیاشی و برہان) فاضل بلاغی نے آلاء الرحمن میں مبسوط علمی بحث کر کے سنی و شیعہ اخبار و آثار سے واضح و آشکار کیا ہے کہ تاویل قرآن کا علم خدا کے خاص بندوں کو ہوتا ہے اور خاص بندے ''والراسخون فی العلم ''ہیں۔انہی حقائق کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی اهلبیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا بعدی و انهما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض''(حدیث متواتر) ولنعم ماقیل

محکم کہیں کہیں متشابہ تیرا کلام یارب عجیب راز یہ قرآن میں بھر دیا
اب تک مفسروں کا الجھنا دلیل ہے دنیا کو اہل بیت کا محتاج کر دیا

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا ...الآية۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن میں محکم و متشابہ کیوں موجود ہیں؟ اور متشابہ کو محکم کی طرف کس طرح لوٹانا چاہیئے؟ ان حقائق کو صاحبان عقل و فکر ہی سمجھ سکتے ہیں چنانچہ امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ فرمایا:

''من رد متشابه القرآن الی محکمه هدی الی صراط مستقیم''۔یعنی جو شخص قرآن کے متشابہ آیات کو اس کے محکم آیات کی طرف لوٹاتا ہے اسے سیدھے راستہ کی ہدایت کی گئی ہے۔(تفسیر صافی)

آیات القرآن

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ
إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ⑧ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ⑨ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ
أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ⑩
كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ
فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ⑪

ترجمۃ الآیات

(جو دعا کرتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! ہمیں سیدھے راستہ پر لگانے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ ہونے دے اور ہمیں اپنی جناب سے رحمت عطا فرما۔ یقینا تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔(۸) اے ہمارے پروردگار! بے شک تو ایک دن سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے جس (کے آنے) میں کوئی شک نہیں ہے۔ بلا شبہ خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔(۹) بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا۔ اللہ کے یہاں ان کے مال اور اولاد ہرگز ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے اور یہی لوگ جہنم کا ایندھن ہیں۔(۱۰) ان کا حال (معاملہ بھی وہی ہے) کہ جو فرعونی گروہ اور اس سے پہلے لوگوں کا تھا کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو گرفت میں لے لیا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے(۱۱)

تشریح الالفاظ

(۱) زیغٌ — اس کے معنی میں حق سے انحراف اور شک

(۲) وقُودالنار — وقود کے معنی ہیں ایندھن

(۳) کدأب — دأب کے معنی ہیں عادت، شان اور حالت

تفسیر الآیات

اہل ایمان کو استقامت اور ثابت قدمی کی دعا کرنی چاہیے

رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا ...الآیۃ

اہل ایمان کی یہ شان ہے کہ وہ دعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''ربنا لا تزغ قلوبنا.....۔''یعنی ہمیشہ اپنی توفیق ہمارے شامل حال رکھ۔ اور کبھی اسے ہم سے سلب نہ کر اور ہمیں ہمارے نفس امارہ کے حوالے نہ کر ورنہ ہم ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایک دعا میں وارد ہے'' اللهم لا تکلنی الی نفسی طرفة عین الا فهلکت ''یعنی یا اللہ! آنکھ کے جھپکنے تک بھی مجھے اپنے نفس کے حوالے نہ کرنا ورنہ میں ہلاک ہو

جاؤں گا۔(مفاتیح الجنان)۔''اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ''۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا: ''اکثروا من ان تقولوا ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا ولا تأمنوا الزیغ''۔یعنی یہ دعا بکثرت پڑھا کرو اور دلوں کی کجی سے مامون رہو۔(عیاشی' صافی)۔

نیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ فرمایا۔ایک سخت دور آئے گا کہ دین حق پر قائم رہنا اس طرح مشکل ہوگا جس طرح ہتھیلی پر آگ کا انگارہ اٹھانا۔آدمی صبح ایمان کی حالت میں کرے گا مگر شام کو بے ایمان ہوگا۔شام ایمان کی حالت میں کرے گا مگر صبح کے وقت بے ایمان ہو چکا ہوگا۔(حق الیقین' علامہ مجلسی وفاصل سید شبر)۔

نیز جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہی مروی ہے فرمایا: ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ علم مفقود ہوگا امام غائب ہوگا اور لوگ پریشان حال ہوں گے۔اور اس حال میں وہی لوگ سلامت رہیں گے جو دعائے غریق پڑھیں گے۔عرض کیا گیا وہ کیا ہے فرمایا۔''یا اللہ یا رحمن یا رحیم یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك''۔(کتاب الاقبال' بحار الانوار' ابواب الدعاء)۔لہٰذا اہل ایمان کو ہمیشہ خدا سے استقامت اور خاتمہ بالخیر کی دعا مانگنی چاہیے۔کیونکہ

کام وہ اچھا ہے جس کا انجام اچھا ہے

اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے اولاد اور جائیداد پر اعتماد روا نہیں ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا...الآیۃ

انسان کی یہ طبعی کمزوری ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس اولاد و جائیداد ہے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے جیسا کہ خدا نے خبر دی ہے کہ۔''اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی''(سورہ علق آیت۔۶،۷)۔ اس لیے اس کا یہ غرور وتکبر اسے اپنے باطل نظریات کو چھوڑ کر حق کے دامن کو تھامنے کی اجازت نہیں دیتا اور وہ یہ خیال کرتا ہے کہ مشکل وقت آنے پر اس کا یہ مال اور یہ اہل وعیال اس کی مدد کریں گے مگر وہ اپنی کم علم وعقل کی وجہ سے نہیں سوچتا کہ اس سے پہلے بڑے بڑے جاہ وحشمت والے لوگ جیسے فرعون اور اس کا گروہ' نمرود اور اس کا لاؤ لشکر اور شداد اور اس کے حشم وخدم گزر چکے ہیں اور جب ان پر مشکل وقت آیا تو ان کا مال' اہل وعیال اور سارا جاہ وجلال کچھ بھی کام نہیں آیا اور انہیں خدا کے عذاب اور اس کی گرفت سے کوئی چیز نہ بچا سکی۔تو اس کی حقیقت

کیا ہے اس لیے خدائے مہربان اس کو متنبہ کر رہا ہے کہ ایسے لوگ یاد رکھیں کہ ان کی اولاد و جائیداد اللہ کے یہاں ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی اور اس کے عذاب اور اس کی سخت گرفت سے بچا نہیں سکے گی۔

کیونکہ ع

دیر گیر و سخت گیر دمر ترا

خدا بلا سبب کسی قوم یا فرد پر عذاب نازل نہیں کرتا

كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا...الآیۃ

اس آیت میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ خدا بلا وجہ کسی قوم یا شخص پر عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ یہ تباہی و بربادی اس کے ذاتی اعمال بد کا طبعی وفطری نتیجہ ہوتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ" (سورہ رعد آیت۔۱۱)۔

یعنی

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

جیسا کہ اس نے فرعونی گروہ اور اس سے پہلے والوں کے ساتھ کیا تھا۔ اسکا وعدہ ہے کہ "لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ" (سورہ ابراہیم آیت۔۷) یعنی اگر تم میری نعمتوں کا شکریہ ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں اور اضافہ کروں گا۔ اور یہ وعید و تہدید بھی ہے کہ۔ "وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ" (سورہ ابراہیم آیت۔۷) یعنی اگر تم نے کفران نعمت کیا تو پھر یاد رکھو میری گرفت بھی بڑی سخت ہے الامان یا رحمن۔

آیات القرآن

قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ وَتُحۡشَرُوۡنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ
الۡمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدۡ كَانَ لَكُمۡ اٰيَةٌ فِىۡ فِئَتَيۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىۡ
سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَاُخۡرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوۡنَهُمۡ مِّثۡلَيۡهِمۡ رَاۡىَ الۡعَيۡنِ ؕ وَاللّٰهُ
يُؤَيِّدُ بِنَصۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِى الۡاَبۡصَارِ ﴿۱۳﴾ زُيِّنَ

لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ
وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ⑭

ترجمۃ الآیات

(اے رسول !) کافروں سے کہہ دو کہ عنقریب تم (اہل اسلام کے مقابلہ میں) مغلوب ہوں گے اور جہنم کی طرف محشور ہوں گے اور وہ کیا بری آرام گاہ ہے (۱۲) تمہارے لیے ان دو گروہوں (کے حالات) میں جن کی (میدان بدر میں) مڈبھیڑ ہوئی تھی (صداقت رسول کی) ایک بڑی نشانی (معجزہ) موجود ہے۔ ایک گروہ خدا کی راہ میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا جنکو (مسلمان) اپنی آنکھوں سے دوگناہ دیکھ رہے تھے اور اللہ اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے' تائید وتقویت کرتا ہے بے شک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ونصیحت ہے نگاہ (عبرت رکھنے) والوں کے لیے۔ (۱۳) لوگوں کے لیے خوش نما بنا دی گئی ہے (عمدہ) گھوڑے' چوپائے اور کھیتی باڑی۔ یہ سب (چیزیں) دنیاوی زندگی کا اثاثہ اور متاع ہیں جبکہ (آخرت کا) اچھا ٹھکانہ اور بہترین انجام خدا کے یہاں ہے۔ (۱۴)

تشریح الالفاظ

(۱) القناطیر یہ قنطار کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک وزن جس کی مقدار مختلف اوقات میں مختلف ہوتی رہی ہے سو رطل، اور بہت سا مال

(۲) والخیل المسوّمة جس کے معنی ہیں داغ لگائے ہوئے گھوڑے جوان کے عمدہ ہونے کی علامت ہے

(۳) الانعام یہ نَعَمْ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں اونٹ اور مویشی (چارپائے)

(۴) متاع اس کے معنی ہیں سونے چاندی کے علاوہ زندگی کا سامان، ہر وہ فانی چیز جس کے کچھ فائدہ اٹھایا جائے اور پھر وہ فنا کی نذر ہو جائے

تفسیر الآیات

یہود کے لئے انجام بد کی دھمکی

قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا...الآیۃ

صاحب مجمع البیان وغیرہ مفسرین نے اس آیت کی شان نزول یہ بیان کی ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جنگ بدر کی فتح کے بعد واپس مدینہ تشریف لائے تو یہود کو جمع کر کے فرمایا ''تم اسلام قبول کرلو ورنہ تمہارا انجام بھی مشرکین عرب جیسا ہوگا۔ اس پر انہوں نے بیٹھ کر کہا کہ آپ کو نا تجربہ کار لوگوں سے واسطہ پڑا ہے اگر جنگ میں ہم ہوتے تو آپ کو پتہ چلتا کہ ہم کیسے لوگ ہیں؟ اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی اور خداوند عالم نے اس طرح اپنا وعدہ وفا فرمایا کہ مسلمانوں نے بنی قریظہ کو قتل کیا۔ بنی نضیر کو جلا وطن کیا۔ خیبر کو فتح کیا اور دوسرے یہودیوں پر فدیہ عائد کیا (مجمع البیان وغیرہ)

مخفی نہ رہے کہ اس آیت میں طنزیہ طور پر دوزخ کو ''آرام گاہ'' کہا گیا ہے۔

جنگ بدر کے واقعہ کا بیان

قَدۡ کَانَ لَکُمۡ اٰیَۃٌ...الآیۃ

اس آیت میں باتفاق مفسرین جنگ بدر کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں حزب الرحمن اور حزب الشیطان کے درمیان بمقام ''بدر'' ۲ ہجری رمضان المبارک بروز جمعہ مڈبھیڑ ہوئی تھی اور یہ کفر و اسلام کے مابین پہلا معرکہ تھا۔ فریقین کے لاؤ لشکر اور سامان حرب و ضرب کی کیفیت یہ تھی کہ کفار کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی اور سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے ان کے ساتھ تھے اور نیزوں، تلواروں اور ہتھیاروں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ اور سامان جنگ کے لحاظ سے انتہائی کمزور تھے ان کے پاس اسلحہ جنگ میں آٹھ تلواریں، سات زرہیں، دو گھوڑے اور چند اونٹ تھے۔ علم لشکر حضرت امیر علیہ السلام کے ہاتھ میں تھا اس کے باوجود کفار کو بری طرح زک اٹھانا پڑی ان کے ستر آدمی قتل اور ستر اسیر ہوئے اور باقی ماندہ افراد نے راہ فرار اختیار کی۔ مسلمانوں میں صرف چودہ آدمی شہید ہوئے۔ حضرت امیر علیہ السلام کی تلوار سے قتل ہونے والوں کی تعداد پینتیس (۳۵) تھی یعنی جتنی تعداد کل مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئی اتنی تنہا حضرت امیر علیہ السلام کے ہاتھ سے ماری گئی اور اس روز سے مسلمان ایک بڑی طاقت سمجھے جانے لگے اور دیگر تمام اسلامی فتوحات اسی پہلی فتح و کامرانی کا

نتیجہ ہیں جس میں خدائے قدیر نے اپنی تائید ونصرت سے قلت کو کثرت پر غلبہ عطا فرمایا۔ چنانچہ فرمایا۔''كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ'' (سورہ بقرہ آیت۔۲۴۹)

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ ...الآية

''جن کو دوگنا دیکھ رہے تھے''۔کون............کس کو............دوگنا دیکھ رہا تھا؟ اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے فاضل نیشاپوری نے غرائب القرآن میں چار احتمال ذکر کیے ہیں۔مگر مشہور دو احتمال ہیں۔

(۱) مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ کافران سے دوگنا ہیں حالانکہ واقع میں وہ تگنے سے بھی زیادہ تھے کیونکہ مسلمان کل تین سو تیرہ تھے اور کفار ایک ہزار کے لگ بھگ۔اس میں یہ حکمت الٰہی کارفرما تھی کہ وہ کفار کی اصل تعداد کو محسوس نہ کریں تا کہ ہمت نہ ہاریں۔اور اپنے سے کم یا برابر بھی نہ دیکھیں تا کہ جنگ میں سہل انگیزی سے کام نہ لیں۔ بلکہ جم کر لڑیں۔

(۲) مشرکین کی آنکھوں کو مسلمان دوگنے نظر آرہے تھے جس سے وہ مرعوب ہو گئے حالانکہ مسلمان ان سے بہت کم تھے۔

بہر حال اس قلیل التعداد جماعت کی فتح اور وہ بھی اس بے سروسامانی کی حالت میں تائید الٰہی اور نصرت ایزدی کا نتیجہ تھی۔اور اس طرح پہلی صورت میں اعجاز کا تعلق مسلمانوں کی اس فتح اور غلبہ سے ہے اور دوسری صورت میں اعجاز کا تعلق اس تاثر سے ہے اور بعد والی فتح اس اعجاز کا نتیجہ وثمرہ ہے''اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ''۔

زندگانی دنیا کی زیب وزینت اشیاء کا تذکرہ

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ...الآية

اس آیت مبارکہ میں اسلام وایمان کی مخالفت اور ہر قسم کی بدعملیوں اور بدکرداریوں کے علل واسباب کی نشاندہی کی جارہی ہے کہ وہ لذائذ نفس، زن و بچہ اور دیگر دنیاوی ساز وسامان کی محبت ہے اگرچہ دنیوی ساز وسامان اور بیوی و بچہ کی محبت فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں بلکہ وہ انسان کا ایک فطری تقاضا ہے جس میں کئی ایک تمدنی و معاشرتی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔لہٰذا اسلام جو کہ دین فطرت ہے کس طرح فطری تقاضوں کی ممانعت کرسکتا ہے؟۔ چنانچہ قرآن اعلان کرتا ہے:

''قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ''۔یعنی کہو کس

نے خدا کی اس زیب وزینت کوحرام قرار دیا ہے۔ جواس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور پاک وپاکیزہ روزی کوکس نے حرام قرار دیا ہے؟ (سورہ اعراف آیت۔ ۳۲)

''قُلۡ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ''یعنی کہوتمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں (سورہ مائدہ آیت۔ ۴)۔

ہاں البتہ اس محبت میں افراط جائز نہیں ہے اور جب دنیا وآخرت کے مفادات میں تصادم ہوتو دنیا کے مفادات کوآخرت کے مفاد پر ترجیح دینا روانہیں ہے بلکہ اس صورت میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آخرت کے مفاد کو دنیا پر ترجیح دی جائے۔ بنابریں اگر اسے'' آراستہ کردی گئی ہے''خوش نما بنائی گئی ہے''۔''دل آویز بنادی گئی ہے'' کا فاعل خدا کو سمجھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ہاں البتہ اس آراستگی اور دل آویزی سے اس قدر مغلوب ومتاثر ہونا کہ اخروی مفادات کونظر انداز کردیا جائے تو یہ شیطانی فعل ہے اور قابل مذمت ہے۔

بہرحال اس آیت میں ان لذائز دنیا کا تذکرہ کیا گیا ہے' جن پر آدمی فریفتہ ہوکر فخر ومباہات کرتا ہے۔اور گناہ عصیاں کرتا ہے وہ کل چھ چیزیں ہیں۔**و حب الدنیا رأس کل خطیئة**۔

۱۔عورت: اس سے مرد کوکس قدر محبت ہے؟ اور یہ محبت بعض اوقات آدمی کوکس طرح ہلاکت ابدی تک پہنچاتی ہے مرد وزن میں کس قدر جذب مقناطیسی ہے اور عورت کس طرح شیطان کا جال ہے؟ یہ باتیں اس قدر واضح ہیں کہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہیں۔

۲۔ بیٹا: جسے آدمی اپنا قائم مقام سمجھ کراوراپنے نام کی بقا کا ضامن سمجھ کر جان سے بھی زیادہ چاہتا ہے اور دنیا جہان میں یہ واحد فرد ہے جس کے لیے انسان چاہتا ہے کہ وہ اس سے بھی بڑھ جائے اسے قرآن نے فتنہ وآزمائش قرار دیا ہے۔اور چونکہ یہ آدمی کا قوت بازو اور مددگار رہوتا ہے اس لیے آدمی اس پر فخر وناز کرتا ہے۔

۳۔ مال ودولت: روپیہ پیسہ اس کی محبت اور اس کی وجہ سے غرور وسرور آدمی کو اندھا بنادیتا ہے ایک مالدار اسے قاضی الحاجات جانتا ہے اور مال ہے جو آدمی کو خدا اور رسولؐ سے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے اور بندے سے خدائی کا دعوی کراتا ہے اسے بھی قرآن نے فتنہ قرار دیا ہے۔

۴۔اعلی نسل کے عمدہ واعلی گھوڑے اور موجودہ دور میں اعلی موٹر کار یا ہر قسم کی اعلی سواری۔

۵۔گائے' بیل اور بھینس وبکری وغیر چوپائے اور مویشی اور موجودہ دور میں مشینی آلات وغیرہ۔

۶۔اور کھیتی باڑی اور موجودہ دور میں ملز اور کارخانے وغیرہ مگر یہ سب چیزیں صرف زندگانی دنیا کا ساز وسامان ہیں' جو خود دنیوی زندگی کی طرح عارضی وفانی ہیں۔لہٰذا گو قانون شرع کے مطابق ان چیزوں کی طلب

اور جمع آوری ممنوع نہیں ہے بلکہ دنیا و آخرت کے فوز و فلاح کا باعث ہے۔ ہاں البتہ ناجائز طریقوں سے ان کو حاصل کر کے ان میں اس قدر انہماک پیدا کیا جائے کہ آخرت یاد ہی نہ رہے یہ کوئی قابل رشک چیز نہیں ہے بلکہ اس کے حصول کیلئے عاجلانہ بلکہ احمقانہ اقدام سے انسان ہمیشہ کے لیے ان نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لیے خدا فرماتا ہے۔ ''وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ''۔ یعنی آخرت کا اچھا ٹھکانہ اور بہترین انجام خدا کے یہاں ہے۔ (سورہ آل عمران آیت۔ ۱۴)

آیات القرآن

قُلۡ اَؤُنَبِّئُكُمۡ بِخَيۡرٍ مِّنۡ ذٰلِكُمۡ‌ ؕ لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتٌ
تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا وَاَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضۡوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ‌ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ‌ۚ ۞۱۵ اَلَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ
لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ‌ۚ ۞۱۶ اَلصّٰبِرِيۡنَ وَالصّٰدِقِيۡنَ وَالۡقٰنِتِيۡنَ
وَالۡمُنۡفِقِيۡنَ وَالۡمُسۡتَغۡفِرِيۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ ۞۱۷ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ ۙ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًاۢ بِالۡقِسۡطِ‌ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِيۡزُ
الۡحَكِيۡمُ ؕ ۞۱۸

ترجمۃ الآیات

(اے رسول!) کہو۔ کیا میں تمہیں ان سب سے بہتر چیز بتاؤں؟ جن لوگوں نے پرہیز گاری اختیار کی ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں ایسے بہشت ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے (ان کے علاوہ) پاک و پاکیزہ بیویاں ہیں اور (سب سے بڑی نعمت) خدا کی خوشنودی ہے اور خدا (اپنے) بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔ (۱۵) (ان متقیوں کی صفت یہ ہے) کہتے ہیں (دعا کرتے ہیں) ہمارے پروردگار! بے شک ہم ایمان لائے ہیں تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں آتش دوزخ کے عذاب سے بچا۔ (۱۶) یہ

لوگ صبر کرنے والے ہیں (قول وفعل میں) سچ بولنے والے، اطاعت کرنے والے، راہ خدا میں خیرات کرنے والے اور سحر کے وقت طلب مغفرت کرنے والے ہیں (۱۷) خود اللہ، اس کے ملائکہ اور صاحبان علم گواہ ہیں کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور وہ عدل وانصاف کے ساتھ قائم وبرقرار ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے جو زبردست، حکمت والا (دانا) ہے (۱۸)

تشریح الالفاظ

(۱) قائمًا بالقسط قسط کے معنی عدل وانصاف کے ہیں

(۲) الحکیم اس کے معنی ہیں عالم اور وہ دانا جس کا کوئی قول وفعل حکمت سے خالی نہ ہو۔

تفسیر الآیات

اخروی نعمتوں کا تذکرہ

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ......الآیۃ

اور کہو میں تمہیں ان سب سے بہتر چیز بتاؤں جو خداوند حکیم نے نیکوکاروں اور پرہیزگاروں کے لئے آخرت میں مہیا کر رکھی ہیں۔

۱۔ ایسے سرسبز وشاداب باغات کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جہاں رنگ برنگ کے خوشبودار پھول وپھل، طائران خوش نوا کے زمزمے، اعلیٰ شان مکان اور پرتکلف مشروب وطعام اور رہائش وسواری کا عمدہ واعلیٰ انتظام ہے۔ الغرض "فیها ما تشتهیه الانفس و تلذّ به الاعین" یعنی جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جسے وہ خود چاہنے والے ہوں گے اور جسے دیکھ کر ان کی آنکھیں لطف اندوز ہوں گی۔

۲۔ صورت وسیرت میں یکتائے روزگار بیویاں جو تمام نسوانی عوارض وامراض از قسم حیض ونفاس وغیرہ سے منزہ ومبرا اور پاک وصاف ہوں گی۔

۳۔ ان سب سے بڑھ کر روحانی نعمت ہے جو رضائے الٰہی اور خوشنودی خدا ہے دوسری جگہ ارشاد ہے کہ "و رضوان من الله اکبر" یعنی خدا کی خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے............ یہی وجہ ہے کہ جو بلند ہمت انسان ہیں اور جو ذوات مقدسہ ہیں وہ جنت کے حصول کو بھی اپنا مقصود ومطلوب نہیں بناتے بلکہ اپنا اصلی

مقصد و مطمع نظر رضائے خدا کو قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے کہ۔ ''الهی ما عبدتك طمعاً فی جنتك ولا خوفاً من نارك بل وجدتك اهلاً للعبادة فعبدتك'' اور ظاہر ہے کہ جب رضائے خدا حاصل ہو جائے تو اس کے نتیجے میں جنت بھی ضرور حاصل ہو ہی جائے گی یہ ہیں وہ تین اخروی نعمتیں جو مذکورہ بالا چھ دنیاوی نعمتوں سے بہتر و برتر ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ ...الآية

یہ اور اس کے بعد والی آیت میں جو چھ قسم کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں یہ ان متقیوں کے ہیں جن کا تذکرہ سابقہ آیت میں کیا جا چکا ہے۔ (مجمع البیان والاء الرحمان)۔

۱۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ ہمارے گناہ معاف فرما کر ہمیں آتش دوزخ سے بچا۔

۲۔ صبر کرنے والے ہیں صبر کے معنی ہیں ''کف النفس عما لا ینبغی'' یعنی ناشائستہ قول و فعل سے نفس کو روکنا۔ اور زحمت برداشت کرنا خواہ وہ عبادت کی ادائیگی میں ہو............ یا خواہش نفس سے باز رہنے میں یا کسی اور بلا و مصیبت کے نازل ہونے پر۔

۳۔ سچ بولنے والے ہیں قول و فعل میں اصل صادق وہ ہے جو سچ کو ترجیح دے اگرچہ اس میں اس کا ضرر و زیاں ہو............ جھوٹ پر اگرچہ اس میں اس کا مفاد ہو۔

۴۔ خدا کی اطاعت گزاری کرنے والے ہیں خضوع و خشوع کرنے والے ہیں۔

۵۔ راہ خدا میں صدقہ و خیرات کرنے والے ہیں خواہ واجبی صورت میں ہو یا مستحبی شکل میں وہ راہ خدا میں خدا کے مستحق بندوں کو نوازتے ہیں۔

۶۔ سحر کے وقت خدا سے طلب مغفرت کرتے ہیں اگرچہ ہر وقت خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرنا مستحب فعل ہے مگر سب سے بہتر وقت ہنگام سحر ہے جو جود عام و فیض تام کا وقت ہے اسی لئے حدیثوں میں سحر خیزی کی بڑی فضلیت وارد ہوئی ہے اس وقت قلبی توجہ و یکسوئی حاصل ہوتی ہے اس وقت کی خاص عبادت نماز تہجد ہے اسی لئے ہمیشہ خاصان خدا نے اس وقت عبادت کرنے اور دعا و استغفار کرنے کو بڑی اہمیت دی ہے ''ومن طلب العلٰی سحر اللیالی''۔ کیونکہ

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

اور یہ سب کچھ اسی وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب آدمی کے عقائد اسلامیہ محکم و مضبوط ہوں ورنہ اصول کے بغیر فروع کس طرح قائم رہ سکتے ہیں؟

خدا، ملائکہ اور سب اہل علم گواہ ہیں کہ خدا ایک ہے اور عادل ہے

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ...الآية

اس آیہ مبارکہ میں خدا، اس کے ملائکہ اور اہل علم یعنی انبیاء اور ان کے اوصیاء اور پختہ اہل ایمان شاہد و گواہ ہیں اور مشہود بہ (جس کی گواہی دی جا رہی ہے) دو چیزیں ہیں۔ ایک خدا کی وحدانیت و یکتائی ہے دوسری اس کی عدالت ہے کہ وہ عدالت کے ساتھ قائم ہے ''قائما بالقسط'' میں ''قائما لا الہ الا ھو'' میں جو ضمیر ہو ہے اس سے حال ہے اور وہ ضمیر ذوالحال ہے پھر یہ خدائی عدل و انصاف کسی خاص چیز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کائنات کی تخلیق، عقائد دینیہ، احکام شرعیہ اور زندگی کے تمام حالات و کوائف میں عدل و انصاف کی روح کارفرما ہے بلکہ مذہب شیعہ خیر البریہ میں پورے نظام تکوین تشریع اور تصور جزا و سزا کا سلسلہ، اسی عقیدہ عدل الٰہی سے وابستہ ہے اس کے بغیر اسلام و ایمان کی چکی چل ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدہ عدل کو عقائد ایمانیہ کا جزء قرار دیا گیا ہے کہ جب تک اصول اسلام (توحید، نبوت اور قیامت) کے ساتھ دو اصول ایمان (عدالت و امامت) شامل نہ ہوں اس وقت تک کوئی آدمی مومن کہلا ہی نہیں سکتا۔

آیات القرآن

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑲ فَاِنْ حَاۗجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ
وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ
فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ⑳ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ
بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ
فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ㉑ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي

الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۲﴾

ترجمۃ الآیات

بے شک خدا کے نزدیک سچا دین صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے (دین حق میں) اختلاف نہیں کیا مگر اپنے پاس علم آجانے (اور اصل حقیقت معلوم ہو جانے) کے بعد محض آپس کی شرارت وضد اور ناحق کوشی کی بنا پر اور جو بھی آیات الٰہیہ کا انکار کرے گا تو یقیناً خدا بہت جلد حساب لینے والا ہے۔(۱۹) پس اگر یہ لوگ آپ سے خواہ مخواہ حجت بازی کریں۔ تو کہہ دو کہ میں نے اور میری پیروی کرنے والوں نے تو اپنا سر خدا کے سامنے جھکا دیا ہے (اپنے کو اس کے سپرد کر دیا ہے) اور اہل کتاب اور جو کسی کتاب کے پڑھنے والے نہیں ہیں سے کہو۔ کیا تم بھی اسلام لائے ہو؟ پس اگر انہوں نے اسلام کا اقرار کرلیا تو گویا ہدایت پا گئے اور اگر (اس سے) منہ موڑا تو آپ کا فرض تو صرف پہنچا دینا ہے (منوانا نہیں ہے) اور اللہ (اپنے) بندوں کو خوب دیکھنے (اور پہچاننے والا ہے)۔(۲۰) جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں انہیں دردناک عذاب کا مژدہ سناؤ(۲۱) یہ وہ (بدنصیب) ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت و برباد ہو گئے اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں ہے(۲۲)

تشریح الالفاظ

(۱) حاجّوك — یہ محاجہ سے مشتق ہے جس کے معنی جھگڑا کرنے کے ہیں

(۲) تولّوا — ولّی اور تولّی جب اس کا صلہ عن ہو تو اس کے معنی پیٹھ پھیرنے کے ہوتے ہیں

(۳) عذاب الیم — اسم اس کے معنی ہیں دردناک سزا

تفسیر الآیات

اللہ کے نزدیک برحق دین صرف اسلام ہے

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰه......الآیة

اگر چہ ہرملت ومذہب والا اپنے دین ومذہب کو سچ وبرحق کہتا ہے کیونکہ ''کل حزب بمالدیھم فرحون''۔ مگر جو دین ساز ہے یعنی خدا۔ اس نے اپنی آخری الہامی وربانی اور لاریب کتاب میں اعلان کر دیا ہے کہ ''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ''۔یعنی تمام ادیان عالم میں جو دین خدا کا پسندیدہ دین ہے' قابل قبول دین ہے اور نجات دارین اور فلاح کونین کا ضامن وکفیل دین ہے وہ صرف دین اسلام ہے جو دین خدا ہے' جو دین انبیاء ہے اور جو دین فطرت ہے۔ اس لیے دوسرے مقام پر فرماتا ہے ''وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ''۔یعنی جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا اس کا دین ہرگز قبول نہیں ہوگا اور اسے آخرت میں نقصان وزیاں اٹھانا پڑے گا۔ کیونکہ اس کا راستہ گمراہی کا راستہ ہے............(سورہ آل عمران آیت۔ ۸۵)

پھر دین کے نام پر اختلاف کیوں؟ اور یہ مختلف فرقے اور مسالک کیوں؟ اس سوال کا جواب خدا نے اس آیت میں یہ دیا ہے کہ یہ سب کچھ باہمی ضد وکد' حسد وعناد اور ناحق کوشی کی وجہ سے ہے۔ یہ اختلاف کسی نیک نیتی یا غلط فہمی پر مبنی نہیں ہے اگر اہل کتاب نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اختلاف کیا ہے تو صرف حسد وضد اور حب جاہ ومال کی وجہ سے کیا ہے ورنہ انہیں آسمانی کتب تورات انجیل اور دوسرے ذرائع سے اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی صداقت وحقانیت کا پورا پورا علم ویقین ہو چکا تھا جیسا کہ ارشاد قدرت ہے یعر فونه کما یعرفون ابناءھم اور اگر مسلمانوں نے ایک اسلام کے تہتر (۷۳) اسلام بنائے ہیں تو انہوں نے بھی محض اہل بیت نبوت علیہم السلام سے حسد اور بغض وعناد اور اپنے ذاتی مفادات کی وجہ سے ان سے اختلاف کر کے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں بنائی ہیں ورنہ اللہ اور اس کے قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناقابل رد فرمان کی روشنی میں ان کو ان ذوات مقدسہ کی مودت ومحبت کے واجب اور ان کی اتباع کے فرض عین ہونے کا علم الیقین تھا۔ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا۔(سورہ نحل آیت۔ ۸۳)

فَاِنْ حَآجُّوْكَ...الآیة

اب جب کہ کفر و شرک کا رد کر کے توحید کا اثبات کر دیا گیا اور دین اسلام کی حقانیت کا اعلان بھی کر دیا گیا اور واضح کر دیا گیا کہ جنہوں نے اختلاف کیا ہے وہ صرف ضد و حسد، ناحق کوشی اور حب جاہ و مال کی وجہ سے کیا ہے لیکن اگر پھر بھی وہ تسلیم نہیں کرتے اور کج بحثی سے کام لیتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ خواہ وہ اہل کتاب ہیں یا ان پڑھ مشرکین عرب ہیں............ کہ میں نے اور میرے پیروکاروں نے تو دین حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے کیا تم بھی ایسا کرتے ہو؟ پس اگر وہ ایسا کریں تو ہدایت یافتہ متصور ہوں گے اور اگر اس سے منہ پھیریں تو آپ نے اپنا فریضہ تبلیغ ادا کر دیا ہے۔ ''اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلاَغُ'' (سورہ آل عمران آیت۔۲۰) ''فَذَرْهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ'' (سورہ انعام آیت۔۱۱۰)۔ پس اب ان سب کو اپنی سرکشی میں چکر لگانے دو۔

تین قسم کے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ......الآیة

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے تین قسم کے آدمیوں کے اعمال حبط و ضبط ہونے اور ان کے جہنم کے دردناک عذاب میں مبتلا ہونے کا ذکر فرمایا۔

۱۔ پہلی قسم وہ لوگ ہیں جو کفر و شرک اختیار کریں۔

۲۔ دوسری قسم وہ لوگ ہیں جو انبیاء و مرسلین کو قتل کریں جب ایک عام اہل ایمان کے قتل کی سزا ابدی جہنم ہے تو اسی سے نبی کے قتل کی سزا کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ما یعمل ابن آدم عملا اعظم عند اللہ تبارك و تعالیٰ من ان قتل نبیا او اماماً او هدم الکعبة التی جعلها اللہ تعالی قبلة لعباده او افرغ مائه فی امرائة حراماً۔

یعنی خداوند تعالیٰ کے نزدیک فرزند آدم علیہ السلام کا کوئی گناہ ان تین گناہوں سے بڑا نہیں ہے۔ ۱۔ جو کسی نبی یا امام کو قتل کرے۔ ۲۔ جو خانہ کعبہ کو گرائے۔ ۳۔ جو زناکاری کرے۔ (کتاب الخصال، نور الثقلین)

۳۔ تیسری قسم وہ لوگ ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہم اسلامی فریضہ ادا کرنے والوں کو قتل کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح قتل انبیاء سنگین گناہ ہے اسی طرح نیک کام کرنے کی تلقین کرنے اور تبلیغ حق کرنے والوں کا قتل کرنا بھی بڑا سنگین گناہ ہے۔

قاتل خواہ جس لباس میں ملبوس ہوں اور جو روپ بھی دھارے ہوئے ہوں اور خواہ ظاہری اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوں۔ مگر ان دونوں کے قاتلوں کا عذاب ایک ہی طرح کا ہے زمانہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والے کفار و مشرکین گو براہ راست اس قسم کے قتل میں ملوث نہیں تھے۔ مگر چونکہ ان کے آبا و اجداد نے ان افعال شنیعہ کا ارتکاب کیا تھا اور یہ لوگ اپنے بزرگوں کے ان کارناموں پر راضی تھے۔ تو بموجب ''من رضی بفعل قوم فھو منھم ''۔ یعنی جو شخص کسی قوم کے کسی فعل پر راضی ہو وہ اسی قوم سے شمار ہوتا ہے ان کو بھی زجر و توبیخ کی گئی ہے اور ان کو بھی تہدید و وعید کی گئی ہے۔

بہر حال اگر یہ سب کچھ درست ہے (اور یقینا درست ہے) تو پھر بعض مسلمان جناب سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاتلین کے بارے میں کیوں نرم گوشہ رکھتے ہیں؟ جبکہ آپ امام بھی ہیں اور امر و نہی کرنے والے بھی۔ جیسا کہ دوسرے شواہد و دلائل کے علاوہ ان کے اس وصیت نامہ سے بھی واضح ہے جو آپ نے مدینہ چھوڑتے وقت اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام لکھا تھا کہ آپ کے بنیادی مقاصد شہادت میں سے ایک اہم مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی تھا۔ بنا بریں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نبی و امام کے قاتل کی بخشش کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مخفی نہ رہے کہ آخر میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ان کو ''دردناک عذاب'' کا مژدہ سناؤ تو یہ بطور طنز ہے۔

آیات القرآن

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ
بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي
دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ
الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن
تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦﴾

ترجمۃ الآیات

کیا تم نے ان (علماء یہود) کو نہیں دیکھا جن کو کتاب (تورات کے علم) سے تھوڑا سا حصہ ملا ہے جب انہیں کتاب خدا کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے اس پر ان کا ایک گروہ پیٹھ پھیر لیتا ہے درانحالیکہ وہ روگردانی کرنے والے ہوتے ہیں (۲۳) یہ (انداز) اس لئے ہے۔ کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ گنتی کے چند دنوں کے سوا ہمیں آتش جہنم چھوئے گی بھی نہیں۔ یہ لوگ جو افتراء پردازیاں کرتے رہتے ہیں انہوں نے ان کو دین کے بارے میں دھوکہ دیا ہے (۲۴) اس وقت ان کی کیا حالت ہوگی جب ہم ان کو ایک دن (بروز قیامت) اکٹھا کریں گے جس (کے آنے) میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہوگا اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۲۵) (اے رسول!) کہئے: اے خدا تمام جہان کے مالک! تو جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے، ہر قسم کی بھلائی تیرے قبضہ میں ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے (۲۶)

تشریح الالفاظ

(۱) یفترون — یہ افتراء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی پر تہمت لگانا، جھوٹ باندھنا

(۲) تنزع — یہ نزع سے مشتق ہے جس کے معنی اکھیڑنے اور معزول کرنے کے ہیں

تفسیر الآیات

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ...الآیۃ

اس آیت مبارکہ کی شان نزول بعض روایات میں یہ وارد ہوئی ہے کہ خیبر کے بعض صاحب ثروت و شرف یہودی مرد و زن نے زنا کیا مگر احبار یہود نے ان کی ثروت مندی اور شرف کی وجہ سے انہیں سنگسار کرنے

میں پس وپیش کی۔ جبکہ تورات میں یہ حکم موجود تھا۔ بالاخرانہوں نے اس امید پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں معاملہ پیش کیا کہ شاید ان کے ہاں کچھ رخصت ہو۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں سنگسار کرنے کا حکم دیا تو ان پر یہ بات گراں گزری۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ حکم تورات میں موجود ہو تو؟

انہوں نے کہا پھر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

چنانچہ ان کے بڑے عالم ابن صوریا کو بلوایا گیا اور اگرچہ اس نے حق وحقیقت کو چھپانے کی ناکام کوشش کی مگر ابن سلام کی بروقت مداخلت سے اس کی خیانت پکڑی گئی اور ثابت ہو گیا کہ تورات میں لکھا ہے کہ جب شادی شدہ مرد وزن زنا کریں تو اس کی حد سنگسار کرنا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق ان دونوں کو سنگسار کر دیا گیا۔ جس پر یہود بگڑ گئے اس پر خدا نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (مجمع البیان' تفسیر حقانی)۔

بعض دوسری روایات میں یوں وارد ہے:

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود کے ایک گروہ کو دین حق قبول کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ آپؐ کس دین پر ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: ملت ابراہیمی پر۔

اس پر انہوں نے کہا کہ جناب ابراہیم علیہ السلام تو خود یہودی تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تورات لے آؤ۔ اس سے اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ مگر انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور آپؐ کی نبوت اور پیغام رسالت پر غور کرنے پر آمادہ نہ ہوئے (صافی)۔

ان اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ یہاں کتاب اللہ سے مراد ''تورات'' ہے اور اسی قول کو اکثر مفسرین اسلام نے اختیار کیا ہے۔ مگر ابن عباس سے منقول ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے اور ہمارے فاضل بلاغی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ بہر حال شان نزول کچھ بھی ہو اور کتاب سے مراد کچھ بھی ہو۔ اس آیت کی زد ہر اس قوم وقبیلہ پر پڑتی ہے جو زبانی کسی مذہب وملت کا اقرار کرے اور مقام عمل میں اس کے خلاف پر اصرار کرے۔

یہود کی سرکشی کا اصلی سبب

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا ...الآیة

یہود کی سرکشی اور قبول حق سے انکار کا سبب یہ تھا کہ ان کے رہبروں اور رہنماؤں نے چند غلط ڈھکوسلے اور مفروضے ان کے دل و دماغ میں بٹھا دیئے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں لہٰذا وہ جہنم میں نہیں جائیں گے اور اگر جائیں گے تو گنتی کے چند دنوں کے سوا آتش جہنم ان کو چھوئے گی بھی نہیں۔ جس طرح نصاریٰ کے علماء وزعماء نے ان کے ذہنوں میں یہ غلط بات راسخ کر دی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھ گئے اور اپنی امت کے گناہوں کی گٹھری اپنے سر پر رکھ کر خدا کے ہاں چلے گئے لہٰذا نصرانی جو چاہیں کریں ان کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو چکا ہے۔

الغرض یہی ان کی غلط فہمیاں تھیں جنہوں نے ان کی نظر میں جزا وسزا کی اہمیت کو کم کر دیا تھا۔ اب اگر مسلمان سب یا ان میں کوئی طبقہ اس قسم کے تصورات قائم کرے تو جو بات قرآن نے یہود ونصاریٰ کے بارے میں کہی ہے وہی ان کے بارے میں صادق آئے گی۔ (فصل الخطاب)۔

دراصل بات یہ ہے کہ ہر شخص کو واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کرتے وقت اخروی جزا و سزا کا تصور قائم رکھنا چاہیے اور کسی ایسے خود ساختہ غلط تصور ونظریہ کو اپنے دل ودماغ میں جگہ نہیں دینی چاہیے جو اس کی نگاہ میں محاسبہ خداوندی اور ثواب وعقاب کے تصور کو ہلکا کر دے۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ ...۲۵الآیة

بروز قیامت ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ دل کے خوش رکھنے کے لیے جو چاہیں نظریہ اپنا لیں مگر قیامت کے دن عدل الٰہی کا اس طرح حقیقی مظاہرہ ہوگا کہ ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ''۔ ذرہ ذرہ نیکی وبدی کا حساب وکتاب ہوگا اور پھر ہر نیکی پر جزا اور ہر بدی پر سزا ملے گی اور اس وقت یہ مزعومات کچھ کام نہ آئیں گے۔ البتہ ''تفضّل خداوندی اور عفو الٰہی'' ''چیز دیگر است'' جس کی بنا پر مقررہ سزا میں کمی یا بالکل معافی کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ موعودہ اجر وثواب میں کمی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

خدا ہی مالک الملک ہے اس لیے عطا ومنع اور عزت و ذلت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ...۱۲۶الآیة

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباؤ واجداد طاہرین علیہم السلام کے سلسلہ سند سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں فرمایا: جب خداوند عالم نے سورہ فاتحہ، آیت الکرسی، آیت شہد اللہ اور آیت قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ......تا بغیر حساب'' کو نازل کرنا چاہا تو یہ عرش الٰہی سے چمٹ گئیں اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔ اے پروردگار! تو ہمیں گنہگاروں میں اور گناہوں کے گھر میں اتارنا چاہتا ہے؟ جبکہ ہم طہور وعرش سے متمسک ہیں ارشاد قدرت ہوا۔ مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم جو شخص ہر نماز فریضہ کے بعد تمہاری تلاوت کرے گا میں اسے ''حظیرۃ القدس ''میں داخل کروں گا، ہر روز اس پر ستر بار نظر رحمت کروں گا، ہر روز اس کی ستر (۷۰) حاجتیں برلاؤں گا۔ جن میں سے کمترین حاجت مغفرت ہے۔ دشمن سے اس کی حفاظت کروں گا، اسے ان پر غلبہ عطاء کروں گا اور اسے موت کے سوا جنت میں داخل ہونے سے کوئی اور چیز مانع نہ ہو گی۔ (مجمع البیان)۔

معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک نہ ہوسکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ دریافت فرمائی۔ عرض کیا کہ میں نے ایک یوحنا نامی یہودی کا کچھ قرض دینا تھا جو مطالبہ کے لیے میرے دروازے پر بیٹھا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں روک نہ لے اس لیے باہر نہ نکلا۔ فرمایا۔ اے معاذ! کیا تم چاہتے ہو کہ خداوند عالم تمہارا قرضہ ادا کرے عرض کیا ہاں یارسول اللہ! فرمایا ہر روز پڑھا کرو:

''اللهم مالك الملك توتي الملك من تشاء'' سے لے کر ''بغیر حساب'' تک۔
پھر پڑھو ''یا رحمٰن الدنیا و الآخرۃ و رحیمهما تعطی منهما من تشاء و تمنع منهما من تشاء اقض عنی دینی ''۔ اگر تجھ پر زمین کے برابر سونے کا قرض ہوگا تو بھی قادر مطلق اسے ادا کردے گا۔ (مجمع البیان وتفسیر قرطبی)

ان آیات مبارکہ میں خداوند علیم وحکیم نے بڑے موثر ودلکش انداز میں اپنی توحید وتفرید اور اپنی عظیم قدرت وطاقت کا اظہار فرمایا ہے کہ سلطنت دینے والا بھی وہی ہے اور سلب کرنے والا بھی وہی۔ عزت وعظمت

سے سرفراز کرنے والا بھی وہی ہے اور ذلیل وخوار کرنے والا بھی وہی ہے یکے بعد دیگرے شب و روز لانے والا بھی وہی ہے اور خالق و مالک بھی وہی۔ ان باتوں میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے وہی سب کچھ کرتا ہے ''ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ'' (سورہ مومن آیت۔ ۶۲)۔

بعض کوتاہ اندیش اور ظاہر بین ان آیات کو دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ جس نیک یا بد آدمی کو حکومت ملتی ہے یا جس سے حکومت سلب ہوتی ہے اور اسی طرح جو شخص دنیا میں عزیز ہوتا ہے یا ذلیل یہ سب کچھ ارادہ و مشیت ایزدی کے تحت ہوتا ہے............ اور پھر اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جناب سلیمان ابن داؤد علیہ السلام اور جناب یوسف بن یعقوب علیہ السلام کی حکومت ہو یا فرعون و یزید کی یہ سب منجانب اللہ ہیں۔

اس خیال کا ابطال یہ ہے کہ مالک حقیقی جہاں قادر و قدیر ہے وہاں حکیم و عادل بھی ہے وہ جو کام بھی کرتا ہے، حکمت و عدل کے تمام تقاضوں کو سامنے رکھ کر کرتا ہے وہ جس فرد یا قوم میں حکومت و عزت کی صلاحیت دیکھتا ہے اسے ان نعمتوں سے فراز دیتا ہے اور جو فرد یا قوم یہ صلاحیت کھو دیتی ہے اسے ان نعمتوں سے محروم کر دیتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کے ایک معنی یہ ہیں کہ خدا جسے اس منصب کا اہل سمجھ کر براہ راست سلطنت اور ملک اور عزت و عظمت عطا کرتا ہے وہ انبیاء و مرسلین، ائمہ طاہرین علیہم السلام اور عباد اللہ الصالحین ہوتے ہیں جیسا کہ طالوت۔ کے واقعہ اور آیت ''اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ'' (سورہ انبیاء آیت۔ ۱۰۵) سے واضح ہے اور اس صورت میں عطا کی نسبت خدا کی طرف حقیقی ہے اور اس کا لازمہ ان حضرات کی حقانیت ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عام لوگ خدا کے مقرر کردہ حاکم کے سامنے سر تسلیم خم بھی کر دیں اور اس عطاء حکومت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم نے (جو مسبب الاسباب ہے) اس دنیا میں ظاہری کامیابی اور حکومت حاصل کرنے کے کچھ اسباب اور عوامل مقرر کیے ہیں۔ جیسے منصوبہ بندی، انتخاب، قہر و غلبہ وغیرہ۔ لہٰذا جو شخص ان اسباب و عوامل سے فائدہ اٹھائے گا خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ فرعون ہو یا یزید۔ چنگیز ہو یا ہٹلر۔ جیسا بھی ظالم ہو جابر ہو وہ سریر حکومت پر قابض و متمکن ہو جائے گا۔ خدا اس کی مزاحمت نہیں کرے گا اور جو فرد یا قوم ان اسباب و عوامل سے استفادہ نہیں کرتی بلکہ اپنے آپ کو ان ظالموں اور جابروں کے حوالے کر دیتی ہے وہ حکومت و اقتدار سے محروم رہتی ہے یا محروم ہو جاتی ہے۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

عروج اقتدار کے علل و اسباب سے فائدہ اٹھانا ہی خدا کی مشیت ہے اور اس کا ارادہ بھی اس معنی کے لحاظ سے ہے۔ خدا نے نمرود کے بارے میں فرمایا ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ

اللہ الْمُلْكَ ''۔یعنی کیا تم نے اسے نہیں دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے ان کے رب کے بارے میں اس بنا پر بحث کی تھی' کہ خدا نے اسے حکومت دے رکھی تھی (سورہ بقرہ آیت۔۲۵۸) اور اس معنی کے اعتبار سے جناب موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا تھا۔''رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا''۔اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کو اسی دنیاوی زندگی میں زینت اور بڑے اموال عطا کیے ہیں۔(سورہ یونس آیت۔۸۸)

ظاہر ہے کہ یہاں اس عطاء سلطنت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا نے فرعون ونمرود کو براہ راست اس منصب پر فائز کیا تھا بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہوں نے سلطنت واقتدار حاصل کرنے کے جو دنیوی اسباب وعوامل ہیں۔ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔اور خدا نے باوجود اپنی طاقت وقدرت کے ان کے حصول اقتدار میں مزاحمت نہیں کی تھی اور رکاوٹ پیدا نہیں کی تھی۔اس معنی کے اعتبار سے اس عطا وسلب کی نسبت خدا کی طرف مجازی ہے نہ کہ حقیقی۔بنابریں یہاں عزت وذلت سے بھی دنیوی اسباب ووسائل سے حاصل کردہ ظاہری عزت وذلت مراد ہوگی۔ورنہ جو حقیقی عزت ہے وہ دنیوی اسباب وآلات سے وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ ایمان واطاعت ایزدی سے وابستہ ہے۔ارشاد قدرت ہے''وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ''۔(منافقون آیت۔۸) یعنی عزت تو بس خدا کیلئے ہے' اس کے پیغمبرؐ کے لئے ہے اور خالص اہل ایمان کے لیے ہے لیکن منافق اس حقیقت کو نہیں جانتے............

خلاصہ کلام یہ کہ ان آیات میں ان چیزوں کی نسبت خدا کی طرف اس لئے دی گئی ہے کہ دنیا کے اسباب وعوامل اسی نے پیدا کیے ہیں اور بندوں میں ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت واہلیت بھی اسی کی عنایت ہے۔اور بس چیزوں کا سرچشمہ وہی ہے ہاں ان اسباب وذرائع سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا انسان کا اختیاری فعل ہے لہٰذا اس مجازی نسبت سے جبر واکراہ لازم نہیں آتا اور نہ ہی اس سے انسان کے ارادہ واختیار اور اس کی آزادی کی نفی ہوتی ہے۔

''تو ہی رات کو (بڑھا کر) دن میں اور دن کو (بڑھا کر) رات میں داخل کرتا ہے''

اس جملہ سے مراد وہی حسی وتدریجی تبدیلی ہے جس کا ہم سال بھر مشاہدہ کرتے ہیں اور یہ تبدیلی اس کرہ ارضی کے محور کے اپنے مدار سے جھکاؤ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔جو ۲۳ درجہ سے کچھ زیادہ ہے اور اسی سے سورج کی کرنوں کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔اس لیے بلاد شمالی (خط استواء سے اوپر والے حصے) میں سردیوں کے آغاز میں دن بڑھنے لگتے ہیں۔اور راتیں چھوٹا ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔اور گرمیوں کی ابتدا میں اس

کے برعکس ہوتا ہے کہ راتیں بڑھنے لگتی ہیں۔اور دن چھوٹا ہونا شروع ہوجاتے ہیں جبکہ بلاد جنوبی (خط استواء سے نیچے والے حصے) میں یہ معاملہ بلاد شمالی کے برعکس ہوتا ہے۔

اس طرح کائنات کی ہر چیز میں تغیر و تبدل اور انقلاب کا یہ سلسلہ برابر جاری و ساری ہے ''وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ'' (سورہ آل عمران آیت۔۱۴۰) جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے کی مفسرین نے انڈے سے پرندہ اور پرندے سے انڈا پیدا ہونے نیز نطفہ سے انسان اور انسان سے نطفہ پیدا ہونے کی مثالیں دی ہیں مگر احادیث میں اس کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ذات کافر سے (جو درصل مردہ ہے) مومن کو (جو درحقیقت زندہ ہے) پیدا کرتا ہے اور کبھی مومن سے کافر بھی پیدا ہوجاتا ہے (تفسیر نور الثقلین، ۃ البرہان)

اس روحانی اور معنوی تفسیر سے اس گزشتہ ظاہری تعبیر کی نفی ہوتی ہے وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے کیونکہ وہ حساب رکھنے کا محتاج نہیں ہے اس لئے کہ اس کا سرمایہ؟ غیر محدود ہے۔''لان خزائنہ بین الکاف والنون''۔

آیات القرآن

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ
الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾
لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ
يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ
وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ
صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

ترجمۃ الآیات

تو ہی رات کو (بڑھا کر) دن میں اور دن کو (بڑھا کر) رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو جاندار کو بے جان اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے' بے حساب روزی عطا کرتا ہے (۲۷) (خبردار) اہل ایمان اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو دوست (اور سرپرست) نہ بنائیں۔ اور جو ایسا کرے گا۔ اس کا خدا سے کوئی تعلق اور سروکار نہیں ہوگا۔ مگر یہ کہ تمہیں ان (کافروں) سے خوف ہو تو پھر (بطور تقیہ اور بچاؤ) ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے اور خدا تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور خدا ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ (۲۷) کہہ دیجئے! جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے' تم اسے چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو بہرحال خدا اسے جانتا ہے۔ اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ سب کچھ جانتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۹)

تشریح الالفاظ

۱) تولج اللیل — یہ ایلاج سے ہے جس کے معنی ہیں داخل کرنا

(۲) تتقوا — یہ اتقاء سے ہے جس کے معنی ہیں کسی سے ڈرنا، بچنا اور پرہیز کرنا۔

(۳) یوم تجد — وجد کے معنی پانے کے ہیں

تفسیر الآیات

مقام تقیہ کے سوا کافروں سے دوستی جائز نہیں ہے

لَا یَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ... ۲۷ الآیۃ

اس آیت مبارکہ میں اہل ایمان کو کافروں سے دوستی کرنے کی ممانعت کی جا رہی ہے قرآن مجید کی مختلف آیات کی بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار سے دوستی کرنا اور کسی باطل امر میں ان سے قولی یا فعلی تعاون کرنا بالخصوص ان کی ہاں میں ہاں ملا کر کسی اہل اسلام کو نقصان پہنچانا دوسرے عام گناہوں کی طرح کوئی عام

گناہ نہیں ہے بلکہ کفر ہے۔ چنانچہ اس آیت میں وارد ہے ''وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ۔۔۔'' کہ جو ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی سروکار نہیں ہے اس سے ظاہر ہے کہ ایسا کرنے والے سے خدا بیزار ہے اور جس سے خدا بیزار ہو وہ کافر ہی ہوتا ہے۔

اور اس کی تائید مزید اس ارشاد خداوندی سے ہوتی ہے کہ ''وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ''۔یعنی تم میں سے جو شخص ان سے میل ومحبت کرے گا وہ انہی میں سے شمار ہوگا (سورہ مائدہ آیت۔۵۱)

ایک اور جگہ فرماتا ہے۔''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ''۔یعنی اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن یعنی کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ کہ انکو دوستی کا پیغام بھیجو(سورہ ممتحنہ آیت۔۱)

آخر میں فرماتا ہے۔''فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ(سورہ مائدہ آیت۔۱۲)''یعنی جو ایسا کرے گا وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا۔

ایک اور جگہ فرماتا ہے''لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ''۔یعنی آپ کسی قوم کو نہیں پائیں گے جو خدا اور آخرت کے دن پر یقین اور ایمان رکھتی ہے کہ وہ دوستی رکھتی ہو ان لوگوں سے جو خدا اور رسول کے مخالف ہیں۔خواہ وہ ان کے باپ' دادا ہوں یا اولاد و احفاد یا بھائی بند یا اپنی قوم وقبیلہ والے ہوں (سورہ مجادلہ آیت۔۲۲)

محبت وتعلق کے اقسام

البتہ اس محبت اور تعلق کی کئی قسمیں ہیں بعض موجب کفر ہیں' کچھ عام گناہ ہیں اور کچھ مباح ہیں جن کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے۔

پہلی قسم

دو شخصوں یا دو گروہوں کے باہمی تعلقات کی پہلی قسم قلبی مودت ومحبت اور دلی موالات ہے جس سے کافر دوست کے کفر پر رضامندی ظاہر ہوتی ہے کافر سے ایسی محبت نہ صرف حرام ہے بلکہ کفر ہے اور محبت کی یہ قسم صرف اہل ایمان سے مخصوص ہے۔

دوسری قسم

یہ ہے کہ آدمی ان کے دین و مذہب کو تو برا سمجھے مگر اہل اسلام کے مقابلہ میں کسی دنیوی طمع ولالچ کے سبب سے یا قرابت داری کی وجہ سے ان کی نوکری کرے' ان کے لیے جاسوسی کرے اور ان کی مدد کرے بالخصوص اہل اسلام کے خلاف تو اگرچہ یہ کفر نہیں مگر سخت گناہ ہے اور ایسا کرنے والا فاسق وفاجر ہے۔

تیسری قسم

یہ ہے کہ ان کی ملت و مذہب کو برا جانتے ہوئے اور ان کافروں کو چھوڑ کر جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں دوسرے عام کافروں سے ظاہری خوش خلقی سے پیش آنا۔ اور ان کی دینی خیر خواہی اور دنیوی نفع رسائی کرنا' یا ان کے ساتھ مل کر تجارت کرنا یا کسی دوسری صنعت وحرفت میں شراکتی کاروبار کرنا' یا ان کے ہاں اجرت پر کام کرنا ' یا ان کو ملازم رکھنا۔ بشرطیکہ ایسا کرنے سے کسی مسلمان کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحسن ہے اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآئمہ ہدیٰ علیہم السلام اور دیگر بزرگان دین کے تعامل سے ظاہر و روشن ہے جبکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ یہ لوگ انسانی معاملات میں کئی نام نہاد مسلمانوں سے بھی بہت آگے ہیں ان کے بارے میں ارشاد قدرت ہے۔ ''لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ'' (سورہ ممتحنہ آیت۔ ۸) یعنی خدا تم کو ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جو دین پر تم سے نہیں لڑتے۔ اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے کہ ان کے ساتھ احسان و بھلائی کرو۔ اور انصاف کا سلوک کرو۔ بے شک خدا احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ دین اسلام میں غیر مسلمانوں سے کسی قسم کی رو اداری کرنا۔ اور ان سے کسی قسم کا کوئی تعلق قائم کرنا۔ حتیٰ کہ ان سے حسن اخلاق سے پیش آنا ممنوع ہے؟

نہیں ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ اسلام میں غیر مسلمانوں کے ساتھ احسان کرنے' ہمدردی کرنے اور ان سے اخلاق و مروت کے ساتھ پیش آنے کے وہ تاکیدی احکام موجود ہیں اور سیرت نبویہ میں اخلاق و کردار کے وہ اعلیٰ عملی نمونے موجود ہیں کہ جن کی اقوام عالم میں مثال نہیں ملتی۔

بہر حال ان کے کفر وشرک کی وجہ سے قلبی محبت اور دلی دوستی اور اس کا قولی وفعلی اظہار کسی حالت میں جائز و روا نہیں ہے بجز اس کے کہ جب اپنے آپ کو ان کے ضرر وزیاں سے ناقابل برداشت جانی ومالی نقصان

سے یا عزت ناموس سے نقصان سے بچانا مقصود ہو کہ اس حالت میں نہ صرف کافروں سے محبت کا اظہار جائز ہے بلکہ مذکورہ بالا مقصد کے تحت کلمہ کفر تک زبان پر جاری کرنا بھی شرعاً روا ہے جبکہ دل و دماغ ایمان سے سرشار ہوں اور دل اسلام اور ایمان پر مطمئن ہو اور اسی چیز کا نام قرآن و اسلام کی اصطلاح میں ''تقیہ'' ہے ارشاد قدرت ہے ''اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ''۔(سورہ آل عمران آیت۔۲۸)''اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کفار سے مضرت کا سخت اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں ظاہرداری کا کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ دین میں کوئی قباحت نہ آوے۔اسی کو ''تقیہ'' کہتے ہیں''۔(تفسیر حقانی جلد ۲ ص ۴۸)۔

حقیقت یہ ہے کہ ''تقیہ'' ایک ایسا عقلی وفطری تقاضا ہے کہ جسے بلا امتیاز مذہب وملت اور بلا اختلاف رنگ ونسل تمام لوگ بوقت ضرورت عمل میں لاتے ہیں۔''ومن ینکر فانما ینکر باللسان و قلبه مطمئن بالایمان۔''ظاہر ہے کہ اگر کمزور و ناتوان انسان تقیہ سے کام نہ لیں تو ختم ہو جائیں۔اسلام جو دین فطرت ہے' کس طرح اس فطری حق کی نفی کر سکتا ہے؟ اسلام کا تمام نظام ہی مہم کو اہم پر قربان کرنے پر قائم ہے سور کے گوشت کی حرمت مہم ہے' مگر انسانی جان کا بچانا اہم ہے لہٰذا اگر جان کا بچانا اس گوشت کے کھانے میں منحصر ہو تو اس کا کھانا جائز ہے ارشاد قدرت ہے۔''فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ''(سورہ بقرہ آیت۔۱۷۳)مال حلال اس قدر محترم ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی حفاظت کرتے ہوئے جان بحق ہو جائے تو شریعت اسے شہید قرار دیتی ہے۔(فتاوی برھنہ وغیرہ)

تو کیا وہی شریعت مقدسہ اسی مال وجان اور عزت وآبرو کی حفاظت کی خاطر خلاف حق بات کہنے کی اجازت نہیں دے گی؟ جبکہ دل و دماغ حق پر مطمئن ہوں۔دل و زبان کی ہم آہنگی بڑی اچھی بات ہے مگر کسی اہم مقصد کی خاطر ان کا اختلاف مضر نہیں ہے بلکہ ایک فریضہ کی ادائیگی ہے جو خوف کیوجہ سے عائد ہوتا ہے۔قرآن وسنت میں اور تعامل آل محمدؐ واصحابؓ و بزرگان دین کے بیسیوں شواہد موجود ہیں ان میں سے ایک یہی آیت ہے' جس کی تفسیر کی جارہی ہے۔جس میں کفار سے محبت کو نہ صرف حرام بلکہ کفر قرار دیا گیا ہے۔مگر خوف کے وقت ان سے محبت کے اظہار کو جائز قرار دیا گیا ہے دوسری آیت یہ ہے کہ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ''(سورہ نحل......۱۰۶)یعنی جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو۔اس سے کچھ مواخذہ نہیں لیکن جو شخص ایمان لائے پیچھے خدا کے ساتھ کفر کرے اور کفر بھی کرے تو دل کھول کر' تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب اور ان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے(ترجمہ نذیری)

اس آیت کی شان نزول قریباً تمام مفسرین اسلام نے یہ بیان کی ہے کہ ایک بار کفار نے جناب عمارؓ اوران کے والدین کو گرفتار کر کے بعض کفریہ کلمات کہنے پر مجبور کیا۔مگر جناب یاسرؓ وسمیہؓ نے انکار کیا۔نتیجتاً ان کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔مگر جناب عمارؓ نے وہ کلمات کہہ دیئے۔لہٰذان کو چھوڑ دیا گیا۔بعدازاں جناب عمار باچشم گریاں ودل بریاں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور ماجرابیان کیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے آنسوصاف کرتے ہوئے فرمایا''ان عادوا ذلک فعد''۔یعنی اگر کفار دوبارہ بھی یہ کلمات کہلوانے چاہیں تو بے شک کہہ دینا(تفسیر بیضاوی'تفسیر کشاف'تفسیر کبیروغیرہ دیکھئے)

قاضی بیضاوی اس آیتہ کے ذیل میں لکھتے ہیں''**و ھو دلیل جواز التکلم بالکفر عند الاکراہ**''یعنی یہ آیت جبرواکراہ کے وقت کلمہ کفر کہنے کے جواز کی دلیل ہے(بیضاوی)اورصاحب تفسیر جامع البیان ومعالم التنزیل نے اس کے ذیل میں لکھا ہے''**والاجماع علی جواز کلمة الکفر عند الاکراہ**'' ہماری زیر بحث آیت مبارکہ میں''**تقاۃ**''موجود ہے جسے **قراء سبعہ** میں سے یعقوب نے''**تقیہ**''پڑھا ہے(تفسیر بیضاوی)

نیز قتادہ اورابورجاء بھی اسے''تقیہ''ہی پڑھتے تھے۔(تفسیر درمنثور)

بخاری شریف میں''تقاہ''کی تفسیر''تقیہ''سے کرتے ہوئے لکھا ہے''**قال الحسن التقیة الی یوم القیامة**''۔یعنی حسن بصری کہتے ہیں کہ تقیہ قیامت تک باقی رہے گا(بخاری جلد ۲۔ص ۱۰۴۶ طبع دہلی......وغرائب القرآن)

اور کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۲ پرمرقوم ہے''**لا دین لمن لا تقیة له**''۔یعنی جوتقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے اس موضوع کی باقی تفصیلات ہماری کتاب''تجلیات صداقت''میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح احکام القرآن جصاص وکتاب فی الفقہ الاسلامی مصطفیٰ زرقہ'تفسیر المناروغیرہ صدہا کتابوں میں اس کے جواز کا اقرارواعتراف کیا گیا ہے الغرض تقیہ کا جواز تمام اہل اسلام کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے اور ہر مذہب ومسلک کے مسلمان عندالضرورت اس پرعمل بھی کرتے ہیں ہاں البتہ شیعیان علی علیہ السلام کے بارے میں تقیہ کی شہرت صرف اس لیے ہے کہ وہ بنی امیہ اور بنی عباس اوربعض بعدوالے تاریخ اسلام کے تاریک ادوار میں اپنی اوراپنے مذہب کی بقاء کیلئے تقیہ کرنے پرمجبوراًزیادہ عمل پیرارہے ہیں جوعقلاًوشرعاًہرطرح نہ صرف جائز بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے۔اورخالق مہربان کا اپنے کمزوربندوں پراحسان ہے''**واللہ ذو الفضل العظیم**''۔

اس مطلب کی وضاحت کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنی بھلائی و برائی سامنے پائے گا؟

چونکہ بھلائی اور برائی عرض ہیں جس کا (جوہر کی طرح) کوئی علیحدہ وجود نہیں ہوتا۔ اس لیے عام طور پر مفسرین نے یہاں ایک مضاف محذوف تسلیم کیا ہے کہ ہر شخص اپنے نامہ اعمال کو سامنے حاضر پائے گا۔ یا اپنے عمل کی جزا وسزا کو حاضر پائے گا۔ اسی طرح ایک جگہ ارشاد قدرت ہے''ووجدوا ما عملوا حاضرً ولا یظلم ربك احداً''(کہف آیت ۴۹) یعنی قیامت کے دن گنہگار اپنے اعمال کو اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔''فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ... وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ''(سورہ زلزال آیت۔۷،۸) یعنی جو شخص ذرہ بھر نیکی کرے گا اسے دیکھے گا اور جو ذرہ بھر بھی برائی کرے گا' اسے دیکھے گا۔

اس قسم کی آیات اور بعض روایات کی بنا پر بعض علماء متکلمین نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ قیامت کے دن خود اعمال حسنہ وسیئہ مجسم ہو جائیں گے۔ اگرچہ دار دنیا میں عرض کا جوہر اور جوہر کا عرض ہو جانا محال ہے مگر عالم کے بدل جانے سے یہ انقلاب ممکن ہے چنانچہ جناب شیخ بہائی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب اربعین میں بذیل شرح حدیث نہم فرماتے ہیں''الحق ان الموزون فی النشاۃ الاخری ھونفس الاعمال لا صحائفھا''یعنی حق یہ ہے کہ بروز قیامت خود اعمال تولے جائیں گے نہ کہ صحیفہ ہائے اعمال............اور محدث جزائری نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے اور اس قول کی تائید مزید حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا''انما ھی اعمالکم ترد الیکم''یعنی تمہارے یہی اعمال قیامت کے دن تمہیں لوٹائے جائیں گے۔(بحارالانوار)

لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ دلائل تجسم اعمال پر نص صریح نہیں ہیں بلکہ ان میں بعض متکلمین کے اختیار کردہ اس قول کا برابر احتمال موجود ہے کہ اعمال حسنہ کو ایک خوبصورت شکل میں متشکل کر کے اور اعمال سیئہ کو بدصورت ہیئت میں تبدیل کر کے لایا جائے گا۔ اور پھر انہی صورتوں کو تولا جائے گا۔

اسی طرح کئی احادیث میں یہ مطلب وارد ہے جیسا کہ قیس بن عاصم والی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''وانه لا بدلك يا قيس من قرين يدفن معك وهو حي و تدفن معه و انت ميت فان كان كريماً اكرمك وان كان لئيماً اسلمك ثم لا يحشر الا معك ولا تحشر الا معه ولا تسئل الا عنه فلا تجعله الا صالحا فا نه ان صلح آنست به وان فسد لا تستوحش الا منه وهو عملك۔''

یعنی اے قیس! تیرا ایک ہمنشین ہے، جو تیرے ساتھ زندہ قبر میں دفن ہوگا جبکہ تو مردہ دفن ہوگا اگر ہم نشین کریم ہوا تو تیرا اکرام کرے گا اور اگر لئیم ہوا تو تجھے تیرے حال پر چھوڑ دے گا۔ اور پھر اس کا حشر تمہارے ساتھ اور تمہارا حشر اس کے ساتھ ہوگا اور تجھ سے اس کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔ پس اگر وہ صالح ہوا تو تو اس سے مانوس ہوگا اور اگر برا ہوا تو تجھے وحشت بھی اسی سے ہوگی۔ تیرا یہ ہمنیشن تیرا عمل ہے (اربعین بہائی، بحار، سبیل النجاۃ، احسن الفوائد)

اس روایت سے تجسم اعمال سے زیادہ تمثل اعمال والے قول کی تائید ہوتی ہے۔

بہر حال اسی وجہ سے علامہ مجلسی نے دونوں احتمال ذکر کرکے تمثیل والے قول کو زیادہ قرین عقل قرار دیا ہے۔ (بحار الانوار)

اور حق الیقین میں ان حقائق پر اجمالی ایمان رکھنے اور تفصیلی حقیقت کو خدا اور راسخون فی العلم کے حوالے کرنے کا نظریہ اختیار کیا ہے۔ وھو احوط واولی

با ایں ہمہ یہ پرانے دور کی بات ہے کہ اعراض و کیفیات کا وزن نہیں ہوسکتا تھا اب تو سائنسی دور میں ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں جن کے ذریعے گرمی، سردی اور ہوا و سایہ تک کا وزن کیا جاسکتا ہے واللہ العالم۔

آیات القرآن

يَوۡمَ تَجِدُ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَيۡرٍ مُّحۡضَرًا ۛۚ وَّمَا عَمِلَتۡ مِنۡ سُوۡٓءٍ ۛۚ تَوَدُّ لَوۡ اَنَّ بَيۡنَهَا وَبَيۡنَهٗۤ اَمَدًاۢ بَعِيۡدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفۡسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۳۰﴾ قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۱﴾ قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّ

اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۳﴾
ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۚ۳۴﴾ اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ
عِمۡرٰنَ رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّیۡ ۚ اِنَّکَ
اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۵﴾

ترجمۃ الآیات

اس دن کو یاد کرو جب ہر شخص اس بھلائی کو اپنے سامنے پائے گا جو اس نے کی ہوگی اور برائی کو بھی (جنہیں دیکھ کر) خواہش کرے گا کہ کاش اس کے اور اسکے برے اعمال کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا اور خدا تمہیں اپنی ذات (اپنے عذاب) سے ڈراتا ہے اور خدا اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے (۳۰) (اے رسول! میری محبت کے دعویداروں سے) کہ دیں کہ اگر تم خدا سے (سچی) محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے (۳۱) کہہ دیجئے! خدا اور رسول کی اطاعت و فرماں برداری کرو اور اگر روگردانی کریں تو بے شک خدا کافروں (نافرمانوں) کو دوست نہیں رکھتا۔ (۳۲) بے شک اللہ نے آدمؑ نوحؑ خاندان ابراہیم اور خاندان عمران کو سارے جہانوں سے منتخب کیا ہے۔ (۳۳) جو ایک نسل ہے جن کے بعض بعض سے ہیں (یہ اولاد ہیں ایک دوسرے کی) اور خدا بڑا سننے والاٗ بڑا جاننے والا ہے۔ (۳۴) (اس وقت کو یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے کہا اے میرے پروردگار! جو بچہ میرے پیٹ میں ہے اسے میں (دنیا کے کاموں سے) آزاد کر کے (خانہ کعبہ کی) جاروب کشی اور تیری عبادت کے لیے تیری بارگاہ میں نذر کرتی ہوں تو میری (نذر) قبول فرما بے شک تو بڑا سننے والاٗ بڑا جاننے والا ہے (۳۵)

تشریح الالفاظ

(۱) یحذّر — یہ تحذیر سے مشتق ہے جس کے معنی ڈرانے، چوکنا کرنے اور متوجہ کرنے کے ہیں

(۲)ذرّیۃ اس کے معنی ہیں اولاد اور نسل

(۳)تنذرتُ یہ نذرونذور سے مشتق ہے جس کے معنی منت ماننے کے ہیں

(۴)محرّراً اس کے معنی آزاد کردہ کے ہیں

تفسیر الآیات

محبت خداوندی کا معیار ''اتباع رسولؐ'' ہے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ ...الآیۃ

بعض مفسرین نے ان دو آیتوں کی شان نزول یہ بیان کی ہے کہ یہ نصارائے نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ ہم خدا کی محبت میں جناب عیسیٰ کی تعظیم وتکریم کرتے ہیں۔(مجمع البیان)اور بعض مفسرین نے شان نزول کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب یہود کو دعوت اسلام دی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم تو پہلے ہی محبت الٰہی سے سرشار ہیں اور اس کے پیارے فرزند ہیں چنانچہ اس پر یہ آیت اتری۔(ضیاء القرآن)

بہر حال شانِ نزول کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ صرف منکرین خدا (کمیونسٹوں) کو چھوڑ کر باقی تمام ارباب ملل و مذاہب خدا سے محبت کا دعوی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''نحن احباء الله''یعنی ہم خدا کے حبیب ہیں مگر محبت چونکہ ایک مخفی شے ہے جس کا تعلق دل و دماغ سے ہے' جو ان ظاہری آنکھوں سے نظر آنے والی چیز نہیں ہے کہ کسی کو کسی سے محبت ہے یا نہیں ہے اور اگر ہے تو کتنی ہے؟ ہاں البتہ محبت کے کچھ آثار وعلامات ہیں' جن کے ذریعہ اس کا پتہ چلتا ہے اور سب سے بڑا معیار محبت یہ ہے کہ جس ذات جامع جمیع صفات سے محبت کا دعوی کیا جا رہا ہے وہ ذات ہمارے مشاہدہ سے ماوراء ہے اور نہ ہی ہم براہ راست اس کی پسند و ناپسند کو معلوم کر سکتے ہیں اور چونکہ وہ جسم وجسمانیت سے منزہ ومبرا ہے اس لیے اس کی اتباع وپیروی بھی نہیں کر سکتے۔

لہٰذا ضرورت اور سخت ضرورت تھی کہ وہ اس کی محبت کا دعویٰ کرنے والوں کے صدق اور کذب کے معلوم کرنے کا کوئی معیار مقرر کرے چنانچہ اس آیت مبارکہ میں اس نے اس امر کا معیار و میزان تمام کائنات میں سے اپنے سب سے بڑے محبوب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی اتباع و پیروی کو قرار دیا ہے پس اس کسوٹی پر پرکھنے سے کھرے اور کھوٹے' سچے اور جھوٹے کا پتہ چل جائے گا۔پس جو شخص جس قدر دعوائے محبت خدا میں جتنا زیادہ سچا ہوگا۔وہ اتنا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع وپیروی کا زیادہ

اہتمام کرے گا۔ اور جو جتنا اپنے اس دعوی میں کمزور ہوگا وہ اتنا ہی اتباع و پیروی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سہل انگیز اور کمزور ہوگا۔

مولانا حافظ سید فرمان علی صاحب مرحوم نے بالکل صحیح اور بجا لکھا ہے کہ ''خداوند عالم نے اپنی محبت کی کسوٹی حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کو قرار دیا ہے' پس محض دعوائے محبت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا جب تک اپنی کارگزاریوں سے ثابت نہ کردے کہ وہ رسول کا سچا پیروکار ہے اسی طرح شیعہ علی علیہ السلام ہونے کا دعوی اس وقت زیبا ہے جب اپنے افعال' اعمال رفتار و گفتار سے یہ کر دکھائے کہ جو کام جناب امیر علیہ السلام جس وقت کرتے تھے اسی طرح وہ بھی کر گزرے صرف نام کا شیعہ و مومن ہونا کافی نہیں ہے اور جب ان کا پیرو ہوگا۔ تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی پیرو ہوگا' اور جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیرو ہوا تو پھر خدا کا دوست ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی دوست اپنے دوست کو عذاب میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتا۔ پھر خدا کیونکر جہنم کی سزا دے سکتا ہے'' (قرآن مجید مترجم فرمان علی حاشیہ ص ۸۴)

اسی بنا پر کہا گیا ہے۔

تعصی الا له و انت تظهر حبه
هذا محال فی القیاس بدیع
لو کان حبك صا دقا لا طعته
ان المحب لمن یحب مطیع

یعنی تو خدا کی نافرنی کرتا ہے اور پھر اس کی محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے یہ ایک ناممکن اور انوکھی بات ہے۔ اگر تیرا دعوائے محبت سچا ہوتا تو تو اس کی اطاعت بھی کرتا۔ کیونکہ ہر محب صادق اپنے محبوب کا مطیع فرمان بردار ہوتا ہے۔

بہر کیف جس طرح کوئی دعویٰ بغیر گواہوں کے ثابت نہیں ہوسکتا' اسی طرح زبانی دعوائے محبت بھی اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتا جب تک عمل اس کی گواہی نہ دے۔ پھر خداوند عالم نے اس معیار محبت پر پورا اترنے والوں کو اپنی محبوبیت اور گناہوں کی بخشش کی بشارت عظمی دی ہے اس موضوع پر یہاں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی ضرورت ہے۔

اگر در خانہ کس است یک حرف بس است

خدااور رسولؐ کی اطاعت سے روگردانی کرنا کفر ہے اور اسکی توجیہ

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا ...الآیۃ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت شریفہ بھی گویا سابقہ آیت کا تتمہ ہے کہ اگر تم خدا سے سچی محبت کرتے ہو تو پھر خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرو ان کے اوامر ونواہی کی تعمیل کرو۔ کیونکہ محبت کی صداقت وسچائی اطاعت وفرمانبرداری سے ہی وابستہ ہے اس سے آگے خدا نے سخت تہدید فرمائی ہے کہ اگر تم نے اطاعت سے روگردانی کی تو یہ عملی کفر متصور ہوگا نہ کہ ایمان۔ اور چونکہ ہمارے مذہب حق میں کوئی بھی بڑا یا چھوٹا گناہ جبکہ گناہ سمجھ کر اس کا ارتکاب کیا جائے وہ گناہ ہی متصور ہوتا ہے کفر نہیں ہوتا بنابریں یا تو یہاں کفر سے گناہ مراد لیا جائے گا۔ جیسا کہ حج والی آیت میں لیا جاتا ہے۔ ''وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ'' (سورہ آل عمران آیت۔۹۷)۔ یا پھر یہاں روگردانی سے خدا اور رسول کی اطاعت کے واجب ہونے کا انکار مراد لیا جائے گا' جو بلاشبہ کفر ہے۔

بہرحال نہ صرف اس آیت شریفہ میں بلکہ بہت سی دوسری آیات وروایات میں خدا کی اطاعت کے ساتھ رسولؐ کی اتباع وپیروی کا بھی حکم دیا گیا ہے (بلکہ سابقہ آیت کے مضمون کے مطابق تو اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی محبت خدا کا معیار قرار دیا گیا ہے) مگر اس کے باوجود ان مسلمانوں کی حالت زار پر تعجب ہوتا ہے جو صرف قرآن کی اتباع کو کافی سمجھتے ہیں اور سنت نبوی کی پیروی کرنا تو درکنار اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔

سنت نبویہ کی اتباع کے بغیر احکام قرآنی کا اتباع ممکن نہیں

بھلا یہ لوگ قرآنی احکام کے اتباع کے دعوی کے ساتھ سنت رسول کی پیروی کا انکار کرنے کی جرات کس طرح کرتے ہیں؟ کیا قرآن مجید ہی میں بے شمار مقامات پر زوردار الفاظ میں اتباع واطاعت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرنے اور ان کے اسوہ حسنہ کو اپنانے کا حکم نہیں دیا گیا؟ اور پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کیا سنت نبوی اور آپ کا اسوہ حسنہ قرآن سے کوئی الگ چیز ہے؟ یا قرآن کی تفسیر وتشریح کا دوسرا نام ہی سنت وسیرت نبی ہے؟ اور پھر یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتار اور ان کے کردار کے بغیر قرآن کا حقیقی مفہوم سمجھ میں کس طرح آسکتا ہے؟ جبکہ خداوند عالم فرماتا ہے:

''وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ'' یعنی (اے رسولؐ!) ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو کھول کر بتائیں کہ کیا نازل کیا گیا ہے۔ (سورہ نحل آیت۔۴۴)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ سنت کا انکار کرنے کا لازمہ ہے قرآن کا انکار کرنا (العیاذ باللہ) لہٰذا قرآن کو سمجھنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کے لیے سنت نبوی پر عمل کرنا لازم ہے اور قرآن کو اپنے خیالات اور اپنی من گھڑت تاویلات کی آماجگاہ بنانے سے احتراز کرنا واجب ہے۔

حضرت آدم حضرت نوح آل ابراہیم اور آل عمران کا اصطفاء وانتخاب

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی...الآیۃ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل اور خاندان میں جہاں جناب اسماعیل اسحاق اور یعقوب داخل ہیں۔ وہاں سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام بھی اس مقدس خانوادہ کے افراد کاملہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف داخل ہیں بلکہ اصطفاء الٰہی کا مرکز بھی ہیں چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''نحن منهم و نحن بقية تلك العترة''۔یعنی ہم ان میں سے ہیں اور ہم اسی برگزیدہ خاندان کے باقی رہنے والے افراد ہیں۔(تفسیر عیاشی، صافی وغیرہ)

البتہ جناب عمران میں اختلاف کی وجہ سے آل عمران میں بھی اختلاف ہے کہ اس سے جناب موسیٰ وہارون علیہما السلام کے والد ماجد مراد ہیں یا جناب مریم کے والد ماجد '۔ کیونکہ یہ عمران جن کی طرف جناب موسی وہارون اور جناب عیسیٰ بن مریم کی نسبت ہے صرف ایک شخص کا نام نہیں بلکہ دو علیحدہ شخص ہیں بلکہ بنابریں مشہور وہ عمران جو جناب موسیٰ وہارون علیہ السلام کے والد ماجد ہیں، وہ ایک ہزار سال اس عمران سے مقدم تھے، جو جناب مریم کے والد اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کے نانا ہیں۔ ہاں اس صورت میں یہ سب حضرات مراد لیے جاسکتے ہیں کہ جب لفظ عمران بطور علم استعمال نہ ہو اور اس کا مدلول جزئی حقیقی نہ ہو۔ بلکہ اس سے مجازی طور پر مسمی بہ عمران مراد لیا جائے۔(فصل الخطاب)

بہرحال جب اس عالمی وکائناتی اصطفاء وانتخاب میں افضل الموجودات سرکار محمد وآل محمد علیہم والسلام بھی بدرجہ اتم داخل ہیں تو پھر عالمین کی لفظ پورے احاطہ واستغراق کیساتھ انہی معنوں میں ان ذوات مقدسہ کی برگزیدگی کا اعلان کررہی ہے، جن معنوں میں رب العالمین اور رحمۃ للعالمین میں استعمال ہوئی ہے۔اور یہ اصطفاء وانتخاب الٰہی ان برگزیدہ ہستیوں کی عصمت وطہارت کی ناقابل رد دلیل ہے۔

جناب مریم علیہا السلام کی مادر گرامی کی منت کا تذکرہ

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ...آلایۃ

اس وقت رسم یہ تھی کہ اس خدمت کے لیے صنف ذکور مخصوص ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے ہاں بچی (مریم سلام اللہ علیہا) پیدا ہوئی تو انہوں نے معذرت کے لب ولہجہ میں عرض کیا کہ میرے ہاں تو بچی پیدا ہوئی ہے اور بچہ اور بچی یکساں نہیں ہوتے لہٰذا یہ بچی کس طرح یہ خدمت انجام دے گی؟ مگر رحیم وکریم پروردگار نے ان کے خلوص کے پیش نظر اسے ہی بطریق احسن قبول فرمالیا۔ اور اس طرح مادر مریم کی نذر پوری ہوگئی۔

مفسرین اسلام نے لکھا ہے کہ وہ عمران جو جناب موسیٰ وہارون کے والد ماجد تھے ان کا سلسلہ نسب یوں تھا۔ عمران بن یصهر بن قاهث بن لاوی بن یعقوب۔ اور جو عمران جناب مریمؑ کے والد ماجد تھے ان کا سلسلہ نسب یوں تھا عمران بن الہشم بن امون جو جناب سلیمان ابن داؤد کی نسل میں سے ہیں اور مادر مریم جنہوں نے یہ منت مانی تھی ان کا اسم گرامی حنہ تھا اور یہ دو بہنیں تھیں ایک جناب عمران کی زوجیت میں تھیں اور دوسری جناب زکریا علیہ السلام کی زوجیت میں تھیں جنکا نام اشیاع تھا اور ان کے والد ماجد کا نام نامی قاقود بن قبیل تھا اس طرح جناب یحییٰ علیہ السلام اور جناب مریمؑ خالہ زاد بہن بھائی تھے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ جناب یحییٰ علیہ السلام اور جناب عیسیٰ علیہ السلام خالہ زاد بھائی تھے غلط ہے۔

آیات القرآن

فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا
وَضَعَتۡ ؕ وَلَیۡسَ الذَّکَرُ کَالۡاُنۡثٰی ۚ وَاِنِّیۡ سَمَّیۡتُهَا مَرۡیَمَ وَاِنِّیۡۤ
اُعِیۡذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا
بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ وَّاَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّکَفَّلَهَا زَکَرِیَّا ۚؕ کُلَّمَا دَخَلَ
عَلَیۡهَا زَکَرِیَّا الۡمِحۡرَابَ ۙ وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا ۚ قَالَ یٰمَرۡیَمُ اَنّٰی لَکِ
هٰذَا ؕ قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ
حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ
ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً ۚ اِنَّکَ سَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

ترجمۃ الآیات

پھر جب اس کے یہاں وہ (بچی) پیدا ہوئی۔ تو اس نے کہا اے میرے پرودگار! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ میں تو یہ لڑکی جنی ہوں) حالانکہ خدا خود خوب جانتا ہے کہ وہ کیا جنی ہے اور وہ جانتا ہے کہ لڑکا، لڑکی یکساں نہیں ہوتے اور میں نے اسکا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم (کے شر) سے (بچنے کے لیے) تیری پناہ میں دیتی ہوں۔(۳۶) تو اس کے پروردگار نے اس لڑکی (مریم) کو احسن طریقہ سے قبول فرمایا لیا اور اچھی طرح اس کی نشوونما کا انتظام کیا (یعنی) زکریا کو اس کا کفیل (اور سرپرست) بنایا۔ جب بھی زکریا محراب عبادت میں اس (مریم) کے پاس آتے تھے تو اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز موجود پاتے (اور) پوچھتے اے مریم! یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ وہ جواب دیتی یہ خدا کے یہاں سے آیا ہے بے شک خدا جسے چاہتا ہے اسے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے(۳۷) اس موقع پر زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور عرض کیا اے میرے پروردگار! مجھے اپنی طرف سے پاک و پاکیزہ اولاد عطا فرما۔ بے شک تو (ہر ایک کی) دعا کا سننے والا ہے۔(۳۸)۔

تشریح الالفاظ

(۱) اعیذھا یہ عوذ و عیاذ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پناہ مانگنا اور پناہ میں دینا (۲) کفّلھا کفّل کے معنی ہیں نان و نفقہ اور خبر گیری کی ذمہ داری لینا (۳) المحراب اس لفظ کے معنی میں (۱) گھر کا شروع کا حصہ (۲) اچھی جگہ (۳) صدر مجلس (۴) محراب مسجد (۵) امام کی جگہ (۶) قبلہ

تفسیر الآیات

جناب زکریاؑ کی کفالت اور جناب مریم کے لیے بے موسم کے پھلوں کا آنا

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ...الآیۃ

خداوند عالم نے مادر مریم کی نذر کو احسن طریقہ سے قبول فرمایا اور اس قبولیت کی ظاہری علامت یہ قرار

دی کہ اس (مریمؑ) کی نشوونما اور تعلیم وتربیت کی کفالت وذمہ داری جناب زکریا علیہ السلام کے سپرد فرمائی۔

ظاہر ہے کہ اچھے مربی کا مل جانا بھی محسن حقیقی کا بہت بڑا احسان ہے۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

ایک قول کے مطابق وہ ایک دن میں اس قدر بڑھتی تھیں جس قدر عام بچیاں ایک سال میں بڑھتی ہیں اور ابن عباس سے مروی ہے کہ جب ان کی عمر نو برس کی ہوئی تو وہ دن کو روزہ رکھتی تھیں اور رات کو مصلائے عبادت پر گزارتی تھیں۔ انہیں دنیا ومافیھا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس دور کے احبار وعباد سے سبقت لے گئیں (مجمع البیان)

چونکہ جناب مریم ہنوز شکم مادر میں تھیں کہ ان کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ان کی کفالت جناب زکریا علیہ السلام نے کی۔ اور جناب زکریا علیہ السلام ان کی خبر گیری کے لیے ان کے پاس محراب عبادت میں تشریف لے جاتے، جو جناب زکریا علیہ السلام نے حجرہ کی شکل میں ان کی عبادت کے لیے بنا کر دیا تھا تو ان کے پاس بے موسم کے پھل موجود پاتے۔ اس طرح کہ گرمی کے پھل سردی میں اور سردی کے پھل گرمی میں اور یہ علاوہ اسکے کہ جناب مریم کی کرامت تھی جو خداوند عالم اپنے اولیاء کے ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے بظاہر اس لیے تھا کہ جناب مریم کی پاکدامنی پر دھبہ نہ آئے اور کوئی یہ شک نہ کرے کہ کوئی آدمی دے گیا ہے اس لیے جناب زکریا علیہ السلام کے اس سوال پر کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ جناب مریم جواب دیتیں "هو من عند الله"۔ یعنی یہ اللہ کی طرف سے ہے............خدا جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے کیونکہ اس کی عطا وبخشش عام اندازوں کی پابند نہیں ہے اور نہ ہی اسے اپنے خزانہ کی کمی کا کوئی اندیشہ ہے۔

جناب زکریا علیہ السلام کا جناب مریم کے پاس بے فصل میوے دیکھ کر خدا سے بے موسم کی اولاد طلب کرنا

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ...الآیۃ

جناب زکریا علیہ السلام کبیر السن ہو چکے تھے۔ عام مورخین کے بیان کے مطابق اس وقت ان کی عمر ایک سو اٹھارہ سال تھا اور ان کی بیوی بھی بانجھ تھی ور ان کے اولاد نہ تھی اور نظر بہ ظاہر حالات اس وقت ان کے ہاں اولاد کے ہونے کی کوئی امید بھی نہ تھی مگر عمومی فطرت انسانی کے مطابق اولاد کی خواہش تو تھی تو جب جناب مریمؑ کے پاس بے فصل کے میوے دیکھے تو جناب زکریاؑ کے دل میں دیرینہ تمنا نے کروٹ لی اور یہ تصور کر کے کہ جو قادر

مطلق مریم کو بے فصل کے پھل دے سکتا ہے' کیا وہ مجھے بے موسم کی اولاد نہیں دے سکتا؟ لہٰذا دعا کی۔

رَبِّ هَبۡ لِيۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ......الآية

اے میرے پروردگار! مجھے پاک و پاکیزہ اولاد عطا فرما۔جس وقت وہ محراب عبادت میں نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ فرشتوں نے یعنی فرشتوں کی نوع میں سے ایک فرشتہ یعنی جناب جبرائیل علیہ السلام نے آواز دی کہ خدائے قدیر آپ کو یحییٰ نامی فرزند کی خوشخبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ (جناب عیسیٰ علیہ السلام) کا تصدیق کرنے والا' سردار' عورتوں سے بے تعلق رہنے والا اور نیکوکار جماعت میں سے نبی ہوگا............ باجودیکہ جناب زکریا نے جناب مریم کے پاس قدرت خدا کا کرشمہ دیکھ کر یعنی بے موسم کے پھل دیکھ کر اپنے لئے بے موسم کی اولاد مانگی تھی اب جبکہ فرشتہ کے ذریعہ من جانب اللہ قبولیت دعا کی بشارت ملی تو طبعی موانع پر نگاہ کر کے کہا میرے ہاں کیوں کر اولاد ہوگی جبکہ میرا بڑھاپا آچکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ظاہر ہے کہ یہ بات قدرت خدا میں کسی شک وشبہہ کے بنا پر نہ تھی بلکہ مضطرب دل کو تسلی اور قلب کو اطمینان دلانے کے لئے تھی کہ آیا ان موانع کے باوجود قادر مطلق عادت اور نیچرل کے خلاف اولاد دے گا یا میاں بیوی میں کوئی تبدیلی کرے گا کہ ہمیں جوان رعنا بنا دے گا۔

بہر حال جب پتا چلا کہ اسی حالت میں نظام عادت کے خلاف خدائے قدیر اولاد دے گا تو بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ بارالہا! تیرا وعدہ برحق ہے لیکن اطمینان قلب کی خاطر میری دعا کی قبولیت کی کوئی علامت مقرر فرما تا کہ مزید شکرادا کروں ارشاد ہوا۔اس کی علامت یہ ہے کہ باوجودیکہ تمہاری زبان میں کوئی نقص نہیں ہو گا مگر تین دن تک خلق خدا سے کلام نہیں کر سکو گے ہاں ذکر خدا اور اس کی تسبیح و تقدیس کر سکو گے اور اس دوران اس کے سوا تمہارا کوئی اور مشغلہ نہ ہوگا اور یہ خدا کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہوگا کہ زبان میں کوئی نقص نہیں ہے اور اسکے باوجود مخلوق سے کلام نہیں کر سکتی ہاں خالق کا ذکر کر سکتی ہے۔

اس واقعہ پر تبصرہ

اس واقعہ میں نیچری حضرات کے لئے لمحہ فکریہ موجود ہے جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اس عالم کی ہر چیز علل و اسباب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ کہ خود خدا بھی اس نظام اور دستور کے خلاف کچھ کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ (العیاذ باللہ) وہ آنکھوں سے تعصب اور کورانہ تقلید کی پٹی اتار کر اس واقعہ میں غور وفکر کریں تو کیا یہ واقعہ نظام عادت کے خلاف نہیں ہے؟ اگر ایسا نہیں تھا تو جناب زکریا علیہ السلام نے کیوں سوال و جواب کیا؟ حقیقت الامر یہ ہے کہ معجزہ نام ہی اسی چیز کا ہے کہ کوئی واقعہ نظام عادت اور اس کے دستور کے خلاف وقوع پذیر ہو یعنی وہ کام جو

عادت، نیچر اور مجرائے طبعی کے خلاف ہو مگر عقل و خرد کے خلاف نہ ہو جسے خدا اپنے کسی نبی یا اس کے وصی کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے اس کے ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ خدا کسی نظام عادت اور نیچر کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ قادر مطلق ہے اور باوجود عادی و طبعی موانع کے جو چاہتا ہے کرتا ہے وہ عالم اسباب کے زنجیروں کو توڑ کر خارق عادت کام کرگزرتا ہے وہ مسبب الاسباب ہے یعنی اسباب کو اسباب بنانے والا ہے تو جو قادر مطلق کسی چیز میں کوئی تاثیر رکھ سکتا ہے عندالضرورہ اسے سلب بھی کرسکتا ہے اسی کا نام معجزہ یا کرامت ہے جو ابنیاء و آئمہ کے معجزات اور اولیاء اللہ کے کرامات کے نام سے قرآن و سنت کی ناقابل ردّ اور ناقابل تاویل نصوص سے ثابت ہے۔

ایک ضروری وضاحت

مخفی نہ رہے کہ اس آیت مبارکہ میں جناب یحیٰؑ کے لئے ''حصور'' کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مشہور معنی عورتوں سے بے رغبت رہنے والا ہے۔ یہ صفت اس شرع میں ممدوح ہوگی مگر اب یہ فعل ممدوح و مستحسن نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد ایسے انبیاء و مرسلین نے ازدواجی تعلقات قائم رکھے ہیں جو مقام و مرتبہ میں جناب یحییٰ علیہ السلام بھی سے بلند و برتر تھے۔

حصول اولاد کے لئے دو عمل:

ا۔ تفسیر مجمع البیان میں حرث بن مغیرہ سے روایت کی گئی ہے ان کا بیان ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ میں اس خاندان سے ہوں جو ختم ہو گیا ہے اور میری بھی کوئی اولاد نہیں ہے فرمایا حالت سجدہ میں یہ دعا پڑھ۔

''رب هب لی من لدنك ذرية طيبة انك سميع الدعاء رب لا تذرنی فردا و انت خير الوارثين۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے ایسا کیا تو خداوندعالم نے مجھے دو بیٹے علی و حسین عطا فرمائے۔ (مجمع البیان جلد ۲ وغیرہ)۔

۲۔ جناب محمد بن مسلم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کو حمل ہو تو اسے چاہیے کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد دو رکعت نماز پڑھے۔ رکوع و سجود کو طول دے پھر یہ دعا پڑھے:

اللهم انی اسئلك بما سئلك به زكريا يارب لا تذرنی فرداً و انت خير الوار

ثين اللهم هب لی ذرية طيبة انك سميع الدعاء اللهم باسمك استحللتها وفی اما نتك اخذ تها فان قضيت فی رحمها ولداً فا جعلها غلاماً مباركاً ولا تجعل للشيطان فيه شركا و نلا صيباً۔ (تفسیر نور الثقلین)۔

آیات القرآن

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ
بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ
عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ
قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ
كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ
اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

ترجمۃ الآیات

تو فرشتوں نے انہیں اس حالت میں آواز دی جب کہ وہ محراب میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ خدا آپ کو یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے ایک کلمہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔ سردار، ضبطِ نفس کرنے والا پارسا اور نیکوکار جماعت میں سے نبی ہوگا (۳۹) جناب زکریا نے (یہ خوشخبری سن کر) کہا۔ اے پروردگار! میرے یہاں لڑکا کس طرح ہوگا جبکہ میرا بڑھاپا آگیا۔ اور میری بیوی بانجھ ہے؟ ارشاد ہوا اسی طرح (خدا) جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے (۴۰) عرض کیا اے میرے پروردگار! میرے (اطمینان قلب) کیلئے کوئی علامت مقرر فرمایا تمہاری علامت یہ ہے کہ تم تین دن رات تک لوگوں سے اشارہ کے سوا بات نہیں کرسکو گے۔ (شکرِ نعمت کے طور پر) اپنے پروردگار کا کثرت سے ذکر کرو اور صبح و شام اسی کی تسبیح کرو (۴۱) او

رجب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ نے تمہیں منتخب کرلیا ہے اور تمہیں پاک و پاکیزہ بنایا ہے اور تمہیں تمام جہانوں کی عورتوں سے برگزیدہ بنادیا ہے۔ (۴۲)۔

تشریح الالفاظ

(۱)حصورًا جب اس کا صلہ عن ہوتواس کے معنی ہوتے ہیں شرم کی وجہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا

(۲)عاقر یہ عُقَر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بانجھ

(۳)رمزًا اس کے معنی ہیں اشارہ وکنایہ

تفسیر الآیات

جناب مریم کی برگزیدگی

اِنَّ اللّٰہ اصۡطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ...الآیة

جناب مریم علیہا السلام کیلئے اصطفاء یعنی انتخاب کی لفظ دوبار استعمال ہوئی ہے۔ حدیثوں کے مطابق پہلی بار لفظ اصطفیٰ سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کی ذریت سے منتخب کیا اور دوسری بار اصطفاء سے مراد یہ ہے کہ شوہر کے بغیر بچہ کی ولادت کے لئے منتخب کیا بہر حال ان کے بارے میں دوبار لفظ اصطفاء کا استعمال ان کی خصوصی عصمت ظاہر کرتا ہے بالخصوص آیت کے آخر میں نساء العالمین پر ان کے اصطفاء وانتخاب کا جو تذکرہ ہے وہ ان کی افضلیت کا آئینہ بردار ہے فریقین کی مستند کتابوں میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

''خیر نساء العالمین اربع (۱) مریم بنت عمران (۲) آسیہ بنت مزاحم امراۃ فرعون و (۳) خدیجه بنت خویلد و (۴) فاطمه بنت محمد'' کائنات کی تمام عورتوں میں سے بہترین عورتیں چار ہیں۔ (۱) مریم بنت عمران (۲) آسیہ بنت مزاحم (۳) خدیجہ بنت خویلد (۴) اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اب اس میں تو کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ چار مستورات تمام کائنات کی عورتوں سے افضل

واعلیٰ ہیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ چاروں مخدرات مرتبہ ومقام میں برابر ہیں یا ان کے باہمی مراتب میں فرق ہے؟ ہم اس پارہ کے آغاز میں واضح کر چکے ہیں کہ خالق حکیم نے اپنی حکمت بالغہ سے اس کائنات میں کوئی بھی دو چیزیں ہرلحاظ سے برابر پیدا نہیں کیں۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان میں بھی باہمی فرق مراتب ہے مگر ہم سر دست جناب مریم اور جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے باہمی مقابلہ کے بارے میں مختصر سی گفتگو کرتے ہیں۔ بعض علماء اہلسنت جناب مریم علیہا السلام کی افضلیت کے قائل ہیں کیونکہ اس آیت میں عالمین کی عورتوں پر ان کے اصطفاء کا تذکرہ کیا گیا ہیں۔

جناب سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی عالمین کی عورتوں پر افضلیت کا اثبات

مگر تمام شیعہ علماء اور بعض اکابر علماء اہلسنت جناب سیدہؑ کی افضلیت کے قائل ہیں اور اس دعوی کی صداقت کے دوسرے دلائل و براہین کو چھوڑ کر یہاں صرف دو مختصر مگر مضبوط دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) کتاب الشرف المو بد لآل احمد نبھانی وغیرہ میں حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

یا ابنتی اما ترضین ان تکونی سیدۃ نساء العلمین۔ (اے میری بیٹی فاطمہ کیا تو اس پر خوش نہیں ہے کہ تو سارے جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے)

اس پر بی بی نے عرض کیا یا ابت فاین مریم ؟ جناب مریمؑ کہاں جائیں گی۔

فرمایا۔ تلك سیدۃ نساء عالمها و انت سیدۃ نساء العالمین من الا ولین و الا خرین۔ جناب مریم اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھیں مگر تم تمام اولین وآخرین کی عورتوں کی سردار ہو۔

اس روایت سے واضح وآشکار ہوتا ہے کہ جناب مریم کے قصہ میں جو ''وا صطفاك علی نساء العا لمین'' کا لفظ وارد ہے اس سے ان کے زمانہ کے عوالم مراد ہیں بالکل اسی طرح جس طرح سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت میں ''اسماعیل و یونس ولوطا کلا فضلنا علی العالمین'' (سورہ انعام۔۸۶)۔ جناب اسماعیل و یونس اور لوط کو عالمین پر افضلیت دی گئی ہے تو اس سے ان کے زمانہ کے لوگ مراد ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اس بات کا قائل نہیں ہے کہ جناب لوط علیہ السلام جناب موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں یا جناب اسما عیل علیہ السلام اپنے والد بزرگوار ابراہیم علیہ السلام سے افضل ہیں۔ مگر سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا کی سیادت کسی خاص زمان و

مکان کی قید سے مقید نہیں ہے وہ اسی طرح عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں جس طرح خدا رب العالمین ہے اور پیغمبر اسلامؐ رحمۃ اللعالمین ہیں یہاں عالمین کا دائرہ وہی ہے جو خدا کی خدائی اور پیغمبرؐ کی مصطفائی کا ہے جس سے کوئی بھی مخلوق باہر نہیں ہے۔

۲۔ متفق علیہ احادیث میں حضرت فاطمہ زہراؑ کو سیدۃ نساء اھل الجنۃ فرمایا گیا ہے۔ وہ جنت میں جانے والی تمام مستورات کی سردار ہیں اور ظاہر ہے کہ اس عموم میں جناب مریم بھی داخل ہیں اسلئے وہ بھی جناب سیدہؑ کی سرداری میں داخل ہیں۔ فاضل نبھانی نے تصریح کی ہے کہ بہت سے محقق علماء جیسے تقی سبکی، سیوطی اور بدرزرکشی اور تقی مقریزی جناب سیدہؑ کی افضلیت کے قائل ہیں انہیں حقائق کی بنا پر دیوبندی مکتبہ فکر کی تفسیر معارف القرآن (جلد ۲ صفحہ ۶۳) میں لکھا ہے ''واصطفاك علی نساء العالمین'' سے مراد اس زمانے میں تمام جہان کی عوتیں ہیں اس لیے حدیث میں سیدۃ نسا اھل الجنۃ فاطمہ کا ارشاد اس کے منافی نہیں''۔ اور بریلوی مکتبہ فکر کی تفسیر ضیاء القرآن (جلد اص ۲۲۷) میں مرقوم ہے ''اور نساء العالمین سے مراد ان کے اپنے زمانہ کی عورتیں ہیں''۔ اور اہلحدیث مسلک کے عالم مولانا وحیدالزمان اپنے ترجمۃ القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں ''ایک جماعت اہل حدیث کا یہ قول ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا جگر پارہ تھیں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لہٰذا ان کے برابر جہان میں کوئی اور عورت نہیں ہوسکتی (قرآن مترجم مولانا وحیدالزمان)۔

اس تشریح سے ثابت ہو گیا کہ جناب مریم سلام اللہ علیہا اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہیں آیت کے آخر میں رکوع و سجود کرنیوالوں کے ساتھ رکوع و سجود کرتی رہو'' کا جو حکم ہے اس سے زمانی و مکانی معیت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے عملی معیت مراد ہے کہ خدا کے دوسرے مخلص بندوں کی طرح تم بھی رکوع و سجود خشوع و خضوع اور اطاعت و عبادت کرتی رہو آیت میں چونکہ سجود کا پہلے اور رکوع کا بعد میں ذکر ہے اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے کہ جناب مریم کے دور کی کوئی اور نماز تھی جس میں سجود پہلے اور رکوع بعد میں تھا۔ اس لئے کہ واؤ (و) جو حرف عطف ہے یہ چیزوں کو ایک حکم میں جمع کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے اس میں ترتیب ملحوظ نہیں ہوتی۔

آیات القرآن

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ

اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾
اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ
الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ
الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾
قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ
يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

ترجمۃ الآیات

اے مریم اپنے پروردگار کی اطاعت کرو اور سجدہ کرو۔ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو (۴۳) (اے رسول) یہ (خبر) غیب کی خبروں میں سے ایک ہے جو وحی کے ذریعہ ہم آپ کی طرف بھیج رہے ہیں اور آپ ان (دعویداران سرپرستی) کے پاس موجود نہ تھے جب وہ (قرعہ اندازی کیلئے) اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے؟ اور آپ ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ (۴۴) اور (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک خدا آپ کو اپنے کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ جو دنیا و آخرت میں عزت و آبرو والا ہوگا۔ اور (خدا کے) مقرب بندوں میں سے ہوگا (۴۵) اور وہ گہوارے میں بھی لوگوں سے باتیں کرے گا۔ اور ادھیڑ عمر میں بھی۔ اور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔ (۴۶) (یہ بشارت سنکر) مریم نے کہا۔ اے میرے پروردگار! میرے یہاں بچہ کہاں سے ہوگا۔ حالانکہ مجھے کسی انسان (مرد) نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ارشاد ہوا بات اسی طرح ہے مگر خدا جو چاہتا ہے (بلا اسباب بھی) پیدا کرتا ہے جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہوجا تو بس وہ ہوجاتا ہے (۴۷)۔

تشریح الالفاظ

(۱)نوحیه یہ وحی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پوشیدہ بات، اشارہ کرنا، اوردوسروں سے چھپا کر بات کرنا

(۲)وجیھًا اس کے معنی ہیں قوم کا سرداراور صاحبِ وجاہت۔

(۳)کھلاً کہل کے معنی ہیں ادھیڑ عمر یعنی تیس سال سے بچاس سال کی عمر والا

تفسیر الآیات

خدائے تعالیٰ اپنے انبیاء کو بعض غیبی امور پر مطلع فرماتا ہے

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ...الآیة

یہ خبر غیب کی چیزوں میں سے ہے جو وحی کے ذریعہ ہم آپ کی طرف بھیج رہے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خدائے علیم وحکیم کے بتانے سے بہت سے غیبی امور پر مطلع ہوتے ہیں اور یہ بات ان کی نبوت کی صداقت کی محکم دلیل ہوتی ہے کیونکہ اس سے اعجاز کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے کہ گذشتہ امتوں کے وہ واقعات کہ جن کے معلوم کرنے کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا۔کیونکہ جو معلومات سابقہ کتابوں سے ملتی تھیں وہ مسخ شدہ حالت میں تھیں۔نیز ان کتابوں کی اشاعت بند تھی اور اہل کتاب کے علماء واحبار ان مذہبی معلومات کو اپنی مرجعیت ومرکزیت کو قائم رکھنے کیلئے اپنے سینوں میں رکھا کرتے تھے اس کے باوجود ان معلومات کا اپنی صحیح صورت میں مل جانا فیض ربانی اور وحی آسمانی کا ہی نتیجہ وثمرہ ہوسکتا ہے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انبیاء ومرسلین یا آئمہ طاہرین علیہم السلام عالم الغیب ہوتے ہیں کیونکہ یہ بات علم کلام و عقائد میں واضح وآشکار کی جاچکی ہے کہ لفظ عالم الغیب کا اطلاق صرف اس ہستی پر کیا جاتا ہے جس کا علم کلی واحاطی ہو اور پھر اپنا ذاتی ہو۔اور ایسی ہستی صرف رب العالمین کی ہے اور جس ہستی کا علم جزئی ہو اور وہ بھی کسی اور ہستی سے حاصل کردہ ہو تو اس کے عالم کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا اس سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے خواہشمند حضرات ہماری کتاب اصول الشریعہ فی عقائد الشیعہ کی طرف رجوع کریں۔نیز اس موضوع کی کسی مناسب مقام پر مزید وضاحت کی جائے گی انشاءاللہ تعالیٰ۔

قرعہ کا شرعی حکم

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ ...۱۱آیۃ

حدیث میں وارد ہے القرعۃ لکل امر مشکل قرعہ ہر مشکل کام کو حل کرنے کیلئے ہے (وسائل الشیعہ) یہاں جناب مریم کی کفالت کے سلسلہ میں اور سورہ صافات میں جناب یونس علیہ السلام کے بارے میں بھی اس قرعہ اندازی کا تذکرہ ہے مگر یہ قرعہ اندازی صرف وہاں وارد ہے جہاں کسی مسئلہ کے حل کی کوئی شرعی و عقلی صورت موجود نہ ہو لیکن جن حقوق و معاملات کے اسباب و احکام شریعت میں متعین ہیں وہاں قرعہ اندازی جائز نہیں ہے بلکہ قمار میں داخل ہے جیسے ایک شے چند افراد کی مشترکہ ملکیت ہو اور وہاں قرعہ اندازی کی جائے کہ جس کا نام نکل آئے وہ بس لے جائے یا کسی بچے کے نسب میں اختلاف ہو تو وہاں قرعہ اندازی کی جائے اور جس کا نام نکل آئے وہ بچہ اس کا سمجھا جائے اور اس شخص کو اس کا باپ تصور کیا جائے۔ یہ طریقہ کار غلط ہے اس طرح قرعہ اندازی کے ذریعہ کاروبار اور لین دین کرنا بھی جائز نہیں ہے بالفاظ دیگر جہاں چند شرکاء کے حقوق مساوی یا نہ ہوں جیسے مشترکہ مکان تو جب اس کی کوئی جہت متعین کرنا ہو کہ کس کیلئے مشرقی حصہ اور کس کیلئے مغربی حصہ تو وہاں قرعہ اندازی جائز ہے نیز تنازعات کے علاوہ بھی کسی مشکل کو حل کرنے میں اس طریقہ کار سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی بھیڑ بکری سے بدفعلی کرے جس کی وجہ سے اس کا دودھ اور گوشت حرام ہو جائے مگر وہ اسے ریوڑ میں چھوڑ دے اور اس کی تمیز نہ ہو سکے تو قرعہ اندازی کر کے اسے متعین کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بعض احادیث اہلبیتؑ میں وارد ہے اب رہی یہ بات کہ اس وقت قلمیں پھینک کر جو قرعہ اندازی کی گئی تھی۔ اس کا طریقہ کار کیا تھا؟ قرآن میں تفصیل مذکور نہیں ہے۔ اور جو تفصیلات بعض کتب تفسیر میں موجود ہیں وہ قابل اعتماد نہیں ہیں (واللہ العالم)۔

کسی مخلوق کے حق میں یہ عقیدہ رکھنا باطل ہے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ حاضر وناظر ہے

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ ہر وقت ہر جگہ پر حاضر و ناظر ہونا خدا کی وہ خصوصی شان الوہیت ہے کہ کوئی بھی مخلوق خواہ لطیف ہو یا کثیف اس صفت میں اس کی شریک نہیں ہے کیونکہ کسی جسم دار چیز کا ایک وقت میں ایک سے زائد جگہ پر موجود ہونا عقلاً محال و ممتنع ہے اور خدا بھی اس لیے ہر وقت ہر جگہ حاضر و ناظر ہے کہ وہ جسم و جسمانیات سے منزہ و مبرا ہے ہاں البتہ علمی و احاطی طور پر ہر وقت ہر جگہ حاضر بھی ہے اور ہر چیز پر نا

ظر بھی مگر وہ عوام کالانعام جو محال عقلی اور محال عادی میں فرق نہیں کر سکتے وہ غیر ذمہ دار اہل منبر کی غلط بیانیوں کی وجہ سے اور نیم خواندہ ملاؤں کی غلط تعلیم کی وجہ سے بعض ایسے غلط عقائد ونظریات دل ودماغ میں قائم کر لیتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ مگر باوجود عقل وشرع کے خلاف ہونے کے وہ لوگوں کے دل ودماغ میں اس طرح راسخ ہو چکے ہیں کہ کسی قیمت پر انہیں چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہیں انہی بے سروپا اور بے بنیاد عقائد باطلہ میں سے ایک عقیدہ انبیاء وآئمہ علیہم السلام کے حاضر وناظر ہونے والا بھی ہے کہ وہ حضرات بجسد عنصری ہر وقت ہر جگہ حاضر بھی ہیں اور ناظر بھی۔ مخفی نہ رہے کہ حاضر وناظر ہونا دو الگ الگ موضوع ہیں اور دوسرے ذمہ دار علماء کی طرح ہم نے بھی اپنی اعتقادی کتابوں (احسن الفوائد بالخصوص اصول الشریعہ) میں اس فاسد نظریہ کا تار پود عقلی ونقلی دلائل سے بکھیر کر رکھ دیا ہے اس موضوع کی جملہ تفصیلات معلوم کرنے کے خواہشمند حضرات ان کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں

یہاں صرف حاضر کے موضوع کے متعلق اس آیت مبارکہ کی مناسبت سے تھوڑی سے وضاحت کی جاتی ہے

(۱) ارشاد قدرت ہے۔ ''وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ'' (سورہ آل عمران آیت۔ ۴۴) اے رسول؟ تم ان (سرپرستان مریم) کے پاس موجود نہ تھے جب وہ لوگ اپنا اپنا قلم ڈال رہے تھے۔

(۲) ''وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ'' (سورہ یوسف آیت۔ ۱۰۲)۔ جس وقت یوسف کے بھائی باہم مشورہ کر رہے تھے اور (ہلاکت کی) تدبیریں کر رہے تھے تو تم ان کے پاس موجود نہیں تھے

(۳) ''وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ'' (سورہ قصص آیت۔ ۴۴) ''(اے رسولؐ) جس وقت ہم نے موسی علیہ السلام کے پاس اپنا حکم بھیجا تھا تو تم (طور کے) مغربی جانب موجود نہ تھے اور نہ تم ان واقعات کے چشم دید دیکھنے والوں سے تھے۔

(۴) ''وَ مَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ'' (سورہ قصص آیت۔ ۴۵) اور نہ تم مدین کے لوگوں میں رہے تھے کہ ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھتے (اور تم کو ان کے حالات معلوم ہوتے) مگر ہم تو (تم کو) پیغمبر بنا کر بھیجنے والے تھے (ترجمہ فرمان)

ان آیات مبارکہ سے بعبارۃ النص یہ بات روز روشن کی طرح واضح وآشکار ہو جاتی ہے کہ جب یہ

واقعات رونما ہوئے تو اس وقت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں حاضر نہ تھے پس جب سردار اہل بیت علیہم السلام کے حاضر ہونے کی نفی کر دی گئی تو پھر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے حاضر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ان آیات مبارکہ سے ان ذوات مقدسہ کے ہر جگہ حاضر ہونے کے خود ساختہ عقیدہ باطلہ کا بطلان تو واضح وعیاں ہو گیا اور جہاں تک ان کے ہر وقت ہر جگہ ناظر ہونے اور ہر چیز کے دیکھنے اور جاننے کا تعلق ہے تو اس کا غلط و باطل ہونا ہم کسی اور مناسب مقام پر وضاحت سے بیان کریں گے انشاءاللہ۔ سر دست اتنا جان لیں کہ خلاق عالم ارشاد فرماتا ہے ''ذلك من انباء الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا'' (سورہ ہود آیت۔۴۹) یہ غیب کی چند خبریں ہیں جن کو ہم تمہاری طرف وحی کے ذریعہ پہنچاتے ہیں اس سے قبل نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم ہی (جانتی تھی) (ترجمہ فرمان)

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ علم کی نفی رویت کی نفی کو مستلزم ہے۔

جناب عیسیٰ علیہ السلام کو ''کلمۃ اللہ'' کہنے کی وجہ اور ان کے دوسرے خصوصیات کا اجمالی تذکرہ

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ...الآیة

جناب عیسیٰ علیہ السلام کو ''کلمۃ اللہ'' اس لیے کہا گیا ہے کہ اگرچہ کائنات کی ہر چیز خدائے تعالیٰ کے کلمہ کن کی جلوہ گری ہے مگر خالق حکیم نے اپنی حکمت بالغہ سے ہر چیز کو سبب اور مسبب اور علت و معلول کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا ہے کہ ان کی تخلیق میں عام نگاہیں کلمہ کن کا جلوہ نہیں دیکھ سکتیں۔ اس لئے علل و اسباب کے حجاب میں اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن یہاں جناب عیسی علیہ السلام کو ''کلمۃ منہ'' قرار دیا گیا ہے جناب عیسیٰ علیہ السلام کا نام تو یہی ہے مگر لقب مسیح اور کنیت ابن مریم ہے ان کے مسیح ہونے کے متعدد وجوہ بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ مسیح کے ایک معنی ہیں مسح کرنے والا۔ چونکہ آپ جب مایوس العلاج بیماروں پر اپنا ہاتھ پھیرتے تھے تو وہ باذن اللہ صحت یاب ہو جاتے تھے۔ اس لیے خداوند علیم نے ولادت سے پہلے ہی ان کا لقب مسیح مقرر کر دیا۔ نیز مسیح کے ایک معنی مبارک بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اس معنی کے لحاظ سے بھی مسیح ہیں۔

نیز مخفی نہ رہے کہ عیسیٰ علیہ السلام عبرانی لفظ یشوع کا معرب ہے جس کے معنی سید و سردار ہیں۔ (ضیاء القرآن)

خدا نے جناب عیسیٰ علیہ السلام کو ابن مریم فرما کر اس وقت اشارہ کر دیا تھا کہ وہ بے باپ پیدا ہوگا ورنہ باپ کی طرف نسبت دی جاتی بہر نوع خلاق عالم نے ان آیات مبارکہ میں جناب عیسی علیہ السلام کی چند خصوصیات کا تذکرہ فرمایا ہے جو بالترتیب یہ ہیں:

(۱) دنیا و آخرت میں عزت والا ہوگا۔ چونکہ جناب مریم کو اندیشہ تھا کہ یہ بچہ چونکہ عام فطرت کے خلاف پیدا ہو رہا ہے لہٰذا لوگ اس پر مختلف الزام لگائینگے اور عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے تو خداوند کریم نے ان کو اطمینان دلایا کہ وہ مولود مسعود ہوگا اور دنیا و آخرت میں معزز و محترم ہوگا۔

(۲) مقرب بارگاہ خدا ہوگا۔

(۳) وہ گہوارے میں اور پوری عمر کو پہنچ کر یکساں پر مغز اور بامعنی فصیح و بلیغ گفتگو کرے گا ایسا نہیں ہوگا کہ گہوارے میں غوں غاں کرے اور بڑا ہو کر عاقلانہ گفتگو کرے۔

(۴) جماعت صالحین سے ہوگا

(۵) خدا اسے کتاب یعنی لکھنے پڑھنے یا قانون کی آسمانی کتابوں بالخصوص توراۃ وانجیل کی اور حکمت و دانائی کی تعلیم دے گا۔

(۶) اسے بنی اسرائیل کا رسول بنائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رسالت پورے عالم انسانیت کیلئے نہیں تھی خود انجیل کی متعدد آیتوں سے قرآن کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ''اس نے جواب میں کہا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کو کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا''۔ (متی ۱۵۔۳۵)

(۷) وہ صاحب معجزات ہوگا جن کی تفصیل بعد ازیں آرہی ہے۔

(۸) وہ تورات کی تصدیق کرنے والا ہوگا

(۹) وہ ان بعض چیزوں کو حلال قرار دے گا جو شریعت موسوی میں حرام تھیں

(۱۰) وہ خدا کی وحدانیت و یکتائی اور اس کی عبادت و کبریائی کا پرچار کرنے والا ہوگا۔ تلک عشرہ کاملہ۔

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَكُوۡنُ...الآیۃ

جناب مریم کا یہ سوال خدا کی قدرت میں کسی قسم کے شک وشبہ کی بنا پر نہیں تھا بلکہ عام نظام فطرت کے تحت تھا بھلا جب کسی باکرہ لڑکی سے کہا جائے کہ تیرے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے تو وہ یقینا نظر بظاہر حالات حیران و پریشان تو ہوگی اور ضرور سوال کرے گی کہ آیا محض قدرت خداوندی سے مرد کے بغیر ایسا ہوگا یا اسے نکاح

کرنے کا حکم دیا جائے گا؟ فرشتے نے جواب دیا کہ وہ نظام فطرت کے خلاف اور کسی آدمی کے مس کئے بغیر محض قدرت الٰہی کے تحت ایسا ہوگا۔ چنانچہ جناب مریم فرشتہ کا یہ جواب سنکر اور مطمئن ہوکر خاموش ہوگئیں۔

آیات القرآن

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ
الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ
الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ
وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ
بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾

ترجمۃ الآیات

اور خدا اس (بچہ) کو کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل کی تعلیم دے گا۔ (۴۸) اور اسے بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنائے گا۔ (اور جب وہ مبعوث ہوگا تو کہے گا کہ) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے معجزہ لے کر آیا ہوں کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندہ کی صورت بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور میں خدا کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو شفا دیتا ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو۔ اور اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو وہ تمہیں بتاتا ہوں بے شک اس میں تمہارے لئے (خدا کی قدرت اور میری نبوت کی) بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو (۴۹) اور جو مجھ سے پہلے توراۃ موجود ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور

(میرے آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ) میں تمہارے لئے ان چیزوں میں سے بعض کو حلال کروں جو تم پر حرام تھیں۔ اور میں تمہارے پروردگار کی طرف سے اعجاز کے ساتھ تمہارے پاس آیا ہوں لہٰذا اللہ (کی نافرمانی) سے ڈرو۔ اور میری اطاعت کرو (۵۰)۔

تشریح الالفاظ

(۱) الاکمہ — اس کے معنی ہیں پیدائشی اندھا

(۲) الابرص — یہ برص سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں برص کی بیماری میں مبتلا ہونا جو ایک جلدی بیماری ہے جس کی وجہ سے جلد سفید ہو جاتی ہے

تفسیر الآیات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پنجگانہ معجزات کا بیان:

اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ...الآیۃ

چونکہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت نیچر اور نظام فطرت کے خلاف واقع ہوئی تھی۔ اس لئے مخالفین کو اعتراضات کے کافی مواقع مل گئے تھے علاوہ بریں آپ جس قوم کی طرف بھیجے گئے تھے وہ حجت بازی اور حیلہ سازی میں ضرب المثل تھی اس لئے خدائے حکیم وعلیم نے انہیں کھلے معجزات دے کر بھیجا تا کہ حجت تمام ہو جائے اور کسی منصف مزاج وعقلمند آدمی کیلئے ابا وانکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے اور یہ معجزات پانچ قسم کے تھے۔

(۱) مٹی سے پرندے کی تصویر بناتے پھر اس میں پھونک مارتے اور وہ باذن اللہ زندہ ہو جاتا۔

(۲) مادرزاد اندھے کی آنکھ پر ہاتھ پھیرتے اور وہ باذن اللہ بینا ہو جاتا۔

(۳) کوڑھی کے بدن پر ہاتھ پھیرتے اور وہ باذن اللہ تندرست ہو جاتا

(۴) مردے پر دعا کرتے اور وہ باذن اللہ زندہ ہو جاتا یہ چار معجزے تو عملی تھے مگر

(۵) پانچواں معجزہ علمی تھا کہ وہ باعلام اللہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور گھروں میں ذخیرہ کیا کیا ہے؟

چونکہ یہ سب چیزیں عام انسانی قوت وقدرت سے باہر تھیں اس لئے اندیشہ تھا کہ ان امور کے جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں پر ظہور کو دیکھ کر کہیں لوگ ان کو خدا نہ ماننے لگ جائیں۔ اس لئے انہوں نے اذن اللہ کی قید لگائی تاکہ واضح ہو جائے کہ اگرچہ ان امور کا بظاہر ظہور تو ان کے ہاتھوں پر ہو رہا ہے مگر ان کا فاعل حقیقی خدا ہے اور آپ کی طرف نسبت مجازی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خدائے قادر وقدیر ہوتا ہے معجزہ کی تعریف کو سمجھنا ضروری ہے جو متکلمین نے قرآن وحدیث اور عقل کی روشنی میں کی ہے۔

معجزہ کی تعریف

معجزہ خداوند عالم کے اس خارق عادت فعل کا نام ہے جسے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی نبی یا وصی کے دعوائے نبوت ووصایت کے وقت ان کی صداقت کو ظاہر کرنے کیلئے ان کے ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے جس کا مثل پیش کرنے سے اس وقت ساری کائنات عاجز ہوتی ہے لہٰذا اگر کبھی کوئی ایسا فعل نبی ووصی سے اس کے اعلان نبوت وامامت سے پہلے ظہور پذیر ہو تو اسے اصطلاح میں ''ارھاص'' کہا جاتا ہے اور اگر نبی وامام کے علاوہ کسی نیکوکار بندے کے ہاتھوں پر اس کا ظہور ہو تو اس کو کرامت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (سبیل النجات، الکلم الطیب، شرح تجرید وغیرہ)۔

اس تعریف میں لفظ ''خارق عادت'' وارد ہے۔ اسے کما حقہ سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ محال کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) محال عقلی جو ذاتی اور عقلی طور پر کبھی وجود میں آ ہی نہیں سکتا جیسے اجتماع نقیضین وضدین جیسے ایک ہی وقت میں ایک چیز کا سفید وسیاہ ہونا یا جیسے ایک ہی وقت میں ایک ہی شخص کا بینا و نابینا ہونا یا گونگا و متکلم ہونا۔ جو ذاتاً' عقلاً اور عادۃً ممتنع الوجود ہے (۲) محال عادی۔ جو گو ذاتاً اور عقلاً ممتنع الوجود نہیں ہے مگر وہ عادت اور نظام فطرت کے خلاف ہے جیسے آگ کا بلا سبب سرد ہو جانا' پانی کے بہاؤ کا رک جانا' عصا کا اژدھا بن جانا اور لوہے کا نرم ہو جانا یا طبعی عمر کے بعد اولاد کا ہونا یا بغیر باپ کے بچہ کا متولد ہونا وغیرہ وغیرہ۔

الغرض معجزہ اس دوسری قسم یعنی عام نیچر اور عام نظام علل واسباب کے خلاف کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے کا نام ہے۔ محال عقلی کو ممکن بنانے کا نام نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ ذاتی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ اس سے قدرت کاملہ کا تعلق قائم ہو۔ ہاں محال عادی میں یہ ممکن ہے کیونکہ جو علیم وحکیم کسی چیز میں کوئی تاثیر ودیعت کرتا ہے وہ قادر مطلق چاہے تو اس سے وہ تاثیر سلب بھی کر سکتا ہے۔

معجزہ کا حقیقی فاعل خدا ہوتا ہے

اب رہی یہ بات کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خدا ہوتا ہے تو یہ بات قرآن و حدیث پر نگاہ رکھنے والوں پر روز روشن کی طرح واضح ہے ارشاد قدرت ہے ''وَ مَا كَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ'' اور کسی پیغمبر کی مجال نہیں ہے کہ کوئی معجزہ خدا کے اذن کے بغیر دکھائے۔(سورہ رعد آیت۔۳۹)

(۱) جناب ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ آگ ان کیلئے گل و گلزار بن گئی۔ مگر یہ حکم خدا نے دیا تھا۔ ''يٰنَارُ كُوۡنِىۡ بَرۡدًا'' اے آگ ٹھنڈی ہو جا۔(سورہ انبیاء آیت۔۶۹)

(۲) عصا کا اژدھا بننا جناب موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا مگر یہ کام خدا نے کیا تھا۔ چنانچہ جناب موسیٰ علیہ السلام اس سے خوفزدہ ہوئے تو ارشاد ہوا۔''لَا تَخَفۡ قفة سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى'' خوف نہ کرہم اس کو اصلی حالت پر لوٹا دیں گے۔(سورہ طٰہٰ آیت۔۲۱)

(۳) لوہے کا نرم ہونا جناب داؤد ۔ کا معجزہ تھا۔ مگر خدا فرماتا ہے ''اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيۡنَ'' کہ ہم اس کے فاعل تھے۔(سورہ انبیاء آیت۔۱۷)

(۴) مردہ کو زندہ کرنا۔ جناب عیسی علیہ السلام کا معجزہ تھا مگر خدا فرماتا ہے باذنی یہ میرے حکم سے تھا

(۵) قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ خالدہ ہے مگر وہ کلام خدا کا ہے ''نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ'' (سورہ شعراء آیت۔۱۹۳)

(۶) کنکر مارنا اور ہر شخص کی آنکھوں تک اس کا پہنچ جانا حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ تھا مگر قرآن کہتا ہے کہ ''وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى'' (سورہ انفال آیت۔۱۷) کہ یہ کام خدا نے کیا تھا۔ اسی طرح بے شمار احادیث میں وارد ہے کہ نبیوں اماموں کے ہاتھ پر خدا معجزے ظاہر کرتا ہے۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:''انما بعث الله بشرا و اظهر على يده المعجزات'' کہ خدا نے انسان کو نبی بنایا اور اس کے ہاتھ پر معجزات ظاہر فرمائے (احتجاج طبرسی)۔

(۸) حضرت امام رضا علیہ السلام ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:''ان الذى اظهره من المعجزات انما كانت فعل القادر الذى لا يشبه المخلوقين''۔ یعنی یہ معجزات اس قادر کا فعل ہے اور اس نے ظاہر کئے ہے جو اپنی مخلوق کے مشابہ نہیں ہے۔(عیون الاخبار) وغیرہ وغیرہ

اسی طرح تمام محقق علماء متکلمین کی کتب کلامیہ اس حقیقت سے لبریز ہیں کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خدا ہوتا ہے ہاں البتہ چونکہ اس کا ظہور نبی و امام کی دعا و استدعا پر ہوتا ہے اور ان کے مقدس ہاتھوں پر ہوتا ہے اس لئے مجازاً اس کی نسبت ان کی طرف کر دی جاتی ہے علامہ سید حسین لکھنوی لکھتے ہیں

''آرے در موارد خاصه اظهارا للمعجزه خداوندعالم بر دست ایشاں امور چند خارق عادت ظاہرمی سازد و ازیں جا است که معجزه را فعل خدا می گویند که بر دست پیغمبر وامام بنا بر غرض تصدیق شان جاوری می فرماید کما صرح به المتکلمون ونص علیه الرضا علیه التحیة والثناء'' (حدیقہ سلطانیہ)

ولایت تکوینی کا مغالطہ

جس چیز کو کبھی تفویض کہا جاتا تھا اور کبھی اس کا نام شیخیت تھا آج کل اسے ولایت تکوینی کے خوشنما غلاف میں لپیٹ کر سادہ لوح عوام کا اعتقاد خراب کرنے کی سعی نافرجام کی جاتی ہے چنانچہ بعض تفسیروں میں لکھا ہے ''اس آیت اور اس سے مشابہ دیگر آیات جن کے بارے میں ہم اشارہ کریں گے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے افراد اولیاء اللہ اللہ کے فرمان اور اذن سے بوقت ضرورت عالم تکوین وآفرینش میں تصرف کر سکتے ہیں اور خلاف معمول اور طبعی قوانیں سے ہٹ کر کچھ واقعات جنم دے سکتے ہیں ''ابرء'' (شفا دیتا ہوں) احی الموتی (مردوں کو زندہ کرتا ہوں) اور اس قسم کے دیگر الفاظ جو فعل متکلم کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے افعال خود پیغمبروں سے صادر ہوتے ہیں اور ان عبارات کو انبیاء علیہم السلام کی دعائیں قرار دینا بلا دلیل دعویٰ ہے ان عبارات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ وہ عالم تکوین میں تصرف کر سکتے تھے اور ان واقعات کو عالم وجود میں لاتے تھے''۔ (تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۳۳۳)۔

یہ بات دراصل معجزہ کی حقیقت اور اذن اللہ کی اصلیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے ورنہ جب یہ بات معلوم ہو جائے کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خدا ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی ذہن نشین ہو جائے کہ اذن اللہ کا مطلب اللہ کا حکم ہے یعنی معجز نما (نبی وامام) اعجاز نمائی کیلئے صرف بارگاہ خدا میں دعا واستدعا کرتا ہے اور خدائے قدیر وخبیر حسب مصلحت اس کے ہاتھوں پر معجزہ ظاہر کرتا ہے تو پھر یہ بات کہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ خدا کے بھیجے ہوئے افراد اولیاء اللہ اللہ کے فرمان اور اذن سے بوقت ضرورت عالم تکوین وآفرینش میں تصرف کر سکتے ہیں چنانچہ اس آیت میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کے چار معجزات میں سے دو کے ساتھ باذن اللہ مذکور ہے ایک پرندہ بنانے کے ساتھ دوسرا مردہ زندہ کرنے کے ساتھ جس سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ اذن اللہ کا تعلق صرف انہی دو معجزوں کے ساتھ ہے اور نابینا کو بینا کرنے اور کوڑھی کو شفا دینے سے نہیں ہے کیونکہ ''چاہے اس وقت کے اطباء کی دسترس سے باہر ہو لیکن ہے وہ اسی جنس کی شے ہے جو اطبا کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا اس میں باذن اللہ کی لفظ لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی مگر پرندے کے مجسمے میں روح پھونک کر اسے جاندار بنانا اور مردہ کو زندہ کرنا خدائی

شان کے کام ہیں اس لئے ان دونوں میں باذن اللہ کی قید لگائی کہ یہ عیسی علیہ السلام کا بذات خود کام نہ تھا بلکہ اللہ کا کام تھا جو ان کے ہاتھ پر ظاہر کیا گیا۔'' (فصل الخطاب ج ا ص ۱۰۶)

حالانکہ اس آخری ''باذن اللہ'' کا تعلق اس سے پہلے مذکور تینوں معجزات (۱) ابراء اکمہ (۲) ابرص (۳) اور احیاء موتی کے ساتھ ہے کہ یہ سب خارق عادت ہیں اور معجزے ہیں اور معجزہ باذن اللہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ جناب عیسی علیہ السلام کے یہ چاروں عملی معجزات سورۂ فائدہ میں مذکور ہیں اور وہاں پر معجزہ کے ساتھ ''باذن'' کا لفظ مذکور ہے چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

''وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ''۔ (سورہ مائدہ آیت۔۱۱۰)

اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے چڑیا کی مورت بناتے پھر اس پر (کچھ) دم کر دیتے تو میرے حکم سے (سچ مچ) چڑیا بن جاتی تھی۔ اور میرے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے اور جب تم میرے حکم سے مردوں کو زندہ (کر کے قبروں سے) نکال کھڑا کرتے تھے'' (ترجمہ فرمان)

آپ نے دیکھا کہ کس طرح خداوند عالم نے ہر ہر معجزہ کے ساتھ ''باذنی'' کی قید لگائی ہے پھر یہ کہنا کس قدر حقیقت کے خلاف ہے کہ ''ان عبارات کو انبیاء کی دعائیں قرار دینا دعوی بلا دلیل ہے''۔ یہ دعوی بلا دلیل نہیں بلکہ اس کی صحت پر ناقابل رد قطعی دلائل قائم ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیات کے ذیل میں امین الاسلام طبرسی اپنی تفسیر مجمع البیان میں رقمطراز ہیں:

''باذنی ای بامری و معناہ انك تدعونی حتی ابراء الاکمه والابرص و نسب الی المسیح لما کان بدعائه و سواله و اذ تخرج الموتی باذنی ای اذ کر اذ تدعوینی فاحی الموتی عند دعائك و اخرجهم من القبور حتی یشاهدهم الناس احیاء و نسب ذلك الی المسیح لما کان بدعائه (مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۴۰۵ طبع طہران)۔

''باذنی'' یعنی میرے حکم سے تم یہ کام کرتے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے دعا کرتے تھے اور میں مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو شفا دیتا تھا۔ مگر اس شفا دینے کی مجازی نسبت اس لئے جناب عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دی گئی ہے کہ چونکہ یہ شفا ان کی دعا کے نتیجہ میں تھی۔ اور یاد کرو اس وقت کو جب تو مردوں کو نکالتا تھا یعنی تو مجھ سے دعا و استدعا کرتا تھا اور میں تیری دعا پر مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکالتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ ان کو زندہ مشاہدہ کرتے تھے اس زندہ کرنے کی نسبت (مجازاً) جناب عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اس لئے دی گئی ہے

کہ چونکہ یہ سب کچھ ان کی دعا و استدعا پر عمل میں لایا گیا تھا۔

اس موضوع کی ذرا اور گہرائی میں جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انبیاء و آئمہ علیہم السلام سے معجزات کا ظہور اس اسم اعظم کی کرشمہ سازی ہے جو خداوند عالم اپنی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ سے حسب ضرورت کم و بیش ان ذوات مقدسہ کو عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ مجلسیؒ نے سابع بحار الانوار میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''ان عندھم الاسم الاعظم بہ تظھر منھم الغرائب'' یعنی آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے پاس اسم اعظم موجود ہے جس کی وجہ سے ان سے عجائب و غرائب (معجزات) ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض اخبار و آثار میں وارد ہے کہ ایک بار حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے کھجور کے خشک درخت سے اپنے اصحاب کو تازہ کھجوریں کھلائیں وہاں ایک بدو موجود تھا اس نے امام علیہ السلام کا یہ معجزہ دیکھ کر کہا میں نے آج بچشم خود جادو گر دیکھا ہے۔ امام علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

''لا تکذبن علینا اھل البیت و انہ لیس منا ساحر و لا کاھن ولکنا علمنا اسماء من اسماء اللہ تعالی نسئل بھا فنعطی وندعو و نجاب'' ہم اہل بیت پر جھوٹ نہ بول کیونکہ ہم میں نہ کوئی جادوگر ہے اور نہ کوئی کاہن بلکہ دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں خدا کے اسماء میں سے کچھ اسم (اعظم) تعلیم دیئے گئے ہیں جب ہم ان کے ذریعہ خدا سے کوئی سوال کرتے ہیں تو ہمیں ہمارا مدعا مل جاتا ہے اور جب دعا کرتے ہیں تو وہ مستجاب ہو جاتی ہے (الدمعۃ الساکبہ)۔

ایک ضروری وضاحت

معجز نما (نبی و امام) موقع و محل کی مناسبت سے اعجاز نمائی سے پہلے کبھی چند رکعت نماز پڑھتا ہے' کبھی طویل دعا و پکار کرتا ہے۔ اور کبھی بظاہر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مگر عند التحقیق ہر جگہ اسم اعظم ہی کا کرشمہ کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں یہ مذکور ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام کے وصی آصف بن برخیا نے آنکھ جھپکنے سے پہلے چھ ماہ کی مسافت سے تخت بلقیس کو حاضر کر دیا تھا وہاں ان کے کچھ پڑھنے پڑھانے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے مگر ارشادات معصومین علیہم السلام سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے پاس اسم اعظم کا ایک حرف تھا جس کے ذریعہ سے انہوں نے دعا کی تھی اور خدا نے چشم زدن میں تخت بلقیس کو حاضر کر دیا تھا۔ اس دعا و استدعا کیلئے کوئی لمبا چوڑا وقت درکار نہیں ہوتا۔ بس ادھر خدا سے قلبی و لسانی رابط ہوا ادھر اس چیز کو حکم دیا اور معجزہ ظاہر ہو گیا اب ایک ظاہر بین تو یہی سمجھے گا کہ اس کا حقیقی فاعل معجز نما ہی ہے مگر حقائق پر نگاہ غائر رکھنے والا جانتا ہے کہ:

''المعجزات فعل القادر المختار الذی لا یشبہ المخلوقین لا فعل المحدث

المحتاج المشارك للضعفاء فی صفات الضعف'' (ارشاد امام رضا علیہ السلام مندرجہ احتجاج طبرسی ص ۲۴۲ طبع نجف)۔

اس موضوع کی مزید تفصیلات معلوم کرنے کے خواہشمند حضرات ہماری کتاب اصول الشریعہ کے باب پنجم کی طرف رجوع فرمائیں۔ان حقائق سے معلوم ہو گیا کہ لا متصرف فی الکون الا اللہ۔ نظام تکوین میں نبی وامامؑ صرف شفاعت و سفارش کر سکتے ہیں باقی رہی امور تکوینیہ کی از قسم خلق ورزق واماتت واحیاء اور شفاوغیرہ کی انجام دہی تو وہ قادر مطلق خود انجام دیتا ہے اس نے یہ ڈیوٹی کسی مخلوق کے سپرد نہیں فرمائی خلاصہ کلام یہ کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام یہ سب محیر العقول معجزات دکھا کر یہ نہیں کہتے ہیں کہ میں خدا یا خدا کا بیٹا ہوں۔ بلکہ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ میں خدا کا بندہ ہوں جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے وہی لائق عبادت ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو یہی صراط مستقیم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام وہی تھا جو سب انبیاء علیہم السلام کا تھا اور جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے لہٰذا عیسائیوں کا آپ کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہیں یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی تعلیمات کے خلاف ہے اور یہ عیسائیوں کا خود ساختہ عقیدہ ہے جو صریح شرک ہے۔

آیات القرآن

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ
عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ
اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ
اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ
وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ
فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ
بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

ترجمۃ الآیات

بے شک اللہ میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس تم اس کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ (۵۱) پھر جب عیسیٰ نے ان (بنی اسرائیل) کی طرف سے کفر و انکار محسوس کیا تو کہا کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہو؟ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان (فرمانبردار) ہیں (۵۲) اور کہا اے ہمارے پروردگار جو کچھ تو نے نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے رسول (عیسی) کی پیروی اختیار کی لہٰذا ہمیں (حق کی) گواہی دینے والوں (کے دفتر) میں درج فرما (۵۳) انہوں (بنی اسرائیل) نے (عیسیٰ کے خلاف) مکاری کی اور اللہ نے بھی اپنی (جوابی) تدبیر و ترکیب کی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر و ترکیب کرنے والا ہے (۵۴) (اس وقت کو یاد کرو) جب اللہ نے کہا (اے عیسیٰ) میں تمہیں پورا قبض کرنے والا اور تمہیں اپنی جانب اٹھانے والا ہوں اور تمہیں کافروں سے پاک کرنے والا ہوں اور تمہاری پیروی کرنے والوں کو کافروں پر قیامت تک غالب اور برتر کرنے والا ہوں پھر تم سب کی بازگشت میری طرف ہے تو اس وقت میں تمہارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرونگا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ (۵۵)

تشریح الالفاظ

(۱) **الحواریون** یہ الحواری کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نصیحت کرنے والا اور مددگار اصطلاح میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کے یار و انصار کو الحواریوں کہا جاتا ہے

(۲) **ومکروا** یہ مکر سے مشتق ہے جس کے معنی دھوکہ دینے کے ہیں اور جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہو جیسے مکر اللہ واس کا مطلب مکر کی سزا دینا ہوتا ہے

(۳) **متوفّیك** یہ توفّی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پورا حق لے لینا، اور پورا قبض کرنا

تفسیر الآیات

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حوارین کا ذکر

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ......الآیة

الغرض اس بشارت کے بعد اسی شان بان سے جناب عیسٰی علیہ السلام متولد ہوئے، معبوث برسالت ہوئے اور باذن اللہ معجزات بھی دکھائے مگر بنی اسرائیل کی اکثریت منکر ہی رہی اور درپئے ایذا بھی ہوئی اب جبکہ عیسٰی کو لوگوں کے کفر اوران کی مخالفت کا احساس ہوا تو تب جماعت بنانے کی فکر لاحق ہوئی تا کہ منظم طریقہ پر کار نبوت کو انجام دیا جائے فرمایا۔''مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ ؟'' کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار رہو؟ (سورہ آل عمران آیت۔ ۵۲ اور سورہ صف آیت۔ ۱۴) حواریوں نے کہا ہم اللہ (یعنی اس کے دین کے) مددگار ہیں۔

''حوارین'' کا لفظ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مخصوص مخلص اصحاب کیلئے استعمال ہوتا ہے کتاب التوحید شیخ صدوقؒ کی روایت کے مطابق ان کی تعداد بارہ تھی حور کے معنی لغت میں سفیدی کے ہیں تو ان لوگوں کے اخلاص وصفائی قلب کی وجہ سے یا ان کی پوشاک کی سفیدی و براقی کی وجہ سے ان کو حواری کہا جاتا ہے جو خود بھی خالص و مخلص لوگ تھے اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے دوسرے لوگوں کو بھی گناہ کی آلائش سے پاک و صاف کرنے میں مشغول رہتے تھے اس سے آگے اس آیت میں اور اس سے اگلی آیت میں انہی لوگوں کا خداوند عالم نے قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار رہیں اور خدا پر ایمان لائے ہیں تا آخر ''فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ'' لہٰذا ہمیں حق کی گواہی دینے والوں میں درج فرما۔

لفظ ''مکر'' کے معنی کی صراحت اور جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہو تو اسکے مفہوم کی وضاحت

وَمَكَرُوۡا وَمَكَرَ اللّٰهُ...الآیة

چونکہ ہماری قومی زبان میں لفظ ''مکر'' سے ذم کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ اردو میں یہ لفظ دھوکہ دہی اور فریب کاری کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے اس بنا پر اس لفظ کی خدا کی طرف نسبت نا مناسب معلوم ہوتی ہے اس لئے اس قسم کے مواقع پر عام مفسرین نے علم بدیع کے قاعدہ ''مشاکلہ'' کا سہارا لیا ہے کہ عربی زبان میں یہ قانون

رائج ہے کہ جس کسی ناپسندیدہ فعل پر سزا دی جاتی ہے اس سزا کو بھی اسی ناپسندیدہ فعل سے تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسے ''جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سيئةٌ مِثْلِهَا'' (سورہ یونس آیت۔ ۲۷) یعنی برائی کا بدلہ برائی ہے حالانکہ برائی کے بدلہ کوئی برائی نہیں ہے بلکہ عین انصاف اور اچھائی ہے یا جیسے ''فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۹۴) جو تم سے زیادتی کرے تم اس سے زیادتی کرو۔

حالانکہ ظلم و زیادتی کی روک تھام کرنا زیادتی نہیں بلکہ عین عدل و انصاف ہے مگر من باب المشاکلۃ سزا کو جرم والا نام دے دیا گیا ہے بالکل اسی طرح یہود نے جناب عیسی علیہ السلام کو شہید کرنے کی جو مکارانہ سازش کی تھی۔ خدائے حکیم نے اسے ناکام بنانے کی جو تدبیر کی اسے من باب المشاکلۃ مکر سے تعبیر کر دیا گیا اصل صورت واقعہ سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے کہ یہودیوں نے جناب عیسی علیہ السلام کو سولی پر لٹکا کر ہلاک کرنے کی ترکیب کی مگر اللہ نے ان کے بالمقابل یہ ترکیب کی کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ لہٰذا تدبیر حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا (یہ کہ اپنے ہی آدمی کو تختہ دار پر لٹکا کر خوش ہو گئے)۔

یہاں تک تو عام مفسرین کی بات تھی مگر تفسیر آلاء الرحمن، الکاشف، فصل الخطاب اور ضیاء القرآن کے مولفین نے اس موضوع پر مبسوط بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ لفظ مکر میں جو ذم کا پہلو ہے وہ ہمارے غلط استعمال کی وجہ سے ہے کیونکہ قریباً ہر زبان میں ایسے مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں جو متعدد معانی پر دلالت کرتے ہیں اور اہل زبان بلا تامل ان الفاظ کو ان معنوں میں استعمال بھی کرتے رہتے ہیں لیکن جب وہی لفظ کسی دوسری زبان میں استعمال ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے اصلی مختلف معنوں میں سے کسی ایک معنی میں مشہور ہو جاتی ہے تو جب ہم اس لفظ کو اس کی اصلی زبان میں استعمال ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو چونکہ اس کا ایک معنی ہمارے ذہنوں میں جاگزیں ہوتا ہے اور وہ معنی وہاں چسپاں نہیں ہوتا تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں جس کی ایک واضح مثال لفظ ''مکر'' ہے جسے اردو میں ''حیلہ سازی، دھوکہ دہی'' اور فریب کاری جیسے ایک ہی برے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

عربی میں اس کے معنی ہیں، میں تدبیر کرنا اور فریق مخالف کی سازش کو ناکام بنانے کیلئے اس کے مقابلہ میں اس طرح خفیہ اقدام کرنا جسے وہ نہ سمجھ سکے لہٰذا چونکہ ہمارے ذہنوں میں اس لفظ کے وہی معنی راسخ ہیں جن معنوں میں اردو میں مستعمل ہے لہٰذا جب عربی زبان میں اس لفظ کی نسبت خدا کی طرف دی جائے تو پریشان ہو جاتے ہیں کہ وہ ذات جو ہر نقص و عیب سے منزہ ہے اور نازیبا فعل سے مبرا ہے وہ کس طرح مکر کر سکتی ہے مگر جب اس کے عربی میں مستعمل معنی مراد لئے جائیں یعنی تدبیر کرنا یا دشمنان حق کے ابلیسی منصوبوں کو خاک میں ملانے کیلئے خفیہ طریقہ سے مناسب اقدام کرنا تو پھر خدا کی جانب اس لفظ کے انتساب میں کوئی خرابی نہیں رہتی ہے۔

چنانچہ فاضل بلاغی نے قرآن وحدیث میں سے متعدد مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں یہ لفظ انہی اچھے معنوں میں استعمال ہوئی ہے جیسے ''اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ج فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ '' (سورہ اعراف آیت۔۹۹) مگر جو گھاٹا اٹھانے والے ہوں اور ایک دعا میں اللہ کو خطاب کرکے یوں وارد ہے ''لا تمكر بي في حيلتك'' اپنے تدابیر میں میرے خلاف کوئی کاروائی نہ کر قرآن مجید میں اسی سورہ اور پھر سورہ انفال میں آیا ہے ''واللہ خیر الماکرین'' اللہ بہترین مکر کرنیوالا ہے جس میں اللہ اور دوسرے اشخاص پر یکساں طور سے ''الماکرین'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی استعمال میں مختلف افراد کے لحاظ سے مکر کے معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوسکتا (فصل الخطاب)۔

الغرض جب عربی زبان میں لفظ ''مکر'' باریک اور خفیہ تدبیر میں مستعمل ہے تو اگر یہ تدبیر کسی اچھے مقصد کیلئے ہو تو یہ لفظ اچھی ہے اور اگر کسی برے مقصد کیلئے ہو تو یہ بری ہے اس لئے فرمایا گیا ''وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ '' (سورہ فاطر آیت۔۴۳) بری سازش اپنے اہل کے علاوہ کسی کو نہیں گھیرتی۔ یہاں ''مکر'' کے ساتھ ''سیئہ'' کی قید لگائی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ''مکر'' فی حد ذاتہ نہ اچھی ہے اور نہ بری بلکہ اس میں جو کچھ اچھائی یا برائی ہے وہ اس کے مقصد کے لحاظ سے ہے وہوالمطلوب۔

حیات ووفات مسیح کے متعلق خدائی فیصلہ

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ...الآیۃ

قریبا تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام تا حال خدائے قدیر کی قدرت کاملہ سے بقید حیات زندہ ہیں اور آسمان پر موجود ہیں آخری زمانہ میں (جب امام زمانہ کا ظہور ہوگا تو) دنیا میں تشریف لائیں گے اور پھر اپنی طبعی موت انتقال کریں گے۔ اس سلسلہ میں فریقین کی روایات حد استفاضہ بلکہ تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں ہاں البتہ مسلمہ نظریہ کے خلاف ایک قول یہ ہے کہ آپ وفات پا چکے ہیں مگر یہ قول النادر فی حکم المعدوم کا مصداق ہے بہر حال قرون سابقہ میں اس مسئلہ کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی مگر جب سے متنبی قادیان نے اپنی خانہ ساز نبوت کا سنگ بنیاد وفات عیسیٰ علیہ السلام پر رکھا کہ چونکہ جناب عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے ہیں لہٰذا وہ نبی ہیں اور مسلمان بلا وجہ اس بحث میں الجھ گئے آئے دن حیات و وفات عیسیٰ علیہ السلام پر مرزا اور مرزائیوں سے مناظرے کرنے لگے اور کتب ورسائل لکھنے لگے اور اسے غیر معمولی اہمیت دے کر اس مسئلہ کو معرکۃ الاراء بنا دیا۔ حالانکہ ہمارے نزدیک یہ سب بحث وتمحیص عبث ہے اور اس موضوع کا مرزائے قادیانی

کے دعوائے نبوت کے غلط یا صحیح ہونے سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے بھلا اس بات کو کہ جناب عیسی علیہ السلام وفات پا گئے ہیں اس بات سے کیا ربط ہے کہ ''پس مرزا قادیانی نبی ہے'' یا اس بات کو کہ چونکہ جناب عیسی علیہ السلام زندہ ہیں اس بات سے کیا تعلق ہے کہ پس مرزا قادیانی نبی نہیں ہے؟ یہ کسی منطقی شکل کا نتیجہ ہے؟ یہ دلالات ثلاثہ (مطابقی تضمنی اور التزامی) میں سے کونسی دلیل اس دعویٰ پر دلالت کرتی ہے؟

کسی بھی مدعی نبوت کے دعوی کی صحت و بطلان معلوم کرنے کا معیار و میزان اور طریقہ کار اور ہے مثلاً نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اگر کوئی شخص نبوت کا دعوی کرے تو سب سے پہلے قرآن وسنت کی ورق گردانی کی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ آیا اب کسی نئے نبی کے آنے کی گنجائش ہے یا نہ؟ پس اگر قرآن۔ وسنت کے قطعی اور ناقابل تاویل نصوص (آیات وروایات) سے ثابت ہو جائے کہ حضرت نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صبح قیامت کے طلوع ہونے تک کسی نبی کے آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو پھر ہم کسی مدعی کے دعوی پر غور و فکر ہی نہیں کریں گے اور اسے دیوانے کی بڑ سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیں گے۔ اور اگر بفرض محال قرآن وسنت سے اس طرح ختم نبوت ثابت نہ ہو سکی بلکہ نبوت کے سلسلہ کا جاری رہنا ثابت ہو گیا۔ تب بھی ہم ہر مدعی نبوت کو آنکھیں بند کر کے نبی تسلیم نہیں کریں گے بلکہ قرآن وسنت اور عقل سلیم کی روشنی میں دیکھیں گے کہ معیار نبوت کیا ہے؟ اور میزان نبی کیا ہے؟ یعنی کن علمی و عملی صفات و کمالات کا حامل انسان نبی ہو سکتا ہے؟ پس اگر وہ مدعی اس معیار پر صد فی صد پورا اترا تو بے شک اسے نبی تسلیم کر لیں گے ورنہ اس کا دعویٰ اس کے منہ پر ماریں گے اور اس پر تین لفظ بھیجیں گے۔

اس تمہید کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد آیئے دیکھیں کہ حیات ووفات مسیح کے بارے میں قرآن وسنت کیا کہتے ہیں؟ چنانچہ خداوند عالم یہود یوں کے اس قول کہ ''ہم نے عیسیٰ بن مریمؑ کو قتل کر دیا ہے'' کے جواب میں سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۵۷ اور ۱۵۸ میں ارشاد فرماتا ہے:

''وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُمْ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَ مَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ملا ... بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا''

نہ تو انہوں نے اس کو قتل کیا ہے اور نہ ہی اسے سولی دی ہے ان کیلئے ایک (اور شخص کو) مشابہ بنا دیا گیا اور جو لوگ اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں مبتلا ہیں انہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے سوائے گمان کی پیروی کے اور یقینا ان لوگوں نے عیسی علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ خدا نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا اور خدا عزیز و حکیم ہے۔

یہود یہ کہتے تھے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو تختہ دار پر لٹکا کر قتل کر دیا اور نصاریٰ یہ کہتے تھے کہ بے شک جناب عیسی علیہ السلام مقتول و مصلوب ہو گئے۔ مگر وہ دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لئے گئے خداوند عالم نے کس وضاحت وصراحت کے ساتھ دونوں گروہوں کے خیال محال کی رد کر دی اور واضح فرما دیا کہ اس نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ اور فریقین کی احادیث متواترہ کے مطابق وہ اس وقت آسمان پر زندہ اور موجود ہیں اور وہ آخری زمانہ یعنی قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہو کر اور حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ہمراہ ہو کر ادیان باطلہ کے مٹانے اور اسلام کے پھیلانے یعنی اس کی نشاۃ ثانیہ میں بھرپور احصہ لیں گے اور بالآخر طبعی موت سے وفات پائیں گے۔

امتِ مرزائیہ کا دام ہمرنگِ زمین

امت مرزائیہ دو آیتوں کے ظاہری الفاظ کا سہارا لے کر عامۃ الناس کو گمراہ کرنے کی سعی نافرجام کرتی رہتی ہے ایک سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۱۱۷ جس میں جناب عیسی علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِيۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِيۡبَ عَلَيۡهِمۡ'' (جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھا لیا۔ تو پھر تو ہی ان کا ناظر و نگران تھا) اور دوسری یہی آیت جس کی ہم اس وقت تفسیر لکھ رہے ہیں۔ جس میں وارد ہے ''يٰعِيۡسٰۤى اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ...تاآخر'' یہ لوگ کہتے ہیں کہ دونوں آیتوں میں لفظ ''توفی'' موجود ہے جس کے معنی موت کے ہیں جواباً عرض ہے کہ یہ ان لوگوں کی کھلم کھلا ابلہ فریبی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''توفی'' جو کہ باب تفعل کا مصدر ہے۔ جس کا مادہ ''وفا'' ہے پھر اس کے ایفا' توفیہ اور توفی مزید فیہ ہیں اس لفظ اور اس کے جملہ مشتقات کے حقیقی معنی پورا ہونا' پورا کرنا' کسی چیز کا پورا پورا لینا یا پورا پورا دینا ہیں جیسے انما یو فی الصا بر ون اجرھم بغیر حساب (سورہ مریم) صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر دیا جائیگا۔ بنابریں توفی کے حقیقی معنی القبض والا ستیفاء ہیں یعنی کسی چیز کو پورا پورا قبضہ میں لینا۔ چنانچہ تاج العروس میں لفظ ''وفی'' کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے ''توفاہ ای لم یدع منہ شیا'' یعنی اسے پورے کا پورا لے لیا۔ اور اس سے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔

جامع احکام القرآن قرطبیؒ میں لکھا ہے ''تو قیت مالی من فلاں ای قبضتہ'' میں نے اس سے سارا مال واپس لے لیا یعنی اسے اپنے قبضہ میں لے لیا'' چونکہ یہودیوں کا خیال تھا کہ انہوں نے جناب عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دے دی ہے لہٰذا ان کا جسم تو بہر حال یہیں رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی روح اٹھائی جائیگی مگر خدائے کریم نے اپنے نبی کو تسلی دی کہ میں تمہیں پورا پورا یعنی روح کو جسم سمیت پورا پورا قبض کروں گا اور اپنی

طرف اٹھاؤں گا۔ ہاں البتہ یہ لفظ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر یہ اس لفظ کے مجازی معنی ہیں چنانچہ تاج العروس میں لکھا ہے:

''ومن المجاز ادرکته الوفاة ای الموت والمنیته وتوفی فلان اذا مات و توفاه اللہ عزّ و جل اذا قبض روحه''

یعنی وفا کے مجازی معنی موت ہیں اور یہ علم نحو ومعانی اور علم الاصول کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب کسی لفظ کے ایک حقیقی معنی ہوں اور دوسرے مجازی تو جب وہ لفظ استعمال ہوتو اس سے بلاقرینہ اس کے حقیقی معنی ہی مراد لئے جاتے ہیں۔ ہاں البتہ جب کوئی ایسا قرینہ صارفہ پایا جائے جس کی وجہ سے حقیقی معنی مراد نہ لئے جاسکتے ہوں تو اس وقت حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں مگر یہاں ایسا کوئی قرینہ صارفہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کے بر عکس یہاں ایسے قوی قرائن موجود ہیں جو اس لفظ کے حقیقی معنی مراد لینے کی تائید مزید کرتے ہیں تو پھر مجازی معنی مراد لینے کا کیا جواز ہے؟ اور اگر ان تمام حقائق سے قطع نظر کرتے ہوئے بفرض محال چند لحوں کیلئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ توفی بمعنی موت ہے تو پھر بھی اس آیت سے جناب عیسی علیہ السلام کی وفات قطعی طور پر ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ آیت مبارکہ میں وارد ہے ''يٰعِيۡسٰٓى اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ'' یہاں ''وائو'' کے ساتھ عطف کیا گیا ہے اور نحویوں کا اتفاق ہے کہ واؤ صرف دو چیزوں کے اشتراک پر دلالت کرتی ہے ترتیب پر نہیں کرتی۔ مثلاً جب کہا جائے کہ جاء زید وعمرو۔ زید اور عمرو آئے تو اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ پہلے زید آیا (کہ پہلے مذکور ہے) اور عمرو بعد میں آیا کہ وہ بعد میں مذکور ہے واؤ صرف یہ بتاتی ہے کہ دونوں آئے اب ممکن ہے کہ دونوں اکٹھے آئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ عمرو پہلے آیا ہو اور زید بعد میں آیا ہو بنا بریں اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ موت پہلے واقع ہوئی ہو اور رفع بعد میں ہوا ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ رفع پہلے ہو اور موت بعد میں اپنے مقررہ وقت پر آئے۔ فاذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال اور جب حدیثوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے تو پھر یہی معنی متعین ہوں گے۔

بعض ایرادات کے جوابات

کہا جاتا ہے کہ آسمان پر اٹھائے جانے سے جناب عیسٰی علیہ السلام کی روح کا اٹھایا جانا مراد ہے؟ اسکا جواب واضح ہے کہ خداوند عالم نے جناب عیسی علیہ السلام کو خطاب کرکے فرمایا ہے کہ میں تمہیں اٹھاؤں گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا عیسی علیہ السلام صرف روح کا نام ہے یا روح مع الجسم کا؟ ظاہر ہے کہ عیسٰی روح مع الجسم کا نام ہے تو پھر اس سے روحانی رفع مراد لینا غلط ہے' نیز کہا جاتا ہے کہ اس رفع سے مراد رفع درجات ہے نہ

رفع جسمانی اس کا جواب واضح ہے کہ رفع کے حقیقی معنی جسمانی رفع کے ہیں اور رفع درجات اس کے مجازی معنی ہیں۔ الہٰذا حقیقی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں ہے بالخصوص جبکہ حقیقی معنی کی تائید قرینہ سے بھی ہوتی ہو۔ جیسا کہ یہاں لفظ "الیّ" استعمال کر کے "را فعك الیّ بل رفعه الله الیه" خدائے حکیم نے مجازی معنی کا احتمال ہی ختم کر دیا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب اللہ لا مکاں ہے تو پھر یہ کیسے فرمایا کہ خدا نے اسے اپنی طرف بلا لیا؟ اس کا شبہ کا جواب بھی واضح ہے کہ خدا نے جہت علوی کو اپنی طرف خاص نسبت اس لئے دی ہے کہ وہ جہت علوی انوار و تجلیات ربانیہ کا مرکز ہے اور جہت سفلی کیلئے فیوض برکات الہیہ کا محور ہے جس طرح کعبہ کا شرف ظاہر کرنے کیلئے اسے بیت اللہ اور ناقۂ صالح کو "ناقۃ اللہ" فرمایا ہے اسی طرح جہت علوی کا مجد و شرف ظاہر کرنے کیلئے اسے اپنی طرف نسبت دی ہے۔

قیامت تک جناب عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کے منکرین پر غالب رہنے کی پیشین گوئی:

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ......الآیۃ

یہ لوگ تمہارے ساتھ رہنے کے لائق نہیں ہیں لہٰذا میں تمہیں ان کی آلائش سے پاک رکھوں گا اور تمہیں زندہ اپنی طرف اٹھا لونگا۔ اور ان کے تمام غلط الزامات و اعتراضات سے تیرے دامن کو صاف کر دونگا۔ خداوند عالم نے اس وعدہ کی تکمیل حضرت خاتم الانبیاء کو بھیج کر کی۔ جنہوں نے یہود کے تمام الزامات کے گرد و غبار کو صاف کر دیا۔ تیرے پیروکاروں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب و برتر رکھوں گا۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ان پیروکاروں سے مراد عیسائی اور مسلمان ہیں جو ان کی نبوت و رسالت کے اعتقاد پر باہم شریک اور ان کے متبع ہیں۔ یہ پیشین گوئی جناب عیسی علیہ السلام کی نبوت' قرآن کی صداقت اور اسلام کی حقانیت کا زندہ معجزہ ہے کہ اس اعلان اور وعدہ کے آغاز سے لے کر آج تک مشاہدہ شاہد ہے کہ برابر ہر جگہ یہود کے بالمقابل نصاریٰ اور اہل اسلام کی حکومتیں قائم رہی ہیں۔ اور یہی غالب رہے ہیں اور اگر چند سالوں سے اسرائیل کے نام سے یہود کی ایک برائے نام حکومت بھی قائم ہوئی ہے تو وہ بھی "بحبل من الناس" کچھ لوگوں کی رسی کے سہارے پر وہ آج بھی روس' امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کی بیساکھیوں پر کھڑی ہے جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک سازش کے تحت قائم کی ہے اگر وہ ممالک آج یہ بےساکھی ہٹا لیں تو اس مجازی حکومت کے صفۂ ہستی سے مٹنے میں ذرا بھی دیر نہ ہوگی۔ جو اپنے وجود کے باوجود نصاریٰ اور مسلمان حکومتوں کے مقابلہ میں مجبور و مقہور ہے اور نقش بر آب کی

مانند ہے اس کے باوجود پھر بھی نصاریٰ اور مسلمانوں کا تفوق و برتری اور ان کا غلبہ ثابت ہے اور ثابت رہے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ اور مسلمانوں کو اس عارضی حکومت کے قیام سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسی کسی حکومت کو جو نصاریٰ کے رحم و کرم پر قائم ہو قرآن میں اس کے قیام کی نفی کہیں مذکور نہیں ہے وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب یہ عارضی حکومت بھی مٹ جائیگی۔ اور جن کے سہارے پر وہ قائم ہے وہ بھی حرف غلط کی طرح مٹ جائینگی انشاءاللہ۔ کیونکہ

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس سے آگے آیت کے آخر میں کفار کے سخت عذاب اور بروز قیامت میں ان کے بے یار و مددگار ہونے کا اور اہل ایمان کو بے حساب اجر و ثواب عطا فرمائے جانے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بعد ازاں جناب آدم علیہ السلام کی طرح جناب عیسیٰ علیہ السلام کی خلقت کو کلمہ کن کی کرشمہ سازی قرار دیا گیا ہے۔

آیات القرآن

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۝۵۶ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۝۵۷ ذٰلِكَ
نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ۝۵۸ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ
اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝۵۹ اَلْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ۝۶۰ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا
جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا
وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ
عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۝۶۱

ترجمۃ الآیات

توجن لوگوں نے کفراختیارکیاانہیں دنیاوآخرت میں سخت سزادوں گا۔اوران کاکوئی مددگارنہ ہوگا۔(۵۶)اورجولوگ ایمان لائے اورنیک عمل کئےتوخداان کوپوراپوراجروثواب دے گا۔اوراللہ ظالموں کودوست نہیں رکھتا۔(۵۷)(اے رسول)یہ جوہم آپکوپڑھ کرسنارہے ہیں(کتاب الٰہی کی)آیات ہیں(یاخداکی قدرت اورآپ کی حقانیت کی نشانیاں ہیں)اور وہ دانائی سے لبریز تذکرے ہیں(۵۸)بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی سی ہے کہ اللہ نے انہیں مٹی سے پیداکیاپھرحکم دیاکہ ہوجاسووہ ہوگیا(۵۹)یہ بات تمہارے پروردگارکی طرف سے حق ہےتوتم شک کرنے والوں میں نہ سے ہونا (۶۰)(اے پیغمبر)اس معاملہ میں تمہارے پاس صحیح علم آجانے کے بعدجوآپ سے حجت بازی کرےتوآپ ان سے کہیں کہ آؤہم اپنے اپنے بیٹوں،اپنی اپنی عورتوں اوراپنے اپنے نفسوں کی بلائیں اورپھرمباہلہ کریں(بارگاہ خدامیں دعاوالتجاکریں)اورجھوٹوں پرخداکی لعنت قراردیں۔(یعنی ہم اپنے بیٹوں کوبلائیں تم اپنے بیٹوں کو،ہم اپنی عورتوں کوبلائیں تم اپنی عورتوں کواورہم اپنے نفسوں کوبلائیں تم اپنے نفسوں کوپھراللہ کے سامنے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پرخداکی لعنت کریں)(۶۱)

تشریح الالفاظ

(۱)ندع — یہ دعاءاوردعویٰ سے مشتق ہےجس کے معنی ہیں پکارنا،رغبت کرنا۔

(۲)نساءنا — یہ امرأۃ کی جمع ہے(من غیرلفظہا)جس کے معنی عورت کے ہیں

(۳)نبتہل — یہ ابتہال سے ماخوذہےجس کے معنی ہیں عجزوانکسارسےاللہ تعالیٰ سےدعاکرنا

تفسیر الآیات

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ...الآیۃ

یہ آیت مبارکہ آیہ مباہلہ کے نام سے مشہور ہے جس میں اسلام کے متفق علیہ واقعہ مباہلہ کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے اور جس کی تفصیلات کتب فریقین میں مذکور ہیں۔

مباہلے کا مفہوم؟

اگر کسی امر کے حق یا باطل ہونے میں دو گروہوں میں نزاع ہو جائے اور دلائل و براہین سے وہ نزاع ختم نہ ہو سکے تو پھر اس نزاع کے ختم کرنے کیلئے یہ طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے کہ فریقین نہایت عاجزی و زاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا و استدعا کرتے ہیں کہ ان میں جو جھوٹا ہے اس پر خدائے تعالیٰ کی لعنت ہو یعنی خدا کا قہر نازل ہو اس سے ہر کس و ناکس پر واضح ہو جاتا ہے کہ صادق کون ہے اور کاذب کون؟ اور جو کاذب ہوتا ہے وہ اس کا وزر و وبال بھگتتا ہے اگرچہ اس میں اعزاء و اقارب کو جمع کرنا لازم نہیں ہے" لیکن اگر ایسا کیا جائے تو اس سے اس واقعہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

واقعۂ مباہلہ کی تفصیل

اس واقعہ مباہلہ کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے کہ نجران یمن کے شمالی کوہستان میں صنعاء سے دس منزل کے فاصلہ پر ایک زرخیز مقام تھا جو چھوٹی بڑی تہتر بستیوں پر مشتمل تھا جہاں کم و بیش چالیس ہزار عیسائی آباد تھے فتح مکہ کے بعد جب اسلام کو عروج حاصل ہوا اور متحارب گروہ سرنگوں ہو گئے تو حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قبائل کو جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے دعوت اسلام کے سلسلہ میں پیغامات بھیجے چنانچہ ۱۰ ہجری میں نصارائے نجران کو بھی ایک نامہ تحریر کیا جس میں انہیں اسلام قبول کرنے یا جزیہ دے کر مملکت اسلامی کی رعایا بننے کی دعوت دی۔ جب نجران کے اسقف اعظم (بشپ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوب گرامی پڑھا تو اس نے علاقہ کے تمام سربر آوردہ لوگوں کو جمع کر کے صورت حال سے مطلع کیا اور بڑی رد و قدح کے بعد یہ طے پایا کہ ایک وفد مدینہ جائے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کرے اور تمام حالات کا جائزہ لے چنانچہ چودہ آدمیوں کا ایک وفد عاقب' سید اور ابو حارثہ کی زیر قیادت مدینہ روانہ ہوا۔ یہ ابو حارث دنیائے عیسائیت کا اسقف اعظم اور سید و عاقب فہم و فراست اور معاملہ فہمی میں ممتاز شخص تھے۔

بالآخر یہ وفد مدینہ پہنچا اور نماز عصر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات ہوئی اور آپ نے ان سے مختلف مسائل پر گفتگو کی اور جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا ہم تو پہلے ہی سے مسلمان ہیں۔

فرمایا: تم کیونکر مسلمان ہو سکتے ہو جبکہ خنزیر کا گوشت کھاتے ہو' صلیب کی پرستش کرتے ہو اور مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔

انہوں نے کہا کہ مسیح ابن اللہ ہیں اور اگر وہ ابن اللہ نہیں ہیں تو آپ فرمائیے کہ ان کا باپ کون تھا ؟ اور کیا کوئی بغیر باپ کے بھی پیدا ہو سکتا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کی آیت سے انہیں جواب دیا۔ ان مثل عیسیٰ عند الله کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے جسے مٹی سے پیدا کیا پھر کہا ہو جا اور وہ ہو گیا۔

مطلب یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا تو فقط باپ نہ تھا اور آدم۔ کا نہ باپ تھا اور نہ ماں تھی۔ پھر انہیں خدا کا بیٹا کیوں نہیں کہتے ہیں ان کے پاس اس کا تو کوئی جواب نہ تھا کٹ حجتیوں اور کج بحثیوں پر اتر آئے جب وہ دلیل وحجت سے قائل ہوتے نظر نہ آئے تو اللہ کی طرف سے وحی ہوئی:

"فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآئَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآئَنَا......"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصاریٰ کو یہ آیت پڑھ کر سنائی اور انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ نصاریٰ پہلے تو اس طریقہ کار سے گھبرائے اور پھر کہا کہ ہمیں آج کے دن کی مہلت دیجئے کل ہم اس کیلئے تیار ہیں یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے مقام پر پہنچ کر آپس میں تبادلہ خیال کیا کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ ابو حارثہ نے کہا کہ اگر پیغمبر اسلام بچوں اور کنبہ والوں کو لے کر عجز و انکسار کے ساتھ آئیں تو پھر مباہلہ نہ کرنا مباہلہ کی قرار داد طے ہونے کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کی آبادی سے متصل ایک جگہ مباہلہ کیلئے منتخب کی جسے سلمان فارسی (محمدی) نے خس و خاشاک سے پاک کیا دوسرے دن نصاریٰ صبح ہوتے ہی مقام مباہلہ پر پہنچ گئے مہاجرین وانصار بھی گھروں سے نکل آئے اور میدان میں جمع ہو گئے جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نصاریٰ کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے علی مرتضیٰ علیہ السلام' فاطمہ زہرسلام اللہ علیہا اور حسن علیہ السلام و حسین علیہ السلام کو مباہلہ میں شرکت کیلئے طلب فرمایا۔ سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں:

" لما نزلت هذه الآيه ندع ابنائنا و ابنائكم دعا رسول عليا و فا طمه و حسنا وحسينا فقال اللهم هولاء اهلي "جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ فاطمہؑ حسنؑ اور حسینؑ کو طلب کیا اور کہا اے میرے اللہ۔ یہی میرے اہلبیت ہیں"۔ (صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۸۷)

ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے:

''غدا رسول الله آخذاً بيدا لحسن و الحسين عليهما السلام تتبعه فاطمه و علی بين يديه'' رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح صبح اس طرح نکلے کہ حسنؑ وحسینؑ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور پیچھے پیچھے فاطمہؑ اور آگے آگے علی علیہ السلام تھے''۔ (تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۶۶)

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدان مباہلہ میں پہنچے تو ایک درخت کے نیچے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور علی علیہ السلام کو آگے اور فاطمہؑ کو عقب میں اور حسنؑ اور حسینؑ کو داہنے بائیں بٹھالیا اور ان سے کہا کہ جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ نصاریٰ نے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ ایک مرد اور ایک خاتون اور دو بچوں کو دیکھا تو پہلے تو حیرت زدہ ہوئے اور پھر ایک مبہم سا خوف ان پر طاری ہو گیا ابوحارثہ نے کہا:

''يا معشر النصارىٰ انی لاری وجوها لو شاء الله ان يزيل جبلا من مكانه لازاله بها فلا تباهلوهم فتهلكو''اے گروہ نصاریٰ! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر اللہ چاہے تو پہاڑ کو اس کی جگہ سے سرکا دے تو وہ ان چہروں کی خاطر سرکا دے گا۔ ان سے مباہلہ نہ کرو۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ (تفسیر کشاف پارہ ۳)

الغرض نصاریٰ کے دل دہل گئے۔ مباہلہ سے دستبردار ہو کر صلح کی درخواست دی۔ جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرف قبولیت بخشا اور حضرت علی علیہ السلام کو شرائط صلح طے کرنے پر مامور فرمایا اور جناب نے اس شرط پر صلح کی کہ وہ سال میں دو مرتبہ ماہ صفر اور ماہ رجب میں ایک ہزار پارچے بطور جزیہ ہدیا کریں گے اور ہر پارچہ چالیس درھم کا ہوگا اور اس کے صلہ میں وہ اپنی زمینوں پر بدستور آباد رہیں گے اور ان کے مال وجان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہوگی۔

یہ فتح وسرفرازی تاریخ اسلام میں کیا تاریخ عالم میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے کہ ایک طرف گنے چنے پانچ افراد ہیں جن میں ایک خاتون اور دو بچے بھی شامل ہیں۔ صرف یقین کی قوت اور اعتماد کی طاقت سے نجران کے نمائندہ وفد کو بے دست و پا کر کے اپنی صداقت کا لوہا منوا لیتے اور ان کے تمرد وشکوہ کو کچل کر ان کی گردنوں میں باجگزاری کا جوا ڈال دیتے ہیں (سیرت امیر المومنینؑ ترجمہ از مفتی جعفر حسین مرحوم)۔

باوجودیکہ آیت کے الفاظ میں بڑی گنجائش تھی مگر حضرت نے ''ابنانا'' کی جگہ حسنؑ وحسینؑ کو ''نسائنا'' کی جگہ خاتون جنت فاطمہ زہراؑ کو اور ''انفسنا'' کی جگہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو اپنے

ہمراہ لے جا کر واضح کر دیا کہ حسنین شریفین فرزندان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور جناب زہراؑ بضعۃ الرسول ہیں اور حضرت علیؑ بمنزلہ نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہیں۔

فاضل نیشاپوری لکھتے ہیں:

''وفی الایۃ دلالۃ علی ان الحسن و الحسن و ھما ربنا بنتہ یصح انھما ابن رسول اللہ لا نہ وعد ان یدعو ابنائہ تم جاء بھما'' یعنی آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی کے بیٹے ہیں انہیں فرزندان رسول علیہ السلام کہنا صحیح ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کو ہمراہ لائیں گے اور پھر ان دونوں کو ہمراہ لائے۔'' (تفسیر غرائب القرآن)

اور انہی ذوات مقدسہ کی بدولت اسلام کو یہ فتح مبین حاصل ہوئی قطع نظر اس جزوی اختلاف کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسین علیہ السلام کو گود میں اٹھایا ہوا تھا یا ان کی انگلی تھامے ہوئے تھے اور جناب امیر علیہ السلام سب کے آخر میں تھے یا آگے تھے اس واقعہ کو قریباً تمام قابل ذکر مفسرین اور محدثین نے اپنی کتب تفاسیر وحدیث میں درج کیا ہے جیسے تفسیر طبری، تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر بیضاوی، تفسیر درمنثور، تفسیر روح المعانی، تفسیر الجواہر طنطاوی وغیرہ اور مسلم شریف مسند احمد ابن حنبل، جامع الاصول، ابن کثیر، مستدرک حاکم، اصابہ ابن حجر عسقلانی، فصول مہمہ مالکی، تذکرۃ الخواص سبط ابن جوزی وغیرہ وغیرہ۔

انہی حقائق کی بنا پر علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ''فیہ دلیل علی فضل اصحاب الکساء لا شئی اقوی منہ .... تفسیر کشاف) اس واقعہ میں اصحاب کساء کے فضل وکمال کی وہ دلیل موجود ہے جس سے بڑھ کر کوئی دلیل ہو نہیں سکتی ہے ان ھذا لھو القصص الحق۔

نیز اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ دونوں کے درمیان اتحاد جسمی و شخصی ہو گیا کیونکہ یہ تو عقلاً محال ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس اتحاد سے مرتبہ نبوت اور اس کے خصائص کے علاوہ دیگر فضائل وکمالات میں اتحاد و یگانگت مراد ہے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام امت سے افضل ہیں تو جو نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوگا وہ بھی تمام امت سے افضل ہوگا سچ ہے۔

خیر البریۃ بعد احمد حیدر
الناس ارض و الوصی سماء

علامہ وحید الزمان اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں ''اس آیت سے حضرت علی علیہ السلام کی بڑی فضیلت نکلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنا نفس فرمایا ہے اس سے زیادہ اتحاد اور کیا ہوگا۔ خدا تعالیٰ خارجیوں کا منہ کالا کرے جو حضرت علی علیہ السلام سے دشمنی رکھتے ہیں بلکہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام سے دشمنی رکھتے ہیں'' (قرآن ترجمۂ وحیدی)۔

آیات القرآن

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾

ترجمۃ الآیات

یہ (حضرت عیسیٰ کی) حقیقی سرگزشت ہے (یعنی ان کا خدا یا خدا کا بیٹا ہونا بے بنیاد ہے) اور خدائے یگانہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور خدا توانا و حکیم ہے (٦٢) اگر (ان دلائل کے باوجود حق سے) روگردانی کرتے ہیں (تو جان لو کہ) خدا فساد کرنے والوں سے آگاہ ہے (٦٣) (اے رسول کہیے اے! اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک اور یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک (مالک و مختار) نہ بنائیں۔ اور اگر یہ لوگ اس (دعوت) سے منہ موڑیں تو (اے مسلمانو) تم کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم مسلمان) (خدا کے فرمانبردار و اطاعت گذار) ہیں (٦٤)

تشریح الالفاظ

(۱)القَصَصَ یہ قص کا مصدر ہے جس کے معنی خبر دینے کے ہیں

(۲)ولانشرك یہ شرک سے ماخوذ ہے جس کے معنی شریک ہونے اور اشراک کے معنی شریک کرنے کے ہیں

تفسیر الآیات

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا ...الآیۃ

اس آیت میں حق کی تبلیغ کرنے اور لوگوں کو اس کی دعوت دینے کا ایک اہم اصول بتایا گیا ہے کہ اگر کسی ایسے شخص یا جماعت کو دعوت حق دینی ہو جو دینی و مذہبی نظریات میں مخالف ہو تو اسے صرف اس چیز پر جمع ہونے کی دعوت دینی چاہیے۔ جس پر دونوں کا اتفاق ہوسکتا ہو۔ چنانچہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ اہل کتاب سے کہو کہ آؤ ہم تم ایک ایسی قدر مشترک پر جمع ہو جائیں جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے اور وہ پروردگار عالم کی وحدانیت ہے

(۱) خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ (۲) کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں

(۳) کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب (مالک ومختار) نہ بنائے۔

یعنی کسی بھی مخلوق کو وہ حیثیت نہ دی جائے جو رب کو حاصل ہے جس طرح یہود و نصاریٰ نے احبار رھبان کو دے رکھی تھی وہ جس حلال کو چاہتے حرام قرار دے دیتے اور جس حرام کو چاہتے حلال کر دیتے اور یہ پھر بھی ان کی پیروی کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو عدی بن حاتم نے بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عرض کیا یارسول اللہ! ہم ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حلال وحرام مقرر کرتے تھے اور تم ان کے ہر قول پر عمل کرتے تھے ؟ عرض کیا ہاں ایسا تو تھا۔ فرمایا: ہو ذاک یہی وہ غیر اللہ کو رب ماننا ہے جسے قرآن نے بتایا کہ "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" (سورۃ توبہ آیت۔ ۳۱) (تفسیر صافی و ترمذی)

چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف ملوک وسلاطین جیسے روم کے بادشاہ ہرقل، مصر کے والی مقوقس، وغیرہ کو جو دعوتی خطوط ارسال فرمائے تھے ان میں اس آیت مبارکہ کو پیش کر کے اسلامی توحید کی

دعوت دی تھی ''اسلم تسلم' جس پر ہر دو فریق کا اتفاق تھا۔

مسلمانوں کی حالت پر اظہار افسوس

بنابریں جب اسلام صرف توحید کی قدر مشترک پر غیر مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دیتا ہے حالانکہ اس کے سوا ان کا کسی چیز پر اتفاق نہ تھا تو آج مسلمان جو جزئی و فروعی باتوں پر باہم دست بگریباں ہیں وہ اختلافی چیزوں کو چھوڑ کر اتفاقی چیزوں پر کیوں اتحاد نہیں کر سکتے؟ جبکہ یہاں بہت سے مشترک اقدار موجود ہیں خدا ایک رسول ایک قرآن ایک' قبلہ ایک' حشر ونشر ایک۔ الغرض اسلام ایک۔ اے کاش کہ ہوتے مسلمان بھی ایک لہٰذا مذہب و مسلک کے نام پر باہم جنگ جدال اور قتل وقتال کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ۔

مذہب نہیں سکھا تا آپس میں بیر رکھنا

موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود

کیونکہ لا اکراہ فی الدین بلکہ

ہر قوم را است راہے دینے و قبلہ گاہے

آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

''فَإِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ'' کہ اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو تم ان سے کہہ دیجئے گواہ رہنا ہم مسلمان ہیں۔ (سورہ آل عمران آیت۔ ۶۴)

اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم احسن طریقہ پر دعوت حق دو اور جدال احسن سے کام لو اگر مخالف فریق واضح دلائل و براہین کو تسلیم نہ کرے اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو تم اتمام حجت کیلئے اپنا مسلک ظاہر کر کے سلسلۂ گفتگو ختم کر دو کیونکہ اب مزید بحث وتمحیص کی نہ ضرورت ہے اور نہ کوئی فائدہ ''وَ مَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنۡ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ''

آیات القرآن

يَاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ۝۶۵ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاللّٰهُ

يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝۶۶ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا
وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝۶۷ اِنَّ اَوْلَى
النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ
وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۝۶۸

ترجمۃ الآیات

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں (ہم سے) حجت بازی کرتے ہو۔ حالانکہ تو رات اور انجیل ان کے بعد اتری ہیں کیا تم میں اتنی بھی عقل (سمجھ) نہیں ہے (۶۵) تم وہی لوگ ہو جو (ہم سے) ان باتوں کے بارے میں بحث وتکرار کرتے رہے جن کا تمہیں کچھ علم تھا۔ اب ان باتوں کے بارے میں کیوں حجت بازی کرتے ہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں (حقیقت حال) صرف اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے (۶۶) ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو نرے کھرے خالص مسلمان (خدا کے فرمانبردار بندے) تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے (۶۷) بے شک تمام لوگوں سے ابراہیم کے زیادہ قریب اور زیادہ تعلق رکھنے والے وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو (ان پر) ایمان لائے ہیں اور اللہ ایمان والوں کا ساتھی وسرپرست ہے (۶۸)

تشریح الالفاظ

(۱) **ودّت** یہ وُدّ اور وَدّ سے مشتق ہے جس کے معنی تمنا کرنے، چاہنے اور محبت کرنے کے ہیں۔

(۲) **ومایشعرون** یہ شَعر اور شُعور اور شعورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں جاننا اور محسوس کرنا

تفسیر الآیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ خالص مسلمان تھے

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ ...الآیۃ

اس آیت کی شان نزول یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک بار یہود کے کچھ احبار اور نجران کے کچھ نصاریٰ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے جو سب جناب ابراہیم علیہ السلام کے فضائل و کمالات اور ان کے دین کی صداقت کے قائل و معترف تھے اس لیے دونوں فریق اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کیلئے باہم جھگڑنے لگے۔ یہودی یہ کہتے کہ وہ یہودی تھے اور نصاریٰ یہ کہتے کہ وہ نصرانی تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (مجمع البیان)

یعنی اے بے عقلو تمہیں اس قدر بھی سوجھ بوجھ نہیں ہے جناب ابراہیم علیہ السلام کا عہد تو یہودیت و نصرانیت سے صدیوں پہلے کا ہے جب ان مذاہب کا کہیں وجود ہی نہ تھا کیونکہ تورات قریباً ایک ہزار سال آپ کے بعد اور انجیل قریباً دو ہزار سال بعد نازل ہوئی تو پہلے زمانے والا کیونکر آئندہ آنے والے دین پر ہوسکتا ہے (روح البیان)

آئین فطرت ہے کہ آدمی کو جس چیز کا کچھ علم ہو وہ اس کے بارے میں تو گفتگو کرسکتا ہے مگر جس چیز کا اسے قطعاً کوئی علم نہ ہو وہ اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اگر ایسا کرے گا تو اس کی دخل اندازی دخل در معقولات سمجھی جائیگی۔ اسی بات پر خداوند عالم یہود و نصاریٰ کی زجر و توبیخ کر رہا ہے کہ تمہیں جو کچھ غلط سلط علم ہے وہ اپنے دین و مذہب کے بارے میں ہے اس میں تو تم بحث و تکرار کرنے کا کچھ حق رکھتے ہو جو تم کر بھی چکے اب ان باتوں کے بارے میں کیوں حجت بازی کرتے ہو جن کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں ہے جیسے جناب ابراہیم علیہ السلام کا دین و مذہب لہٰذا تمہارے لئے اس بارے میں بحث و تکرار کرنے کا عقلاً و شرعاً کوئی جواز نہیں ہے اب خدا وضاحت کرتے ہوئے فرماتا کہ جناب ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو ادیان باطلہ سے کنارہ کش اور نرے کھرے مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے اس آخری فقرہ میں یہود و نصاریٰ پر تعریض کی گئی ہے کہ موجودہ یہودیت و نصرانیت میں تو شرک پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہودی عزیر کے ابن اللہ اور نصرانی عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہیں جو کہ کھلم کھلا شرک ہے۔

یہاں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اگر جناب ابراہیم علیہ السلام اس بنا پر یہودی و نصرانی نہ تھے کہ یہودیت

ایک ہزار سال اور نصرانیت دو ہزار سال بعد میں آئی تو اس وقت اسلام بھی تو موجود نہیں تھا۔ بلکہ وہ قریباً اڑھائی ہزار سال ان کے بعد آیا ہے تو وہ مسلمان کس طرح تھے؟ اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے کہ دین اسلام اور ہے اور شریعت اسلامیہ اور یعنی دین بنیادی اصول وعقائد کا نام ہے اور شریعت فروع واحکام کا نام اور ارباب علم و دانش جانتے ہیں کہ مختلف ادوار میں شریعتیں بدلتی رہی ہیں دین اسلام جو کہ خدا کا پسندیدہ دین ہے وہ ازل سے ایک رہا ہے اور ابد تک ایک رہے گا اور قرآن میں جناب نوح علیہ السلام کے دور سے یہ لفظ مستعمل ہے اور اس دین کی بنیاد ہی عقیدہ توحید و نبوت اور قیامت پر ہے۔ لہٰذا جناب ابراہیم علیہ السلام کو جو مسلمان کہا گیا ہے تو وہ بنیادی اصول دین کے اعتبار سے ہے جو کہ ہمیشہ یکساں رہے ہیں نہ کہ شریعت کے اعتبار سے لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کامل طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی شریعت پر عامل بھی ہوں۔ جس طرح وہ لوگ مسلمان تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی میں اسلام لائے۔ اور پھر وہیں وہ وفات پا گئے جبکہ شریعت اسلامیہ ابھی مکمل ہی نہیں ہوئی تھی۔

جناب ابراہیم سے زیادہ مناسبت نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی امت کو ہے

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ...الآیۃ

مولانا سید فرمان علی صاحب اس آیت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ ''چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک نامی پیغمبر تھے اس وجہ سے یہود و نصاریٰ ہمیشہ جھگڑتے رہتے تھے کہ ہر فریق ان کو اپنی طرف کہتا تھا آخر یہ دونوں جھگڑتے ہوئے فیصلہ کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے۔ آپ کو خدا نے یہ جواب تعلیم فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہودی یا نصرانی اس معنی سے کہتے ہو کہ توراۃ وانجیل پر ان کا عمل تھا تو یہ صریحی بے عقلی ہے۔ توراۃ وانجیل تو ان کے بعد نازل ہوئیں اور اگر یہ مطلب ہے کہ اس وقت کے ہدایت یافتہ لوگوں کا یہی نام تھا جواب تمہارا ہے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام اپنے کو ''حنیف مسلم'' کہتے تھے نہ یہودی نہ نصرانی اور اگر یہ مطلب ہے کہ سب دینوں میں یہود و نصاریٰ کے دین کو ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ مناسبت ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ مناسبت یا خود ان کی امت کی تھی یا پچھلی امتوں میں اس نبی اور اس کی امت کو ہے۔ کیونکہ نام بھی ایک ہی ہے اور احکام بھی بہت سے ملتے جلتے ہیں تو پھر تم لوگ کیا جھگڑتے ہو؟ یہ سن کر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔ ایک حدیث میں ہے کہ:

''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوست وہی ہے جو ان کی پیروی کرے اگر چہ کوئی رشتہ نہ رکھتا ہو۔اور دشمن وہ ہے جو آپ کے خلاف چلے اگر چہ یگانہ ہو''۔

دوسری حدیث میں ہے:

''بہشت پرہیزگاروں کیلئے ہے اگر چہ حبشی غلام ہو۔اور جہنم نافرمانوں کے واسطے ہے اگر چہ سید قریشی ہی کیوں نہ ہو'' (حاشیہ قرآن مترجم مولانا فرمان علی)۔

آیات القرآن

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ
اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْۤا
اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ
الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ
عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

ترجمۃ الآیات

اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کر سکے حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو بھی گمراہ نہیں کرتے مگر انہیں اس کا شعور نہیں (۶۹) اے اہل کتاب تم آیات الٰہیہ کا کیوں انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم خود گواہ ہو (کہ وہ آیات الٰہیہ ہیں اور برحق ہیں۔ (۷۰) اے اہل کتاب! حق کو باطل کے ساتھ کیوں گڈمڈ کرتے ہو؟ اور حق کو کیوں چھپاتے ہو حالانکہ تم

جانتے ہو (کہ حق کیا ہے) (۷۱)۔ اہل کتاب کا ایک گروہ (اپنے لوگوں سے) کہتا ہے کہ جو کچھ مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اس پر صبح کے وقت ایمان لے آؤ اور شام کے وقت انکار کر دو۔ شاید (اس ترکیب سے) وہ مسلمان (اپنے دین سے) پھر جائیں (۷۲)۔ خبردار۔ صرف اسی کی بات مانو جو تمہارے دین کی پیروی کرے۔ کہہ دیجیے کہ حقیقی ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے (اور یہ اسی کی دین ہے) کہ کسی کو ویسی ہی چیز مل جائے جو (کبھی) تم کو دی گئی تھی۔ یا وہ دلیل و حجت میں تمہارے پروردگار کے ہاں تم پر غالب آ جائیں۔ کہہ دیجیئے۔ کہ بے شک فضل و کرم اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ وہ بڑی وسعت والا اور بڑا جاننے والا ہے۔ (۷۳)

تشریح الالفاظ

(۱) طائفة یہ طائف کی مؤنث ہے جس کے معنی ہیں لوگوں کی جماعت اور ایک رائے و مذہب کے لوگ۔

(۲) وجه النهار دن کا شروع جیسے کہا جاتا ہے وجہ الدہر یعنی زمانہ کا شروع

تفسیر الآیات

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ... الآية

چاہیے تو یہ تھا کہ اہل کتاب اپنی کتابوں میں آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علامات پڑھ کر اور ان کے معجزات دیکھ کر آپ پر ایمان لاتے۔ لیکن ان کی ضد اور کج روی کا یہ عالم ہے کہ جو خوش قسمت لوگ تصدیق رسالت کر کے کلمہ اسلام پڑھ چکے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ مختلف حیلوں بہانوں اور مختلف ابلیسی تدبیروں سے ان کو بھی اسلام سے برگشتہ کریں خداوند لطیف و خبیر خبر دے رہا ہے کہ یہ لوگ کبھی اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور مسلمانوں کو راہ راست سے بہکا نہیں سکتے البتہ وہ غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو گمراہ کر رہے ہیں اور دنیا و آخرت میں ناکام و نامراد ہو کر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔

مسلمان کے مرتد بنانے کیلئے احبار و رھبان کی ایک گہری سازش کا بیان

وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ...۴۹ الاٰیۃ

اہل کتاب کے ایک گروہ یعنی احبار و رھبان کی مسلمانوں کو دین حق سے برگشتہ کرنے کی گہری شیطانی سازشوں میں سے ایک سازش یہ تھی جس کا خدائے علیم وحکیم نے یہاں پردہ چاک کیا ہے کہ انہوں نے کچھ خاص عیار و مکار لوگ تیار کئے کہ وہ مسلمانوں کے پاس جا کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کریں اور کچھ وقت گذرنے کے بعد مرتد ہو جائیں اور دل کھول کر پرچار کریں کہ ہم نے قریب جا کر اسلام اور بانی اسلام کو دیکھا ہے۔ اس لئے جب ان کے عیوب ونقائص ہم پر واضح وآشکار ہوئے ہیں تو ہم دین اسلام کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس سازش کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ اس طرح کئی جدید الاسلام لوگوں کا اعتماد اسلام سے متزلزل ہو جائیگا۔ اور وہ سوچنے لگیں گے کہ اسلام میں کوئی ایسی خرابی تو ہے جس کی وجہ سے یہ پڑھے لکھے لوگ اسلام لا کر پھر منحرف ہو گئے ہیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ وہ بھی مرتد ہو جائیں۔

دوسرا یہ کہ اس حیلہ سے وہ اپنی قوم کو اسلام کے اثر سے بچا لیجائیں گے۔ کیونکہ وہ دیکھیں گے کہ ان کی قوم کے پڑھے لکھے اسلام کو آزما کر چھوڑ چکے ہیں تو ان کے اندر اسلام لانے کی رغبت وکشش کمزور ہو جائے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے جب بھی کسی قوم وملت کو اپنی کسی سازش کا نشانہ بنایا ہے۔ تو اس کے اندر گھس کر ہی اس کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو یہود ونصاریٰ کی اس مخفی سازش سے غافل نہیں رہنا چاہیے ان دو آیات شریفہ کے فقرات کی ساخت کو سمجھنے اور پھر ان کا ترجمہ وتفسیر کرنے میں ہمارے مترجمین و مفسرین کو بڑا اشتباہ ہوا ہے اور بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

(۱) بعض مترجمین اور مفسرین کا خیال ہے کہ ''وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ'' سے لے کر ''عِنْدَ رَبِّكُمْ'' تک اسی طائفہ کا کلام ہے ہاں البتہ اس آیت میں صرف ایک جملہ معترضہ ''قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ''۔ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس بنا پر مفہوم آیت یہ ہوگا۔ ''اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ ایمان لاؤ اس کتاب پر جو اہل ایمان پر اتاری گئی ہے صبح کے وقت اور سر شام اس کا انکار کر دو۔ شاید اس طرح وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں اور مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں یہ کہہ دیجئے۔ کہ ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔ اور یہ بھی نہ ماننا کہ دیا جا سکتا ہے کسی کو جیسے تمہیں دیا گیا یا کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر

تمہارے رب کے پاس''

(۲) بعض مترجمین ومفسرین کا یہ خیال ہے کہ''ولا تومنوا'' سے لے کر''واللہ واسع علیم'' تک سب خدا کا کلام ہے اور اہل اسلام سے خطاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام! ان لوگوں کے سوا جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کسی کی بات نہ مانو۔ کہہ دو کہ ہدایت بس وہی ہے جو تمہارے پروردگار کی ہدایت ہے اور یہ مت مانو کہ کسی کو وہ کچھ دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے اور یہ بھی نہ مانو کہ کوئی حجت لا سکتا ہے۔ تم پر تمہارے پروردگار کے پاس فرما دیجئے کہ فضل وکرم تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

(۳) بعض محقق مترجمین اور مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ ان دو آیتوں میں صرف دو قول اہل کتاب کے ہیں ایک''امنوا بالذی۔۔۔۔'' دوسرا''ولا تومنوا الا لمن تبع دینکم'' باقی''قل ان الھدی'' سے لے کر''واللہ واسع علیم'' تک خدا کا کلام ہے اور یہی ہماری ناچیز تحقیق ہے اور اس صورت میں ان آیتوں کا ترجمہ اور مفہوم وہی ہے جو ہم نے ترجمہ میں بیان کیا ہے۔ ملا محسن فیض کاشانی تفسیر صافی میں لکھتے ہیں۔''و ھی من المتشابھات التی لم یصل الینا من اھل البیت فیھا شیی''' (تفسیر صافی)۔

یہ آیت ان متشابہ آیات میں سے ہے جس کے متعلق اہل بیت رسول علیہم السلام سے ہم تک کچھ نہیں پہنچا۔ اور فاضل نیشاپوری نے لکھا ہے''عدت الایۃ من المواضع المشکلۃ'' (عرائب القرآن)

اس آیت کا شمار مشکل مقامات میں کیا گیا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ بعض اعلام کی طرح ہمیں بھی اس آیت مبارکہ کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی اور ان آیات کے فقرات کی ساخت وہی صحیح ہے جو ہم نے اوپر تیسرے قول میں بیان کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کے کچھ شاطر لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے اور انہیں مرتد بنانے کی یہ سازش کی تھی کہ کچھ مخصوص لوگوں کو آمادہ کیا کہ دن کے ابتدائی حصہ میں اسلام کا اعلان کرو۔ اور اس کے آخری حصہ میں انکار کردو۔ اور یہ سب کچھ حسب ظاہر ہو۔ ویسے تم صرف اس شخص کی بات مانو جو تمہارے دین کی پیروی کرے''۔

چونکہ کافی عرصہ سے انبیاء وصلحاء اس گروہ میں پیدا ہوتے رہے تھے اس لئے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہدایت ایک گروہی چیز ہے نہ کہ اصولی۔ یعنی تاریخی روایات کے زیر اثر ان کا یہ ذہن بن+ گیا تھا کہ جو ہمارے گروہ میں ہے وہ ہدایت پر ہے اور جو ہمارے گروہ سے باہر ہے وہ ہدایت سے عاری ہے اس گروہ کے جواب میں خدائے حکیم اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارکہ سے یہ اعلان کرا رہا ہے کہ''قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰی هُدَی اللّٰهِ...'' ان لوگوں سے کہو اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔ یعنی اس میں تمہاری کوئی اجارہ

داری نہیں ہے یہ تو خدا کا دین ہے وہ چاہے تو کسی دوسرے کو بھی وہی نعمت عطا فرما دے جو کبھی تمہیں ملی تھی یعنی آسمانی کتاب وحکمت اور نبوت ورسالت یہ اللہ کی صوابدید پر منحصر ہے وہ جسے چاہے عطا کرے۔لہٰذا اگر اس نے اب یہ نعمت خاندان اسماعیل علیہ السلام کو عطا فرما دی ہے تو تم اسے روک سکتے ہو؟ یہ ''اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ '' کا صحیح مفہوم ہے۔

''اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ '' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اب تک تو نجات اور کامیابی کے مستحق تم تھے۔مگر اب جبکہ دوسری کتاب وشریعت آگئی ہے تو اب اگر یہ مسلمان لوگ خدا کے سامنے دلیل وحجت میں تم پر غالب آجائیں تو تم کیا کر سکتے ہو؟''قل ان الفضل بید اللہ'' کہہ دیجئے کہ فضل وکرم خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔اس طرح کلام کی سطح پوری طرح ہموار ہو جاتی ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ اس توضیح کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا متوازن مفہوم ہے جس میں کوئی پیچیدگی معلوم نہیں ہوتی۔والحمدللہ۔

آیات القرآن

یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۞۷۴ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۞۷۵ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۞۷۶ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۞۷۷

ترجمۃ الآیات

وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے خاص کر لیتا ہے اللہ بڑے فضل وکرم والا ہے اور اہل

کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم ڈھیر بھر روپیہ بھی بطور امانت اس کے پاس رکھو تو وہ تمہیں ادا کر دے گا اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار (اشرفی) بھی بطور امانت رکھو تو جب تک تم اس کے سر پر کھڑے نہ رہو وہ تمہیں واپس نہیں کرے گا (یہ بدمعاملگی) اس وجہ سے ہے کہ ان کا قول ہے کہ ہم پر امّیوں (ان پڑھ عربوں جو کہ اہل کتاب نہیں) کے بارے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ منڈھتے ہیں (۷۵) ہاں جو شخص اپنے عہد و پیمان کو پورا کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے تو بے شک خدا پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے (۷۶) جو لوگ اللہ سے کئے گئے عہد و پیمان اور قسم اقسام کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ خدا قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر (رحمت) کرے گا اور نہ ان کو (گناہوں کی کثافت سے) پاک کرے گا۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے (۷۷)

تشریح الالفاظ

(۱) بقنطار — قنطار کے معنی ہیں ڈھیر سارا روپیہ پیسہ اور دوسرے معنی ہیں اتنی رقم جو کہ بیل کے چمڑے میں سما جائے۔

(۲) لاخلاق — خلاق کے معنی ہیں حصہ

تفسیر الآیات

امانت ادا کرنے کے سلسلہ میں اہل کتاب میں دو قسم کے لوگ ہیں

وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ...الآية

اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر ڈھیر بھر روپیہ بھی بطور امانت اس کے پاس رکھو تو وہ تمہیں ادا کر دے گا اور ان میں کوئی ایسا بھی ہے کہ تم اگر اس کے پاس ایک دینار (اشرفی) بھی بطور امانت رکھو تو جب تک تم اس کے سر پر کھڑے نہ رہو وہ تمہیں واپس نہیں کرے گا۔ اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے بعض اہل کتاب کی ان کے امین ہونے کی وجہ سے مدح کی ہے اور بعض بددیانتوں کی مذمت کی ہے جو اپنے مخالفین

مذہب کے مال کوہضم کر جانا جائز جانتے تھے اوران کی ملامت کی جاتی تو جواب دیتے کہ ہمیں اپنی کتاب میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ ان کا یہ کہنا توراۃ پر سرا سر بہتان ہے۔ اس لئے وہ عام اہل عرب سے عموما اور مسلمانوں سے خصوصاً معاملہ کرنے میں کسی ضابطہ اخلاق کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ خداوند عالم نے پہلے گروہ کی مدح کر کے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام میں تعصب و تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہیں ہے اگر کوئی غیر مسلمان اور کافر ہی اچھا کام کرے تو اس کی مدح کرنی چاہیے۔ اگر چہ کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔ مگر مقبول ہونا اور چیز ہے اور مدح کرنا اور چیز ''اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ'' اللہ تعالیٰ صرف متقیوں کے عمل کو قبول کرتا ہے۔ (سورہ مائدہ آیت ۔ ۲۷) اسلام اپنے مخالفین کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

چنانچہ متعدد احادیث اہل بیت علیہم السلام میں وارد ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن میں نیک و بد اور مسلم و کافر میں تفریق کرنا جائز نہیں ہے:

(۱) جب وعدہ کرو تو اسے پورا کرو خواہ نیک سے کیا ہو یا بد سے

(۲) جب کوئی شخص تمہارے پاس امانت رکھے تو اسے ادا کرو۔ خواہ نیک کی ہو یا بد کی۔

(۳) جب کچھ بیان کرو تو سچ بولو خواہ تمہارا مخاطب نیک ہو یا بد (الخصال' لوسائل' الوانی)۔

نیز متعدد حدیثوں میں وعدہ خلافی کرنے' امانت میں خیانت کرنے اور جھوٹ بولنے کو منافق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ (الخصال' لوسائل' الوانی)

فصل الخطاب کے فاضل مؤلف رقمطراز ہیں کہ علامہ نیشاپوری نے جناب ابن عباس کے متعلق نقل کیا ہے کہ ان سے کسی نے کہا کہ ہمیں دوسرے اہل مذاہب کی بکریاں وغیرہ کبھی مل جاتی ہیں۔ انہوں نے پوچھا پھر تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں ہمارے لئے کوئی حرج نہیں ہے انھوں نے کہا یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کافر کہتے تھے ''لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ''۔ ہم پر ان لوگوں کا جو غیر اہل کتاب ہیں مال کھانے میں کوئی الزام نہیں ہے۔ (غرائب القرآن)۔

اس سے واضح ہو گیا کہ معاملات میں امانت کا لحاظ ہر جماعت کے ساتھ ضروری ہے۔ خواہ وہ مسلمانوں کی جماعت ہو یا غیر مسلمین کی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ...الآية

اس آیت کی شان نزول

اس آیت کی شان نزول میں متعدد روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ بعض احبار وعلماء یہود جیسے ابی رافع کنانہ بن ابی الحقیق، حی ابن اخطب اور کعب بن اشرف کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اپنی ریاست وقیادت بچانے کی خاطر تورات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں واردشدہ علامات کو چھپا دیا تھا اور اس کی جگہ اپنے ہاتھوں سے کچھ اور لکھ دیا تھا اور پھر قسمیں کھائی تھیں کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے ہے۔اور بعض نے بیان کیا ہے کہ یہ اشعث بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے اپنے مخالف کی زمین ہتھیانے کیلئے جھوٹی قسم کھانا چاہی تھی (مجمع البیان)۔

خدا کے عہد و پیمان سے کیا مراد ہے؟

بہر حال شان نزول کچھ ہو آیت مبارکہ میں خدا کے عہد و پیمان سے اس کی اطاعت کرنے اور اس کی معصیت سے بچنے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی نصرت واطاعت کرنے کا عہدہ پیمان مراد ہوسکتا ہے۔عہد خواہ خالق سے کیا جائے یا مخلوق سے بہر حال اس کی ایفا واجب ہوتی ہے۔اور یہی حکم قسم کا ہے لہذا جولوگ تھوڑی قیمت پر یعنی دنیا کے جاہ وجلال یا اس کے مال ومنال کے خاطر ان فرائض کو بدل دیتے ہیں یا انہیں ترک کردیتے ہیں۔انہیں خداوند قہار نے پانچ سزاؤں کی وعید وتہدید کی ہے

(۱) وہ جنت کی نعمتوں سے یکسر محروم ہوں گے

(۲) خدائے رحیم ان سے بات نہیں کرے گا

(۳) ان پر نگاہ لطف وکرم نہیں کرے گا

(۴) خداوند غفار ان کو گناہ کی کثافت سے پاک نہیں کرے گا۔

(۵) ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا۔خدائے حکیم نے اس معاوضہ کو تھوڑا اس لئے فرمایا ہے کہ وہ اس ثواب عظیم کے مقابلہ میں جو اس کارستانی کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے نکل گیا بہر حال تھوڑا ہے۔اگرچہ ہفت اقلیم کی بادشاہی کیوں نہ ہو۔**لو کانوا یعلمون**۔

مخفی نہ رہے کہ احادیث اہلبیتؑ سے معلوم ہوتا ہے کہ چند قسم کے اور بھی ایسے بدقسمت لوگ ہیں جو اسی مذکورہ بالا وعید وتہدید کے سزاوار قرار دئے گئے ہیں۔

(۱) چنانچہ جناب ابوذر غفاریؓ حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے تھے فرمایا:

تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے دن خدا ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ہی ان پر نظر رحمت کرے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے

۱۔ جو کسی کو مال عطا کر کے احسان جتلائے۔

۲۔ جو جھوٹی قسم کھا کر اپنا مال فروخت کرے۔

۳۔ جو ازراہ تکبر اپنی چادر زمین پر گھسیٹ کر چلے (مجمع البیان بحوالہ صحیح مسلم)۔

(۲) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے خدا بروز قیامت کلام نہیں کرے گا۔ نہ ان پر نظر کرم فرمائے گا نہ ان کو گناہوں کی آلائش سے پاک کرے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

۱۔ بوڑھا زناکار۔

۲۔ غریب متکبر۔

۳۔ جابر حکمران (تفسیر عیاشی و برہان)۔

بعض اخبار میں دیوث (بے غیرت مرد) اور ایسی شوہردار زناکار عورت کو بھی ان لوگوں میں شامل کیا گیا ہے جو ولد الحرام بچے کو شوہر کے گلے مڑھتی ہے (تفسیر عیاشی و برہان)۔

آیات القرآن

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ
وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ
اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا
كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ
اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

ترجمۃ الآیات

بے شک ان (اہل کتاب) سے ایک گروہ ایسا بھی ہے۔ جو اپنی زبانوں کو کتاب (تورات و غیرہ) کے پڑھنے میں مروڑتا ہے اور کچھ کا کچھ پڑھتا ہے۔ تاکہ تم یہ سمجھو کہ یہ (توڑ موڑ) بھی کتاب خدا میں سے ہے حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے (آیا) ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتا ہے (۷۸) کسی ایسے انسان کو یہ بات زیب نہیں دیتی جسے خدا کتاب وحکمت (یا اقتدار) اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (میری عبادت کرو) تم اللہ والے ہو جاؤ۔ اس بنا پر کہ تم کتاب الٰہی کی تعلیم دیتے ہو۔ اور اسے پڑھتے بھی رہتے ہو (۷۹) اور وہ کبھی تمہیں یہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو اپنا پروردگار بنا لو۔ بھلا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا۔ اس کے بعد کہ تم مسلمان ہو؟ (۸۰)

تشریح الالفاظ

(۱) بلوون — یہ لویٰ یلوی لیّاً سے ماخوذ ہے جس کے معنی موڑنے کے ہیں۔

(۲) ربّانیّن — یہ ربّانی کی جمع ہے۔ الرّب اللہ تعالیٰ کا نام ہے اس سے نسبت کیلئے ربّی، ربّانی اور ربوبی کہا جاتا ہے

(۳) تدارسون — یہ درس سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں علم یا کتاب کو یاد کرنا نیز درس کے معنی سبق کے بھی ہیں۔

(۴) میثاق النبین — میثاق کے معنی ہیں عہد و پیمان۔

تفسیر الآیات

اہل کتاب کی تحریف کا تذکرہ

وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ ...الآیته

اس سے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کی تحریف مراد ہے۔ جو لفظی بھی ہوسکتی ہے کہ ان کتابوں کی جن کی جن آیات میں پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر خیر ہوتا تھا وہ انہیں اس لب ولہجہ سے پڑھتے تھے کہ ا لفاظ واعراب میں ردوبدل اور کم وبیشی کر دیتے تھے۔ جس سے ان کا اصل مطلب بگڑ جاتا تھا اور معنی بھی کہ وہ لوگ ان الفاظ وآیات کی ایسی غلط اور من پسند تشریح وتاویل کر دیتے تھے جس کا اصل کلام سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یلوون لی بروزن حی سے مشتق ہے جس کے معنی اس طرح زبان کو پیچ وخم دینا ہیں کہ جس سے الفاظ واعراب میں ردوبدل ہو جائے تاکہ تم سمجھو کہ یہ بھی اصل کتاب سے ہے حالانکہ وہ اصل کتاب سے نہیں ہے۔

اسی طرح یہ لفظ بطور کنایہ جھوٹ اور من گھڑت بات میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ مفردات راغب اصفہانی میں لکھا ہے "لوی لسانه کنایته عن الکذب و تحرص" (الحدیث) بنابریں اس سے معنوی تحریف بھی مراد ہوسکتی ہے کہ یہود وانصاریٰ کے احبار ورھبان اپنی کتابوں کی رشوت لے کر وہ تشریح وتوضیح کرتے تھے جس کا اصل حقیقت سے اور اصل کلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ خداوند علیم نے قرآن کریم کی آیات میں اہل کتاب کی ان کارستانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کہیں فرماتا ہے "تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا" (سورہ انعام آیت۔۹۱) تم نے اس (تورات) کو ورق ورق کر رکھا ہے کہ کچھ حصہ ظاہر کرتے ہو اور کچھ چھپاتے ہو۔ کہیں فرماتا ہے۔ "يَسۡمَعُوۡنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ" (سورہ بقرہ آیت۔۷۵) یعنی وہ کلام خدا کو سنتے ہیں اور اسے خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ قرآن جو سابقہ کتب کی تصدیق کرنیوالا ہے اس سے مراد اصلی کتابیں ہیں نہ کہ تحریف شدہ جو کہ خرافات سے لبریز ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ رب جبار وقہار کی یہ وعید وتہدید صرف یہود وانصاریٰ تک محدود نہیں بلکہ جس دین ومذہب سے تعلق رکھنے والا کوئی اہل علم کتاب خدا اور دین ہدیٰ سے یہ سلوک کرے گا وہ ضرور اس کی زد میں آجائے گا۔

خدا کے کسی نمائندہ کو بھی یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنائے اور ان سے اپنی بندگی کرائے

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ...۷۹ الآیۃ

یہودی جناب عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور خدائی اختیار کا حامل قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں جناب

موسیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح عیسائی حضرت عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور خدائی اختیار و تصرفات کا مالک جانتے تھے اور کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ان لوگوں کے اس خودساختہ اور من گھڑت نظریہ کی بڑے احسن انداز میں ردّ کی گئی ہے۔ کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جس ہستی کو خدا منتخب کر کے اور کتاب، علم وحکمت اور نبوت دے کر اپنی توحید وعبادت کا پرچار کرانے کیلئے بھیجے وہ لوگوں سے خدا کی توحید کا اقرار کرانے اور اس کی عبادت کرانے کی بجائے الٹا ان کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت دے اور ان سے اپنی خدائی منوائے یا لوگوں کو یہ کافرانہ حکم دے کہ خدا کو چھوڑ کر فرشتوں اور پیغمبروں کو اپنا پروردگار اور مالک و مختار مانو۔ کیا وہ لوگوں کو مسلمان ہوچکنے کے بعد کفروشرک کا حکم دے سکتا ہے؟ حاشا وکلا۔

ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ تو صرف یہ کہے گا کہ تم اللہ والے ہوجاؤ۔ اور صرف اسی کی عبادت کرو۔ اس بنا پر کہ تم دوسروں کو خدا کی تعلیم دیتے ہو۔ اور خود بھی اسے پڑھتے ہو۔ قانون فطرت ہے کہ جب کوئی حکومت کسی شخص کو اپنا سفیر مقرر کرتی ہے تو پہلے اطمینان حاصل کرتی ہے کہ آیا وہ شخص یہ کام انجام دے سکتا ہے؟ اور یہ کہ آیا وہ شخص وفادار اور اطاعت گذار ہے؟ کہیں ملک وملت کے مفاد کے خلاف کام کرنے والا غدار تو نہیں ہے؟۔ حالانکہ حکومت کا اندازہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ تو کیا جب خدائے علیم وحکیم کسی برگزیدہ شخص کو نبوت ورسالت کے جلیل القدر عہدہ پر فائز کرے گا تو وہ پہلے یہ نہیں دیکھے گا کہ وہ اس منصب جلیل کا اہل ہے یا نہ؟

اور اگر (العیاذ باللہ) خدا کا مقرر کردہ پیغمبر لوگوں کو خدا کی توحید اور اس کی عبادت کی دعوت دینے کی بجائے خود اپنی خدائی منوانے اور اپنی عبادت کرانے لگ جائے تو پھر اس طرح خدا کے انتخاب وعلم پر ایراد وارد نہ ہوگا کہ اس نے جس شخص کو اس عہدہ کا اہل سمجھ کر بھیجا تھا وہ تو اس کا اہل نہ تھا؟

خدا کے نمائندے معصوم ہوتے ہیں

اسی مختصر سے بیان سے واضح وعیاں ہوجاتا ہے کہ خدا جن ذوات مقدسہ کو نبوت ورسالت یا وصایت و امامت کے عہدہ جلیلہ کیلئے منتخب کرتا ہے وہ عصمت کے درجہ رفیعہ پر فائز ہوتے ہیں۔ کبھی غیر معصوم نبی وامام نہیں ہوسکتا ''لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ۔'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۲۴)

نبی ہوں یا امام وہ کبھی لوگوں کے غلو آمیز نظریہ پر راضی نہیں ہوسکتے

خدا کے اس بیان حق ترجمان سے واضح وعیاں ہوگیا کہ انبیاء ومرسلین یا آئمہ طاہرین علیہم السلام کبھی لوگوں کے غلو آمیز نظریات پر راضی نہیں ہوسکتے اور خدا کے بالمقابل اپنی عبادت و پرستش کے دعویدار یا اپنی غلط

تعظیم وتکریم کرانے اور اپنی کبریائی و بڑائی کے روادار نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ مروی ہے:

ایک بار ایک شخص نے بارگاہ رسالت مآب میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم آپ کو اس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح ایک دوسرے کو کرتے ہیں کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں؟

فرمایا: خبردار سجدہ خدا کے سوا کسی کیلئے روا نہیں ہے۔ ہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اکرام کرو۔ اور حق والوں کا حق پہچانو (مجمع البیان)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:

ایک شخص نے عرض کیا کیا ہم آپ کی عبادت نہ کریں؟

فرمایا: خبردار نہ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ میری یہ دعوت ہے (تفسیر کاشف)۔

ایک بار حضرت امیر المومنین علیہ السلام اپنے ظاہری عہد امامت میں عراق کے شہر انبار میں تشریف لے گئے۔ تو وہاں کے کچھ لوگ آپ کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ آپ اس پر غضبناک ہوئے اور لوگوں کو سخت سرزنش کی (نہج البلاغہ کلمات قصار)۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا:

''سیھلك فی اثنان و لا ذنب لی محب غال و مبغض قال۔ میرے بارے میں دو قسم کے لوگ تباہ و برباد ہو جایں گے جبکہ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔

(١) ایک مجھے میرے مقام سے بڑھانے والا محب

(٢) دوسرا مجھے میرے رتبہ سے گھٹانے والا مبغض (نہج البلاغہ)۔

اور جن لوگوں نے حضرت امیر علیہ السلام کی ربوبیت کا دعویٰ کیا تھا اور وہ مولائے متقیان کے روکنے ٹوکنے کے باوجود اس غلط دعویٰ سے باز نہیں آئے تھے اور اس عقیدہ سے توبہ نہیں کی تھی تو جناب نے انہیں آگ میں جلا کر بھسم کر دیا تھا یہ ایک نا قابل انکار مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ (بحار الانوار وغیرہ)۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کی دعا

حضرت امام رضا علیہ السلام اپنی دعا میں کہا کرتے تھے:

''اللھم انی ابراء الیك من الحول و القوۃ ولا حول و لا قوۃ الّا بك اللھم انی ابرء الیك من الذین قالوا فینا ما لم نعلمه فی انفسنا اللھم لك الخلق و منك الامر و ایاك نعبد و ایاك نستعین اللھم انت خالقنا وخالق ابائنا الاولین و ابنائنا الاخرین۔

اللهم لا تليق الربوبية الا لك و لا تصلح الالٰهيته الا لك فالعن النصارىٰ الذين صغروا عظمتك و العن المضاهئين من بريتك اللهم انا عبيدك و ابناء عبيدك لانملك لانفسنا ضرا و لانفعا ولا موتا و لا حيوة و لا نشورا اللهم من زعم ان لنا الخلق و علينا الرزق فنحن اليك منه براء كبرائته عيسى ابن مريم من النصارى اللهم انا لم ندعهم الى ما يذعمون فلا تواخذنا بما يقولون و اغفرلنا ما يذعمون رب لا تذر على الارض من الكافرين دياراً انك ان تذرهم يضلوا عبادك و لا يلدوا الا فاجرًا كفارًا۔

بارالہا! میں تیرے حضور میں اپنی ہرقسم کی طاقت وقوت سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں۔ کیونکہ ہرقسم کی طاقت وقوت کا سرچشمہ تیری ذات ہے۔ یا اللہ! میں ان لوگوں سے اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں جو ہمارے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو ہم اپنے اندر نہیں پاتے ہیں۔ بارالہا ! پیدا کرنا اور حکم دینا تجھ ہی سے متعلق ہے ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تو ہی ہمارا خالق ہے اور ہمارے آباء اولین اور ابناء آخرین کا خالق بھی ہے۔ بارالہا ! مقام ربوبیت تیرے ہی لائق ہے۔ اور معبود بننے کی صلاحیت صرف تجھ ہی میں ہے۔ اس لئے تو نصرانیوں پر لعنت کر۔ کیونکہ انہوں نے تیری عظمت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے اور ان لوگوں پر بھی لعنت کر جو ان کے ہم خیال ہیں۔ بارالہا! ہم تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کی اولاد ہیں ہم نہ اپنے نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے اور نہ ہی موت کے مالک ہیں اور نہ حیات کے اور نہ ہی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بارالہا! جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ہم پیدا کرتے ہیں اور ہم روزی دیتے ہیں۔ ہم اس سے اسی طرح بیزار ہیں جس طرح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم عیسائیوں سے بیزار تھے۔ بارالہا! یہ لوگ جن باتوں کا ہمارے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں ہم نے ان کو اس کی دعوت نہیں دی۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کا ہم سے مواخذہ نہ کرنا اور وہ جو گمان فاسد کرتے ہیں ہمیں معاف فرما۔ بارالہا! روئے زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑ کیونکہ اگر تو ان کو زندہ چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور کافر اور فاسق وفاجر کے سوا اور کسی کو جنم نہیں دیں گے (احسن الفوائد بحوالہ عیون الاخبار و بحار الانوار وغیرہ)۔

اس بیان نیز البرہان سے روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا کہ ہر معاملہ کی طرح عقائد میں بھی افراط و تفریط غلط اور مذموم ہے اور اعتدال ومیانہ روی صحیح اور ممدوح ہے۔ وَ اللّٰهُ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ۔

آیات القرآن

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَ
اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ
فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ
عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ
وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا
نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

ترجمۃ الآیات

اور جب خدا نے تمام پیغمبروں سے یہ عہد واقرار لیا تھا کہ میں نے جو تمہیں کتاب وحکمت عطا کی ہے اس کے بعد جب تمہارے پاس ایک عظیم رسول آئے جو تمہارے پاس کی چیزوں (کتابوں) کی تصدیق کرنے والا ہو تو تم اس پر ضرور ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا۔ ارشاد ہوا: کیا تم اقرار کرتے ہو؟ اور اس پر میرے عہد و پیمان کو قبول کرتے ہو اور یہ ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد ہوا۔ تم سب گواہ رہنا ہے اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں (۸۱) اب جو کوئی بھی اس (عہد) سے منہ پھیرے گا تو ایسے ہی لوگ فاسق (نافرمان) ہیں (۸۲)۔ کیا وہ اللہ کے دین (اسلام) کے سوا کسی اور (دین) کو تلاش کرتے ہیں حالانکہ جو آسمانوں میں ہیں یا زمین میں ہیں سب خوشی سے یا ناخوشی

سے (چاروناچار) اسی کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں اور بالآخر سب اسی کی طرف لو ٹائے جائیں گے (۸۳)۔ (اے رسول) کہہ دیجئے! کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر بھی جو ہم پر اتارا اور جو ابراہیمؑ اسماعیلؑ اسحاقؑ یعقوبؑ اور اسباط پر اتارا گیا۔ اور اس پر بھی جو کچھ موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا ہوا۔ ہم (بحیثیت نبی ہونے کے) ان کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی (خدائے یکتا) کے مسلمان (اطاعت گذار بندے) ہیں (۸۴)

تشریح الالفاظ

(۱) اصری — اِصر کے معنی ہیں عہد و پیمان

(۲) طوعاً و کرھاً — پہلے لفظ کے معنی بخوشی کوئی کام کرنا اور دوسرے لفظ کے معنی ہیں زبردستی کرنا

تفسیر الآیات

خداوند عالم کا تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے عہد و پیمان لینا کہ آخری عظیم الشان پیغمبر پر ایمان لائیں اور ان کی نصرت بھی کریں

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ... الآیۃ

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ یہاں نبیین سے سابقہ انبیاء اور ان کی امتیں مراد ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جب انبیاء سے عہد و پیمان ہوگیا۔ تو ان کے ذریعہ یہ اطلاع ان کی امتوں کو بھی پہنچ گئی۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق جو حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ اس آیت کے آخر میں جو وارد ہیں۔ ''وَ اَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبیو! تم نے خود اس عہد و پیمان کا اقرار کرنے کے بعد کیا اپنی امتوں سے بھی یہ عہد لیا ہے؟ انبیاء نے کہا ہاں لیا ہے (تفسیر صافی)۔ اور سب کے بعد آنے والے عظیم رسول سے حضرت محمد مصطفیٰ واحمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے فرمایا:

''لم یبعث اللہ نبیاء آدم و من بعدہ الا اخذ علیہ العھد لئن بعث اللہ محمدا و ھو حی لیؤمنن بہ و لینصر نہ''۔ خدا نے آدم سے اور ان کے بعد جو بھی نبی بھیجا اس سے یہ ضرور عہد و

پیمان لیا کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیری زندگی میں مبعوث ہو جائیں تو ضرور ان پر ایمان بھی لانا اور ضرور ان کی مدد بھی کرنا۔ (مجمع البیان)۔

خدا نے سابقہ امتوں سے یہ عہد و پیمان ان کے انبیاء کے ذریعہ سے لیا کہ اپنی اپنی امتوں کو یہ حکم دے جائیں کہ اگر وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے وقت میں تشریف لائیں تو یہ ان کی نیابت میں یہ فریضہ ایمان و نصرت انجام دیں (مجمع البیان)

قرآن مجید خبر دیتا ہے کہ سابقہ انبیاء کی بشارتیں تورات و انجیل وغیرہ آسمانی صحیفوں اور کتابوں میں مذکور ہیں ارشاد قدرت ہے۔ ''اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ'' (سورہ اعراف آیت۔ ۱۵۷) یہ وہ لوگ ہیں جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے جسے وہ تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں''۔ ظاہر ہے کہ انبیاء کے ان پر ایمان لانے اور نصرت کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھیں کہ وہ رسول اعظم ان کے بعد یقیناً تشریف لائے گا اور وہ اس بات کی اپنی امتوں کو بھی بشارت دے جائیں۔ چنانچہ خدائے جلیل نے جناب عیسیٰ ابن مریم کی روش و رفتار اور گفتار کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ ''وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ'' (سورہ صف آیت۔ ۶)۔ اور (یاد کرو) جب عیسیٰ علیہ السلام بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں اس کی جو مجھ سے پہلے موجود ہے یعنی تورات۔ اور بشارت دینے والا ہوں۔ ایک نبی کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔'' مگر جب وہ رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آ گیا تو اس دور کے اہل کتاب نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ قرآن کی زبانی سنیئے ''وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ'' (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۰۱)۔ اور جب اللہ کی طرف سے ان کے پاس موجود کتابوں کی تصدیق کرنے والا رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آ گیا۔ تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا''۔ آہ۔ ما اکثر العبر و ما اقل الاعتبار ؟؟

اس ایمان و نصرت کا حقیقی اظہار امام زمانہ علیہ السلام کے ظہور کے وقت ہوگا

بہر حال اس ایمان و نصرت کا اصلی و عملی مظاہرہ اس وقت ہوگا کہ جب اس آخری پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری وارث حضرت امام مہدی ہادی علیہ السلام ظہور فرمائے گا۔ اور تمام سابقہ انبیاء کا نمائندہ حضرت

عیسیٰ بن مریمؑ آسمان سے نزول اجلال فرمائے گا اور امام زمانہ علیہ السلام کے اقتداء میں نماز خدا ادا کر کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کا اور پھر امام عصرؑ کی قیادت میں جہاد کر کے اور ادیان باطلہ کو حرف طرح صفحہ ہستی سے مٹا کر اور اسلام کو تمام روئے زمین پر پھیلا کر آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کا فریضہ ادا کرے گا۔''هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ'' عجل اللہ فرجه و سهّل مخرجه۔ فأ نهم یرونه بعیداً و نراه قریباً۔

الغرض خداوند عالم نے انبیاء کے ذریعے سے ان کی امتوں سے عہد و پیمان لے کر فرمایا کہ پیغمبر آخر الزمان پر ایمان ہے اور ان کی نصرت کا فریضہ ادا کرنے کے عہد و پیمان کے ایک دوسرے کے گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ اور جو اس عہد و پیمان سے منہ پھیرے گا تو ایسے ہی لوگ فاسق (نافرمان) ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ ''اگرچہ یہ آیت انبیاء کے بارے میں ہے لیکن واضح ہے کہ ان کے جانشینوں پر بھی صادق آتی ہے۔ کیونکہ ان کے سچے جانشین ان سے جدا نہیں ہیں اور سب کے سب ایک ہی مقصد رکھتے ہیں۔ انبیاء ہمیشہ اپنے جانشینوں کا تعارف کرواتے تھے' ان کی بشارت دیتے تھے اور لوگوں کو ان پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کی دعوت دیتے تھے اس لئے اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری تفسیر و حدیث کی کتب میں اس آیت کے ذیل میں چند روایات میں۔ ''ولتنصرنہ سے حضرت علی علیہ السلام کی مدد کرنا مراد لیا گیا ہے اور اس میں مسئلہ ولایت کو بھی شامل قرار دیا گیا ہے تو وہ درحقیقت اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے'' (تفسیر نمونہ)۔ یہ روایات تفسیر عیاشی و صافی اور برہان وغیرہ تفاسیر میں موجود ہیں اور ان میں زمانہ رجعت کے اندر انبیاء کا جہاد میں حضرت امیر علیہ السلام کی مدد کرنا مذکور ہے۔ فراجع

سب اہل زمین و آسمان کا طوعاً یا کرھاً ایمان لانا

اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰهِ یَبۡغُوۡنَ...الآیة

اسلام کے معنی قانون الٰہی کے سامنے سر جھکانے کے ہیں۔ اب اسلام کی دو قسمیں ہیں ایک تشریعی کہ آدمی اپنے عزم و ارادہ اور اختیار سے اس خدائی راستہ پر گامزن ہو جائے۔ یہ ہوا طوعاً کا مفہوم۔ اور دوسرا تکوینی و تسخیری جن و انس کے علاوہ دوسری چیزوں کا سر تکوینی طور پر خدا کے سامنے جھکا ہوا ہے اور جو چیز جس مقصد کیلئے پیدا کی گئی ہے وہ تسخیری طور پر اسی راستہ پر قدم زن ہے یہ ہوا کرھا کا مفہوم۔ اور بعض مفسرین نے اس آیت کی یوں تفسیر کی ہے کہ ہر نیک و بد اسلام ضرور لاتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ نیک دار دنیا میں برضا و رغبت خود لاتا ہے اور بد بروز قیامت عذ

اب خداوندی کو دیکھ کر مجبوراً لائے گا۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ ''فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ وَ كَفَرۡنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشۡرِكِيۡنَ'' (سورہ مومن آیت۔ ۸۴)۔ جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم واحد و یکتا خدا پر ایمان لائے ہیں اور جن چیزوں کو ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے ان کا انکار کرتے ہیں۔ (تفسیر کاشف)۔

مگر اس وقت ایمان لانا کوئی فائدہ نہ دے گا ''فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا'' (سورہ مومن آیت۔ ۸۵) یعنی عذاب دیکھ کر ایمان لانا کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اور بعض احادیث اہل بیت علیہم السلام کے مطابق یہ گھڑی اور ناخوشی والا اسلام جب حضرت قائم آل محمد علیہ السلام قیام فرمائیں گے تو روئے زمین کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں رہ جائے گا جہاں توحید و رسالت کی گواہی نہیں دی جائیگی (تفسیر عیاشی، صافی، برہان وغیرہ) بہرحال ایک نہ ایک دن سب نے اسی کی بارگاہ میں واپس جانا ہے۔

مسلمان جماعت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سب انبیاء پر اجمالی ایمان رکھتی ہے

قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا ...الآیتہ

بعینہ اس مضمون کی آیت پہلے پارے کے آخر میں گذر چکی ہے وہاں قولوا سے ابتداء ہے اور یہاں قل سے آغاز ہے۔ اس طرح صرف بعض الفاظ کا ادل بدل ہے مضمون بالکل وہی ہے۔ وہاں اس کی بقدر ضرورت تفسیر بیان کی جا چکی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہود جناب موسیٰ علیہ السلام کو مانتے تھے۔ مگر جناب عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرتے تھے اور عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے تھے مگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرتے تھے۔ پھر ہر دو فریق جناب اسحاق کی عظمت شان و رفعت مکان کے تو قائل تھے مگر جناب اسماعیل علیہ السلام کو نظرانداز کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ انبیاء میں تفریق کے مرتکب ہوتے تھے۔ مگر اسلام جذبات کی رو میں بہہ کر اس تفریق کا قائل نہیں ہوتا۔ بلکہ اسلام سب انبیاء کرام کی جلالت شان کا محافظ و پاسبان ہے اور سب پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اور سب کو سچا نبی جانتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آئین فطرت اور قانون قدرت یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ خدا کا پیغام زمین کے کس خطہ پر آیا؟ اور کس خاندان میں آیا؟ وہ سب پر اجمالی ایمان رکھتا ہے۔ اور یہ مسلم جماعت کی وہ خصوصیت ہے جسے اس آیت مبارکہ میں پیش کیا گیا ہے۔

آیات القرآن

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ
وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ
الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
وَاَصْلَحُوْا ۗ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ
اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ
اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

ترجمۃ الآیات

اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین اختیار کرے گا۔ تو اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا (۸۵)۔ بھلا خدا ان لوگوں کو کیونکر ہدایت دے گا (منزل مقصود پر پہنچائے گا) جو ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو گئے۔ حالانکہ گواہی دے چکے تھے۔ کہ رسول برحق ہے۔ اور ان کے پاس آیات بینات (واضح معجزات) بھی آ چکے تھے۔ بے شک خدا ظلم و جور کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۸۶)۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت ہے (۸۷)۔ وہ ہمیشہ اس لعنت

(پھٹکار) میں گرفتار رہیں گے۔ نہ ان کے عذاب میں تخفیف (کمی) کی جائیگی اور نہ انہیں مہلت دی جائیگی (۸۸)۔ مگر وہ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی تو۔ بے شک خدا بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے (۸۹)۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے اور کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور یہی لوگ حقیقی گمراہ ہیں (۹۰) بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور پھر کفر ہی کی حالت میں مر گئے تو ان میں سے کسی ایک سے ساری زمین بھر سونا بطور فدیہ و معاوضہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے دردناک عذاب ہے اور ان کیلئے کوئی مددگار نہیں ہوں گے (۹۱)۔

تشریح الالفاظ

(۱) من یبتغ — یہ ابتغاء سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں طلب کرنا اور چاہنا

(۲) ینظرون — یہ انظار سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مہلت دینا۔

(۳) مِلْاٰءُ الارض مل ء کے معنی ہیں بھرنا۔

(۴) افتدیٰ — یہ فدی اور فدیہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں فدیہ (مال وغیرہ) دے کر کسی کو قید سے چھڑانا

(۵) الیم — اس کے معنی ہیں المناک یعنی دردناک عذاب

تفسیر الآیات

جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے گا اس کا دین قبول نہیں ہوگا

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا...الآية

قبل ازیں اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۹۔ ''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ'' کی تفسیر میں فی الجملہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ لغت میں اسلام کے معنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کے ہیں اور اصطلاح میں اسلام نام' ہے اس پیغام کا جو خداوند عالم نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کی ہدایت و راہنمائی کیلئے بھیجا ہے کیونکہ تمام رسولوں کی شریعتوں کے اصول دین ایک رہے ہیں جو کہ توحید پروردگار' وحی و نبوت انبیاء

اور حیات بعد الموت اور جزاء وسزا پر ایمان لانا ہے۔ چنانچہ ارشاد رب لعزت ہے۔''شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا''۔ یعنی خدا نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی وصیت نوح اور دوسرے پیغمبروں کو کی تھی (سورہ شوریٰ آیت۔ ۱۳)۔

لہٰذا ہر نبی ورسول اپنے زمانہ میں اسلام کا ہی داعی اور مبلغ تھا اور جو لوگ ان پر ایمان لاتے تھے وہ مسلم ہی کہلاتے تھے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے فرمایا:

''انا معاشر الانبیاء دینا واحد''ہم گروہ انبیاء کا دین ایک ہی ہے۔

چنانچہ قرآن اس بات کا شاہد ہے کہ جناب نوح علیہ السلام سے لے کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک خدا نے ہر نبی اور اس کے پیروکاروں پر اسلام اور مسلم کی لفظ کا اطلاق کیا ہے۔ چنانچہ جناب نوح علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ فرمایا:

''وَ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' (سورہ یونس آیت۔ ۷۲)

جناب ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

''قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ''(سورہ بقرہ آیت۔۱۳۱)

جناب ابراہیم علیہ السلام اپنی اولاد کو مسلمان بنکر مرنے کا حکم دیتے ہیں:

'' وَ وَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ''(سورہ بقرہ آیت۔ ۱۳۲)۔

نیز جناب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو اور اپنی ذریت کو مسلمان فرمایا ہے:

''رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ''(سورہ بقرہ آیت۔۱۲۸)

جناب یوسف علیہ السلام دعا کرتے ہیں:

''اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ج تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ'' (سورہ یوسف آیت۔۱۰۱)

جناب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

''وَ قَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ''(سورہ یونس آیت۔ ۸۴)

جناب عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے بارے میں ارشاد قدرت ہے:

''وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ قَالُوْآ اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ''(سورہ مائدہ آیت۔١١١)۔

اسی لئے خدا فرماتا ہے:

''هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ لا ۵ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا''اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام اس سے پہلے ہی مسلمان رکھ دیا ہے (سورہ حج آیت۔٧٨)۔ یہ الگ بات ہے کہ مولوی، مولانا، چودھری، ملک، خان، مرزا، مغل بادشاہ اور سنی وشیعہ کہلانے والے تو بہت مل جاتے ہیں۔مگر حقیقی مسلمان کبریت احمر سے بھی کم نظر آتے ہیں۔بقول اقبالؒ

یوں تو مرزا بھی ہو سید بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو ؟

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کا اپنے دور میں لایا ہوا دین دین اسلام ہی تھا اور وہ مقبول بارگاہ خدا تھا۔ان الدین عند الله الا سلام۔اور اسی کے بارے میں خدا فرماتا ہے کہ و من يبعغ غير الا سلام دينا فلن يقبل منه و هو فی لا خرة من الخا سرين۔اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور (دین) اختیار کرے گا اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔ ہاں البتہ لفظ شریعت اور منہاج جو فروعی احکام کیلئے استعمال ہوتی ہے۔اس میں حالات وظروف کے مطابق ردوبدل اور تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے اور شریعتیں منسوخ ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ اب سرکار خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین اور ان کی لائی ہوئی شریعت دین اسلام کہلاتی ہے جو قیامت تک باقی وبرقرار رہے گی۔ بنا بریں اب اس زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اب قیامت تک صرف وہی اسلام قبول بارگاہ خدا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہے۔لہٰذا سابقہ ادیان کو گو ان کے ادوار واوقات میں اسلام کہا جاتا تھا۔مگر اب چونکہ وہ منسوخ ہو چکے ہیں۔اس لئے اب خدا کا پسندیدہ اور مقبول دین صرف وہی ہے جو حضرت خاتم الانبیاء کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔ جو ناقابل نسخ ہے بلکہ تا قیامت قائم ودائم رہے گا۔اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر اس وقت جناب موسیٰ ۔زندہ ہوتے تو ان پر میری پیروی واجب ہوتی۔ اور جب قرب قیامت میں جناب عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے تو وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی شریعت مقدسہ کی پیروی کریں گے۔

لہٰذا وحدت ادیان کے مدعی جو سورہ بقرہ کی آیت ۶۲ ''وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''۔سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہے کہ کوئی یہودی ہو یا نصرانی یا کسی اور دین کا پیروکار۔نجات کیلئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک خداوآخرت پرایمان اور دوسرا نیک کام۔مسلمانوں کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔یہ استدلال بالکل غلط اور باطل ہے کیونکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اللہ اور آخرت پر ایمان لاکر اور نیک عمل بجالا کر وفات پا گئے۔مگر آپ کی آمد کے بعد اگر کوئی شخص بے شک اللہ وآخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل بھی بجالائے۔لیکن اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر باوجود اطلاع کے ایمان نہیں لائے گا اور ان کی لائی ہوئی شریعت اسلامیہ کو برحق سمجھ کر اس کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوگا تو اس کا دین ہرگز قبول نہیں ہوگا۔**وھو فی الاخرۃ من الخاسرین۔**

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ...الآیۃ

قبل ازیں کسی مقام پر یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ ہدایت کے دومعنی ہیں ایک ارائۃ الطریق (راستہ دکھانا) دوسرے **ایصال الی المقصود** (منزل مقصود تک پہنچانا) پہلے معنی کے اعتبار سے تو خداوند عالم انبیاء و رسل کے واسطہ سے ہر شخص کو ہدایت کرتا ہے۔قبول کرنا یا نہ کرنا بندہ کا اختیاری فعل ہے۔اور جہاں تک دوسرے معنی کے لحاظ سے ہدایت کا تعلق ہے تو اس معنی میں خداوند عالم انہی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو خلوص نیت کے ساتھ ہدایت حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ارشاد قدرت ہے:

''وَ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' (سورہ عنکبوت آیت۔۶۹)

یہاں رسول سے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں اور کافر ہونے والوں کے سب سے بڑے مصداق یہود ونصاریٰ کے احبار وعلماء ہیں۔جو تورات وانجیل کی بشارتوں کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کو جانتے تھے اور مانتے بھی تھے۔مگر وہ جب بینات ومعجزات کے ساتھ تشریف لائے تو ضد، حسد اور اپنے ذاتی مفادات کی خاطر انکار کردیا۔(تفسیر کاشف)۔

سزائے ایں چنین دونان بجز دوزخ کجا باشد

ویسے اس سے عام مرتد بھی مراد ہو سکتے ہیں۔جو اسلام کا اعلان کرنے کے بعد اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔''اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ......... اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا اقف فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورہ آل عمران آیت۔۸۷ اور ۸۹)''

مگر جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنی اصلاح (احوال) کر لی تو بے شک خدا بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔ کیونکہ حدیث میں وارد ہے۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب له۔ گناہ کر کے اس سے توبہ کرنیوالا ایسا ہے جیسا گناہ نہ کرنے والا۔ چنانچہ منقول ہے کہ حارث بن سوید بن الصامت نامی ایک انصاری مجذرین زیادہ بلوی کو دھوکہ سے قتل کر کے بھاگ کھڑا ہوا اور مرتد ہو کر مکہ چلا گیا مگر بعد ازاں اپنے کئے پر نادم ہوا اور اپنی قوم کے توسط سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کر بھیجا۔ کہ اگر میں صدق نیت سے توبہ کروں تو کیا میری توبہ قبول ہو جائیگی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی چنانچہ وہ واپس مدینہ لوٹ آیا اور اچھا مسلمان ثابت ہوا (تفسیر مجمع البیان)۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَھُمۡ کُفَّارٌ ...الآیۃ

بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا اور پھر کفر ہی کی حالت میں مر گئے تو ان میں سے کسی ایک سے زمین بھر سونا بطور فدیہ و معاوضہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے دردناک عذاب ہے اور ان کے لئے کوئی یار و مددگار نہیں ہوں گے۔ (العیاذ باللہ)

تفسیر فیضان الرحمن کی پہلی جلد بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوئی۔

والحمد للہ اولا و اخرا و صلی اللہ علی نبیه محمد و آله الطاھرین

وانا الاحقر محمد حسین النجفی عفی عنہ

سرگودھا۔ یکم شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ۔

بمطابق ۱۵ نومبر ۱۹۹۹ء ساڑھے دس بجے دن۔

❀ ❀ ❀ ❀ ❀